

معارف القرآن

مدرسہ اسلامیہ دارالافتاء
کونوٹی، لاہور



(Darul Afta, Lahore)

مَعَارِفُ الْقُرْآنِ

جلد
۳

ماندہ ، انعام ، اعراف
پارہ ۶ ، رکوع ۵ تا پارہ ۹ ، رکوع ۱

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کراچی



تہذیبی و تعلیمی ادارے

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر ۲۷۳۸

عرضِ نامشور: اگرچہ معارف القرآن کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن
کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد بندی میں سہو غلطی
ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم
مطلع فرمائیں۔
ادارۃ المعارف کراچی ۱۲
احاطہ دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰
فون: ۵۰۳۲۰۲۰۵ - ۵۰۳۹۷۳۳

باہتمام : سید جمیل اشرف
طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون : 5031565 - 5031566
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

مکتبہ معارف القرآن کراچی

فون: 5031565 - 5031566

ادارۃ المعارف کراچی

فون: 5049733 - 5032020

فہرست مضامین معارف القرآن جلد سوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۹۰	زمانہ فترت کی تحقیق	۹	سورۃ مائدہ
۹۱	زمانہ فترت کے احکام	۹	شان نزول اور خلاصہ مضامین سورۃ
۹۲	ایک سوال اور جواب	۱۱	اسلام میں حقوق و معاملات کی اہمیت
۹۳	خاتم الانبیاء کے مخصوص کمالات کی طرف اشارہ	۱۳	ہیبت الانعام کی تفصیل اور اس سے مستثنیٰ جانور
۹۴	قوم موسیٰ پر خصوصی انعامات	۱۵	شعائر اللہ کا مفہوم اور ان کا احترام
۹۵	ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے	۲۰	باہمی تعاون و تناصر کا شرعی اصول
۱۰۳	قوم کی انتہائی بے وفائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عزم و استقلال	۲۲	قومیتوں کی تقسیم
۱۰۵	وادی تیسہ	۲۳	قومیت اور اجتماعیت کیلئے قرآنی تعلیم
۱۱۰	قصۃ بابل و قابیل	۲۶	حلال و حرام جانوروں کی تفصیل
۱۱۱	تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور سچائی واجب ہے	۳۳	عید اور تہوار منانے کے اسلامی اصول
۱۱۳	قبولیت عمل کا مدار اخلاص و تقویٰ پر ہے	۳۶	اکمال دین اور اتمام نعمت کا بیان
۱۱۴	جرم و سزا کے چند قرآنی ضابطے	۳۹	بقیہ حلال و حرام جانوروں کا بیان
۱۱۵	قرآنی قوانین کا عجیب و غریب انقلابی اسلوب	۴۲	طیبات اور خبائث کی شرعی حقیقت
۱۱۶	شرعی سزاؤں کی تین قسمیں اور ان کی تفصیل	۴۸	صرف نام کے یہودی و نصرانی جو حقیقتہً کسی مذہب کے قائل نہیں ہر تہیہ اہل کتاب میں داخل نہیں
۱۲۶	دلیل کی تفسیر	۴۹	دلہام اہل کتاب سے کیا مراد ہے ؟
۱۲۹	سرقہ کی تعریف اور اس کی تفصیل	۵۱	اہل کتاب کا ذبح حلال ہونے کی حکمت اور وجہ
۱۳۳	اسلامی سزاؤں پر اعتراضات کا جواب	۵۶	خلاصہ کلام
۱۳۴	رسوم جاہلیت کا منانا اور اسلامی مساوات کا قیام	۶۰	کن عورتوں سے نکاح حلال ہے ؟ اور محضنت کی تفصیل
۱۳۵	اس پر کفار کے طعنے اور ان کا جواب از آیت ۲۳ تا ۲۴	۶۵	احکام شرعیہ متعلقہ عبادات
۱۳۶	اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے مقدمات کا ضابطہ	۶۸	سچی گواہی کا بیان اور شہادت کی تفصیل
۱۳۸	یہود کی ایک بُری خصلت	۷۰	انتخابات کے غیر سند اور سرٹیفکیٹ اور انتخابات کے دوٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں
۱۴۰	عوام کیلئے علماء کے اتباع کا ضابطہ	۷۲	امت محمدیہ برحق تعالیٰ کے خصوصی انعامات
۱۴۱	یہود کی ایک دوسری بُری خصلت	۷۸	وہ عبد ميثاق جو بنی اسرائیل سے لیا گیا اس کی تفصیل
۱۴۲	تیسری بُری خصلت، کتاب اللہ کی تحریف	۸۱	بنی اسرائیل کا نقص و عہد اور اس پر حق تعالیٰ کا غضب
۱۴۳	چوتھی بُری خصلت، رشوت خواری	۸۲	عیسائی فرقوں میں باہمی عداوت
۱۴۴	تورات کے کتاب الہی ہونے کا بیان	۸۴	تردید قول نصاریٰ
۱۴۵	قرآن تورات و انجیل کا بھی محافظ ہے		
۱۴۶	شرائع انبیاء پر جزوی اختلاف اور اس کی حکمت		
۱۴۷	چند احکام		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۷	حضرت یح علیہ السلام کی الوہیت کی تردید	۱۶۵	آیت ۵ تا ۵ مع خلاصہ تفسیر
۲۰۸	حضرت مریمؑ بنی تمیم یا ولی	۱۷۰	شان نزول کا واقعہ یہودی عہد شکنی اور اہل مکہ سے سازش
۲۱۰	آیت ۸ تا ۸ مع خلاصہ تفسیر	۱۷۵	وفات نبویؐ کے بعد فتنہ ارتداد و صدیق اکبر کا جہاد
۲۱۱	بنی اسرائیل کی مجبوری کا ایک دوسرا پہلو	۱۸۱	میلہ کذاب اور اسود غنسی کا خاتمہ
۲۱۱	بنی اسرائیل کی افراط و تفریط	۱۸۳	آیت ۵۹ تا ۶۱ مع خلاصہ تفسیر
۲۱۲	اللہ تعالیٰ تک رسائی کا طریقہ	۱۸۳	تبلیغ و دعوت میں مخاطب کے نفسیات کی رعایت
۳۱۲	غلو منوع ہے مگر علمی تحقیق و تدقیق اس میں داخل نہیں	۱۸۴	آیت ۶۲، ۶۳ مع خلاصہ تفسیر
۳۱۲	بنی اسرائیل کو معتدل راہ کی ہدایت	۱۸۴	یہودی اخلاقی تباہ حالی
۳۱۲	بنی اسرائیل کے غلو کا انجام بد	۱۸۵	اصلاح اعمال کا طریقہ
۲۱۶	آیت ۸۲ تا ۸۶ ابتدائی پارہ ہفتم مع خلاصہ تفسیر	۱۸۵	علماء پر عوام کے اعمال کی ذمہ داری
۲۱۶	بعض اہل کتاب کی حق پرستی	۱۸۷	علماء و مشائخ کے لئے تنبیہ
۲۱۷	شاہ حبشہ کے دربار میں حضرت جعفرؑ کی تقریر	۱۸۷	اصلاح امت کا طریقہ
۲۱۷	اور بادشاہ حبشہ پر اس کا اثر	۱۸۸	گناہوں پر اظہار نفرت نہ کرنے پر وعید
۲۱۷	شاہ حبشہ کا وفد بارگاہ رسالت میں	۱۸۹	آیت ۶۴ تا ۶۷ مع خلاصہ تفسیر
۲۱۸	قوم و ملت کی اصلی روح حق پرست علماء و مشائخ ہیں	۱۹۱	یہودی ایک گستاخی کا جواب
۲۱۹	آیت ۸۷، ۸۸ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۲	احکام الہیہ پر پورا عمل دنیا میں برکات کا سبب ہے
۲۲۰	ترک دنیا حد شرعیہ کے اندر ہو تو مجبور نہ حرام ہے	۱۹۳	احکام الہیہ پر پورا عمل کس طرح ہوتا ہے
۲۲۰	کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے عین درجات	۱۹۳	ایک شبہ کا جواب
۲۲۱	آیت ۸۹ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۴	تبلیغ و دعوت کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی
۲۲۲	قسم کھانسی کی چند صورتیں اور ان کے متعلق احکام	۱۹۵	حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت کی ایک نصیحت
۲۲۳	قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ کی ادائیگی معتبر نہیں	۱۹۵	آیت ۶۸، ۶۹ مع خلاصہ تفسیر
۲۲۵	آیت ۹۰ تا ۹۲ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۷	اہل کتاب کو شریعت الہیہ کے اتباع کی ہدایت
۲۲۶	تمام کائنات کی تخلیق انسان کے نفع کے لئے ہی	۱۹۷	حدیث رسولؐ بھی قرآن کی طرح واجب اتباع ہے
۲۲۷	ازلام کی تشریح	۱۹۸	احکام شرعیہ کی تین قسمیں
۲۲۷	قرعہ اندازی کی جائز صورت	۱۹۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تسلی
۲۲۷	شراب اور جوئے کے جسمانی اور روحانی مفساد	۲۰۰	چار اقوام کو ایمان کی دعوت اور عمل صالح کی ترغیب اور نجات آخرت کا وعدہ
۲۳۰	آیت ۹۳ تا ۹۶ مع خلاصہ تفسیر	۲۰۰	اللہ کے نزدیک اعزاز و امتیاز کا مدار عمل صالح پر ہے
۲۳۲	حرم میں شرکاء کی ممانعت اور متعلقہ مسائل	۲۰۱	ایمان باللہ ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالرسول
۲۳۵	آیت ۹۷ تا ۱۰۰ مع خلاصہ تفسیر	۲۰۲	کے بغیر کسی کی نجات (ایک شبہ کا جواب)
۲۳۷	امن و اطمینان کے چار ذرائع	۲۰۳	آیت ۱۰۱، ۱۰۲ مع خلاصہ تفسیر
۲۳۸	بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے	۲۰۳	بنی اسرائیل کی عہد شکنی
۲۳۸	امن عالم بیت اللہ کے وجود سے وابستہ ہے	۲۰۵	آیت ۱۰۳ تا ۱۰۵ مع خلاصہ تفسیر
۲۳۹	خبیث اور طیب کی تشریح		
۲۴۱	آیت کا شان نزول		
۲۴۲	آیت ۱۰۱ تا ۱۰۳ مع خلاصہ تفسیر		
۲۴۳	بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت		
۲۴۵	شان نزول		
۲۴۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہے		
۲۴۶	بحرہ اسبابہ وغیرہ کی تشریح		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	سُورَةُ الْأَنْعَامِ	۲۴۷	آیت ۱۰۴ تا ۱۰۵ مع خلاصہ تفسیر
		۲۴۸	آیات کا شان نزول
۲۷۶	آیت ۵ مع خلاصہ تفسیر و معارف	۲۴۹	نااہل کو مقتدار بنانا ملاکت کو دعوت دینا ہے
۲۸۲	آیت ۶ تا ۱۱ مع خلاصہ تفسیر و معارف	۲۵۰	اقتدار کا معیار
۲۸۵	ایک عبرت کا سبق	"	کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ
۲۸۸	آیت ۱۲ تا ۱۴ مع خلاصہ تفسیر و معارف	"	اصلاح خلق کی فکر کرنیوالوں کو ایک تسلی
۲۹۰	آیت ۱۵ تا ۲۱ مع خلاصہ تفسیر	۲۵۱	گناہوں کی روک تھام کے بارگاہ میں صدیق اکبرؐ کا خطبہ
۲۹۳	اسلام کا انقلابی عقیدہ - نفع و ضرر کا الگ صرف ایک اللہ ہے	"	معروف اور منکر کے معنی
۲۹۷	آیت ۲۲ تا ۲۶ مع خلاصہ تفسیر	۲۵۲	ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں سے کوئی بھی
۲۹۸	کیفیت عدم صلاح مشرکین		منکر شرعی نہیں ہوتا
۲۹۹	معارف و مسائل	۲۵۳	آیات ۱ تا ۱۰۸ مع خلاصہ تفسیر
۳۰۵	آیت ۲۷ تا ۳۲ مع خلاصہ تفسیر		آیات کا شان نزول
۳۰۷	معارف و مسائل - اسلام کے تین بنیادی اصول	۲۵۴	وصیت اور وصی کے بعض احکام
۳۱۱	آیت ۳۳ تا ۴۱ مع خلاصہ تفسیر	۲۵۷	کافر کے مقابلہ میں کافر کی گواہی مقبول ہے
۳۱۳	کفار کے بیہودہ کلمات پر رسولؐ کی تسلی	۲۵۸	جس شخص کے ذمہ کسید کا حق ہو وہ اس کو قید کر سکتا ہے
۳۱۵	معارف و مسائل	"	آیت ۱۰۹، ۱۱۰ مع خلاصہ تفسیر
۳۱۶	حقوق خلق کی انتہائی اہمیت	۲۵۹	قیامت میں سب پہلے سوال انبیاء علیہم السلام ہوگا
۳۱۷	آیت ۴۲ تا ۴۵ مع خلاصہ تفسیر	۲۶۱	ایک شبہ کا جواب
۳۱۸	معارف و مسائل	"	انبیاء کی انتہائی شفقت، ایک سوال و جواب
۳۲۲	آیت ۴۶ تا ۴۹ مع خلاصہ تفسیر	"	محشر میں پانچ چیزوں کا سوال
۳۲۳	آیت ۵۰ تا ۵۱ مع خلاصہ تفسیر	۲۶۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصی سوال و جواب
۳۲۴	معارف و مسائل	۲۶۵	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب
۳۲۶	کفار عرب کی طرف سے قرآنی معجزات کا معاندانہ مطالبہ	"	حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند خصوصی انعامات
۳۲۹	آیت ۵۲ تا ۵۵ مع خلاصہ تفسیر	۲۶۶	آیت ۱۱۵ تا ۱۱۸ مع خلاصہ تفسیر
۳۳۱	معارف و مسائل	۲۶۸	مومن کو نبی سے معجزہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے
"	عزت و ذلت کا اسلامی معیار، امیر غریب	"	جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو تو ناشکری کا
۳۳۶	میں کوئی مستیاز نہیں		دوبال بھی بڑا ہوتا ہے
۳۳۷	چند احکام و ہدایات	۲۶۹	آیت ۱۱۶ تا ۱۱۸ مع خلاصہ تفسیر
۳۳۹	توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے	۲۷۱	فوائد مہمہ
۳۴۱	آیت ۵۶ تا ۵۸ مع خلاصہ تفسیر	۲۷۳	آیت ۱۱۹، ۱۲۰ مع خلاصہ تفسیر
۳۴۲	آیت ۵۹ تا ۶۲ مع خلاصہ تفسیر	۲۷۴	ختم سورۃ مائدہ
۳۴۴	معارف و مسائل		
"	گناہوں سے بچنے کا نسخہ، اکسیر		
۳۴۵	قرآنی اصطلاح میں علم غیب تم کی خاص صفت کوئی دوسرا نہیں		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۴	آیت ۱۰ تا ۱۱ مع خلاصہ تفسیر	۳۴۶	غیب کی خبر و کون علم غیب کہنا عوامی اصطلاح ہے
۳۱۷	معارف و مسائل	۳۵۲	آیت ۶۳ تا ۶۴ مع خلاصہ تفسیر
۳۲۱	کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے	"	معارف و مسائل، علم و قدرت الہیہ کے بعض مظاہر
۳۲۳	اگر کسی جائز کام سے مفاسد لازم آتے ہوں تو اس کا ترک لازم ہے	۳۵۴	عبرت
۳۲۵	آیت ۱۱ تا ۱۲ مع خلاصہ تفسیر	"	حوادث و مصائب کا علاج
۳۲۷	معارف و مسائل	۳۵۷	آیت ۶۵ تا ۶۷ مع خلاصہ تفسیر
۳۳۱	آیت ۱۸ تا ۲۱ مع خلاصہ تفسیر	۳۵۸	معارف و مسائل
۳۳۲	معارف و مسائل	"	عذاب الہی کی تین قسمیں
"	آیت ۱۲۲ مع خلاصہ تفسیر	۳۶۴	اختلاف امت کے رحمت ہونے کا مطلب
۳۳۵	معارف و مسائل	۳۶۶	آیت ۶۸ تا ۷۳ مع خلاصہ تفسیر
"	مومن زندہ ہو اور کافر مردہ	۳۷۰	معارف و مسائل
۳۳۶	انسان کا مقصد حیات	"	اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز
۳۳۸	ایمان نور ہے اور کفر ظلمت	۳۷۵	آیت ۷۴ تا ۸۱ مع خلاصہ تفسیر
۳۳۹	نور ایمان کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے	۳۷۹	اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت اپنے گھراور
۳۴۰	آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵ مع خلاصہ تفسیر	۳۷۹	خاندان سے شروع کرنی چاہئے
۳۴۱	معارف و مسائل	۳۸۱	دو قومی نظریے مسلمان ایک قوم اور کافر دوسری قوم
۳۴۳	نبوت اور رسالت کسی اور اختیار سے نہیں بلکہ ایک عہد ہے جس کے عطا کرنے کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے	۳۸۱	تبلیغ و دعوت میں حکمت تدبیر کا لینا سنت انبیاء ہے
۳۴۴	دین میں شرح صدر اور اس کی علامات	۳۸۲	مبلغین اسلام کیلئے چند ہدایات
"	صحابہ کرام کو دین میں شرح صدر حاصل تھا اس لئے	۳۸۲	آیت ۸۲ تا ۸۹ مع خلاصہ تفسیر
۳۴۵	شکوہ و شہادت بہت کم پیش آئے	۳۸۶	معارف و مسائل
"	شکوہ و شہادت دو رکن یکا اصلی طریقہ بحث و مباحثہ نہیں	۳۸۹	آیت ۹۰ تا ۹۴ مع خلاصہ تفسیر
"	آیت ۱۲۶ تا ۱۲۸ مع خلاصہ تفسیر	۳۹۲	معارف و مسائل
۳۴۷	معارف و مسائل	۳۹۸	آیت ۹۵ تا ۹۸ مع خلاصہ تفسیر
۳۵۰	آیت ۱۲۹ تا ۱۳۲ مع خلاصہ تفسیر	۳۹۹	معارف و مسائل
۳۵۲	معارف و مسائل	۴۰۰	مخلوقات کے آرام کیلئے رات کی قدرتی اور جبری تعین ایک عظیم نعمت ہے
"	محشر میں لوگوں کی جماعتیں اعمال اخلاق کی بنیاد پر ہونگی	۴۰۲	شمسی اور قمری حساب
"	دنوی تعلقات کی بنیاد پر نہیں	۴۰۴	آیت ۹۹ تا ۱۰۲ مع خلاصہ تفسیر
۳۵۳	دنیا میں بھی اعمال اخلاق کا اجتماعی معاملا ہے اثر	۴۰۷	معارف و مسائل
"	ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے	۴۰۹	آیت ۱۰۳ تا ۱۰۷ مع خلاصہ تفسیر
		۴۱۱	معارف و مسائل
			رویت باری تعالیٰ کا مسئلہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۹۳	آیت ۵۳ تا ۱۵۷ مع خلاصہ تفسیر	۴۵۵	کیا جنات میں بھی رسول ہوتے ہیں؟
۴۹۵	معارف و مسائل	"	ہندوؤں کے اوتار بھی عموماً جنات ہوتے ہیں نہیں
"	آیت ۱۵۸ مع خلاصہ تفسیر	"	کسی رسول نبی ہونے کا احتمال
۴۹۶	معارف و مسائل	۴۵۷	آیت ۱۳۳ تا ۱۳۶ مع خلاصہ تفسیر
۴۹۷	قیامت اور اس کی نشانیاں	۴۵۸	معارف و مسائل
۵۰۱	آیت ۱۵۹، ۱۶۰ مع خلاصہ تفسیر و مسائل	۴۵۹	اللہ تعالیٰ سب کے لیے نیاز ہوا اور تخلیق کائنات
۵۰۲	دین میں بدعت ایجاد کرنے پر وعید شدید	"	صرف اس کی رحمت کا نتیجہ ہے
۵۰۶	آیت ۱۶۱ تا ۱۶۵ مع خلاصہ تفسیر	۴۵۹	انسان اللہ سے بے نیاز نہیں اور اس کی حکمت
۵۰۸	معارف و مسائل	۴۶۲	کافروں پر تنبیہ اور اس میں مسلمانوں کے لئے عبرت
۵۱۰	کس کے گناہ کا بار دوسرا نہیں اٹھا سکتا	"	آیت ۱۳۷ تا ۱۴۰
۵۱۲	ختم سورۃ النعام	۴۶۳	رسوم جاہلیت
		۴۶۴	خلاصہ تفسیر
		۴۶۵	آیت ۱۴۱، ۱۴۲ مع خلاصہ تفسیر
		۴۶۷	معارف و مسائل
		۴۶۸	زمین کا عشر
۵۱۴	آیت ۱ تا ۷	۴۶۹	آیت ۱۴۳ تا ۱۴۴ مع خلاصہ تفسیر
۵۱۵	خلاصہ مضامین سورۃ، خلاصہ تفسیر	۴۷۱	آیت ۱۴۵ تا ۱۴۷ مع خلاصہ تفسیر
۵۱۶	معارف و مسائل	۴۷۳	آیت ۱۴۸ تا ۱۵۰ مع خلاصہ تفسیر
۵۱۷	آیت ۸ تا ۱۰، مع خلاصہ تفسیر	۴۷۴	آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳ مع خلاصہ تفسیر
۵۱۸	معارف و مسائل	۴۷۶	معارف و مسائل آیات مذکورہ کی اہم خصوصیات
۵۲۰	وزن اعمال کی متعلق ایک شبہ اور جواب	۴۷۹	آیات مذکورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصیت نامہ
۵۲۲	وزن اعمال کس طرح ہوگا؟	۴۸۰	سب پہلا گناہ عظیم شرک ہے
۵۲۳	آیت ۱۱ تا ۱۸ مع خلاصہ تفسیر	۴۸۱	شرک کی تعریف اور قسمیں
۵۲۴	معارف و مسائل	"	دوسرا گناہ والدین سے بدسلوکی ہے
"	ابلیس کی دُعا کے متعلق دو آیتوں میں متعارض	۴۸۲	تیسرا حرام قتل اولاد ہے
"	الفاظ کی تطبیق	۴۸۳	اولاد کی تعلیمی اخلاقی تربیت نہ کرنا اور بے دینی کیلئے آزاد
۵۲۸	کیا کافر کی دُعا بھی قبول ہو سکتی ہے؟	"	چھوڑ دینا بھی ایک طرح سے قتل اولاد ہے
"	واقعہ آدم و ابلیس کے مختلف الفاظ	"	چوتھا حرام بے حیائی کے کام ہیں
"	بارگاہ خداوندی میں ابلیس کو بیباکانہ گفتگو کی	۴۸۶	پانچواں حرام قتل ناحق ہے
"	جرات کیلئے ہوتی؟	۴۸۷	چھٹا حرام یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانا
۵۲۹	شیطان کا حملہ انسان پر چار طرف میں محدود نہیں	۴۸۸	ساتواں حرام ناپ تول میں کمی
"	عام ہے	"	افسردہ، ملازموں اور مزدوروں کا اپنی مقررہ
"	آیت ۱۹ تا ۲۵ مع خلاصہ تفسیر	۴۸۹	ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا ناپ تول کی کمی کے حکم میں ہے
"	معارف و مسائل	"	آٹھواں حکم عدل انصاف اس کے خلاف کرنا حرام ہے
۵۳۱	آیت ۲۶ تا ۲۷ مع خلاصہ تفسیر	۴۹۰	نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا عہد شکنی کا حرام ہونا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۶۳	آیت ۲۲ تا ۲۹ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۳	معارف و مسائل
۳۶۵	معارف و مسائل	۵۳۲	لباس کے دو فائدے
۵۶۶	اہل اعراف کون لوگ ہیں؟	"	انسان پر شیطان کا پہلا حملہ اور آجکل کی نئی تہذیب
۵۶۸	مسلام کا مسنون لفظ	"	ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی ہے
۵۶۹	آیت ۵۰ تا ۵۳ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۵	نیا لباس پہننے کے وقت پُرانے لباس کو
۵۷۱	آیت ۵۴، مع خلاصہ تفسیر		صدقہ کرنے کا ثواب
"	معارف و مسائل	"	ستر پوشی ابتداءً آفرینش سے انسان کا
۵۷۲	آسمان و زمین کی تخلیق میں چھ روز کی مدت کیوں لگی		فطری عمل ہے
"	تخلیق زمین و آسمان و سیارات سے پہلے دن رات	"	لباس کی ایک تیسری قسم
	کیسے پہچانے گئے؟	۵۳۶	ظاہری لباس کا بھی اصل مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے
۵۷۵	آیت ۵۵، ۵۶ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۷	آیت ۲۸ تا ۳۱ مع خلاصہ تفسیر
۵۷۶	معارف و مسائل	۵۳۸	معارف و مسائل
"	احکام و عار اور اس کے آداب	۵۳۳	نماز میں ستر پوشی فرض ہے
۵۸۰	زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے؟	"	نماز کے لئے اچھا لباس
۵۸۲	دعار کے مزید آداب	"	نماز کے لباس کی متعلق چند مسائل
۵۸۵	آیت ۵۷، ۵۸ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۴	کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے
۵۸۶	معارف و مسائل	۵۳۵	اشیاء عامہ میں اصل اباحت ہے جب تک کسی
۵۹۰	آیت ۵۹ تا ۶۲ مع خلاصہ تفسیر		وسیل سے حرمت ثابت نہ ہو
۵۹۱	معارف و مسائل، واقعہ قوم نوح	"	کھانے پینے میں اسراف جائز نہیں
۵۹۶	آیت ۶۵ تا ۷۲ مع خلاصہ تفسیر	"	کھانے پینے میں اعتدال ہی نافع دین و دنیا ہے
۵۹۹	معارف و مسائل، عار اور عورت کی محقر تاریخ	۵۳۶	ایک آیت سے آٹھ مسائل شرعیہ
۶۰۰	حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات	۵۳۷	آیت ۳۲ تا ۳۴ مع خلاصہ تفسیر
۶۰۳	آیت ۷۳ تا ۷۶ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۹	معارف و مسائل
۶۰۵	معارف و مسائل، واقعہ شمود	"	عمد لباس اور لذیذ کھانے پر مہر اسلام کی تعلیم نہیں
۶۰۸	چند احکام و مسائل	۵۵۰	خوراک پوشاک میں سنت نبوی
۶۰۹	آیت ۷۷ تا ۷۹ مع خلاصہ تفسیر	۵۵۳	آیت ۳۵ تا ۳۹ مع خلاصہ تفسیر
۶۱۰	معارف و مسائل	۵۵۶	آیت ۴۰ تا ۴۳ مع خلاصہ تفسیر
۶۱۳	آیت ۸۰ تا ۸۳ مع خلاصہ تفسیر	۵۵۷	معارف و مسائل
۶۱۵	معارف و مسائل، واقعہ قوم لوط	۵۶۰	احکام شریعت میں سہولت کی رعایت
۶۱۹	آیت ۸۵ تا ۸۷ مع خلاصہ تفسیر	۵۶۱	اہل جنت کے دل بجا ہی کدورتیں نکال لی جائیں گی
۶۲۱	معارف و مسائل، واقعہ اہل مدین	۵۶۲	ہدایت کے مختلف درجات ہیں جس کا آخری درجہ
۶۲۵	آیت ۸۸ تا ۹۳ مع خلاصہ تفسیر		دخول جنت ہے
۶۲۸	معارف و مسائل		

سُورَةُ الْمَائِدَةِ

(یہ سورت مدنی ہے اس میں ایک سو بیس آیات اور رسولہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ●

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۖ أُحِلَّتْ لَكُمْ

لے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو حلال ہوئے تمہارے لئے

بِهَيْمَةِ الْأُنْعَامِ ۚ إِلَّا مَا يَتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرُ مُحِلِّ

چوہائے مویشی سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے

الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ①

مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے

سُورَتِ کا شان نزول | یہ سورۃ مائدہ کی ابتدائی آیت ہے۔ سورۃ مائدہ بالاتفاق مدنی

اور خلاصۂ مضامین | سورۃ ہے اور مدنی سورتوں میں بھی آخر کی سورت ہے یہاں

تک کہ بعض حضرات نے اس کو قرآن کی آخری سورت بھی کہا

ہے۔ مسند احمد میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمار بنت یزید منقول ہے کہ سورۃ

مائدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ سفر میں عصبہ نامی اونٹنی پر

سوار تھے۔ نزول وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسب دستور اُس وقت

بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہو گئی۔ تو آپ اس سے نیچے اتر آئے۔ یہ سفر لفظ ہر حجۃ الوداع

کاسفر ہے جیسا کہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حجۃ الوداع ہجرت کے پچیس سال میں ہوا، اور اس سے واپسی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات تقریباً اسی دن ہی ابن حبان نے بحر محیط میں فرمایا کہ سورۃ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حدیبیہ میں اور بعض فتح مکہ کے سفر میں اور بعض حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت نازل قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے خواہ بالکل آخری سورت نہ ہو۔

روح المعانی میں بحوالہ ابو عبیدہ حضرت حمزہ بن حبیب اور عطیہ بن قیس کی یہ روایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ المائدۃ من آخر القرآن تنزیلاً فاحلوا حللہا وحرّموا حرّمہا۔ یعنی سورۃ مائدہ ان چیزوں میں سے ہے جو نازل قرآن کے آخری دور میں نازل کی گئی ہیں۔ اس میں جو چیز حلال کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حلال اور جو چیز حرام کی گئی ہے اس کو ہمیشہ کے لئے حرام سمجھو۔

اسی قسم کی ایک روایت ابن کثیر نے مستدرک حاکم کے حوالہ سے حضرت جبیر بن نفیرہ سے نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبیر تم سورۃ مائدہ پڑھتے ہو۔ انھوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں۔ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ قرآن پاک کی آخری سورۃ ہو اس میں جو احکام حلال و حرام کے آئے ہیں وہ محکم ہیں۔ ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔ سورۃ مائدہ میں بھی سورۃ نسا کی طرح فروعی احکام، معاملات، معاہدات وغیرہ کے زیادہ بیان کئے گئے ہیں۔ اسی لئے روح المعانی نے فرمایا ہے کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران باعتبار مضامین کے متحد ہیں۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر احکام اصول عقائد، توحید، رسالت، قیامت وغیرہ کے آئے ہیں۔ فروعی احکام ضمنی ہیں اور سورۃ نسا اور مائدہ باعتبار مضامین کے متحد ہیں کہ ان دونوں میں بیشتر فروعی احکام کا بیان ہے، اصول کا بیان ضمنی ہے۔ سورۃ نسا میں باہمی معاملات اور حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے۔ شوہر بیوی کے حقوق، یتیموں کے حقوق، والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ سورۃ مائدہ کی پہلی آیت میں بھی ان تمام معاملات اور معاہدات کی پابندی اور ان کے پورا کرنے کی ہدایت آئی ہے۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوفُوا بِالْعُقُودِ اسی لئے سورۃ مائدہ کا دوسرا نام سورۃ عقود بھی ہے۔ (بحر محیط)

معاہدات اور معاملات کے بارہ میں یہ سورۃ اور بالخصوص اس کی ابتدائی آیت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمر بن حزمہ کو مین کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا اور ایک فرمان لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ تو اس فرمان کے

سرنامہ پر آپ نے یہ آیت تحریر فرمائی تھی۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو تمھارے ایمان کا مقتضایہ ہے کہ اپنے عہدوں کو (جو کہ ایمان کے ضمن میں تم نے خدا تعالیٰ سے کئے ہیں) پورا کرو (یعنی احکام شرعیہ کو بجا لاؤ، کیونکہ ایمان لانے سے سب کا التزام ہو گیا اور التزام کا مقتضی ایفا ہے) تمھارے لئے تمام چوپائے جو مشابہ (ان) الغام (یعنی اونٹ، بکری، گائے) کے ہوں (جن کی حلت اس کے قبل سورۃ الغام میں جو کہ مکیتہ ہے معلوم ہو چکی ہے، پس ان کے مشابہ جتنے چوپائے ہیں) حلال کئے گئے ہیں (جیسے ہرن، نیل گائے، وغیرہ کہ اونٹ بکری گائے کے مشابہ ہیں اس بات میں کہ درندے اور شکاری نہیں بجز ان بہائم کے جو کہ دوسرے دلائل شرعیہ حدیث وغیرہ سے مخصوص و مستثنیٰ ہو چکے ہیں۔ جیسے گدھا، خچر وغیرہ۔ ان مستثنیات کے سوا اور سب بہائم اہل وحشی حلال ہیں) مگر جن کا ذکر آگے (آیت حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْبَيْتَاتُ الَّتِیْ هِیَ) آتا ہے (کہ وہ باوجود بے حیثیتہ الا نغار میں داخل ہونے اور مخصوص بالحدیث وغیرہ سے خارج ہونے کے بھی حرام ہیں۔ اور باقی تم کو حلال ہیں) لیکن (ان میں) جو شکار (ہیں ان) کو حلال مت سمجھنا جس حالت میں کہ تم احرام (یا حرم) میں ہو (مثلاً حج و عمرہ کا احرام باندھے ہو گو حرم سے خارج ہو یا یہ کہ حرم کے اندر ہو کہ غالباً شکار بھی حرم کے اندر ہوگا، کیونکہ اصل مدار حکم کا شکار کا حرم کے اندر ہونا ہے گو احرام نہ باندھے ہو، دونوں حالتوں میں شکار یعنی بڑی وحشی کا حرام ہے) بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہے حکم کریں۔ یعنی وہی مصلحت ہوتا ہے، پس جس جانور کو چاہا ہمیشہ کے لئے فی نفسہ غیر اوقات اضطرار میں حرام کر دیا جس کو چاہا ہمیشہ کے لئے حلال کر دیا۔ جس کو چاہا کسی حالت میں حلال کر دیا کسی حالت میں حرام کر دیا۔ تم کو ہر حالت میں امثال واجب ہے۔

معارف و مسائل

اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا جملہ ایک ایسا جامع جملہ ہے کہ اس کی تشریح و تفسیر میں ہزاروں صفحات لکھے جاسکتے ہیں اور لکھے گئے ہیں ارشاد ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** **أَوْفُوا بِالْعُقُودِ**۔ یعنی اے ایمان والو اپنے معاہدوں کو پورا کیا کرو۔ اس میں پہلے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** سے خطاب فرما کر مضمون کی اہمیت کی طرف متوجہ کر دیا گیا کہ اس میں

جو حکم ہے وہ عین ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد حکم فرمایا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ لفظ عقود عقد کی جمع ہے جس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔ اور جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں باندھ جائے اس کو بھی عقد کہا جاتا ہے۔ اس لئے بمعنی عہود ہو گیا۔

امام تفسیر ابن جریر نے مفسرین صحابہ و تابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو۔ اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے اسی لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہو گیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان معاہدات سے کون سے معاہدات مراد ہیں۔ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے اس سے مراد وہ معاہدات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و طاعت کے متعلق لئے ہیں۔ یا وہ معاہدات جو اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کئے ہوئے احکام حلال و حرام سے متعلق اپنے بندوں سے لئے ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے اس جگہ وہ معاہدات مراد ہیں جو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کر لیا کرتے ہیں۔ جیسے معاہدہ نکاح، معاہدہ بیع و شرا و غیرہ مفسرین میں سے ابن زید اور زید بن اسلم اسی طرف گئے ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ معاہدات سے وہ حلف اور معاہدے مراد ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے سے باہمی امداد کے لئے لیا کرتے تھے۔ مجاہد، ربیع، قتادہ وغیرہ، مفسرین نے بھی یہی فرمایا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ سب قسم کے معاہدات لفظ عقود کے تحت میں داخل ہیں اور سبھی پورے کرنے کے لئے قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد۔ دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کر لے، تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور اس تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاہدات۔ یا باہمی سمجھوتے۔ جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق

اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات، نکاح، تجارت، شرکت، اجارہ، ہبہ وغیرہ ان تمام معاہدات میں جو جائز مشرطیں باہم طے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فرقہ پر لازم و واجب ہے۔ اور جائز کی قید اس لئے لگائی کہ خلاف شرع شرط لگانا یا اس کا قبول کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جملہ میں اس عام ضابطہ کی خاص جزئیات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْاَنْعَامِ۔ لفظ بہیمہ ان جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے، جن کو عادتاً غیر ذوی العقول سمجھا جاتا ہے کیونکہ لوگ ان کی بولی کو عادتاً نہیں سمجھتے تو ان کی مراد مبہم رہتی ہے۔ اور امام شعرانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کو عقل نہیں اور عقل کی باتیں اس پر مبہم رہتی ہیں۔ جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل و ادراک سے کوئی جانور بلکہ کوئی شجر و حجر بھی خالی نہیں۔ ہاں درجہ کا فرق ضرور ہے۔ ان چیزوں میں اتنی عقل نہیں ہے جتنی انسان میں اسی لئے انسان کو احکام کا مکلف بنایا گیا ہے۔ جانوروں کو مکلف نہیں بنایا گیا۔ ورنہ اپنی ضروریات زندگی کی حد تک ہر جانور بلکہ ہر شجر و حجر کو حق تعالیٰ نے عقل و ادراک بخشا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ قرآن میں شَئْءٌ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ۔ عقل نہ ہوتی تو اپنے خالق و مالک کو کس طرح پہچانتی اور کس طرح تسبیح کرتی۔

امام شعرانی کے فرمانے کا خلاصہ یہ ہے کہ بہیمہ کو بہیمہ اس لئے نہیں کہتے کہ اس کی بے عقلی کے سبب معلومات اس پر مبہم رہتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی بولی لوگ نہیں سمجھتے۔ اس کا کلام لوگوں پر مبہم رہتا ہے۔ بہر حال لفظ بہیمہ ہر جاندار کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چوپایہ جانداروں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور لفظ اَنْعَامِ نعم کی جمع ہے۔ پالتو جانور جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بکری وغیرہ جن کی آٹھ قسمیں سورہ اَنْعَامِ میں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان کو اَنْعَامِ کہا جاتا ہے۔ بہیمہ کا لفظ عام تھا۔ اَنْعَامِ کے لفظ نے اس کو خاص کر دیا۔ مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ گھر بلو جانوروں کی آٹھ قسمیں تمہارے لئے حلال کر دی گئیں۔ لفظ عقود کے تحت میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ تمام معاہدات داخل ہیں۔ ان میں سے ایک معاہدہ وہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے حلال و حرام کی پابندی کے متعلق لیا ہے۔ اس جملہ میں اس خاص معاہدہ کا بیان آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اونٹ، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کو حلال کر دیا ہے۔ ان کو شرعی قاعدہ کے موافق ذبح کر کے کھا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی ان حدود کے اندر رکھ کر پابندی کرو۔ نہ تو مجوسی اور بت پرستوں کی طرح مطلقاً ان جانوروں کے ذبح ہی کو حرام قرار دو کہ یہ حکمت حق جلّ شاد پر اعتراض اور اس کی نعمت کی ناشکری ہے۔ اور نہ دوسرے گوشت خور فرقوں کی طرح بے قید ہو کر ہر طرح کے جانور کو کھا جاؤ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے قانون کے تحت جن جانوروں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کو کھاؤ۔ اور جن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے اُن سے بچو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی خالق کائنات ہیں۔ وہ ہر جانور کی حقیقت اور خواص سے اور انسان کے اندر ان سے پیدا ہونے والے اثرات سے واقف ہیں۔ وہ طبیات یعنی پاک اور ستھری چیزوں کو انسان کے لئے حلال کر دیتے ہیں۔ جن کے کھانے سے انسان کی جسمانی صحت پر باری و حافی اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑے اور گندے ناپاک جانوروں سے منع فرماتے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لئے مہلک ہیں یا اُن کے اخلاق خراب کرنے والے ہیں۔ اسی لئے اس حکم عام سے چند چیزوں کا استثنا فرمایا۔

پہلا استثناء یہ ہے، **إِلَّا مَا يُتْلَىٰ حَلَالٍ حَكْمٌ**۔ یعنی بجز ان جانوروں کے جنکی حرمت قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔ مثلاً مُردار جانور یا خنزیر وغیرہ۔ دوسرا استثناء یہ: **عَنْبُرٌ مَّحَلًى الصَّيْدِ وَاسْتَمْرَحُ مَرَاةٍ** سے فرمایا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چوپائے جانور تمھارے لئے حلال ہیں، اور جنگل کا شکار بھی حلال ہے۔ مگر جبکہ تم نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا ہو، تو اس وقت شکار کرنا جرم و گناہ ہے اس سے بچو۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ**۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے کسی کو حق نہیں کہ اس کے ماننے میں چون و چرا کرے۔ اس میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کیلئے بعض جانوروں کو ذبح کر کے کھانے کی اجازت کوئی ظلم نہیں۔ جس مالک نے یہ سب جانیں بنائی ہیں۔ اسی نے پوری حکمت و بصیرت کے ساتھ یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لئے غذا بنایا ہے زمین کی مٹی و درختوں کی غذا ہے۔ اور درخت جانوروں کی غذا۔ اور جانور انسان کی غذا۔ انسان سے اعلیٰ کوئی مخلوق اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس لئے انسان کسی کی غذا نہیں بن سکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ

اے ایمان والو! حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو اور نہ ادب والے

الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَاعِدَ وَلَا أُمِّينَ الْبَيْتِ

مہینہ کو اور نہ اس جانور کو جو نیا نہ کعبہ کی ہو اور نہ جن کے گلے پٹاؤں کے لہجے میں کعبہ کو اور نہ آنیوں کو

الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَإِذَا حَلَلْتُمْ

کو حرامیت والے گھر کی طرف جوڑ دیتے ہیں فضل اپنے رب کا اور اس کی خوشی اور جب احرام سے نکلے تو

فَاصْطَادُوا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ أَن صَدُّكُمْ

شکار کر لو اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی

عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۚ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ

حرمت والی مسجد سے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور

وَالْتَّقَوْا ۚ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا

پرہیز گاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر اور ڈرتے رہو

اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝۲

اللہ سے بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے ۔

رابط آیات

سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں معاہدات کے پورا کرنے کی تاکید تھی۔ ان معاہدات میں سے ایک معاہدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حلال و حرام کی پابندی کی جائے۔ اس دوسری آیت میں اس معاہدہ کی دو اہم دفعات کا بیان ہے۔ ایک شعار اللہ کی تعظیم اور ان کی بھیمستی سے بچنے کی ہدایت، دوسرے اپنے اور غیر دوست اور دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کی ممانعت۔

اس آیت کے نزول کا سبب چند واقعات ہیں۔ پہلے ان کو سن لیجئے تاکہ آیت کا مفہوم پوری طرح دلنشین ہو سکے۔ ایک واقعہ حدیبیہ کا ہے جس کی تفصیل قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ ہجرت کے چھٹے سال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ارادہ کیا کہ عمرہ کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار سے زائد صحابہ کے ساتھ احرام عمرہ باندھ کر قصد مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب مقام حدیبیہ میں پہنچ کر مکہ والوں کو اطلاع دی کہ ہم کسی جنگ یا جنگی مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں اس کی اجازت دو۔ مشرکین مکہ نے اجازت نہ دی۔ اور بڑی سخت اور کڑی شرطوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ اس وقت سب اپنے احرام کھول دیں اور واپس جائیں۔ آئندہ سال عمرہ کے لئے اس طرح آئیں کہ ہتھیار ساتھ نہ ہوں۔ صرف تین روز ٹھہریں۔ اور عمرہ کر کے چلے جائیں۔ اور بھی بہت سی ایسی شرائط تھیں جن کا تسلیم کر لینا بظاہر مسلمانوں کے وقار و عزت کے منافی تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سب مطمئن ہو کر واپس ہو گئے۔ پھر مشرکین میں دوبارہ ماہ ذی قعدہ میں انھیں شرائط کی پابندی کے ساتھ یہ عمرہ قضا کیا گیا۔ بہر حال واقعہ حدیبیہ اور ان توہین

آمین شرائط فی صحابہ کرام کے قلوب میں مشرکین مکہ کی طرف سے انتہائی نفرت و بغض کا بیج بو دیا تھا۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ مشرکین مکہ میں سے حطیم بن ہند اپنا مال تجارت لے کر مدینہ طیبہ آیا۔ اور مال فروخت کرنے کے بعد اپنا سامان اور آدمی مدینہ سے باہر چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور منافقانہ طور پر اپنا ارادہ اسلام لانے کا ظاہر کیا تاکہ مسلمان اس سے مطمئن ہو جائیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آنے سے پہلے ہی بذریعہ وحی خبر پاکر صحابہ کرام کو بتلادیا تھا کہ ہمارے پاس ایک شخص آنے والا ہے جو شیطان کی زبان سے کلام کرے گا۔ اور جب یہ واپس گیا تو آپ نے فرمایا کہ شیخ کفر کے ساتھ آیا اور دھوکہ دہری کیا تھا لوٹا، یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس نکل کر سیدھا مدینہ سے باہر پہنچا۔ جہاں اہل مدینہ کے جانور چر رہے تھے ان کو ٹھنکا کر ساتھ لے گیا۔ صحابہ کرام کو اس کی اطلاع کچھ دیر میں ہوئی۔ تعاقب کے لئے نکلے تو وہ ان کی زد سے باہر ہو چکا تھا۔ پھر جب ہجرت کے ساتویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ حدیبیہ کی قضا کے لئے جا رہے تھے تو دور سے تلبیہ کی آواز سنی اور دیکھا کہ یہی حطیم بن ہند اہل مدینہ کے ان جانوروں کو جو مدینہ سے لایا تھا بطور قربانی کے اپنے ساتھ لئے ہوئے عمرہ کرنے جا رہا ہے۔ اس وقت صحابہ کرام کا قصد ہوا کہ اس پر حملہ کر کے اپنے جانور چھین لیں اور اس کو یہیں ختم کر دیں۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ہجرت کے آٹھویں سال رمضان المبارک میں مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور تقریباً پورے عرب پر اسلامی قبضہ ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی انتقام کے آزاد فرما دیا۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے سب کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے جاہلانہ طرز پر حج و عمرہ کی رسوم بھی ادا کرتے رہے۔ اس وقت بعض صحابہ کرام کے دل نہیں واقعہ حدیبیہ کا انتقام لینے کا خیال آیا کہ انھوں نے ہمیں جائز اور حق طریق پر عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ہم ان کے ناجائز اور غلط طریق کے عمرہ و حج کو کیوں آزاد چھوڑیں، ان پر حملہ کریں، ان کے جانور چھین لیں اور ان کو ختم کر دیں۔

یہ واقعات ابن جریر نے بروایت عکرمہ وسدی نقل کئے ہیں۔ یہ چند واقعات تھے کہ جن کی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ شعائر اللہ کی تعظیم تمھارا اپنا فرض ہے۔ کسی دشمن کے بغض و عداوت کی وجہ سے اس میں خلل ڈالنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ ایشہ حرم میں قتل و قتال بھی جائز نہیں۔ قربانی کے جانوروں کو حرم تک جانے سے روکنا یا ان کا چھین لینا بھی جائز نہیں اور جو مشرکین احرام باندھ کر اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کے فضل و رضا حاصل کرنے کے قصد سے چلے ہیں۔ (اگرچہ بوجہ کفر ان کا یہ خیال خام ہے

تاہم، شعار اللہ کی حفاظت و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ نیز وہ لوگ جنہوں نے تمہیں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ان کے بغض و عداوت کا انتقام اس طرح لینا جائز نہیں کہ مسلمان ان کو مکہ میں داخل ہونے یا شعار حج ادا کرنے سے روک دیں۔ کیونکہ ان کے ظلم کے بدلہ میں ہماری طرف سے ظلم ہو جائے گا، جو اسلام میں روا نہیں۔ اب آیت کی پوری تفسیر دیکھئے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو بے حرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ (کے دین) کی نشانیوں کی (یعنی جن چیزوں کے ادب کی حفاظت کے واسطے خدا تعالیٰ نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں۔ ان احکام کے خلاف کر کے ان کی بے ادبی نہ کرو، مثلاً حرم اور احرام کا یہ ادب مقرر کیا ہے کہ اس میں شکار نہ کرو تو شکار کرنا بے ادبی اور حرام ہوگا) اور نہ حرمت والے مہینے کی (بے ادبی کرو کہ اس میں کافروں سے لڑنے لگو) اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کی (بے ادبی کرو کہ اس سے تعرض کرنے لگو) اور نہ ان جانوروں کی (بے ادبی کرو) جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے پڑے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز میں حرم میں ذبح ہوں گے) اور نہ ان لوگوں کی (بے حرمتی کرو) جو کہ بیت الحرام (یعنی بیت اللہ) کے قصد سے جا رہے ہوں (اور) اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں (یعنی ان چیزوں کے ادب سے کافروں کے ساتھ بھی تعرض مت کرو) اور (اوپر کی آیت میں جو احرام کے ادب سے شکار کو حرام فرمایا گیا ہے وہ احرام ہی تک ہے ورنہ) جس وقت تم احرام سے باہر آ جاؤ تو (اجازت ہے کہ) شکار کیا کرو (بشرطیکہ وہ شکار حرم میں نہ ہو) اور (اوپر جن چیزوں کے تعرض سے منع کیا گیا ہے اس میں) ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم سے جو اس سبب سے بغض ہے کہ انہوں نے (تم کو سال حدیبیہ میں) مسجد حرام (میں جانے) سے روک دیا تھا (مراد کفار قریش ہیں) وہ (بغض) تمہارے لئے اس کا باعث ہو جاوے کہ تم (شرع کی) حد سے نکل جاؤ۔ (یعنی احکام مذکورہ کے خلاف کر بیٹھو، ایسا نہ کرنا) اور تم کی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو (مثلاً یہ احکام ہیں کہ ان میں دوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دو) اور گناہ اور زیادتی (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت مت کرو (مثلاً یہی احکام ہیں اگر کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو تم اس کی اعانت مت کرو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس سے سب احکام کی پابندی سہل ہو جاتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (احکام کی مخالفت کرنے والے کو) سخت

سزا دینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ** یعنی اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ اس میں لفظ **شعائر** جس کا ترجمہ نشانیوں سے کیا گیا ہے شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، اسی لئے **شعائر** اور شعیرہ اس محسوس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو۔ **شعائر اسلام** ان اعمال و افعال کو کہا جائیگا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق ڈاڑھی وغیرہ۔ **شعائر اللہ** کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ سے منقول ہے مگر صاف بات وہ ہے جو بحر محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصری اور عطاء رحمہ سے منقول ہے اور امام جصاص نے اس کو تمام اقوال کے لئے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ **شعائر اللہ** سے مراد تمام شرائع اور دین کے مقرر کردہ واجبات و فرائض اور ان کی حدود ہیں۔ اس آیت میں **لَا تَحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ** کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے **شعائر** کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور **شعائر اللہ** کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دوسرے یہ ہے کہ ان پر عمل تو کریں مگر اوھورا کریں، پورا نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں۔ **لَا تَحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ** میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے۔

یہی ہدایت قرآن کریم نے دوسرے عنوان سے اس طرح ارشاد فرمائی ہے **وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ**۔ یعنی جو شخص اللہ کی حریمات کی تعظیم کرے تو وہ دلوں کے تقویٰ کا اثر ہے۔ آیت کے دوسرے جملہ میں **شعائر اللہ** کی ایک خاص قسم یعنی **شعائر حج** کی کچھ تفصیلات بتائی گئی ہیں۔

ارشاد ہے۔ **وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا أُمُومِينَ الْبَيْتِ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن تَرْبِهِمْ وَرِضْوَانًا**۔ یعنی شہر حرام میں قتل و قتل کر کے اسکی بے حرمتی نہ کرو۔ **الشہر الحرام** وہ چار مہینے ہیں جن میں باہمی جنگ کرنا شرعاً حرام تھا۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب بعد میں یہ حکم جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہو گیا، نیز حرم مکہ میں قربان ہونے والے جانور اور خصوصاً وہ جنکے گلے میں قربانی کی علامت کے طور پر قلاوڑ لٹکیا، انکی بھرتی نہ کرو۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے

روک دیا جائے یا چھین لیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے وغیرہ کا لیا جائے۔ آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دے دیا۔

پھر فرمایا۔ وَلَا آمِیْنَتِ الْبَیْتِ الْحَرَامِ یَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا یعنی ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرو جو حج کے لئے مسجد الحرام کا قصد کر کے گھر سے نکلے ہیں۔ اور اس سفر سے ان کا مقصد وہ ہے کہ وہ اپنے رب کا فضل اور رضا حاصل کریں۔ ان لوگوں کی بے حرمتی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سفر میں ان سے مزاحمت نہ کی جائے۔ نہ کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا۔ یعنی پہلی آیت میں بحالت احرام شکار کی جو ممانعت کی گئی ہے، اس کی حد بتلا دی گئی کہ جب تم احرام سے فارغ ہو جاؤ تو شکار کرنے کی ممانعت ختم ہو گئی۔ اب شکار کر سکتے ہو۔

آیت متذکرہ میں اس معاہدہ کے اہم جز کا بیان ہو رہا ہے جو ہر انسان اور رب العالمین کے درمیان ہے۔ اس کے چند اجزاء کا یہاں تک بیان ہوا ہے۔ جس میں اول مطلقاً شعار اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت ہے اور پھر خاص طور پر ان شعار اللہ کی کچھ تفصیلات ہیں جو حج سے متعلق ہیں۔ ان میں بقصد حج آنے والے مسافروں اور ان کے ساتھ آنے والے قربانی کے جانوروں سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنے اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

اس کے بعد معاہدہ کا دوسرا جز اس طرح ارشاد فرمایا۔ وَلَا یَجْرِمَنَّ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا۔ یعنی جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس آ رہے تھے۔ اب جبکہ تم کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ پچھلے واقعہ کے غم و غصہ اور بغض کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکنے لگو۔ کیونکہ یہ ظلم ہے۔ اور اسلام ظلم کا انتقام ظلم سے لینا نہیں چاہتا۔ بلکہ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا سکھاتا ہے۔ انھوں نے اپنی قوت و اقتدار کے وقت مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے ظلماً روک دیا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ اب مسلمان اپنے اقتدار کے وقت ان کو ان افعال حج سے روک دیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عدل و انصاف میں دوست و دشمن سب برابر ہونے چاہئیں

تمھارا دشمن کیسا ہی سخت ہوا اور اس نے تمھیں کیسی ہی ایذا پہنچائی ہو اس کے معاملہ بھی انصاف ہی کرنا تمھارا فرض ہے۔

یہ اسلام ہی کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ دشمنوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور ان کے ظلم کا جواب ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دینا سکھاتا ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ
وَالْعَدَاوَاتِ وَالْقَوَا اللّٰهُ ط إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

باہمی تعاون و تناصر کا
قرآنی اصول

یہ سورۃ مائدہ کی دوسری آیت کا آخری جملہ ہے۔ اس میں قرآن حکیم نے ایک ایسے اصولی اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے جو پورے نظام عالم کی روح ہے۔ اور جس پر انسان کی ہر صلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون و تناصر کا۔ ہر ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون و تناصر پر قائم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریات زندگی کو تنہا حاصل نہیں کر سکتا۔ اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لئے غلہ اگانے سے لیکر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل کو طے کر سکتا ہے۔ نہ لباس وغیرہ کے لئے روئی کی کاشت سے لیکر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بیشمار مسائل کا حل کر سکتا ہے اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتا ہے۔ غرض ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کا محتاج ہے۔ اُن کے باہمی تعاون و تناصر سے ہی سارا دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ تعاون دنیوی زندگی ہی میں ضروری نہیں۔ مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

حق جل شانہ نے اپنی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ سے اس جہان کا ایسا محکم نظام بنایا ہے کہ ہر انسان کو دوسرے کا محتاج بنا دیا۔ غریب آدمی پیسوں کے لئے مالدار کا محتاج ہے تو بڑے سے بڑا مالدار بھی محنت و مشقت کے لئے غریب مزدور کا محتاج ہے۔ سوداگر گاہکوں کا محتاج ہے۔ اور گاہک سوداگروں کا۔ مکان بنانے والا معمار۔ لوہار۔ بڑھئی کا محتاج ہے۔ اور یہ سب اس کے محتاج ہیں۔ اگر یہ ہمہ گیر احتیاج نہ ہوتی اور تعاون محض اخلاقی برتری پر رہ جاتا تو کون کس کا کام کرتا۔ اس کا وہی حشر ہوتا جو عام اخلاقی تشریروں کا

اس دنیا میں ہو رہا ہے اور اگر یہ تقسیم کار کسی حکومت یا بین الاقوامی ادارہ کی طرف سے بصورت قانون کر بھی دی جاتی تو اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو آج پوری دنیا میں دنیا کے قانون کا ہو رہا ہے کہ قانون ایکٹوں میں محفوظ ہے۔ اور بازار اور دفاتر میں رشوت، بے جا رعایت، فرض ناشناسی اور بے عملی کا قانون چل رہا ہے۔ یہ محض حکیم الحکماء، قادر مطلق کا الہی نظام ہے کہ مختلف لوگوں کے دلوں میں مختلف کاروبار کی امنگ اور صلاحیت پیدا کر دی۔ انھوں نے اپنی اپنی زندگی کا محور اسی کام کو بنالیا ہے

ہر یکے را بہر کارے ساختند

میل اور در دلش انداختند!

ورنہ اگر کوئی بین الاقوامی ادارہ یا کوئی حکومت لوگوں میں تقسیم کار کرتی اور کسی جماعت کو بڑھئی کے کام کے لئے، کسی کو لوہار کے کام کیلئے، کسی کو خاکروب کے کام کے لئے، کسی کو پانی کے لئے، کسی کو خوراک کے لئے مقرر کرتی۔ تو کون اس کے حکم کی ایسی اطاعت کرتا کہ دن کا چین اور رات کی نیند خراب کر کے اس کام میں لگ جاتا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہر انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کام کی رغبت اس کے دل میں ڈال دی۔ وہ بغیر کسی قانونی مجبوری کے اس خدمت ہی کو اپنی زندگی کا کام سمجھتا ہے اس کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ اس نظام محکم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری ضروریات چند ٹیکے خرچ کرنے سے آسانی حاصل ہو جاتی ہیں۔ پکا پکا کھانا۔ سلا سلا کپڑا۔ بنا بنایا فرنیچر۔ تیار شدہ مکان سب کچھ ایک انسان کچھ پیسے خرچ کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو ایک کروڑ پتی انسان اپنی پوری دولت لٹا کر بھی گندم کا ایک دانہ حاصل نہ کر سکتا۔ اسی قدر فی نظام کا نتیجہ ہے کہ آپ ہوٹل میں قیام پذیر ہو کر جس جس چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگر ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اٹا امریکہ کا۔ گھی پنجاب کا۔ گوشت سندھ کا۔ مسالے مختلف ملکوں کے۔ برتن اور فرنیچر مختلف ملکوں کا۔ کام کرنے والے بیرے باورچی مختلف شہروں کے آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک لقمہ جو آپ کے منہ تک پہنچا ہے اس میں لاکھوں مشینوں۔ جانوروں اور انسانوں نے کام کیا ہے۔ تب یہ آپ کے ذائقہ کو سنوار سکا ہے۔ آپ صبح گھر سے نکلے تین چار میل جانا ہے جس کی طاقت یا فرصت آپ کو نہیں۔ آپ کو اپنے کسی قریبی مقام میں ٹیکسی اور رکشہ یا بس کھڑی ہوئی ملے گی۔ جس کا لوہا اسٹریلیا کا۔ لکڑی برما کی۔ مشینری امریکہ کی۔ ڈرامیور فرنیچر کا۔ کنڈکٹر یوپی کا۔ یہ کہاں کہاں کے سامان اور کہاں کہاں کی مخلوق آپ کی خدمت کے لئے کھڑی ہے

کہ صرف چند پیسے دے کر آپ ان سب سے خدمت لے لیں۔ ان کو کس حکومت نے مجبور کیا ہے یا کس نے یا بند کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں آپ کے لئے مہیا کر دیں۔ سوائے اس قانون قدرت کے جو قلوب کے مالک نے تکوینی طور پر ہر ایک کے دل پر جاری فرما دیا ہے۔

آج کل سوشلسٹ ممالک نے اس قدرتی نظام کو بدل کر ان چیزوں کو حکومت کی ذمہ داری بنالیا۔ کہ کون انسان کیا کام کرے۔ اس کے لئے ان کو سب سے پہلے جبر و ظلم کے ذریعہ انسانی آزادی سلب کرنا پڑی جس کے نتیجے میں ہزاروں انسانوں کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں کو قید کیا گیا۔ باقی ماندہ انسانوں کو شدید جبر و ظلم کے ذریعہ مشین کے پرزوں کی طرح استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں اگر کسی جگہ کچھ اشیا کی پیداوار بڑھ بھی گئی تو انسانوں کی انسانیت ختم کر کے بڑھی۔ تو یہ سودا سستا نہیں پڑا۔ قدرتی نظام میں ہر انسان آزاد بھی ہے اور قدرتی تقسیم طبائع کی بنا پر خاص خاص کاموں کے لئے مجبور بھی اور وہ مجبوری بھی چونکہ اپنی طبیعت سے ہے۔ اس لئے اس کو کوئی بھی جبر محسوس نہیں کرتا۔ سخت سے سخت محنت اور ذلیل سے ذلیل کام کے لئے خود آگے بڑھنے والے اور کوشش کر کے حاصل کرنے والے ہر جگہ ہر زمانے میں ملتے ہیں۔ اور اگر کوئی حکومت ان کو اس کام کے لئے مجبور کرنے لگے تو یہ سب اس سے بھاگتے لگیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام باہمی تعلق پر قائم ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے کہ اگر جرائم۔ چوری۔ ڈاکہ۔ قتل و غارتگری وغیرہ کے لئے یہ باہمی تعاون ہونے لگے۔ چور اور ڈاکوؤں کی بڑی بڑی اور منظم قوی جماعتیں بن جائیں تو یہی تعاون و عناصر اس عالم کے سارے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ باہمی تعاون ایک دودھاری تلوار ہے جو اپنے اوپر بھی چل سکتی ہے۔ اور نظام عالم کو برباد بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ عالم چونکہ خیر و شر اور اچھے برے۔ نیک و بد کا ایک مرکب معجون ہے۔ اس لئے اس میں ایسا ہوتا کچھ بعید بھی نہ تھا کہ جرائم اور قتل و غارت یا نقصان رسانی کے لئے باہمی تعاون کی قوت استعمال کرنے لگیں۔ اور یہ صرف احتمال نہیں بلکہ واقعہ بن کر دنیا کے سامنے آگیا۔ تو اس کے ردِ عمل کے طور پر عقلائے دنیا نے اپنے تحفظ کے لئے مختلف نظریوں پر خاص خاص جماعتوں یا قوموں کی بنیاد ڈالی۔ کہ ایک جماعت یا ایک قوم کے خلاف جب کوئی دوسری جماعت یا قوم حملہ آور ہو تو یہ سب ان کے مقابلہ میں باہمی تعاون کی قوت کو استعمال کر کے مدافعت کر سکیں۔

قومیتوں کی تقسیم | عبدالکریم شہرستانی کی مثل و نخل میں ہے کہ شروع میں جب تک انسانی

آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کے چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئیں۔ مشرقی۔ مغربی۔ جنوبی۔ شمالی۔ ان میں سے ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسروں کو دوسری قوم سمجھنے لگے۔ اور اسی بنیاد پر تعاون و تناصر قائم کر لیا۔ اس کے بعد جب آبادی زیادہ پھیلی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی اور خاندانی بنیادوں پر قومیت اور اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا۔ عرب کا سارا نظام اسی نسبی اور قبائلی بنیاد پر تھا۔ اسی پر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ بنو ہاشم ایک قوم۔ بنو تمیم دوسری قوم۔ بنو خزاعہ تیسری قوم۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں تو آج تک اورنجی ذات اور نیچی ذات کی تفریق اسی طرح چل رہی ہے۔

یورپین اقوام کے دو پر جدید نے نہ کوئی اپنا نسب باقی رکھا۔ نہ دنیا کے انساب کو کچھ سمجھا، جب دنیا میں ان کا عروج ہوا تو نسبی اور قبائلی قومیتیں اور تقسیمیں ختم کر کے پھر علاقائی اور صوبائی۔ وطنی اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ قومیں کھڑی کر دی گئیں۔ اور آج یہی سکہ تقریباً ساری دنیا میں چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ جادو مسلمانوں پر بھی چل گیا۔ عربی۔ ترکی۔ عراقی۔ سندھی کی تقسیمیں ہی نہیں بلکہ ان میں بھی تقسیم در تقسیم ہو کر مصری شامی۔ حجازی۔ نجدی اور پنجابی۔ بنگالی۔ سندھی۔ ہندی وغیرہ کی الگ الگ قوم بن گئی۔ حکومت کے سب کاروبار انھیں بنیادوں پر چلائے گئے۔ یہاں تک کہ یہ صوبائی عصبيت اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اور ہر صوبہ کے لوگوں کا تعاون و تناصر اسی بنیاد پر ہونے لگا۔

قومیت اور اجتماعیت کے لئے قرآنی تعلیم

فشران کریم نے انسان کو پھر بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ سورہ بشار کی شروع آیات میں یہ واضح کر دیا کہ تم سب انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان کر دیا کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ فضیلت کا مدار صرف تقویٰ اور اطاعتِ خدا تعالیٰ پر ہے۔ اس قرآنی تعلیم نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کا اعلان کر کے ہمیشہ کے کالے بھینگ کو سرخ ترکی اور رومی کا، عجم کی نچلی ذات کے انسانوں کو عرب کے قریشی اور ہاشمی کا بھائی بنا دیا۔ قومیت اور برادری اس بنیاد پر قائم کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ماننے والے ایک قوم۔ اور نہ ماننے والے دوسری قوم ہیں۔ یہی وہ بنیاد تھی جس نے ابو جہل اور ابولہب کے خاندانی رشتوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑ دیا۔ اور بلال حبشی اور صہیب رومی کا رشتہ جوڑ دیا۔

۵ حسن زبیرہ بلال زحیش صہیب از روم

زخاک مکہ ابو جہل اس جہ بوالعجبی ست

حتی کہ قرآن کریم نے اعلان کر دیا خَلَقْتُكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ کافر ہو گئے۔ کچھ مؤمن۔ بدر و اُحد اور احزاب حنین کے معرکوں میں اسی قرآنی تقسیم کا عملی مظاہرہ ہوا تھا کہ نبی بھائی جب خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے باہر ہوا تو مسلمان بھائی کا رشتہ اخوت و تعاون اس سے کٹ گیا اور وہ اس کی تلوار کی زد میں آ گیا۔ نبی بھائی تلوار لے کر مقابلہ پر آیا تو اسلامی بھائی امداد کے لئے پہونچا۔ غزوہ بدر و اُحد اور خندق کے واقعات اس پر شاہد ہیں ۵

۵ ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد

فدائی یک تن بیگانہ کہ آشنا باشد

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے تعاون و تناصر کا یہی معقول اور صحیح اصول بتلایا ہے۔ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ذَلِكُمْ تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ یعنی نیکی اور خدا ترسی پر تعاون کرو۔ بدی اور ظلم پر تعاون نہ کرو۔

غور کیجئے کہ اس میں قرآن کریم نے یہ عنوان بھی اختیار نہیں فرمایا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی جو اصل بنیاد ہے، یعنی نیکی اور خدا ترسی اسی کو تعاون کرنے کی بنیاد قرار دیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم و جور کی طرف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد نہ کرو۔ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو۔ کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم و جور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انصر اخاک ظالماً او مظلوماً۔ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو قرآنی تعلیم میں رنگے جا چکے تھے، انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ مظلوم بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے۔ مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو۔ یہی اس کی امداد ہے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم نے برو تقویٰ یعنی نیکی اور خدا ترسی کو اصل معیار بنایا۔ اسی پر مسلم قومیت کی تعمیر کھڑی کی۔ اس پر تعاون و تناصر کی دعوت دی۔ اس کے بالمقابل اِثْمٌ و

عَدْوَانِج کو سخت جرم قرار دیا۔ اس پر تعاون کرنے سے روکا۔ بِرّ و تَقْوٰی کے دو لفظ اختیار کر مائے۔ جمہور مفسرین نے برّ کے معنی اس جگہ فعل الخیرات یعنی نیک عمل قرار دئے ہیں اور تقویٰ کے معنی ترک المنکرات یعنی برائیوں کا ترک بتلائے ہیں۔ اور لفظ اِشْمِ مطلق گناہ اور معصیت کے معنی میں ہے۔ خواہ وہ حقوق سے متعلق ہو یا عبادات سے اور عدوان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے ظلم و جور ہے۔

بِرّ و تقویٰ پر تعاون اور امداد کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ الدال علی الخیر کفا علما۔ یعنی جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتا دے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اُس نے خود کیا ہو۔ یہ حدیث ابن کثیر نے بحوالہ بزار نقل فرمائی ہے۔ اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سب کی برابر اس کو بھی ثواب ملے گا۔ بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں کچھ کم کیا جائے۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا۔ تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کی برابر اس کو بھی گناہ ہوگا۔ بغیر اس کے کہ ان گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

اور ابن کثیر نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ اسی پر سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے۔ کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے۔ تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ فَلَنْ أَكُونَ خَلِيفَةً لِّلْمُجْرِمِينَ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔ وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن و سنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی۔ انصاف۔ ہمدردی۔ اور خوش خلقی پھیلانے کے لئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو ایک ایسا مسپاہی بنا دیا تھا جو خفیہ اور علانیہ اپنی ڈیوٹی بجالانے پر خوف خدا تعالیٰ کی وجہ سے مجبور تھا۔ اسی حکیمانہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جو دنیا نے صحابہ و تابعین کے قرن میں دیکھا۔ آج بھی جب کسی ملک میں

جنگ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو شہری دفاع کے محکمے قائم کر کے ہر فرد قوم کو کچھ فنون کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے مگر جرائم کے انسداد کے لئے اس کا کہیں اہتمام نہیں ہے کہ لوگوں کو خیر کا داعی اور شر کو روکنے والا سپاہی بنانے کی کوشش کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اسکی مشق نہ فوجی پر پڑے ہوتی ہے نہ شہری دفاع کے طریقوں سے۔ یہ منہر تو تعلیم گاہوں میں سیکھنے سکھانے کا ہے جو آجکل بدقسمتی سے ان چیزوں کے نام سے نا آشنا ہے۔ بد وقتقویٰ اور ان کی تعلیمات کا داخلہ آجکل کی عام تعلیم گاہوں میں ممنوع ہے۔ اور اشروع و حدود ان کا ہر راستہ کھلا ہوا ہے۔ پھر یہ بیچاری پولیس کہاں تک جرائم کی روک تھام کرے۔ جب ساری قوم حلال و حرام اور حق و ناحق سے بیگانہ ہو کر جرائم پیشہ بن جائے۔ آج جو جرائم کی کثرت چوری، ڈاکہ، فواحش، قتل و غارت گری کی فراوانی ہر جگہ اور ہر ملک میں روز بروز زیادہ تر ہوتی جاتی ہو اور قانونی مشینری ان کے انسداد سے عاجز ہے۔

اس کے یہی دو سبب ہیں کہ ایک طرف تو حکومتیں اس شرآئی نظام سے دور ہیں، ان کے ارباب اقتدار اپنی زندگی کو بد وقتقویٰ کے اصول پر ڈالتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اگرچہ اسکے نتیجے میں ہزاروں تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ کاش وہ اس تلخ کھونٹ کو ایک دفعہ تجربہ کے لئے ہی پی جائیں، اور خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ کس طرح ان کو عوام کو امن و سکون اور چین و راحت کی حیات طیبہ عطا ہوتی ہے۔

دوسری طرف عوام نے یہ سمجھ لیا کہ انسداد جرائم صرف حکومت کا کام ہے۔ وہ ہر جرائم پیشہ کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ محض احقاق حق اور انسداد جرائم کے لئے سچی شہادت دینے کا رواج ہی ان میں نہ رہا۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مجرم کے جرم پر پردہ ڈالنا اور شہادت سے گریز کرنا جرم کی اعانت ہے جو از روئے قرآن کریم حرام اور سخت گناہ ہے۔ اور وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے حکم سے بغاوت ہے۔

✽

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّامُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا

حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور لہو اور گوشت سور کا اور جس

أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ

جانور جو نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر

وَالنَّطِيطَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبْعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذِبح

یا سینک مارنے سے اور جس کو کھا یا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور حرام ہے جو ذبح

عَلَى النَّصَبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَمْرِ ذَالِكُمْ

ہوا کسی حقان پر اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے

فَسُقُطَ الْيَوْمَ يَكْسِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا

آج ناامید ہو گئے کافر تمہارے دین سے سوان سے

تَخْشَوْهُمْ وَانْخَشَوْنَ ط الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ

مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں پورا کر چکا ہوں تمہارے لئے دین تمہارا اور

اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ غَيْرِ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمِهِ

پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو

فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ③

تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر تم پر (یہ جانور وغیرہ) حرام کئے گئے ہیں مردار (جانور جو کہ باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا وجہ شرعی مر جاوے) اور خون (جو بہتا ہو) اور خنزیر کا گوشت (اسی طرح

اس کے سب اجزاء) اور جو جانور کہ (بقصد قربت) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جاوے اور جو کسی ضرب سے مر جاوے اور جو اونچے سے گر کر مر جاوے (مثلاً پہاڑ سے یا کنوئیں میں) اور جو کسی کی ٹکڑے سے مر جاوے اور جس کو کوئی درندہ (پکڑ کر) کھائے لگے (اور اس کے صدمہ سے مر جاوے) لیکن (منخفہ سے ماکل ابع تک جن کا ذکر ہے ان میں سے) جس کو تم (دم نکلنے سے پہلے قاعدہ شرعیہ کے مطابق) ذبح کر ڈالو (وہ اس حرمت سے مستثنیٰ ہے)۔ اور (نیز) جو جانور (غیر اللہ کی) پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے (حرام ہے) گو زبان سے غیر اللہ کے نامزد نہ کرے۔ کیونکہ مدار حرمت کائنیت جہیہ پر ہے۔ اس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے کہ نامزد کرے کبھی فعل سے ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر ذبح کرے، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ (گوشت وغیرہ) تقسیم کر و بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں آج کے دن (یعنی اب) تا امید ہو گئے کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب و گم ہو جانے) سے (کیونکہ ماشاء اللہ اسلام کا خوب شیوع ہو گیا) سوان (کفار) سے مت ڈرنا (کہ تمہارے دین کو کم کر سکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت مت کرنا) آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو

ما یوسی ہوئی اور احکام و قواعد میں بھی، اور اس اکمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا (یعنی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی اور اکمال دین میں دونوں آگئے) اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کر لیا (یعنی قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا۔ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہ کیا جاوے گا۔ پس تم کو چاہیے کہ میری نعمت کا شکر کر کے اس دین پر پورے پورے قائم رہو) پھر اشیائے مذکورہ بالا کی حرمت دریافت کر لینے کے بعد یہ بھی معلوم کر لو کہ جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جاوے (اور اس وجہ سے اشیائے بالا کو کھالے) بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو (یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھاوے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورہ بقرہ میں غَیْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ سے تعبیر فرمایا ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہوا اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا اور رحمت والے ہیں کہ ایسی حالت میں اجازت دے دی)۔

معارف و مسائل

یہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے۔ جس میں بہت سے اصول اور فروعی احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے۔ جن جانوروں کا گوشت انسان کے لئے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے، یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے۔ انکو قرآن نے خیانت قرار دیا اور حرام کر دیا، اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں ہے، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کئے گئے تم پر مردار جانور۔ مُردار سے مراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مر جائیں۔ ایسے مُردار جانور کا گوشت ”طبی“ طور پر بھی انسان کے لئے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔

البتہ حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ایک ”مجہلی“ دوسرے ”بڈی“۔ یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

دوسری چیز جس کو اس آیت نے حرام قرار دیا ہے وہ خون ہے، اور قرآن کریم کی دوسری آیت میں اَوْ ذَٰمًا مَّسْفُوحًا فرمایا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے۔

اس لئے جگر اور تلی باوجود خون ہونے کے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیث مذکور میں جہاں ”میتہ“ سے مچھلی اور ہڈی کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ اسی میں جگر اور طحال کو خون سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔
 ”غیسری چیز“ لحم خنزیر ہے۔ جس کو حرام فرمایا ہے۔ لحم سے مراد اس کا پورا بدن ہے۔ جس میں جربی، پٹھے وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

چوتھے وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھلا شرک ہے۔ اور یہ جانور یا اتفاق مردار کے حکم میں ہے۔

جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر، اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ تعالیٰ کا لیا، مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہو اور اس کی رضا مندی کے لئے قربان کیا ہے تو جہوہ فقہاء نے اس کو بھی مَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

پانچویں۔ مُنْخَنِقَةٌ یعنی وہ جانور حرام ہے جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو یا خود ہی کسی جاہل وغیرہ میں پھنس کر دم گھٹ گیا ہو۔ اگرچہ منخنقہ، اور موقوذة بھی میتہ کے اندر داخل ہیں، مگر اہل جاہلیت ان کو جائز سمجھتے تھے۔ اس لئے خصوصی ذکر کیا گیا۔

چھٹے۔ موقوذة، یعنی وہ جانور جو ضرب شدید کے ذریعہ ہلاک ہوا ہو۔ جیسے لاشی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو۔ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کر دے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذة میں داخل ہو کر حرام ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات ”معراض“ تیر سے شکار کرتا ہوں۔ اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور عرض تیر کی چوٹ سے مرے تو وہ موقوذة میں داخل ہے اس کو مت کھا (اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت جصاص نے ”احکام القرآن“ میں اپنی اسناد سے نقل کی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکنے کے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا گیا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اس کو بھی فقہاء نے موقوذة میں داخل اور حرام قرار دیا ہے۔ امام جصاص نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے۔ المقتولۃ بالبندقۃ تلک الموقوذة۔ یعنی بندوق کے ذریعہ جو جانور قتل کیا گیا ہے وہ ہی موقوذة ہے اس لئے حرام ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ۔ شافعی۔ مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی) ساتویں مُتَشَدِّدٌ یعنی وہ جانور جو کسی پہاڑ، ٹیلہ یا اونچی

عمارت یا کنوئیں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ بھی حرام ہے۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے، اور تم نے تیر بسم اللہ پڑھ کر اس پر پھینکا اور وہ تیر کی زد سے نیچے گر کر مر گیا تو اس کو نہ کھاؤ۔

کیونکہ اس میں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہو گرنے کے صدمہ سے ہو تو وہ مُتَسَدِّیْہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا، وہ پانی میں گر گیا تو اس کے کھانے کو بھی اسی بنا پر منع فرمایا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی ہو (حصاص)۔

اور حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہی مضمون رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت فرمایا ہے۔ (حصاص)۔

آٹھویں۔ نطیحہ۔ یعنی وہ جانور جو کسی ٹکڑے اور تصادم سے ہلاک ہو گیا ہو۔ جیسے ریل، موٹر وغیرہ کی زد میں آکر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکڑے سے مر جائے۔
نوٹیں۔ وہ جانور جس کو کسی درندہ جانور نے پھاڑ دیا ہو اس سے مر گیا ہو۔
ان نواقسام کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا۔ فرمایا۔۔۔۔۔
إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ۔ یعنی اگر ان جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کر لیا تو وہ حلال ہو گیا۔ اس کا کھانا جائز ہے۔

یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مُبَیَّتہ اور دَم میں تو اس کا امکان ہی نہیں۔ اور خَنْزِیر اور مَآءُ اَہْلٍ لِغَیْرِہِ اللہ۔ اپنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا ذکرنا ان میں برابر ہے۔ اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بصری۔ قتادہ۔ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی مُنْحَقَہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ اس لئے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔ خواہ وہ مُنْحَقَہ ہو، یا مُوقُودَہ یا مُتَرَدِّیَہ اور نطیحہ یا جبکو درندہ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ ان میں سے جس کو بھی آثار زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا۔

دستویں۔ وہ جانور حرام ہے جو نُسَب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نُسَب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لئے کرتے تھے۔ اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔

اہل جاہلیت ان سب قسم کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے جو خیانت میں داخل ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا۔

گیاڑھویں چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ وہ استقسام بالاذلہم ہے۔ اذلام، زلم کی جمع ہے۔ زلم اس تیر کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لئے مقرر تھا کہ اس کے ذریعہ قسمت آزمائی کی جاتی تھی اور یہ سات تیر تھے۔ جن میں سے ایک پر نعم ایک پر لا۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ اور یہ تیر بیت اللہ کے خادم کے پاس رہتے تھے۔

جب کسی شخص کو اپنی قسمت یا آئندہ کسی کام کا مفید ہونا یا مضر ہونا معلوم کرنا ہوتا، تو خادم کعب کے پاس جاتے اور تنوروں پر اس کو نذرانہ دیتے وہ ان تیروں کو ترکش سے ایک ایک کر کے نکالتا۔ اگر اس پر لفظ نعم نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام مفید ہے، اور اگر لا نکل آیا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہ کرنا چاہیے۔ حرام جانوروں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم ہر ایک کے حصہ شرکت کے مطابق کرنے کے بجائے ان جوئے کے تیروں سے کرتے تھے جس میں کوئی بالکل محروم رہتا، کسی کو بہت زیادہ، کسی کو حق سے کم ملتا تھا۔ اس لئے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کا بیان کر دیا گیا۔

علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے لفظ مش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالاذلہم کے حکم میں ہیں۔

اور استقسام بالاذلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جس میں فرقہ اندازی یا لٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے۔ یہ بھی بنص و شران حرام ہے۔ جس کو قرآن کریم نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لئے حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، اور شعبی نے فرمایا کہ جس طرح عرب اذلام کے ذریعہ حصے نکالتے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج، چوسرو وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ اذلام کے حکم میں ہیں۔ (مظہری)

استقسام بالاذلام کی حرمت کے ساتھ ارشاد فرمایا:-

ذَلِكُمْ فِسْقٌ ۚ لَّعْنَةُ اللَّهِ عَلَىٰ طَرِيقَةِ الْقِسْمِ ۚ مَقْرَرٌ ۚ كَرِهَ اللَّهُ مُشْرِكِيهِ ۚ

گمراہی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:-

الْيَوْمَ يَكْفُرُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ
دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

آج کے دن کفار تمہارے دین پر غالب آنے سے
سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب تم ان سے
کوئی خوف نہ رکھو البتہ مجھ سے ڈرتے رہو۔

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
پر نازل ہوئی۔ جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون
جاری تھا۔ اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو کفار یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت
ہمارے مقابلہ میں کم بھی ہے اور کمزور بھی ان کو ختم کر دیا جائے۔ اب نہ ان میں یہ حوصلے باقی
رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی۔ اس لئے مسلمان ان سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت
و عبادت میں لگ جائیں۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ
الْإِسْلَامَ دِينًا

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں
سیدالایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام
میدان عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت
کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور
خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے
اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔
حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ
صحابہ کرام رضاشریک ہیں۔ رحمتہ للعالمین صحابہ کرام رض کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے
اپنی ناقہ "عُصْبَاء" پر سوار ہیں۔ اور حج کے آب بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول
ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیت کریمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم پر نازل ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی
تو حسب دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جا رہی تھی
یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رض فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت

ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں۔ جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے، کیونکہ مسئلہ ہجری کی نویں ذی الحجہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور مسلمان ہجری کی بارھویں ربیع الاول کو آنحضرت صلی اللہ علیہ کی وفات ہو گئی۔

یہ آیت جو اس خاص شان اور اہتمام سے نازل ہوئی اس کا مفہوم بھی ملت اسلامیہ اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری اور بھاری انعام اور اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دین حق اور نعمت الہی کا انتہائی معیار جو اس عالم میں بنی نوع انسان کو عطا ہونے والا تھا، آج وہ مکمل کر دیا گیا۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے جو دین حق اور نعمت الہیہ کا نزول اور ترویج شروع کی گئی تھی اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے مناسب حال اس نعمت کا ایک حصہ اولادِ آدم کو عطا ہوتا رہا آج وہ دین اور نعمت مکمل صورت میں خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو عطا کر دی گئی۔

اس میں تمام انبیاء و رسل کے زمرہ میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت اور امتیازی شان کا تو اظہار ہے ہی اس کے ساتھ تمام امتوں کے مقابلہ میں امتِ مرحومہ کی بھی ایک خاص امتیازی شان کا واضح ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ چند علماء ربہود، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمہارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوئی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشن عید مناتے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ وہ کونسی آیت ہے۔ انھوں نے یہی آیت۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پڑھ دی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اُن کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوسری عید کا دن تھا ایک عرفہ دوسرے جمعہ۔

عید اور تہوار منانے کا اسلامی اصول | فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس جواب میں ایک اسلامی اصول کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جو تمام دنیا کی

سے مشہور قول کی بنا پر لکھ دیا گیا ہے، درنہ خود حضرت مولف قدس سرہ نے اپنے رسالہ "سیرت خاتم الانبیاء" پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور حافظ مغلطیؒ کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات دوسری ربیع الاول کو صحیح قرار دیا ہے، اور اکیاسی روز اسی حساب بنتے ہیں مجتہد عثمانی

آقوم و مذاہب میں صرف اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ہر قوم اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنے اپنے حالات و خصوصیات کے ماتحت اپنے خاص خاص تاریخی واقعات کے دنوں کی یادگاریں مناتے ہیں، اور ان ایام کو ان کے یہاں ایک عید یا تہوار کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کہیں قوم کے بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کا یا تخت نشینی کا دن منایا جاتا ہے اور کہیں کسی خاص ملک یا شہر کی فتح یا اور کسی عظیم تاریخی واقعہ کا جس کا حامل اشخاص خاص کی عزت افزائی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام اشخاص پرستی کا قائل نہیں ہے۔ اس نے ان تمام رسوم جاہلیت اور شخصی یادگاروں کو چھوڑ کر اصول اور مقاصد کی یادگاریں قائم کرنے کا اصول بنا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ”خلیل اللہ“ کا خطاب دیا گیا اور قرآن کریم میں ان کے امتحانات اور ان سب میں مکمل کامیابی کو سراہا گیا۔ **وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَتْهُ هُنَّ**۔ کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن نہ ان کی پیدائش یا موت کا دن منایا گیا نہ ان کے صاحبزادے اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی پیدائش و موت یا دوسرے حالات کی کوئی یادگار قائم کی گئی۔

ہاں ان کے اعمال میں جو چیزیں مقاصد دین سے متعلق تھیں، ان کی یادگاروں کو نہ صرف محفوظ رکھا گیا، بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے دین و مذہب کا جز اور قرص و واجب قرار دے دیا گیا۔ قربانی، ختنہ، صفا مروہ کے درمیان دوڑنا۔ منیٰ میں تین جگہ کنکریں مارنا۔ یہ سب انہیں بزرگوں کے ایسے افعال کی یادگار ہیں جو انہوں نے اپنے نفسانی جذبات اور انسان کے طبعی تقاضوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے مقابلے میں کچلتے ہوئے ادا کئے۔ اور جن میں ہر قرن اور ہر زمانے کے لوگوں کو اس کا سبق ملتا ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اپنی محبوب سے محبوب چیز کو قربان کر دینا چاہیے۔

اسی طرح اسلام میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی موت و حیات یا شخصی حالات کا کوئی دن منانے کے بجائے ان کے اعمال کے دن منائے گئے۔ جو کسی خاص عبادت سے متعلق ہیں جیسے شبِ برات، رمضان المبارک، شبِ قدر، یومِ عرفہ، یومِ عاشورہ وغیرہ، عیدِ دین صرف دو رکھی گئیں، وہ بھی خالص دینی لحاظ سے۔ پہلی عید رمضان المبارک کے اختتام اور اشہر حج کے شروع ہونے پر رکھی گئی۔ اور دوسری عید عبادتِ حج سے فراغت کے بعد رکھی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس جواب نے یہ بتلادیا کہ یہود و نصاریٰ کی طرح ہماری عیدیں تاریخی وقائع کے تابع نہیں۔ کہ جس تاریخ میں کوئی اہم واقعہ پیش آگیا

اس کو عید منادیں۔ جیسا کہ جاہلیتِ اولیٰ کی رسم تھی۔ اور آجکل کی جاہلیتِ جدیدہ نے تو اس کو بہت ہی پھیلا دیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسری قوموں کی نقل کر کے مسلمان بھی اُس میں مبتلا ہونے لگے۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ پیدائش کی عید میلاد منائی۔ ان کو دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر عید میلاد البنی کے نام سے ایک عید بنادی۔ اسی روز بازاروں میں جلوس نکالنے اور اس میں طرح طرح کی خرافات کو اور رات میں چراغاں کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ جس کی کوئی اصل صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلافِ اُمت کے عمل میں نہیں ملتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دن منانے کا طریقہ اُن قوموں میں تو چل سکتا ہے کہ جو بالکمال افراد اور ان کے حیرت انگیز کارناموں کے لحاظ سے مفلس ہیں۔ دو چار شخصیتیں کل قوم میں اس قابل ہوتی ہیں، اور اُن کے بھی کچھ مخصوص کام ایسے ہوتے ہیں، جن کی یادگار منانے کو قومی فخر سمجھتے ہیں۔

اسلام میں یہ دن منانے کی رسم چلے تو ایک لاکھ بیس ہزار زائد تو انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی نہ صرف پیدائش بلکہ ان کے حیرت انگیز کارناموں کی طویل فہرست ہے جن کے دن منانے چاہئیں۔ انبیاءؑ کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو دیکھا جائے۔ تو آپ کی زندگی کا شاید کوئی دن بھی ایسے کارناموں سے خالی نہیں جن کا دن منانا چاہیے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے وہ کمالات جمہوں نے پورے عرب میں آپ کو اُمین کا لقب دیا تھا۔ کیا وہ ایسے نہیں ہیں کہ مسلمان ان کی یادگار منائیں پھر نزولِ قرآن۔ ہجرت۔ غزوہ بدر، احد، خندق، فتح مکہ، حنین، تبوک اور تمام غزوات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں کہ جس کی یادگار نہ منائی جائے۔ اسی طرح آپ کے ہزاروں معجزات یادگار منانے کی چیزیں ہیں۔ اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر دن نہیں ہر گھنٹہ ایک یادگار منانے کا داعیہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام رض وہ ہیں، جن میں سے ہر ایک درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے کیا یہ بے انصافی نہیں ہوگی کہ ان کی یادگاریں نہ منائی جائیں۔ اور یہ رسم چل پڑے تو پھر صحابہ کرام کے اُمت کے اکابر، اولیاء اللہ اور علماء و مشائخ پر نظر ڈالو، جو کروڑوں کی تعداد

میں ہوں گے۔ اگر یادگاری دن منائے جائیں تو ان کو چھوڑ دینا کیا ان کے حق میں بے انصافی اور قدرنا شناسی نہیں ہوگی۔ اور اگر یہ طے کر لیا جائے کہ کبھی کے یادگاری دن منائے جائیں تو سال بھر میں ایک دن بھی ہمارا یادگار منانے سے خالی نہیں رہے۔ بلکہ ہر دن کے ہر گھنٹہ میں کسی یادگاریں اور کسی کئی عیدیں منانی پڑیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ ”رسول کریم“ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس رسم کو جاہلیت کی رسم قرار دے کر نظر انداز کیا ہے۔۔۔۔۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اب اس آیت کے معنی و مطالب کی تفصیل سنئے۔ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت مرحومہ کو تین خصوصی انعام عطا فرمائے کی بشارت دی ہے۔ ایک اکمال دین، دوسرے اتمام نعمت، تیسرے شریعت اسلام کا اس امت کے لئے انتخاب۔

اکمال دین کے معنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دین حق کے تمام حدود و فرائض اور احکام و آداب مکمل کر دئے گئے ہیں۔ اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال (روح)۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد احکام اسلام میں سے کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں، ان میں یا تو ترغیب و ترہیب کے مضامین ہیں، اور یا انھیں احکام کی تاکید جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا۔

اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ اصول و اجتہاد کے ماتحت ائمہ مجتہدین نے نئے نئے پیش آنے والے واقعات و حالات کے متعلق اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ بیان کر دیے کیونکہ قرآن کریم نے جس طرح احکام شرعیہ کے حدود و فرائض و غیرہ بیان فرمائے ہیں اسی طرح اصول اجتہاد بھی قرآن ہی نے متعین فرما دئے ہیں۔ ان کے ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں وہ سب ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے احکام ہیں۔ کیونکہ ان اصول کے ماتحت ہیں جو قرآن نے بیان کئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکمال دین کا مطلب۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو مکمل کر دیا گیا۔ اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت باقی ہے نہ منسوخ ہو کر کمی کا احتمال۔ کیونکہ اس کے بعد ہی متصل سلسلہ وحی و وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منقطع ہونے والا تھا اور بغیر وحی الہی کے

قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا۔ اور جو بظاہر زیادتی احکام کی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء و مجتہدین کی طرف سے ہوئی۔ وہ درحقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکام قرآنی کی توضیح و بیان ہے۔

اور اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے، جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مشرک کے شریک نہ ہونیکے ذریعہ ہوا۔

یہاں الفاظ شرآن میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ دین کے ساتھ لفظ اکمال استعمال فرمایا گیا اور نعمت کے ساتھ لفظ اتمام، حالانکہ یہ دونوں لفظ بظاہر ایک دوسرے کے ہم معنی اور مرادف سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن درحقیقت ان دونوں کے مفہوم میں ایک فرق ہے جس کو مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی چیز کا ”اکمال اور تکمیل“ اس کو کہتے ہیں کہ اس چیز سے جو غرض اور مقصود تھا وہ پورا ہو گیا۔ اور لفظ اتمام کے معنی یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت اور حاجت نہیں رہی۔ اس لئے ”اکمال دین“ کا حاصل یہ ہوا کہ قانونِ الہی اور احکام دین کے اس دنیا میں بھیجئے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا۔ اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہوا کہ اب مسلمان کسی کے محتاج نہیں۔ ان کو خود حق تعالیٰ جل شانہ نے غلبہ، قوت اور اقتدار عطا فرما دیا جس کے ذریعہ وہ اس دین حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت تو مسلمانوں کی طرف فرمائی گئی ہے اور نعمت کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف، وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور اُن اعمال و افعال کے ذریعہ ہوتا ہے جو اُمت کے افراد کرتے ہیں اور نعمت کی تکمیل براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (ابن قیم، تفسیر القیم)۔

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اکمال دین آج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا۔ بلکہ جیسا تفسیر بحر محیط میں بحوالہ قتال مروزی رحمۃ اللہ علیہ... نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی و رسول کا اُس کے زمانہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھا۔ یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت و دین اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اُس زمانہ اور اُس قوم کے لحاظ سے وہی کامل و مکمل تھا۔ لیکن اللہ جل شانہ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لئے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنیوالی

قوموں کے لئے مکمل نہ ہوگا، بلکہ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی۔
 بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے
 کامل و مکمل ہے۔ نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ، ملک یا
 قوم کے ساتھ۔ بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے یہ شریعت کامل و
 مکمل ہے۔

تیسرا انعام جو اس اُمت مرحومہ کے لئے اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ
 اس اُمت کے لئے اللہ جل شانہ نے اپنے مکوینی انتخاب کے ذریعہ دین اسلام کو منتخب فرمایا
 جو ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔ اور جس پر نجات کا انحصار ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتا دیا کہ اُمت مرحومہ کے لئے دین اسلام ایک بڑی
 نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے۔ اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور جہت سے کامل و مکمل
 ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے
 مگر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے
 رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب
 آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے۔ کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسال رسول کی ضرورت بھی
 پوری ہو چکی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر و
 بحر محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتا دیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آخر آیت میں فَمِنْ أَضْطَرَّ فِي مَخْمَصَةٍ کا تعلق اُن جانوروں سے ہے،
 جن کی حرمت کا بیان شروع آیت میں آیا ہے۔ اور اس جملہ کا مطلب ایک خاص حالت
 کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک کی شدت سے بیاب ہو جاوے اور خطرہ
 موت کا لاحق ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر وہ مذکورہ بالا حرام جانوروں میں سے
 کچھ کھالے تو اس کے لئے گناہ نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پیٹ بھرنا اور لذت حاصل کرنا مقصود
 نہ ہو، بلکہ صرف اتنا کھالے جس سے اضطراب کی کیفیت رفع ہو جاوے۔

آیت میں غَيْرُ مُتَجَانِفٍ لِإِشْعَارِ کا یہی مطلب ہے کہ اس کھانے میں اُسکا
 میلان گناہ کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اضطراب کا رفع کرنا ہو۔ آخر میں فَإِنَّ اللَّهَ
 غَفُورٌ رَحِيمٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ محرمات اس وقت بھی اپنی جگہ حرام

دنا جائز ہی ہیں، صرف اس شخص کو اضطراب کی وجہ سے معاف کر دیا گیا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبُ

تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ان کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو حلال ہیں مستحضر چیزیں

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ

اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں سے جو

مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ

اللہ نے تم کو سکھایا ہے سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے

وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ ص وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ

اور اللہ کا نام لو اس پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ جلد

سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

لینے والا ہے حساب

رَبِطِ آيَات پہلی آیات میں حلال و حرام جانوروں کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اسی معاملہ کے متعلق ایک سوال کا جواب ہے۔ بعض صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکاری کتے اور باز سے شکار کرنے کا حکم دریافت کیا تھا، اس آیت میں اس کا جواب مذکور ہے۔

خلاصہ تفسیر

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتے اور باز کے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے کیا کیا جانور ان کے لئے حلال کئے گئے ہیں (یعنی جتنے حلال شکار ذبح سے حلال ہو جاتے ہیں۔ کیا کتے اور باز کے شکار کرنے سے وہ سب حلال رہتے ہیں یا ان میں سے کچھ مخصوص جانور حلال ہوتے ہیں یا مطلقاً کوئی حلال نہیں ہوتا اور جو حلال ہوتے ہیں تو کیا اس کیلئے کچھ شرط بھی ہے) آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ تمہارے لئے کل حلال جانور (جو از قسم شکار پہلے سے حلال ہیں، وہ سب کتے اور باز کے ذریعہ شکار کرنے سے بھی) حلال رکھے گئے ہیں (یہ سوال کے پہلے جز کا جواب ہے، آگے دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ کتے اور باز کے شکار حلال ہونے کے لئے کچھ شرائط ہیں وہ کہ جن شکاری جانوروں کو (مثلاً کتا، باز وغیرہ) تم (خاص طور پر جس کا بیان آگے آتا ہے) تعلیم دو (یہ ایک شرط ہے)

اور تم ان کو شکار پر چھوڑو بھی۔ (یہ دوسری شرط ہے) اور ان کو (جو تعلیم دینا اور پر ذکر کیا گیا ہے) اس طریقہ سے تعلیم دو جو تم کو اللہ نے (شرعیات میں) تعلیم دیا ہے (وہ طریقہ یہ ہے کہ کتے کو تو یہ تعلیم دی جائے کہ شکار پکڑ کر کھاوے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً واپس آجائے یہ شرط اول کا بیان ہے) تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمھارے لئے پکڑیں اس کو کھاؤ۔ (یہ تیسری شرط ہے جس کی علامت طریقہ تعلیم میں بیان ہو چکی ہے، سو اگر کتا اس شکار کو کھانے لگے یا باز بلائے سے واپس آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب یہ جانور اس کے کہنے میں نہیں تو انھوں نے شکار بھی اس کے لئے نہیں پکڑا بلکہ خود اپنے لئے پکڑا ہے) اور (جب شکار پر اس شکاری جانور کو چھوڑنے لگو تو) اُس (جانور) پر (یعنی اس کے چھوڑنے کے وقت) اللہ کا نام بھی لیا کرو۔ (یعنی بسم اللہ پڑھ کر چھوڑو۔ یہ چوتھی شرط ہے) اور (تمام امور میں) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (مثلاً شکار میں ایسے منہمک مت ہو کہ نماز وغیرہ سے غفلت ہو جاوے یا اتنی حرص مت کرو کہ شرائط حلت کے بغیر بھی اس جانور کو کھا جاؤ) بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکور الصدر جواب و سوال میں شکاری کتے اور باز وغیرہ کے ذریعہ شکار حلال ہونے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں :-

اول یہ کہ کتا یا باز سکھایا اور سدھایا ہو اور سکھانے سدھانے کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ جب تم کتے کو شکار پر چھوڑو تو وہ شکار پکڑ کر تمھارے پاس لے آئے۔ خود اُس کو کھانے نہ لگے۔ اور باز کے لئے یہ اصول مقرر کیا کہ جب تم اس کو واپس بلاؤ تو وہ فوراً آجائے اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو۔ جب یہ شکاری جانور ایسے سدھ جائیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ جو شکار کرتے ہیں تمھارے لئے کرتے ہیں اپنے لئے نہیں، اب ان شکاری جانوروں کا شکار خود تمھارا شکار سمجھا جائے گا۔ اور اگر کسی وقت وہ اس تعلیم کے خلاف کریں مثلاً کتا خود شکار کو کھانے لگے یا باز تمھارے بلانے پر واپس نہ آئے تو یہ شکار تمھارا نہیں رہا۔ اسلئے اس کا کھانا جائز نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تم فوراً اپنے ارادہ سے کتے کو یا باز کو شکار کے پیچھے چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ وہ خود بخود کسی شکار کے پیچھے دوڑ کر اس کو شکار کر لیں۔ آیت مذکورہ میں اس شرط کا

بیان لفظ مُکَلَّبِین سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ دراصل تکلیب سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی کتوں کو سکھلانے کے ہیں۔ پھر عام شکاری جانوروں کو سکھلانے اور شکار پر چھوڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ صاحب جلالین اس جگہ مُکَلَّبِین کی تفسیر ارسال سے کرتے ہیں جس کے معنی ہیں شکار پر چھوڑنا۔ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے۔
تیسری شرط یہ ہے کہ شکاری جانور شکار کو خود نہ کھانے لگیں بلکہ تمھارے پاس لے آئیں۔ اس شرط کا بیان مِمَّا امْسَكْنَ عَلَیْكُمْ سے ہوا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے یا یاز کو شکار پر چھوڑ دو تو بسم اللہ کہہ کر چھوڑو جب یہ چاروں شرطیں پوری ہوں تو اگر جانور تمھارے پاس آنے تک دم توڑ چکا ہو تو بھی حلال ہے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ بغیر ذبح کے تمھارے لئے حلال نہ ہوگا۔
امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ یہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے۔ اس شرط کی طرف لفظ جَوَّ اِیْرَاح میں اشارہ موجود ہے۔

مسئلہ: یہ حکم اُن وحشی جانوروں کا ہے جو اپنے قبضہ میں نہ ہوں، اور اگر کسی وحشی جانور کو اپنے قابو میں کر لیا گیا ہے تو وہ بغیر باقاعدہ ذبح کے حلال نہیں ہوگا۔
آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ شکار جانور کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے حلال تو کر دیا ہے، مگر شکار کے پیچھے لگنے نماز اور ضروری احکام شرعیہ سے غفلت برتنا جائز نہیں ہے۔

الْيَوْمَ اَحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اَوْلَتْوا الْكِتٰبَ

آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تم کو

حِلُّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ

حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کو حلال ہے اور حلال ہیں تم کو پاک دامن

الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اَوْلَتْوا الْكِتٰبَ

عورتیں مسلمان اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جن کو دی گئی کتاب

مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اتَّيَمُوْهُنَّ اَجُورَهُنَّ مُحْصِنٰیْنَ

تم سے پہلے جب دو ان کو میرے ان کے قید میں لانے کو

غَيْرِ مُسْفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ اَخْدَانٍ ط وَمَنْ يَّكْفُرْ

نہ مستی نکالنے کو اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو اور جو منکر ہوا

بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿٥﴾

ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اسکی اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے

خلاصہ تفسیر

آج (تم پر جیسے دینی ابدی انعام ہوا کہ اکمال دین سے مشرف کئے گئے۔ اسی طرح ایک معتد بہ دنیوی ابدی انعام بھی ہوا کہ تمہارے لئے حلال چیزیں (کہ اس سے پہلے حلال کر دی گئی تھیں ہمیشہ کے لئے) حلال رکھی گئیں (کہ کبھی منسوخ نہ ہوں گی) اور جو لوگ (تم سے پہلے آسمانی) کتاب دے گئے ہیں (یعنی یہود و نصاریٰ) ان کا ذبیحہ (بھی) تم کو حلال ہے اور (اس کا حلال ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسا) تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں) اور (جیسا مسلمان عورتوں کا حلال ہونا یقینی ہے اسی طرح) پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) دے گئے ہیں (تم کو حلال ہیں) جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو (یعنی ہر دنیا گوشت نہ بنیں مگر واجب ہے اور عورتیں مذکورہ جو حلال کی گئی ہیں تو) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ۔ (یعنی نکاح میں لاؤ جن کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں) نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو (یہ سب احکام شرعیہ ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے) اور جو شخص ایمان (لانے کی چیزوں) کے ساتھ کفر کرے گا (مثلاً حلال قطعی کی حلت کا یا حرام قطعی حرمت کا انکار کرے گا) تو اس شخص کا (ہر نیک) عمل غارت (اور اکارت) جاوے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔ (بس حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو)۔

معارف و مسائل

سورۃ مائدہ کی پہلی آیت میں بہیمۃ الانعام یعنی پالتو جانور، بکری، گائے، بھینس وغیرہ کا حلال ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور تیسری آیت میں نوشتم کے حرام جانوروں کی تفصیل ہے مگر اس تفصیل سے اس کے ابتدائی جملہ میں اس پورے باب کا خلاصہ اس طرح بیان فرمادیا ہے کہ اس میں جانوروں کی حلت و حرمت کا خاصہ بھی معلوم ہو گیا۔ اور اس کا ایک معیار و اصول بھی۔

ارشاد ہے، اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ یعنی آج تمہارے لئے حلال ہوئیں

سب صاف ستھری چیزیں۔ آج سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئی ہیں۔ یعنی حجۃ الوداع منہ کا یوم عرفہ۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے آج تمہارے لئے دین کا مل مکمل کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تم پر مکمل ہو گئی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ چیزیں جو پہلے بھی تمہارے لئے حلال تھیں، دائمی طور پر حلال رکھی گئیں۔ اور ان کے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوا۔ کیونکہ سلسلہ روحی ختم ہونے والا ہے۔

اس جملہ میں طیبات حلال ہونے کا بیان ہے اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔ یعنی حلال کرتا ہے ان کے لئے طیبات اور حرام کرتا ہے ان پر خبائث۔ اس میں طیبات کے بالمقابل خبائث لا کر ان دونوں لفظوں کی حقیقت واضح کر دی گئی۔

لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت کے اس جملہ نے یہ بتا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصد زندگی دنیا میں کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو۔ اس کو قدرت نے مخدوم کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے بد اخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔

اسی لئے قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا قُلْ هُمْ أَضَلُّ۔ یعنی وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ اور جب انسان کی انسانیت کا مدار اصلاح اخلاق پر ہو تو ضروری ہے کہ جتنی چیزیں انسانی اخلاق کو گندہ اور خراب کرنے والی ہیں ان سے اس کا مکمل پرہیز کرایا جائے۔ انسان کے اخلاق پر اس کے گرد و پیش کی چیزوں اور اس کی سوانحی کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب گرد و پیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں ان سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے۔ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوئی۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، سود، قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی، وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دور اور شیطنیت سے قریب کر دے گی۔ اسی لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِنْ الطَّيِّبَاتِ

وَأَعْمَلُوا صَلَاحًا عَمَلًا صَالِحًا کے ساتھ اکل حلال کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اکل حلال کے بغیر عمل صالح متصور نہیں۔
بالخصوص گوشت انسان کے بدن کا جزو اہم بنتا ہے اس میں اس کی احتیاط سب سے زیادہ
ضروری ہے کہ کوئی ایسا گوشت اس کی غذا میں داخل نہ ہو جو اس کے اخلاق کو خراب کرے
اسی طرح وہ گوشت جو جسمانی طور پر انسان کے لئے مضر ہے کہ بیماری اور ہلاکت کے جراثیم اس
میں ہیں۔ اس سے انسان کے پرہیز کا ضروری ہونا تو سمجھی جانتے ہیں۔ جتنی چیزیں شریعت نے
خبائث قرار دی ہیں۔ وہ یقینی طور پر انسان کے جسم یا روح یا دونوں کو خراب کرنے والی
اور انسانی جان یا اخلاق کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ اس کے بالقابل
طبیات سے انسان کے جسم و روح کی تربیت اور اخلاق فاضلہ کا نشو و نما ہوتا ہے ان کو
حلال قرار دیا گیا۔ غرض قرآن پاک کے جملہ اَحْلَلْ لَكُمْ الطَّيِّبَاتِ نے حلت و حرمت کا فلسفہ بھی
بھی بتلادیا اور اصول بھی۔

اب یہ بات کہ گوشتی چیزیں طبیات یعنی صاف ستھری مفید اور مرغوب ہیں اور گوشتی
خبائث یعنی گندی، مضر اور قابل نفرت ہیں۔ اس کا اصل فیصلہ طبائع سلیمہ کی رغبت و نفرت
پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، ہر زمانہ کے سلیم الطبع
انسان ان کو گندہ اور قابل نفرت سمجھتے رہے ہیں، جیسے مردار جانور، خون۔ البتہ بعض اوقات
جاہلانہ رسوم طبیعت پر غالب آجاتی ہیں تو اچھے اور بُرے کی تمیز اٹھ جاتی ہے یا بعض چیزوں کا
خبت مخفی ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں انبیاء علیہم السلام کا فیصلہ سب کے لئے حجت ہے
کیونکہ افراد انسانی میں سب سے زیادہ سلیم الطبع انسان انبیاء علیہم السلام ہیں جنکو حق تعالیٰ نے
مخصوص طور پر فطرت سلیمہ سے نوازا اور ان کی تربیت کا خود تکفل فرمایا۔ ان کے گرد و
پیش اپنے فرشتوں کا پہرہ لگایا جس سے ان کے قلب و دماغ اور اخلاق کسی غلط ماحول
سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے جن چیزوں کو خبائث قرار دیا وہ حقیقتہً خبائث ہیں
اور جن کو طبیات سمجھا وہ حقیقتہً طبیات ہیں۔

چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک
تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان
فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے کے سلیم الطبع حضرات
لے ان کو گندی اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ دہلوی نے حجة اللہ الباقیہ میں بیان فرمایا ہے کہ جتنے
جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دیے ہیں، ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب

دو اُسولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبح کے بجائے میسہ یعنی مردار قرار دیا جائے گا۔

سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں نو چیزوں کو حرام بتلایا ہے۔ ان میں خنزیر قسم اول میں داخل ہے۔ باقی آٹھ قسم دوم میں۔ قرآن کریم نے ذَبَحَہُمْ عَلَیْہِہُمُ الْخَبِیْثَ فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا۔ اور اس کی تفصیل میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحتہً بیان فرمادیں۔ جیسے لَحْمَ خَنِیْزٍ اور دَمٌ مَّسْفُوحٌ وغیرہ۔ باقی چیزوں کا بیان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتلانی کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے جس جانور کی شکل میں مسخ و تبدیل کیا گیا ہو تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ جانور طبعاً خبیث ہے کہ جن لوگوں پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ان کو اس جانور کی شکل دی گئی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے وَجَعَلَ مِنْہُمُ الْقِرَادَۃَ وَالْخَنَازِیْرَ۔ یعنی بعض قوموں کو خنزیر اور بندر کی شکل میں بطور عذاب کے مسخ کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی یہ دونوں قسمیں بالطبع خیانت میں داخل ہیں۔ ان کو باقاعدہ ذبح بھی کر دیا جائے تو بھی حلال نہیں ہو سکتے۔ اور بہت سے جانور ایسے بھی ہیں کہ افعال و آثار سے ان کا خبیث ہونا عام طبائع خود بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ مثلاً درندے جانور، جن کا کام ہی دوسرے جانوروں کو زخمی کرنا، پھاڑنا کھانا ہے اور سخت دلی ہے۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیے کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے جانور ہیں جن کی خصالت ایذا رسانی، چیزوں کو اچک لینا ہے۔ جیسے سانپ۔ بچھو۔ چھپکلی۔ مکھی۔ یا چیل اور باز وغیرہ۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضابطہ کے طور پر بیان فرمایا کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کھاتا ہے، جیسے شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ اور پرندوں میں وہ جانور جو اپنے پنجے سے شکار کرتے ہیں۔ جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ یا ایسے جانور جن کی طبیعت میں خست اور ذلت یا نجاست کا ماحول ہوتا ہے، جیسے چوہا یا مردار جو جانور یا گدھا وغیرہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان جانوروں کے طبعی خواص اور ان کا مضر ہونا ہر انسان جو معمولی سلامت طبع رکھتا ہو محسوس کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کو شریعت اسلام نے حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جن میں ذاتی طور پر خبیث پایا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان کی ذات میں کوئی خبیث نہیں۔ مگر جانوروں کے ذبح کرنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے اس طریقہ پر اسکو ذبح نہیں کیا گیا خواہ سرے سے ذبح ہی نہیں کیا گیا ہو۔ جیسے جھٹکا کر کے مارا ہو یا چوٹ کے ذریعہ مارا ہو یا جانور یا ذبح تو کیا مگر اس پر اللہ کے نام کے بجائے کسی غیر اللہ کا نام لیا یا کسی کا بھی نہ لیا اور جان بوجھ کر اللہ کے نام کو بوقت ذبح چھوڑ دیا تو یہ ذبح بھی شرعاً معتبر نہیں بلکہ ایسا ہی ہے جیسے کسی جانور کو بغیر ذبح کے ہلاک کر دیا ہو۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ انسان جو کچھ کھاتا پیتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ مگر جانوروں کے سوا اور کسی چیز کے کھانے پکانے پر یہ پابندی نہیں ہے کہ اللہ اکبر یا بسم اللہ کہہ کر ہی کھایا پکایا جائے اس کے بغیر وہ حلال ہی نہ ہو، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر چیز کھانے پینے کے وقت بسم اللہ کہنا مستحب قرار دیا جاتا ہے۔ بخلاف جانوروں کے ان کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا واجب قرار دیا گیا اور جان بوجھ کر کوئی اس وقت اللہ کا نام ترک کر دے تو جانور کو مردار اور حرام قرار دیا گیا اس میں حکمت کیا ہے۔

غور کیا جائے تو فرق واضح ہے کہ جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے سب برابر ہیں۔ اس لئے ایک جاندار کیلئے دوسرے جاندار کو فنا کرنا اور ذبح کر کے کھالینا لفظاً ہر جائز نہ ہوتا چاہیے۔ اب جن کے لئے یہ جائز کیا گیا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا ایک بھاری انعام ہے۔ اس لئے جانور کو ذبح کرنے کے وقت اس نعمت الہیہ کا استحضار اور ادائے شکر ضروری و شرار دیا گیا۔ بخلاف غلہ، دانہ، پھل وغیرہ کہ ان کی پیدائش ہی اس لئے ہے کہ انسان ان کو فنا کر کے اپنی ضروریات پوری کرے۔ اس لئے ان پر صرف بسم اللہ کہنا مستحب کے درجہ میں رکھا گیا ہے، واجب اور ضروری نہیں کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت سے یہ رسم جاری تھی کہ مشرکین جانوروں کے ذبح کے وقت اپنے بتوں کے نام لیا کرتے تھے۔ شریعت اسلام نے ان کی اس کافرانہ رسم کو ایک بہترین عبادت میں تبدیل کر دیا کہ اللہ کا نام لینا ضروری قرار دیا۔ اور اس مشرکانہ رسم کو مٹانے کی مناسب صورت یہی تھی کہ غلط نام کی بجائے کوئی صحیح نام تجویز کر دیا جائے۔ ورنہ چلی ہوئی رسم و عادت کا چھوڑنا مشکل ہوتا۔ یہاں تک آیت کے پہلے جملے کی تشریح تھی۔ دوسرا جملہ یہ ہے۔ وَطَعَا مِ الدِّیْنِ اَوْ تَوَّالْکِیْمِ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَا مُمْکُ

حِلُّ لَہُمْ۔ یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔ اور تمہارا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال۔

اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک کھانے سے مراد ذبیحہ جانور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، ابوالدرداء، ابراہیم، قتادہ، سعدی، صفحاک، مجاہد، رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہی منقول ہے (روح المعانی و جصاص) کیونکہ دوسری قسم کے کھانوں میں اہل کتاب اور بت پرست، مشرکین سب برابر ہیں کہ روٹی۔ آٹا۔ دال۔ چاول۔ پھل وغیرہ جن ذبح کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی جائز طریقہ پر حاصل ہو تو مسلمان کو اس کا کھانا جائز ہے۔ اور مسلمانوں سے اُن کو ملے تو اُن کے لئے حلال ہے۔ اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمان کے لئے اور مسلمان کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے حلال ہے۔

اب اس جگہ چند مسائل قابل غور ہیں: اول یہ کہ اہل کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں۔ کتاب سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اہل کتاب ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور سے ایمان عمل رکھتے ہوں۔ اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کتاب کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا۔ وہ ہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو۔ اس لئے باتفاق اُمت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا تصدیق شرعاً یقینی ہو۔ جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس لئے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں۔ وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی۔ جیسے مشرکین مکہ۔ مجوس۔ بت پرست ہندو۔ بدھ۔ آریہ۔ سکھ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ باصطلاح قرآن اہل کتاب میں داخل ہیں۔ تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں۔ جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں۔ اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور ان کا کوئی تعلق نہیں، یہ نجوم پرست قوم ہیں۔ وہ ان کو بت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں۔ بہر حال یقینی طور پر جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں

کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اُن کے لئے حلال ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہتے اور سمجھنے کے لئے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر عمل رکھتے ہوں۔ یا محرف تورات اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں۔ سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اسکی اتباع کرنے کے دعویدار ہوں۔ خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا۔ انھیں کے بارے میں یہ بھی جا بجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ **يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ**۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو **وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرِي** ابن اللہ **وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ**۔ ان حالات و صفات کے باوجود جب قرآن نے انکو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جب تک یہودیت و نصرانیت کو بالکل چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعلیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

صرف نام کے یہودی و نصرانی | آجکل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد جو درحقیقت دہریے ہیں وہ ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی اس میں داخل نہیں۔ | یافرائی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب

ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات و انجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی و پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نصاری کے بارے میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اسکی

وجہ یہ بتانی کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی پرزے کے قائل نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے کہ
 راوی ابن الجوزی بسنداً عن علی
 قال لا تأكلوا من ذبائح نصاری
 بنی تغلب فانهم لم یتمسکوا
 من النصرانیۃ بشئ الا شرابهم
 الخمر ورواها الشافعی بسند صحیح
 عنہ (تفسیر مظہری ص ۳۲، جلد ۳۷
 ص ۸۵)۔

ابن جوزی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علی رضی
 اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاری بنی تغلب کے
 ذبائح کو نہ کھاؤ۔ کیونکہ انہوں نے مذہب
 نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں
 لیا۔ امام شافعی نے بھی سند صحیح کے ساتھ
 روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں
 نصرانی نہیں۔ اگرچہ نصرانی کہلاتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا۔ جمہور صحابہ و
 تابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں۔ بالکل دین کے منکر نہیں۔ اس لئے
 انہوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمہور الامۃ ان ذبیحۃ
 کل نصرانی حلال سوا کان من
 بنی تغلب او غیرہم وکذا لاک
 الیہود۔ (تفسیر قرطبی ص ۷۷، جلد ۶)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ
 حلال ہے۔ خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا
 ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت
 سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی
 حلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے
 وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے۔ وہ اہل کتاب
 کے حکم میں نہیں۔

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں۔ جس میں از روئے لغت عربی
 ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں۔ لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ
 طعام سے مراد صرف اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے۔ کیونکہ گوشت کے

طعام اہل کتاب سے
 کیا مراد ہے؟

سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق
 نہیں۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں۔ گہوؤں۔ چنا۔ چاول۔ اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا
 حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور جس کھانے میں انسانی صنعت

کو داخل ہے۔ اس میں چونکہ کفار کے برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت کا کوئی بھروسہ نہیں اسلئے احتیاط اس میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ بلا ضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں مگر اس میں جو حال مشرکین، بت پرستوں کا ہے، وہی اہل کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف اُن کے ذبائح کے گوشت میں ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں اتفاق امت طعام اہل کتاب سے مراد ان کے ذبائح ہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے لکھا ہے :-

لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی داخل ہیں۔ اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا ہے اکثر علماء تفسیر کے نزدیک اور اہل کتاب کے طعام میں سے جو چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔ وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔

والطعام اسم لما يؤكل والذبائح منه وهو ههنا خاص بالذبائح عند كثير من اهل العلم بالآويل واما ما حترم من طعامهم فليس بداخل في عموم الخطاب۔

(قرطبی ص ۴، ج ۶)

اس کے بعد امام قرطبی نے مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے :-

علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ چیزیں جن میں ذبح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کھانا جس میں تصرف نہیں کرنا پڑتا جیسے میوہ اور گندم وغیرہ اس کا کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بننا چنداں مضر نہیں ہے۔ البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو کچھ عمل کرنا پڑتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً آٹے سے روٹی بنانا، تیل کا لانا وغیرہ تو کافر ذمی کا ایسی چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ جس طبعی کراہت کی بناء پر ہوگا۔ اور دوسری

لا خلاف بين العلماء ان ما لا يحتاج الى ذبح كالطعام الذي لا محاولة فيه كالفاكهة والبر۔ جائز اكله اذ لا يضرب فيه تملك احد والطعام الذي تقع فيه المحاولة على ضربين احدهما ما فيه محاولة صنعة لا تعلق لها بالدين كخبز الدقيق وعصارة التراب وتحوه۔ فهذا ان تجنب من الذبح فعلى وجه التقدير۔ والضرب الثاني التذكية التي ذكرنا انها هي التي تحتاج الى الدين والنية۔ فلما كان القياس ان لا تجوز ذبائحهم كما

نقول انتم لاحلالة لهم ولا عبادة مقبولة
له رخص الله تعالى في ذبائهم وعلى
هذه الامة واخرجها النص عن القياس
على ما ذكرنا من قول ابن عباس -

(قرطبي سورۃ مائدہ ص ۶، ج ۶)

قسم وہ ہے، جس میں عمل ذبح کرنا پڑتا ہے
جس کے لئے دین اور نیت کی ضرورت ہے۔
تو اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کافر کی
نماز اور عبادتوں کی طرح اس کا عمل ذبح
بھی قبول نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن اللہ نے
اس امت کے لئے خاص طور پر ان کے ذبح
حلال کر دیئے اور حضرت ابن عباس رضی
نص نے اس مسئلہ کو خلاف قیاس ثابت
کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہل کتاب سے مراد اس آیت میں باتفاق علماء تفسیر وہ طعام ہے جسکی
حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے یعنی ذبیحہ اسی لئے اس طعام میں اہل کتاب کے ساتھ
امتیازی معاملہ کیا گیا۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی
ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعویٰ کو مجروح کر دیا۔ یہاں تک کہ شرک و کفر میں
مبتلا ہو گئے۔ بخلاف بت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی یا رسول پر ایمان
لانے کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے۔ اور جن کتابوں یا شخصیتوں پر ان کا ایمان ہے۔ وہ نہ اللہ کی بھیجی
ہوئی کتابیں ہیں اور نہ ان کا رسول و نبی ہونا اللہ کے کسی کلام سے ثابت ہے۔

زیر بحث مسئلہ کا یہ تیسرا سوال ہے۔ اس کا جواب اکثر صحابہ و تابعین اور
ائمہ تفسیر کی طرف سے یہ ہے کہ تمام کفار میں سے اہل کتاب یہود و نصاریٰ
کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ
ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود ان دو مسئلوں میں
ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدہ ضروری سمجھتے
ہیں۔ اس کے بغیر جائز کو مردار میتہ اور ناپاک و حرام قرار دیتے ہیں۔

اہل کتاب کا ذبیحہ
حلال ہونے
کی حکمت اور وجہ

اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے ان کے مذہب میں
بھی حرام ہے، اور جس طرح اسلام میں نکاح کا اعلان اور گواہوں کے سامنے ہونا ضروری
ہے۔ اسی طرح ان کے موجودہ مذہب میں بھی یہی احکام ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیر نے یہی قول اکثر صحابہ و تابعین کا نقل فرمایا ہے۔ ان کی عبارت

یہ ہے :-

(وطعام اہل الکتاب) قال ابن عباس
وابو امامۃ ومجاہد وسعید بن جبیر
وعکرمہ وعطاء والحسن ومکحول
وابراہیم النخعی والسدی ومقاتل بن
حیان یعنی ذباۃ حصم حلال للمسلمین
لانہم یعتقدون تحسیر الذباۃ بحرقہا
واللہ ولایذکرون علی ذباۃ حصم
الا اسم اللہ وان اعتقدوا فیہ تعالیٰ
ما هو منزہ عنہ تعالیٰ وتقدس
(ابن کثیر مائدہ ص ۱۹ ج ۳)

ابن عباس، ابو امامہ مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطاء، حسن، مکحول، ابراہیم نخعی، سدی، اور مقاتل بن حیان نے طعام اہل کتاب کی تفسیر ان کے ذباۃ حصم کے ساتھ کی ہے۔ اور یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے یہاں اجماعی ہے کہ ان کے ذبیحہ مسلمان کے لئے حلال ہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا حرام سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا اور کسی کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں۔ جن سے باری تعالیٰ پاک، اور بلند و بالا ہے۔

ابن کثیر کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام مذکورہ صدر حضرات صحابہ و تابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے ان کے ذباۃ حصم مراد ہیں۔ اور ان کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان سب حضرات کے نزدیک ذباۃ حصم اہل کتاب کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بہت سی تحریفات کے باوجود ذبیحہ کا مسئلہ اسلامی شریعت کے مطابق باقی ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو وہ بھی حرام کہتے ہیں۔ اور ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں وہ تشدید کے مشرکانہ عقیدہ کے قائل ہو گئے۔ اور اللہ اور مسیح بن مریم کو ایک ہی کہنے لگے۔ جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ | بے شک کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ذبیحہ کے متعلق تمام قرآنی آیات جو سورۃ بقرہ اور سورۃ انفصام میں آئی ہیں، جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے جانور کو بھی اور اس جانور کو بھی جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، حرام قرار دیا ہے۔ یہ سب آیتیں اپنی جگہ پر محکم اور معمول بہا ہیں۔ سورۃ مائدہ کی آیت جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے، وہ بھی ان آیات کے حکم سے مختلف نہیں کیونکہ طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ ان کے موجودہ مذہب میں

بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور، اور وہ جانور جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام ہے۔
موجودہ زمانے میں توراۃ و انجیل کے جو نسخے اب بھی موجود ہیں ان میں بھی ذبیحہ اور نکاح کے
احکام تقریباً وہی ہیں جو قرآن کریم اور اسلام میں ہیں۔ جن کی تفصیل عنقریب ذکر
کی جائے گی۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف کچھ عمل کرتے
ہوں، جیسا کہ خود مسلمانوں کے جاہل عوام میں بھی بہت سی جاہلانہ رسمیں شامل ہو گئی ہیں
مگر ان کو مذہب اسلام نہیں کہا جاسکتا۔ نصاریٰ کے جاہل عوام کے طرز عمل کو دیکھ کر، ہی
بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا اور
اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبح کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ کوئی اس پر مسیح یا عزیز
کا نام لیتا ہے، کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آیت مائدہ جس میں طعام
اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے۔ اس آیت نے اہل کتاب کے ذبح کے حق میں سورۃ بقرہ اور
اور سورۃ انعام کی ان آیتوں میں تحفہ ص یا ایک قسم کا نسخ قرار دیا ہے جن میں غیر اللہ
کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض اکابر علماء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات تابعین نے اہل کتاب کے
متروک التسمیہ ذبیحہ اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے۔ ان
کے نزدیک بھی اہل کتاب کا اصل مذہب تو اسلامی احکام سے مختلف نہیں ہے۔ مگر ان کے جاہل
عوام یہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات نے جاہل اہل کتاب کو بھی عام اصل
کتاب کے حکم سے الگ نہیں کیا۔ اور ذبیحہ اور نکاح کے معاملہ میں ان کا بھی وہی حکم رکھا
جو ان کے آباء و اجداد اور اصل مذہب کے پیروں کا ہے کہ ان کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں
سے نکاح جائز ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد ابوالفتح مقدسی سے
سوال کیا کہ موجودہ نصاریٰ تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں، مثلاً مسیح یا عزیز کا نام بوقت ذبح
لیتے ہیں تو ان کا ذبیحہ کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ اس پر ابوالفتح مقدسی نے فرمایا:-

ان کا حکم اپنے آباء و اجداد کا سا ہے۔ (آج کے
اہل کتاب کا) یہ حال اللہ کو معلوم تھا، لیکن اللہ
نے ان کو ان کے آباء کے تابع بنا دیا ہے۔

ہم من اباہم و فتا جعلہم
اللہ تعالیٰ تبعاً لمن کان قبلہم من
علمہ بحالہم۔

(احکام ابن عربی ص ۲۲۹، جلد اول)

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اسلاف امت میں جن حضرات علماء نے اہل کتاب کے ایسے ذبیح کی اجازت دیدی ہے جن پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بلکہ غیر اللہ کا لیا گیا۔ ان کے نزدیک بھی اصل مذہب اہل کتاب کا یہی ہے کہ یہ چیزیں ان کے مذہب میں بھی حرام ہیں مگر ان حضرات نے غلط کار عوام کو بھی اس حکم میں شامل رکھا جو اصل اہل کتاب کا حکم ہے۔ اس لئے ان کے ذبیح کو بھی حلال قرار دے دیا۔ اور جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس پر نظر فرمائی کہ اہل کتاب کے جاہل عوام جو غیر اللہ کے نام یا بغیر اللہ کے نام کے ذبیح کرتے ہیں۔ یہ اسلامی حکم کے تو خلاف ہے ہی، خود نصاریٰ کے موجودہ مذہب کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے ان کے عمل کا احکام پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان لوگوں کا ذبیحہ طعام اہل کتاب میں داخل ہی نہیں۔ اس لئے اس کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور ان کے غلط عمل کی وجہ سے آیات قرآنی میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

اسی لئے تمام ائمہ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، ابو حیان وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ سورۃ بقرہ اور النعام کی آیات میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا۔ یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے جیسا کہ بحوالہ ابن کثیر اور نقل ہو چکا ہے۔ اور تفسیر بحر محیط میں بالفاظ ذیل مذکور ہے۔

ان کا مذہب یہ ہے کہ کتابی اگر ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لے لے اور اللہ کے سوا کوئی نام لے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ یہی قول ہے ابو الدرداء، عبادہ بن صامت اور صحابہ کرام کی ایک جماعت کا۔ اور یہی ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر اور مالک کا مذہب ہے۔ بخنی اور ثوری اس کی کھانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

وذهب الی ان الکتابی اذا لم یذکر اللہ علی الذبیحۃ و ذکر غیر اللہ لم یتوکل وہ قال ابو الدرداء و عبادۃ بن الصامت و جماعۃ من الصحابۃ وہ قال ابو حنیفۃ و ابو یوسف و محمد و زفر و مالک و کثرۃ النخعی و الثوری اکل ما ذبح و اهل بلہ لغیر اللہ۔

(بحر محیط ص ۴۳ - ج ۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور اسلاف امت کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہل کتاب کا اصل مذہب زمانہ نزول قرآن میں بھی یہی تھا کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا قصد اللہ کا نام چھوڑا جائے وہ حرام ہے۔ اسی طرح نکاح کی حلت و حرمت میں بھی اہل کتاب کا اصل مذہب موجودہ زمانے تک اکثر چیزوں میں اسلامی شریعت کے مطابق ہے اس کے خلاف جو کچھ اہل کتاب میں پایا گیا، وہ جاہل عوام کے غلط ہیں ان کا مذہب

نہیں ہے۔

موجودہ تورات و انجیل جو مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کے مندرجہ ذیل اقوال۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں جو موجودہ زمانہ کے یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلم ہے۔

ذبیحہ کے متعلق یہ احکام ہیں :-

(۱) جو جانور خود بخود مر گیا ہو۔ اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو۔ ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، تم اسے کسی حال میں نہ کھانا۔ (احبار سے - ۲۳)

(۲) پر گوشت کو تو ایسے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے دی ہوئی برکت کے موافق ذبح کر کے کھا سکے گا۔۔۔۔۔ لیکن تم خون کو بالکل نہ کھانا۔

(استثنا ۱۲-۱۵)

(۳) تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں۔ اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ (عہد نامہ جدید کتاب اعمال ۱۵-۲۹)

(۴) عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے کہ جو قربانی غیر قوم میں کرنی ہیں شیاطین کے لئے قربانی کرتی ہیں، نہ کہ خدا کے لئے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو۔ تم خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے دونوں میں سے نہیں پی سکتے۔ (کرنتھیوں ۱۰-۲۰-۲۰)

(۵) کتاب اعمال حواریں میں ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا تھا کہ وہ صرف بتوں کی قربانی کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں، اور حرام کاری سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ (اعمال ۲۱-۲۵)

یہ تورات و انجیل کے وہ تصریحات ہیں جو آجکل کی بائبل سوسائٹیوں نے چھاپی ہوئی ہیں، جن میں سینکڑوں تحریفیات و ترمیمات کے بعد بھی بعینہ قرآن کریم کے احکام کے مطابق یہ چیزیں باقی ہیں۔ قرآن کریم کی آیت یہ ہے کہ

تم پر حرام کرو یا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت۔ اور جس پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام پکارا گیا ہو۔ اور گلا گھونٹا ہوا، اور چوٹ کھا کر مرا ہوا۔ اور گر کر مرا ہوا۔ اور سینک کھا کر مرا ہوا۔ اور جسے درندہ نے کھایا ہو۔ (الایہ کہ

حُمِّمَتْ عَلَيْكُمْ أَلْمَيْتَةُ وَالْدَّامُ وَالْخَمْرُ
الْخِنْزِيرُ وَمَا أَهَلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَفَقَةُ
وَالْمَرْقُودَةُ وَالْمُتَرَدِّيَّةُ وَالنَّطِيحَةُ
وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذَرَجَ
عَلَى النَّصَبِ - (المائدہ ۳)

سم نے اس کو پاک کر لیا ہو۔ اور وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت نے مینہ یعنی خود مرا ہوا جانور، اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اور گلا گھونٹا ہوا جانور اور چوٹ سے مارا یا اونچی جگہ سے گر کر مرا ہوا۔ یا سینگوں کی چوٹ سے مارا ہوا۔ اور جس کو درندوں نے بھاڑا ہو سب حرام قرار دیئے ہیں۔ توراۃ و انجیل کی مذکورہ تصریحات میں بھی ”لحم خنزیر“ کے علاوہ تقریباً سبھی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف چوٹ سے یا اونچی جگہ سے گر کر سینگوں سے مرنے والے جانور کی تفصیل اگرچہ مذکور نہیں ہے۔ مگر وہ سب تقریباً خود مرے یا گلا گھونٹ کر مارے ہوئے کے حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح سترآن کریم نے ذبیحہ پر اللہ کے نام لینے کی تاکید فرمائی ہے ﴿فَلَوْلَا مَا ذُكِّرْتُمْ﴾ اللہ علیہ۔ اور جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو حرام کیا ہے ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرْ﴾ اللہ علیہ۔ بائبل میں کتاب استثنائے کی عبارت مذکور ہے ۲ سے بھی اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے کہ جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔ اسی طرح نکاح کے معاملہ بھی اہل کتاب کا مذہب اکثر چیزوں میں شریعت اسلام کے مطابق ہے۔

ملاحظہ ہو۔ احبار۔ ۱۸۔ ۶۔ تا ۱۹ جس میں ایک طویل فہرست محرمات کی دی گئی ہے اور جن میں بیشتر وہی ہیں جن کو قرآن نے حرام کیا ہے، یہاں تک کہ جمع بکین الاختیت۔ یعنی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں حج کرنیکی حرمت اور حالت حیض میں صحبت کا حرام ہونا بھی اس میں مصرح ہے۔ نیز بائبل میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بُت پرست اور مشرک اقوام سے نکاح جائز نہیں۔ موجودہ توراۃ کے الفاظ یہ ہیں۔

”توان سے بیاہ، شادی بھی نہ کرنا۔ نہ اُن کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا۔ اور نہ اپنے بیٹوں کے لئے، اُن کی بیٹیاں لینا۔ کیونکہ وہ میرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے۔ تاکہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں“ (استثنا ۲۔ ۳۳۔ ۳۴)

یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال خلاصہ کلام اور دوسرے کفار کے ذبائح اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کے اغلاط ہیں۔ اُن کا مذہب نہیں ہے۔ اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورہ بقرہ

انعام اور مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد یا نسخ یا تخصیص نہیں ہے۔ اور جن علماء و تابعین نے غلط کار عوام کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا اور آیات بقروہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے۔ اس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے کہ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ یعنی اللہ تو عیسیٰ بن مریم ہی ہیں۔ یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اس سے مراد عیسیٰ بن مریم ہی لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذبح میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہو گیا۔ اس بنا پر ان حضرات تابعین نے ذبائح اہل کتاب میں اس کی اجازت دیدی ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں اس بنیاد کی وضاحت فرمائی ہے۔

(احکام ابن عربی ص ۲۲۹، جلد ۱)

مگر جہود رامت نے اس کو قبول نہیں کیا۔ جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر و تفسیر بحر محیط ابھی گذر چکا ہے۔ اور تفسیر مظہری میں اقوال مختلف نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :-

وَالصَّحَابَةُ الْمَخْتَارُونَ عِنْدَنَا هُوَ الْقَوْلُ
الْأَوَّلُ۔ یعنی ذبائح اہل کتاب رکا للتسمیہ
عاملاً او علی غیر اسم اللہ تعالیٰ لایوکل
ان علم ذالک یقیناً او کان غالباً حالہم
ذالک وهو محمل النہی عن اکل ذبائح
نصاری العرب ومحمل قول علی رضی اللہ عنہ
من ذبائح نصاری بنی تغلب فانہم
لم یتمسکوا من النصرا نیۃ بشیء الا بشہم
الخمر فلعل علیاً علم من حالہم انہم
لا یسمون اللہ عند الذبح او یذبحون
علی غیر اسم اللہ ہکذا حکم نصاری
العجم ان کان عادۃہم الذبح علی غیر
اسم اللہ تعالیٰ غالباً لایوکل ذبیحہ حقہم
ولاشک ان النصاری فی ہذا الزمان
لا یذبحون بل یقتلون بالوقد غالباً فلا
یحل طعامہم۔

(تفسیر مظہری ص ۲۹۹ - جلد ۳)

اور صحیح اور مختار ہمارے نزدیک پہلا ہی قول ہے
یعنی یہ کہ اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصد اللہ
کا نام لینا چھوڑ دیا ہو، یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے
گئے ہوں۔ وہ حلال نہیں، اگر یقینی طور پر اس کا
علم ہو جائے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا یا غیر اللہ
کا لیا ہے، یا اہل کتاب کی عام عادت یہ ہو جائے،
جن بزرگوں نے عرب کے نصاریٰ کے ذبائح کو
منع کیا ہے ان کے قول کا مقصد بھی یہی ہے۔
اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو یہ فرمایا کہ نصاریٰ
بنی تغلب کے ذبائح کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ
انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے بجز شراب
نوشی کے اور کچھ نہیں لیا۔ اس کا محل بھی یہی ہے
حضرت علی رضی اللہ عنہ ثابت ہوا ہو گا کہ بنی تغلب
اپنے ذبائح پر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یا پھر غیر
اللہ کا نام لیتے ہیں۔

پس یہی حکم عجمی نصاریٰ کا بھی ہے کہ اگر
ان کی عادت یہی ہو جائے کہ عام طور پر غیر اللہ

کے نام پر ذبح کرتے ہیں، تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں اور اس میں شک نہیں کہ آجکل کے نصاریٰ تو ذبح ہی نہیں کرتے بلکہ عام طور پر چوٹ مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔

یہ تفصیلی بحث یہاں اس لئے نقل کی گئی کہ اس مقام پر مصر کے مشہور عالم مفتی عبیدہ سے ایک سخت لغزش ہو گئی ہے جس کے غلط اور کتاب و سنت اور جمہور امت کے خلاف ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ موصوف سے تفسیر المنار میں اس جگہ دوہری غلطی ہوئی ہے۔

اولیٰ تو اہل کتاب کے مفہوم میں دنیا کے کفار۔ مجوس۔ ہندو۔ سکھ وغیرہ سب کو داخل کر کے اتنا عام کر دیا کہ پورے قرآن میں جو کفار اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تقسیم و تفریق کی گئی ہے وہ بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

اور دوسری غلطی اس سے بڑی یہ ہوئی کہ طعام اہل کتاب کے مفہوم میں اہل کتاب کے ہر کھانے کو بلا کسی شرط کے حلال کر دیا۔ خواہ وہ جانور کو ذبح کریں یا نہ کریں۔ اور اس پر اللہ کا نام لیں یا نہ لیں۔ ہر حال میں وہ جانور کو جس طرح کھاتے ہیں اس کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا۔

جس سے وقت ان کا یہ فتویٰ مصر میں شائع ہوا اس وقت خود مصر کے اور دنیا کے تمام اکابر علماء نے اس کو غلط قرار دیا۔ اس پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے گئے۔ مفتی عبیدہ کو عہدہ فتویٰ سے معزول کرنے کے مطالبات ہر طرف سے ہوئے۔ ادھر مفتی صاحب موصوف کے شاگردوں اور کچھ مغرب زدہ یورپین معاشرے کے دلدادہ لوگوں نے بحثیں چلائیں۔ کیونکہ یہ فتویٰ ان کی راہ کی تمام مشکلات کا حل تھا کہ یورپ کے یہود و نصاریٰ بلکہ دہریوں کا ہر کھانا ان کے لئے حلال ہو گیا۔

لیکن اسلام کا یہ بھی معجزہ ہے کہ خلافت شریعت کا م خواہ کتنے ہی بڑے عالم سے کیوں نہ ہو جائے۔ عام مسلمانوں کے قلوب اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور یورپی دنیا کے مسلمانوں نے اس کو گمراہی قرار دیا۔ اور اس وقت یہ معاملہ دب کر رہ گیا۔ مگر زمانہ حال کے ملحدین جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کیا جائے کہ جس میں یورپ کی ہر لغویت کھپ جائے۔ اور نئے جو انوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرے انھوں نے پھر اس بحث کو اس انداز سے نکالا کہ گویا وہ خود کو فی اپنی تحقیق پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ سب نقل مفتی عبیدہ کے مذکورہ مقالہ کی ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس

بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے۔

اب احمد رحمۃ اللہ علیہ بقدر ضرورت اس کا بیان ہو گیا۔ اور اس کی پوری تفصیل میرے رسالہ ”اسلامی ذبیحہ“ میں ہے۔ وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

دوسرا مسئلہ۔ اس جگہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس ارشاد میں ایک حکم جو مسلمانوں کے لئے بیان فرمایا کہ اہل کتاب کا طعام جو تمہارے لئے جائز ہے، یہ تو ظاہر ہے مگر اس کا دوسرا جز یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے جائز ہے، اس کا کیا مقصد ہے۔ کیونکہ اہل کتاب جو قرآنی ارشادات کے قائل ہی نہیں، ان کے لئے کیا حلال ہے کیا حرام۔ اس کے بیان سے کیا فائدہ۔

تفسیر سبچر محیط وغیرہ میں اس کے متعلق فرمایا کہ دراصل یہ حکم بھی مسلمانوں ہی کو بتلانا منظور ہے کہ تمہارا ذبیحہ ان کے لئے جائز ہے۔ اس واسطے تم اپنے ذبیحہ میں سے کسی غیر مسلم اہل کتاب کو کھلا دو تو کوئی گناہ نہیں۔ یعنی اپنی قربانی میں سے کسی کتابی شخص کو دے سکتے ہو۔ اور اگر ہمارا ذبیحہ ان کے لئے حرام ہوتا تو ہمارے لئے جائز نہ ہوتا کہ ہم ان کو اس میں سے کھلائیں۔ اس لئے گو یہ حکم بظاہر اہل کتاب کا ہے مگر درحقیقت اس کے مخاطب مسلمان ہی ہیں۔

اور تفسیر روح المعانی میں بحوالہ سدی اس جملہ کا ایک اور منشاء ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بعض حلال جانور یا ان کے کچھ حصے ستر کے طور پر حرام کر دئے گئے تھے۔ اس لئے وہ جانور یا جانور کا حصہ طعام اہل کتاب میں بظاہر داخل نہیں، لیکن آیت کے اس جملہ نے بتلادیا کہ جو جانور تمہارے لئے حلال ہے گو اہل کتاب اس کو حلال نہ جانتے ہوں، اگر اہل کتاب کے ذبح کردہ ملیں تو وہ بھی مسلمانوں کے لئے حلال ہی سمجھے جائیں گے۔ دَطْعَا مُمْكِرُ حِلٍّ لَّهُمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تقریر پر بھی آخر کار اس جملہ کا تعلق خود مسلمانوں کے ساتھ ہو گیا۔

اور تفسیر منطہری میں فرمایا کہ فائدہ اس جملہ کا فرق بیان کرنا ہے۔ ذبائح کے معاملہ میں اور نکاح کے معاملہ میں وہ فرق یہ ہے کہ ذبائح تو دونوں طرف سے حلال ہیں۔ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے۔ مگر عورتوں کے نکاح کا یہ معاملہ نہیں۔ اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمانوں کی عورتیں اہل کتاب کے لئے حلال نہیں۔

تیسرا مسئلہ:- یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں۔ بلکہ وہ مرتد ہے، اس کا ذبیحہ باجماع امت حرام ہے۔

اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہو وہ بھی مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ محض قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہل کتاب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یا کسی دوسرے مذہب و ملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی و نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں شمار ہوگا۔ اور اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے :-

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْنَهُنَّ الْأَمْوَالَ جُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِينَ أَخْدَانٍ ط یعنی تمہارے لئے مسلمان عقیف و پاکدامن عورتوں سے نکاح حلال ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عقیف و پاکدامن عورتوں سے بھی نکاح حلال ہے۔

اس میں دونوں جگہ محصنات کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی عربی لغت و محاورہ کے اعتبار سے دو ہو سکتے ہیں۔ ایک آزاد جس کا مقابل کینزین ہیں۔ دوسرے عقیف و پاکدامن عورتیں ہیں لغت کے اعتبار سے اس جگہ بھی دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

اسی لئے علماء تفسیر میں سے مجاہد نے اس جگہ محصنات کی تفسیر حرارت سے کی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اہل کتاب کی آزاد عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کینزین حلال نہیں۔ (منظہری)

لیکن جمہور علماء صحابہ و تابعین کے نزدیک اس جگہ محصنات کے معنی عقیف و پاکدامن عورتوں کے ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جس طرح عقیف اور پاکدامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح اہل کتاب کی عقیف و پاکدامن عورتوں سے بھی جائز ہے۔

(احکام القرآن جصاص و منظہری)

لیکن بالفاق جمہور اس جگہ عقیف و پاکدامن عورتوں کی قید کے یہ معنی نہیں کہ عقیف عقیف عورتوں سے نکاح ہی حرام ہے۔ بلکہ اس قید کا فائدہ بہتر اور مناسب صورت کی ترغیب ہے کہ خواہ مسلمان عورت سے نکاح کرو یا اہل کتاب سے۔ بہر حال یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ پاکدامن عقیف عورت سے نکاح ہو۔ بدکار فاسق عورتوں سے نکاح کا رشتہ جوڑنا کسی شریف مسلمان کا کام نہیں۔ (منظہری وغیرہ)

اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے حلال ہے کہ کسی مسلمان

عورت سے نکاح کرے یا اہل کتاب کی عورت سے۔ البتہ دونوں صورتوں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ عقیقہ و پاکدامن عورت سے نکاح کرے۔ بدکار، ناقابل اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جو ژنادین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ اس آیت میں اہل کتاب کی قید سے باجماع اُمت یہ ثابت ہو گیا کہ جو غیر مسلم اہل کتاب میں داخل نہیں، اُن کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

سابقہ بیان میں یہ واضح ہو چکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں۔ ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہل کتاب میں شمار ہو سکتی ہیں۔ باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہل کتاب میں داخل نہیں۔ آتش پرست۔ یا بت پرست ہندو۔ یا سکھ آریہ۔ بدھ وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعویدار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحی الہی ہو نا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو توراۃ و انجیل ہی ہیں۔ جنکی ماننے والی کچھ قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں، باقی زبور اور صحیف ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعویدار ہے اور ”وید“ اور ”گرنتھ“ یا زردشت وغیرہ... کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحی الہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے۔ اور صرف یہ امکان کہ شاید زبور اور صحیف ابراہیم ہی کی مسخ شدہ وہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا ”وید“ یا گرنتھ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امکان محض اور احتمال محض ہے۔ جو ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے باجماع اُمت ثابت ہو گیا کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے نکاح حرام ہے۔

آیت قرآن کریم وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا۔ اسی مضمون کے لئے آئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کر جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ اور اہل کتاب کے سوا دوسری قومیں سب مشرکات میں داخل ہیں۔

غرض قرآن مجید کی دو آیتیں اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ ایک میں یہ ہے کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح حلال نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ دوسری یہ آیت سورہ مائدہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ اس لئے جمہور علماء و تابعین نے دونوں آیتوں کا مدلول و مفہوم یہ قرار دیا کہ

کہ اصولی طور پر غیر مسلم عورت سے مسلمان کا نکاح نہ ہوتا چاہیے۔ لیکن سورۃ مائدہ کی اس آیت نے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اس عموم سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے سوا کسی دوسری قوم کی عورت سے بغیر اسلام لائے ہوئے مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اب رہا مسئلہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتوں کا تو بعض صحابہ کرام کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا یہی مذہب ہے۔ اُن سے جب کوئی پوچھتا تو وہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن کریم میں واضح ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰی يُؤْمِنُوْا یعنی مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو، جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑا کونسا مشرک ہو گا کہ وہ عیسیٰ بن مریم یا کسی دوسرے بندہ خدا کو اپنا رب اور خدا قرار دے۔ (احکام القرآن - جصاص)

ایک مرتبہ میمون بن مہرانؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں آباد ہیں جہاں اہل کتاب زیادہ رہتے ہیں۔ تو کیا ہم ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور ان کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو جواب میں یہ دونوں آیتیں پڑھ کر سنادیں۔ ایک وہ جس میں مشرکات کے نکاح کو حرام فرمایا ہے۔ دوسرے یہ آیت مائدہ جس میں اہل کتاب کی عورتوں کی حلت بیان کی ہے۔

میمون بن مہرانؓ نے کہا یہ دونوں آیتیں تو میں بھی قرآن میں پڑھتا ہوں اور جانتا ہوں۔ میرا سوال تو یہ ہے کہ ان دونوں کے پیش نظر میرے لئے حکم شرعی کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پھر یہی دونوں آیتیں پڑھ کر سنادیں۔ اور اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا۔ جس کا مطلب علماء امت نے یہ قرار دیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہونے پر کبھی اطمینان نہیں تھا۔

اور جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے فی نفسہ نکاح حلال ہے، لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفسد اور خرابیاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے از روئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی۔ ان کی بنا پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

جصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہؓ

نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے، تو پھر امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانے میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابو حنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے:-

اعنہ علیک ان لا تضع کتابی حتی
تخلی سبیلہا فانی اخاف ان یقتدیک
المسلمون فیختاروا النساء اهل
الذمۃ لجمالہن وکفی بذلک فتنۃ
للساء المسلمین۔

(کتاب الآثار ص ۱۵۶)

یعنی آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دیکر آزاد کر دو۔ کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔

اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت محمد بن حسن رحمہ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انھوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا تو جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔ (منظہری)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا زمانہ خیر الفتنوں کا زمانہ ہے۔ جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں۔ یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ مگر فاروقی نظر دور رہیں اتنے ہی مفاسد کو سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ ان کا

اس کے متعلق کیا عمل ہوتا۔ اول تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے حیطوں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ نہ ان کا توراۃ و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر۔ وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لامذہب اور اور دہریئے ہیں۔ محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان گھرانہ میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جن کے عبرتناکے روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت کو تباہ کر دیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اس کے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

الغرض قرآن و سنت اور اسوۂ صحابہ کی رو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آجکل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے کلی پرہیز کریں۔ آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اگر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، ان کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو دانتہ کے طور پر رکھنا اور کھلے طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو تو دھو لو

وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ

اپنے منہ اور ہاتھوں تک اور مل لو اپنے سر کو

وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا

اور پاؤں ٹخنوں تک اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو

وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم میں آیا ہے جائے

مِّنَ الْغَائِطِ أَوْلَسْتُمْ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا

ضرورت سے یا یاں گئے ہو عورتوں کے پھرنے یا تو تم پانی تو قصد کرو

صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ مَا

مٹی پاک کا اور مل لو اپنے منہ اور ہاتھ اس سے اللہ

يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ

نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے

وَلِيُنِمْ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ وَاذْكُرُوا

اور یاد کرو کہ تم پر اپنا احسان تم پر تاکہ تم احسان مانو اور یاد کرو احسان

نِعْمَةِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ

اللہ کا اپنے اور تم پر عہد ایسا کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے

قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ

کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ خوب جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾

دلوں کی بات

ربط آیات | پچھلی آیات میں کچھ احکام شرعیہ وہ ذکر کئے گئے جن کا تعلق انسان کی دنیوی زندگی اور کھانے پینے سے ہے۔ اس آیت میں چند احکام شرعیہ متعلق عبادات کے ذکر کئے گئے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو (یعنی نماز پڑھنے کا ارادہ کرو اور تم کو اس وقت وضو نہ ہو) تو (وضو کر لو یعنی) اپنے چہروں کو دھو دو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت (دھو دو) اور اپنے سروں پر بھینکا ہوا پھیرو۔ اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت (دھو دو) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نماز سے پہلے) سارا بدن پاک کر لو اور اگر تم بیمار ہو اور پانی کا استعمال مضر ہو، یا حالت سفر میں ہو (اور پانی نہیں ملتا جیسا آگے آتا ہے، یہ تو عذر کی حالت ہوئی) یا (اگر مرض و سفر کا عذر بھی نہ ہو بلکہ ویسے ہی وضو یا غسل ٹوٹ جاوے اس طرح سے کہ مثلاً، تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو

اور پھر ان ساری صورتوں میں، تم کو پانی کے استعمال کا موقع نہ ملے (خواہ بوجہ ضرر کے یا پانی نہ ملنے کے) تو ان سب حالتوں میں تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اس زمین (کی جنس) پر سے (ہاتھ مار کر) اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے مقرر فرمانے سے، یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں (یعنی یہ منظور ہے کہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے، چنانچہ احکام مذکورہ میں خصوصاً اور جمیع احکام شرعیہ میں عموماً رعایت سہولت و مصلحت کی ظاہر ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہو کہ تم کو پاک صاف رکھے (اس لئے طہارت کے قواعد اور طرق مشروع کئے اور کسی ایک طریق پر بس نہیں کیا گیا کہ اگر وہ نہ ہو تو طہارت ممکن ہی نہ ہو، مثلاً صرف پانی کو مٹھ کر رکھا جاتا تو پانی نہ ہونے کے وقت طہارت حاصل نہ ہو سکتی، یہ طہارت ابدان تو خاص احکام طہارت ہی میں ہے۔ اور طہارت قلوب تمام طاعات میں عام ہے پس یہ تطہیر دونوں کو شامل ہے اور اگر یہ احکام نہ ہوتے تو کوئی طہارت حاصل نہ ہوتی۔) اور یہ (منظور ہے) کہ تم پر اپنا انعام تام فرمادے۔

(اس لئے احکام کی تکمیل فرمائی تاکہ ہر حال میں طہارت بدنی و قلبی جس کا ثمرہ رضا و قرب ہے جو اعظم نعم ہے حاصل کر سکو) تاکہ تم (اس عنایت کا) شکر ادا کرو (شکر میں امتثال بھی داخل ہے) اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو، (جس میں بڑا انعام یہ ہے کہ تمہاری فلاح کے طریقے تمہارے لئے مشروع کر دئے) اور اس کے اس عہد کو بھی (یاد کرو) جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے جبکہ تم نے (اس کا التزام بھی کر لیا تھا کہ عہد لینے کے وقت تم نے) کہا تھا کہ ہم نے (ان احکام کو) سنا اور مان لیا (کیونکہ اسلام لانے کے وقت ہر شخص اسی مضمون کا عہد کرتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کام کرو اس میں اخلاص و اعتقاد بھی ہونا چاہیے صرف منافقانہ امتثال کافی نہیں۔ مطلب یہ کہ ان احکام میں اول تو تمہارا ہی نفع پھر تم نے اپنے سر بھی رکھ لیا ہے۔ پھر مخالفت میں ضرر ان وجوہ سے امتثال ہی ضروری ہوا اور وہ بھی دل سے ہونا چاہیے ورنہ مثل عدم امتثال ہی کہے)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو

بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ ٓآلَا

انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ

تَعْدِلُوا إِعْدِلُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ

پھوڑو عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہو

إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ

اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں

أَمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ

سے اور جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے واسطے بخشش اور بڑا ثواب

عَظِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ

ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں

أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

دوزخ والے

خلاصہ تفسیر

(آزہ: بَيَانُ الْقُرْآنِ)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے (احکام کی) پوری پابندی کرنے والے اور شہادت کی ثبوت آوے تو، انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو، اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم (ان کے معاملات میں) عدل نہ کرو (ضرور ہر معاملہ میں) عدل کیا کرو (یعنی عدل کرنا، تقویٰ سے زیادہ قریب ہے) (یعنی اس سے تقویٰ کے ساتھ موصوفت کہلاتا ہے) اور (تقویٰ اختیار کرنا تم پر فرض ہے، چنانچہ حکم ہوا ہے کہ) اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو۔ (یہی حقیقت ہے تقویٰ کی پس عدل جو کہ اس فرض تقویٰ کا موقوف علیہ ہے نیز فرض ہو گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے، پس مخالفین احکام کو سزا ہو جاوے تو بعید نہیں) اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور (انہوں نے) اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ثواب عظیم ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھوٹا بتلایا ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت کا مضمون تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ سورۃ

نسا میں بھی گزر چکا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں گوئی اَقْسُوْا مِیْنَ بِالْقِسْطِ شَہِدَآءُ اللہ ارشاد ہوا تھا اور یہاں گوئی اَقْسُوْا مِیْنَ اللہ شَہِدَآءُ بِالْقِسْطِ۔ فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں آیات میں الفاظ کے تقدم اور تاخر کی ایک لطیف وجہ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں ذکر کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

الانسان کو عدل و انصاف سے روکنے اور ظلم و جور میں مبتلا کرنے کے عادتاً دو سبب ہو ا کرتے ہیں ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں، عزیزوں کی طرف داری۔ دوسرے کسی شخص کی دشمنی و عداوت۔ سورۃ نسا کی آیت کا روئے سخن پہلے مضمون کی طرف ہے۔ اور سورۃ مائدہ کی اس آیت کا روئے سخن دوسرے مضمون کی طرف۔

اسی لئے سورۃ نسا میں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَوْ عَلَى الْفُسْكَاءِ وَالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو۔ چاہے وہ عدل و انصاف کا حکم خود تمہارے نفوس یا تمہارے والدین اور عزیزوں و دوستوں کے خلاف پڑے۔ اور سورۃ مائدہ کی اس آیت میں جملہ مذکور کے بعد یہ ارشاد ہے۔ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ یعنی کسی قوم کی عداوت و دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کروے کہ تم انصاف کے خلاف کرنے لگو۔

اس لئے سورۃ نسا کی آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے نفس اور والدین اور عزیزوں کی بھی پرواہ نہ کرو۔ اگر انصاف کا حکم ... ان کے خلاف ہے تو خلاف ہی پر قائم رہو۔ اور سورۃ مائدہ کی آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی دشمن کی دشمنی کی وجہ سے لغزش نہ ہوئی چاہیے کہ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے خلاف انصاف کام کرنے لگو۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ نسا کی آیت میں قسط یعنی انصاف کو مقدم کر کے ارشاد فرمایا ، **اَقْسُوْا مِیْنَ بِالْقِسْطِ شَہِدَآءُ اللہ**۔ اور سورۃ مائدہ کی آیت میں اللہ کو مقدم کر کے ارشاد فرمایا **اَقْسُوْا مِیْنَ اللہ شَہِدَآءُ بِالْقِسْطِ**۔ اگرچہ انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں عنوان ایک ہی مقصد کو ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص انصاف پر کھڑا ہو گا، وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہو گا۔ اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہو گا ہے وہ ضرور انصاف ہی کرے گا۔ لیکن اپنے نفس اور دوستوں عزیزوں کی رعایت کے مقام میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان تعلقات کی رعایت بھی تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے وہاں لفظ قسط کو مقدم لا کر اس کی طرف، یہ آیت کر دی کہ وہ رعایت اللہ کے لئے نہیں ہو سکتی جو عدل و انصاف

کے خلاف ہو۔ اور سورہ مائدہ میں دشمنوں کے ساتھ عدل و انصاف برتنے کا حکم دینا تھا تو وہاں لفظ للہ کو مقدم لاکر انسانی فطرت کو جذبات میں مغلوب ہونے سے نکال دیا۔ کہ تم لوگ اللہ کے لئے کھڑے ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورہ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے۔ ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل و انصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہیے اور نہ کسی دشمنی و عداوت سے۔ دوسری ہدایت ان دونوں آیتوں میں اس کی بھی ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلو ہٹ کر نہ کی جائے۔ تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

شیران کریم نے اس مضمون پر کئی آیتوں میں مختلف عنوانات سے زور دیا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے کہ لوگ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ برتیں۔ ایک آیت میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا

وَلَا تَكُونُوا الشَّاهِدَآءَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ۔

یعنی گواہی کو چھپاؤ نہیں اور جو شخص چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ جس سے سچی گواہی دینا واجب اور اس کا چھپانا سخت گناہ ثابت ہوا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن حکیم نے اس پر بھی نظر رکھی ہے کہ لوگوں کو سچی گواہی دینے سے روکنے والی چیز دراصل یہ ہے کہ گواہ کو بار بار عدالتوں کی حاضری اور فضول قسم کی کیشا جرح سے سابقہ پڑتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا نام کسی گواہی میں آگیا وہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے کاروبار سے گیا، اور مفت کی زحمت میں مبتلا ہوا۔

اس لئے قرآن کریم نے جہاں سچی گواہی دینے کو لازم و واجب قرار دیا، وہیں یہ بھی ارشاد فرمادیا۔ وَلَا يُضَآئِرُكَ قَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ۔ یعنی معاملہ کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

آج کی عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدمات کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موقع پر کے اور سچے گواہ شاذ و نادر کہیں ملتے ہیں۔ سمجھدار شریف آدمی جہاں کوئی ایسا واقعہ دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آجائے۔ پولیس ادھر ادھر کے گواہوں سے خانہ پڑی کرتی ہے۔ اور نتیجہ اس کا وہی ہو سکتا ہے جو رات و دن مشاہدہ میں آ رہا ہے کہ فیصد دس پانچ مقدمات میں بھی حق و انصاف پر فیصلہ نہیں ہو سکتا اور

عدالتیں بھی مجبور ہیں، جیسی شہادتیں اُن کے پاس پہنچتی ہیں وہ انہی کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکال سکتی ہیں اور انھیں کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتی ہیں۔

مگر اس بنیادی غلطی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ اگر گواہوں کے ساتھ شرفیافہ معاملہ کیا جائے اور ان کو بار بار پریشان نہ کیا جائے تو اچھے بھلے نیک اور سچے آدمی قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے باز نہ رہیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہ ہی بار بار بلا کر گواہ کو اتنا پریشان کر دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ مرتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا۔ پھر اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں۔ ہر تاریخ پر اس ناکرہ گناہ گواہ کو حاضری کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طولانی ضابطہ کار روائی نے جو انگریز اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے، ہماری ساری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے۔ قدیم سادہ طرز پر جو آج بھی حجاز اور بعض دوسرے ممالک میں رائج ہے نہ مقدمات کی اتنی کثرت ہو سکتی ہے اور نہ ان میں اتنا طول ہو سکتا ہے نہ گواہوں کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضابطہ شہادت اور ضابطہ کار روائی اگر قرآنی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کی برکات آج بھی آنکھوں سے مشاہدہ ہونے لگیں۔ قرآن نے ایک طرف واقعہ سے باخبر لوگوں پر سچی شہادت ادا کرنے کو لازم و واجب قرار دے دیا ہے۔ تو دوسری طرف لوگوں کو ایسی ہدایتیں دیدی ہیں کہ گواہوں کو بلا وجہ پریشان نہ کیا جائے۔ کم سے کم وقت میں ان کا بیان لیکر فارغ کر دیا جائے۔

آخر میں ایک اور اہم بات بھی یہاں جاننا ضروری ہے، وہ یہ کہ لفظ شہادت اور گواہی کا جو مفہوم آج کل عرف میں مشہور ہو گیا ہے وہ تو صرف مقدّمات و خصوصیات ہیں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینے کے	امتحانات کے نمبر۔ سارے ٹیفکٹ اور انتخابات کے ووٹ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں۔
---	--

لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹر کی سارٹیفکٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بھی ایک شہادت ہے۔ اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کہ گناہ کبیرہ ہو گیا۔

اسی طرح امتحانات میں طلباء کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان

بوجھ کر یا بے پروائی سے نمبروں میں کمی بیشی کر دی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے۔ اور حرام اور سخت گناہ ہے۔

کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلباء کو مسند یا سارٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سارٹیفکیٹ یا مسند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کا ذیہ کے مجرم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے۔ جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت و امانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے نمائندوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ گواہی سچی اور صحیح ثابت ہو سکے۔ مگر ہمارے عوام میں کہ انہوں نے اس کو محض ہارجیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے ووٹ کا حق کبھی پیسوں کے عوض میں فروخت ہوتا ہے، کبھی کسی دباؤ کے تحت استعمال کیا جاتا ہے، کبھی ناپائدار دوستوں اور ذلیل وعدوں کے بھروسہ پر اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔

اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نااہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر مستحق لعنت و عذاب بن رہے ہیں۔

نمائندوں کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کی از روئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو شفاعت یا سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ اس کا حکم قرآن کریم کے الفاظ میں پہلے بیان ہو چکا ہے، ارشاد ہے :-

وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّمَّنَّهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا۔

یعنی جو شخص اچھی اور سچی سفارش کرے گا، تو جس کے حق میں سفارش کی ہے اس کے نیک عمل کا حصہ اس کو بھی ملے گا۔ اور جو شخص بُری سفارش کرتا ہے، یعنی کسی نااہل اور برے شخص کو کامیاب بنانے کی سعی کرتا ہے، اس کو اس کے بُرے اعمال کا حصہ ملے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ امیدوار اپنی کارکردگی کے پنج سالہ دور میں غلط اور ناجائز

کام کرے گا، ان سب کا وبال و وٹ دینے والے کو بھی پہونچے گا۔

وٹ کی ایک تیسری شرعی حیثیت وکالت کی ہے کہ وٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنی نمائندگی کے لئے وکیل بناتا ہے۔ لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوئی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہونچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں۔ کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لئے اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لئے وٹ دیکر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ کہ ہمارا وٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے، ایک شہادت، دوسرے شفاعت اور تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت۔ تینوں حیثیتوں میں جس طرح ٹیک صالح قابل آدمی کو وٹ دینا موجب ثواب عظیم ہے اور اس کے ثمرات اس کو ملنے والے ہیں۔ اسی طرح نا اہل یا غیر متدین شخص کو وٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بُری شفاعت بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن ثمرات بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

اس لئے ہر مسلمان ووٹر پر فرض ہے کہ وٹ دینے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کر لے کہ جس کو وٹ دے رہا ہے وہ کام کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور دیانت دار ہے یا نہیں، محض غفلت و بے پرواہی سے بلا وجہ ان عظیم گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

اے ایمان والو یاد رکھو احسان اللہ کا اپنے اوپر

إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ

جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلا دیں پھر روک دیجئے تم سے

أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ج وَاتَّقُوا اللَّهَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

ان کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ ہی پر چاہئے بھروسہ

الْمُؤْمِنُونَ ۝ وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ

ایمان والوں کو اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي

اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار اور کہا اللہ نے میں تمہارے

مَعَكُمْ وَلَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ

ساتھ ہوں اگر تم قائم رکھو گے نماز اور دیتے رہو گے زکوٰۃ اور یقین لاؤ گے

بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا

میرے رسولوں پر اور مدد کرو گے ان کی اور قرض دو گے اللہ کو اچھی طرح کا قرض

لَا تُكْفِرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَا دُخِلَتْكُمْ جَنَّتٌ

تو البتہ دور کردوں گا میں تم سے گناہ تمہارے اور داخل کردوں گا تم کو باغوں میں

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ

کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں پھر جو کوئی کافر ہوا تم میں سے

مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ①

اس کے بعد تو وہ بیشک گمراہ ہوا سیدھے راستے سے ۔

خلاصہ تفسیر

(از بیان القرآن)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ ایک قوم (یعنی کفار قریش) ابتداء میں اسلام میں جب کہ مسلمان ضعیف تھے، اس فکر میں تھے کہ تم پر (اس طرح) دست درازی کریں کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابو تم پر (اس قدر) نہ چلنے دیا (اور آخر میں تم کو غالب کر دیا۔ پس اس نعمت کو یاد کرو) اور (احکام کے امتثال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس نعمت کا یہ شکریہ ہے) اور (آئندہ بھی) اہل ایمان کو حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ (جس نے پہلے تمہارے سب کام بنائے ہیں) آئندہ بھی آخرت تک امید رکھو اللہ میں خوف دلایا اور امر بالئوکل میں امید اور یہی دو عمل معین امتثال ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے (حضرت موسیٰ کے واسطے سے) بنی اسرائیل سے (بھی) عہد لیا تھا (جس کا بیان عنقریب آتا ہے) اور (ان عہود کی تاکید کے لئے) ہم نے ان میں سے (موافق عدد ان کے قبائل کے) بارہ سردار مقرر کئے (کہ ہر سر قبیلہ پر ایک ایک سردار رہے جو اپنے ماتحتوں پر ہمیشہ ایفا عہود کی تاکید رکھے) اور (مزید تاکید عہد کے لئے ان سے) اللہ تعالیٰ نے یوں (بھی) فرما دیا کہ میں تمہارے پاس ہوں (تمہارے برے بھلے کی سب مجھ کو خبر رہے گی) مطلب یہ ہے کہ عہد لیا پھر اس کی تاکید در تاکید فرمائی اور اس عہد کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ (اگر تم نماز کی پابندی رکھو گے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے اور میرے سب رسولوں پر (جو آئندہ بھی نئے نئے آتے رہیں گے) ایمان لاتے رہو گے اور (دشمنوں کے مقابلہ میں) ان کی مدد

مدد کرتے رہو گے اور (علاوہ زکوٰۃ کے اور مصارف خیر میں بھی صرف کر کے) اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ) قرض دیتے رہو گے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کر دوں گا اور ضرورت تم کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے کو نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اس (عہد و پیمان لینے) کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بے شک راہِ راست سے دور ہوا پڑے گا۔

معارف و مسائل

سورہ مائدہ کی ساتویں آیت جو پہلے گزر چکی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد و میثاق لینے اور ان کے ماننے اور تسلیم کر لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ **وَ اذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَ مِثْقَاتُہُ الّٰذِیْ وَ اَتَقَّکُمْ بَیْہٖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا وَ اَتَقَّوْا اللّٰہَ** یہ میثاق خدا و رسول کی اطاعت اور احکام شرعیہ کے اتباع کا میثاق ہے جس کا اصطلاحی عنوان کلمہ **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ** ہے۔ اور ہر کلمہ کو مسلمان اس میثاق کا پابند ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں میثاق کی بعض اہم دفعات یعنی خاص خاص احکام شرعیہ کا بیان فرمایا ہے جس میں دوست دشمن سب کے لئے عدل و انصاف کے قیام کی اور اقتدار پانے کے بعد دشمنوں سے جذبہ انتقام کے بجائے انصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ میثاق خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا انعام ہے، اسی لئے اُس کو **اِذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ** سے شروع کیا گیا ہے۔

آیت مذکورہ کو پھر اسی جملہ **اِذْکُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ** سے شروع کر کے یہ بتلانا منظور ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اس عہد و میثاق کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا و آخرت میں قوت و بلندی اور درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور دشمنوں کے ہر مقابلہ میں انکی امداد فرمائی۔ دشمنوں کا قابو ان پر نہ چلنے دیا۔

اس آیت میں خاص طور پر اس کا ذکر ہے کہ دشمنوں نے بارہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مٹا دینے اور قتل و غارت کر دینے کے منصوبے بنائے، اور تیاریاں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو خائب و خاسر کر دیا۔ ارشاد ہے کہ "ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے۔"

مجموعی حیثیت سے تو ایسے واقعات تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں کہ کفار کے منصوبے بفضل خداوندی سے خاک میں مل گئے۔ لیکن بعض خاص خاص اہم واقعات بھی ہیں جن کو حضرات مفسرین نے اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ مثلاً مسند عبد الرزاق میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کسی جہاد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے صحابہ کرام مختلف حصتوں میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے لگے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ اور اپنے ہتھیار ایک درخت پر لٹکا دیئے۔ دشمنوں میں سے ایک گاؤں والا موقع غنیمت جان کر چھپتا اور آتے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر قبضہ کر لیا۔ اور آپؐ وہ تلوار کھینچ کر بولا مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي أَبْتَلَايَ کہ آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے دھڑک فرمایا کہ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ گاؤں والے نے پھر وہی کلمہ دہرایا۔ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي آپؐ نے پھر اسی بے فکری کے ساتھ فرمایا اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ دو تین مرتبہ اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ غیبی قدرت کے رعب نے اس کو مجبور کر کے تلوار کو میان میں داخل کر کے رکھ دیا۔ اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بلایا اور یہ واقعہ سنایا۔ یہ گاؤں والا ابھی تک آپؐ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، آپؐ نے اس کو کچھ نہیں کہا۔ (ابن کثیر)

اسی طرح بعض صحابہ رضہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نے ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں بلا کر قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس کی اطلاع کر دی اور ان کی ساری سازش خاک میں مل گئی (ابن کثیر) اور حضرت مجاہد، عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ کے لئے یہودی بنی تفسیر کے پاس تشریف لے گئے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں مشغول کیا اور دوسری طرف عمرو بن حبش کو اس کام پر مقرر کر دیا کہ دیوار کے پیچھے سے اوپر چڑھ کر پتھر کی ایک چٹان آپؐ کے اوپر ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ارادہ پر مطلع فرمایا اور آپؐ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ (ابن کثیر)

ان واقعات میں کوئی تضاد نہیں، سب کے سب آیت مذکورہ کا مصداق ہو سکتے ہیں۔ آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی غیبی حفاظت کا ذکر کرنے

کے بعد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ**۔

اس میں ایک ارشاد تو یہ ہے کہ یہ انعام خداوندی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس نصرت و امداد اور غیبی حفاظت کا اصلی سبب تقویٰ اور توکل ہے۔ جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو وصفوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی ایسی ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت و حمایت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے ۷

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو

اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کو آیات سابقہ کے مجموعہ کے ساتھ لگایا جائے۔ جن میں بدر میں دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کے احکام دئے گئے ہیں تو پھر اس جملہ میں اس طرف اشارہ ہوگا کہ ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کی تعلیم بظاہر ایک سیاسی غلطی اور دشمنوں کو جرات و ہمت دلانے کے مرادف ہے، اس لئے اس جملہ میں مسلمانوں کو اس پر متنبہ کیا گیا کہ اگر تم تقویٰ شعار اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے رہو تو یہ رواداری اور حسن سلوک تمہارے لئے قطعاً مضر نہیں ہوگا، اور دشمنوں کو مخالفت کی جرات کے بجائے تمہارے زیر اثر لانے اور اسلام سے قریب کرنے کا سبب بنے گا۔ نیز تقویٰ اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کر سکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوفِ خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آج کل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے، اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے وہاں بھی آخر آیت میں **وَاتَّقُوا اللَّهَ**۔ فرمایا گیا تھا۔ اور یہاں پھر اس کا اعادہ کیا گیا، نیز اس پوری آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی نفع و نصرت صرف ظاہری ساز و سامان کی مرہون منت نہیں ہے، بلکہ ان کی اصل طاقت کا راز تقویٰ اور توکل میں مضمر ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں سے عہد و میثاق لینے اور ان کے ایفاء عہد پر دنیا و آخرت میں اس کے بیش بہا نتائج کا ذکر کرنے کے بعد معاملہ کا دوسرا رخ سامنے لانے کے لئے دوسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ عہد و میثاق لینا صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ان سے پہلے دوسری امتوں سے بھی اسی قسم کے میثاق لئے گئے تھے۔ مگر وہ اپنے عہد و میثاق میں پورے نہ اترے۔ اس لئے ان پر طرح طرح کے عذاب مسلط کئے گئے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی ایک عہد لیا تھا۔ اور ان سے عہد لینے کی یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ پوری قوم بنی اسرائیل جو بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی انھیں سے ہر خاندان سے

ایک سردار چنا گیا، اور ہر خاندان کی طرف سے اس کے ہر سردار نے ذمہ داری اٹھائی کہ میں اور میرا پورا خاندان اس میثاق الہی کی پابندی کرے گا۔ اس طرح ان بارہ سرداروں نے پوری قوم بنی اسرائیل کی ذمہ داری لے لی۔ ان کے ذمہ یہ تھا کہ خود بھی اس میثاق کی پابندی کریں۔ اور اپنے خاندان سے بھی کرائیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عزت و فضیلت کے معاملہ میں اسلام کا اصل اصول تو یہ ہے کہ

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اعلان فرما دیا ہے کہ اسلام میں عرب و عجم، کالے، گورے اور اونچی نیچی ذات، پات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اسلام میں داخل ہو گیا وہ سارے مسلمانوں کا بھائی ہو گیا۔ حسب نسب، رنگ، وطن، زبان کے امتیازات جو جاہلیت کے بت تھے ان سب کو اسلام نے توڑ ڈالا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انتظامی معاملات میں نظم قائم رکھنے کے لئے بھی حنائی خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک خاندان کے لوگ اپنے خاندان کے جانے پہچانے آدمی پر نسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ اور یہ شخص ان کی پوری نفسیات سے واقف ہو سکی بنا پر ان کے جذبات و خیالات کی زیادہ رعایت کر سکتا ہے۔ اسی حکمت عملی پر مبنی تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں سے جب عہد لیا گیا تو ہر خاندان کے ایک ایک سردار کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

اور اسی انتظامی مصلحت اور مکمل اطمینان و سکون کی رعایت اس وقت بھی کی گئی تھی جبکہ قوم بنی اسرائیل پانی نہ ہونے کی وجہ سے سخت اضطراب میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کی اور حکم خداوندی انھوں نے اپنا عصا ایک پتھر پر مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے بارہ چشمے بارہ خاندانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جاری کر دیے۔

سورۃ اعراف میں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کا اس طرح ذکر فرمایا ہے :-

وَقَطَّعْنَاهُمْ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ نَسَبًا
أُمَمًا - اَدْرَاقًا نَبَجَسَتْ مِنْهُ اِثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا

ہم نے بانٹ دیئے ان کے بارہ خاندان بارہ جماعتوں
میں۔ پھر پھوٹ نکلے پتھر سے بارہ چشمے (ہر ایک
خاندان کے لئے جدا جدا)۔

اور یہ بارہ کا عدد بھی کچھ عجیب خصوصیت اور مقبولیت رکھتا ہے۔

جس وقت انصارِ مدینہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے لئے دعوت دینے حاضر ہوئے اور آپ نے اُن سے بذریعہ بیعت معاہدہ لیا تو اس معاہدہ میں بھی انصار کے بارہ سرداروں نے ذمہ داری لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی اُن میں تین سردار قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے تھے۔ (ابن کثیر)۔

اور صحیحین میں حضرت جابر بن سمرہ رضی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کا کام اور نظام اس وقت تک چلتا رہے گا، جب تک کہ بارہ خلیفہ ان کی قیادت کریں گے۔ امام ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کے کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بارہ امام یکے بعد دیگرے مسلسل ہوں گے۔ بلکہ ان کے درمیان فاصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ چار خلفاء صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم مسلسل ہوئے اور درمیان کی کچھ مدت کے بعد پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز باجماع اُمت پانچویں خلیفہ برحق مانے گئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے معاہدہ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ خاندانوں کے بارہ سرداروں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اُن سے ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ مَعَکُمْ یعنی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے میثاق کی پابندی کی اور دوسروں سے پابندی کرائے کا غم کیا تو میری امداد و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد آیت مذکورہ میں اس میثاق کی چند اہم دفعات اور بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور ان پر عذاب الہی کا ذکر ہے۔

میثاق کی دفعات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ۔ اِنِّیْ مَعَکُمْ۔ جس میں دو باتیں بتلا دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم میثاق پر قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے، اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے، تمہارا کوئی عزادارادہ، اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں کی نیتوں اور ارادوں سے بھی واقف ہے۔ میثاق کی خلاف ورزی کر کے تم کسی طرح بھی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے بعد میثاق کی دفعات میں سے پہلے اقامت صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور پھر آدابِ زکوٰۃ کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ کے فرائض اسلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر بھی عائد تھے۔ اور دوسرے قرآنی اشارات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرائض صرف بنی اسرائیل ہی کے ساتھ مخصوص نہیں

بلکہ ہر پیغمبر اور ہر شریعت میں ہمیشہ عائد رہے ہیں۔ تیسرا نمبر میثاق میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان لائیں اور ان کے مقصد و رشد و ہدایت میں ان کی امداد کریں۔ — بنی اسرائیل میں چونکہ بہت سے رسول آئے والے تھے، اس لئے ان کو خصوصیت سے اس کی تاکید فرمائی گئی۔ اور اگرچہ ایمانیات کا درجہ عملیات، نماز، زکوٰۃ سے رتبہٴ مقدم ہے۔ مگر میثاق میں مقدم اس کو رکھا گیا جس پر بالفعل عمل کرنا تھا۔ آئے والے رسول تو بعد میں آئیں گے، ان پر ایمان لانے اور ان کی امداد کرنے کا وقوع بھی بعد میں ہونے والا تھا اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا گیا۔

چوتھا نمبر میثاق میں یہ ہے کہ۔ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (یعنی تم اللہ تعالیٰ کو قرض دو، اچھی طرح کا قرض)۔ اچھی طرح کے قرض کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو، اور اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز خرچ کرے۔ ردی اور بیکار چیزیں دے کر نہ ملے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض دینے سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ قرض کا بدلہ قانوناً و عرفاً اور اخلاقاً واجب الادا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ یقین کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں خرچ کریں کہ اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔

اور زکوٰۃ فرض کا ذکر مستقلاً کرنے کے بعد اس جگہ قرض حسن کا ذکر یہ بتلارہا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات و خیرات ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان صرف زکوٰۃ ادا کر کے ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اور مالی حقوق انسان کے ذمہ لازم ہیں۔ کسی جگہ مسجد نہیں تو تعمیر مسجد اور دینی تعلیم کے لئے حکومت متکفل نہیں ہے تو دینی تعلیم کا انتظام مسلمانوں ہی پر لازم ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ فرض عین اور یہ فرض کفایہ ہیں۔

فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے چند افراد یا کسی جماعت نے ان ضرورتوں کو پورا کر دیا تو دوسرے مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ آج کل دینی تعلیم اور اس کے مدارس جس کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں ہیں ان کو وہی لوگ جانتے ہیں، جنہوں نے اس کو دین کی اہم خدمت سمجھ کر قائم کیا ہوا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی حد تک مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے ذمہ فرض ہے۔ اور یہ جاننے کے باوجود بہت کم افراد ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور ادا کر کے والوں میں بھی بہت کم افراد ہیں جو پورا حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو خال خال پوری زکوٰۃ ادا کر کے والے بھی ہیں تو وہ بالکل یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اب ہمارے ذمہ اور کچھ نہیں۔ ان کے سامنے مسجد کی ضرورت آئے تو زکوٰۃ

کا مال پیش کرتے ہیں، اور دینی مدارس کی ضرورت پیش آئے تو صرف زکوٰۃ کا مال دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ فرائض زکوٰۃ کے علاوہ مسلمانوں پر عائد ہیں اور قرآن کریم کی اس آیت اور اس کی امثال بہت سی آیات نے اس کو واضح کر دیا ہے۔

میتاق کی اہم دفعات بیان کرنے کے بعد بھی یہ بتلادیا کہ اگر تم نے میتاق کی پابندی کی تو اس کی جزا یہ ہوگی کہ تمہارے پچھلے گناہ بھی معاف کر دئے جائیں گے۔ اور دائمی راحت و عافیت کی ہمیشہ جنت میں رکھا جائے گا۔ اور آخر میں یہ بھی بتلادیا کہ ان تمام واضح بیانات و ارشادات کے بعد بھی اگر کسی نے کفر و سرکشی اختیار کی تو وہ ایک صاف سیدھی راہ چھوڑ کر اپنے ہاتھوں تباہی کے گڑھے میں جاگرا۔۔۔۔۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ

سو ان کے عہد توڑنے پر ہم نے ان پر لعنت کی اور کر دیا ہم نے ان کے دلوں کو

قُسِيَّةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِمْ وَنَسُوا حَظًّا

سخت پھرتے ہیں کلام کو اس کے ٹھکانے سے اور بھول گئے نفع اٹھانا

مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا

اس نصیحت سے جو ان کو کی گئی تھی اور ہمیشہ تو مطلع ہوتا رہتا ہے ان کی کسی دغا پر مگر

قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحِبُّ

تھوڑے لوگ ان میں سے سو معاف کر اور درگزر کر ان سے اللہ دوست رکھتا ہے

الْمُحْسِنِينَ ۝۱۳ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِي أَخَذْنَا

احسان کرنے والوں کو اور وہ جو کہتے ہیں اپنے کو نصاریٰ ان سے بھی

مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ

لیا تھا ہم نے عہد ان کا پھر بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو ان کو کی گئی تھی پھر ہم نے لگا دی

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ

اپس میں ان کے دشمنی اور کینہ قیامت کے دن تک اور آخر جہادے گا ان کو

اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝۱۴

اللہ جو کچھ کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

(از بیان القرآن)

(لیکن بنی اسرائیل نے عہد مذکور کو توڑ ڈالا، اور توڑنے کے بعد طرح طرح کے عفتوبات میں جیسے مسخ اور ذلت وغیرہ گرفتار ہوئے۔ پس یہ جو ان کو عنایت والطف الہیہ سے بعد ہوا) تو صرف ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت (یعنی اس کے آثار) سے دور کر دیا، (اور یہی حقیقت ہے لعنت کی) اور (اسی لعنت کے آثار سے یہ ہے کہ) ہم نے ان کے قلوب کو سخت کر دیا (کہ حقیقتات کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا اور اس سخت دلی کے آثار سے یہ ہے کہ) وہ لوگ (یعنی ان میں کے علماء) کلام (الہی یعنی توریت) کو اس کے (الفاظ یا مطالب کے) مواقع سے بدلتے ہیں (یعنی تحریف لفظی یا تحریف معنوی کرتے ہیں) اور اس تحریف کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جو کچھ ان کو (توریت میں) نصیحت کی گئی تھی اس میں سے اپنا ایک بڑا حصہ (نفع کا جو کہ ان کو عمل کرنے سے نصیب ہوتا) فوت کر بیٹھے (کیونکہ زیادہ مشق ان کی اس تحریف کے مضامین متعلق بتصدیق رسالت محمدیہ میں ہوتی تھی، اور ظاہر ہے کہ ایمان سے زیادہ بڑا حصہ کیا ہوگا۔ غرض نقص میثاق پر لعنت مرتب ہوئی اور لعنت پر قساوت وغیرہ اور قساوت پر تحریف اور تحریف پر قوت حظ عظیم اور وجہ ترتیب ظاہر ہے) اور (پھر یہ بھی تو نہیں کہ جتنا کر چکے اس پر بس کریں بلکہ حالت یہ ہے کہ) آپ کو آئے دن (یعنی ہمیشہ دین کے باب میں) کسی نہ کسی (نئی) خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے جو ان سے صادر ہوتی رہتی ہے بجز ان کے معدودے چند شخصوں کے (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) سو آپ ان کو معاف کیجئے اور ان سے درگزر کیجئے (یعنی جب تک شرعی ضرورت نہ ہو۔ ان کی خیانتوں کا اظہار اور ان کو فضیحت نہ کیجئے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوش معاملہ لوگوں سے محبت کرتا ہے (اور بلا ضرورت نصیحت نہ کرنا خوش معاملگی ہے) اور جو لوگ (نصرت دین کے دعوے سے) کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان سے بھی ان کا عہد (مثل عہد یہود کے) لیا تھا، سو وہ بھی جو کچھ ان کو (انجیل وغیرہ میں) نصیحت کی گئی تھی اس میں سے اپنا ایک بڑا حصہ (نفع کا جو کہ ان کو عمل کرنے سے نصیب ہوتا) فوت کر بیٹھے (کیونکہ وہ امر جس کو فوت کر بیٹھے توحید ہے اور ایمان ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس کا حکم ان کو بھی ہوا تھا اور اس کا حظ عظیم ہونا ظاہر ہے جب توحید کو چھوڑ بیٹھے) تو ہم ان میں باہم قیامت تک کے لئے بغض و عداوت ڈال دیا (یہ تو دنیوی عقوبت ہوئی) اور عنقریب (آخرت میں) کہ وہ بھی قریب ہی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ ان کا کیا ہوا جملہ دیں گے (پھر سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی بدبختی سے ان واضح ہدایات پر کان زد نہ کیا اور ميثاق کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیا۔

بنی اسرائیل پر ان کی عیدلی اور سرکشی کی سزائیں دو طرح کے عذاب آئے۔ ایک ظاہری اور محسوس جیسے پتھر اُڑا کر زمین کا تختہ الٹ دینا وغیرہ جن کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ دوسری قسم عذاب کی معنوی اور روحانی ہے کہ سرکشی کی سزائیں ان کے دل و دماغ سخت ہو گئے۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی۔ وہ اپنے گناہوں کے وبال میں مزید گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

ارشاد ہے:- **فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَسِيَةً**۔ یعنی ہم نے ان کی بد عہدی اور ميثاق کی خلاف ورزی کی سزائیں ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ اب ان میں کسی چیز کی گنجائش نہ رہی۔ اسی رحمت سے دوری اور دلوں کی سختی کو قرآن کریم نے سورہ مطففین میں **رَأَاتِ كَلَامَ بَلْ رَأَتْ عَلَى أَعْيُنِهَا بِهِنَّ مَا كَانُوا يُكْسِبُونَ**۔ یعنی قرآنی آیات بینات اور کھلی ہوئی نشانیوں سے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ

انسان جب اول کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، جس کی برائی کو وہ ہر وقت ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی صاف سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ لگ جائے وہ ہر وقت نظر کو تکلیف دیتا ہے۔ پھر اگر اس نے متنبہ ہو کر توبہ کر لی اور آئندہ گناہ سے باز آگیا تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے پروا نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک نقطہ سیاہ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کا صفحہ و قلب ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے قلب کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کوئی برتن اوندھا رکھا ہو کہ اس میں کوئی چیز ڈالی جائے تو فوراً باہر آجاتی ہے، اس لئے کوئی خیر اور نیکی کی بات اس کے دل میں نہیں جمتی، اس وقت اس کے دل کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ - لا یعرف معد و فاد لا ینکر منکر - یعنی اب نہ وہ کسی نیکی کو نیکی سمجھتا ہے نہ برائی کو برائی

عہ پہلے ایڈیشنوں میں یہاں عبارت یوں تھی: ”جیسے ان پر خون اور مینڈکوں وغیرہ کی بارش یا پتھر اُڑاؤ“ بعض اہل علم نے توجہ دلائی کہ خون اور مینڈکوں کا عذاب بنی اسرائیل پر نہیں آیا تھا، اس لئے یہاں سے خون اور مینڈکوں کا ذکر حذف کر دیا گیا۔ حضرت مصنف کی طرف سے احقر کو ایسے تصرفات کی اجازت تھی ۱۲ احقر محمد تقی عثمانی غفرلہ

بلکہ معاملہ برعکس ہونے لگتا ہے کہ عیب کو ہنر، بدی کو نیکی، گناہ کو ثواب سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنی طغیانی اور سرکشی میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کے گناہ کی نقد سزا ہے جو اس کو دنیا ہی میں بلجاتی ہے۔

بعض اکابر نے فرمایا ہے۔ ان من جن اء الحسنة الحسنۃ بعدھا وان من جن اء السيئة السيئة بعدھا۔ یعنی نیکی کی ایک نقد جزا یہ ہے کہ اس کے بعد اس کو دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے۔ اسی طرح گناہ کی نقد سزا یہ ہے کہ ایک گناہ کے بعد اس کا دل دوسرے گناہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ طاعات اور معاصی میں تجاذب ہے کہ سہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج

ایک نیکی دوسری نیکی کو دعوت دیتی ہے۔ اور ایک بدی دوسری بدی کو اور گناہ کو ساتھ لے آتی ہے۔

بنی اسرائیل کو عہد شکنی کی نقد سزا حسب ضابطہ ان کو یہ ملی کہ وہ رحمت خداوندی سے دور ہو گئے، جو سب سے بڑا وسیلہ نجات ہے اور ان کے دل سخت ہو گئے جس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ۔ يُحَسِّرُونَ الْكَلِمَةَ عَنْ مَوَاضِعِہَا۔ یعنی یہ لوگ کلام الہی کو اس کے ٹھکانے سے پھیر دیتے ہیں۔ یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں۔ کبھی اس کے الفاظ میں اور کبھی معنی میں، کبھی تلاوت میں۔ تحریف کی یہ سب اقسام قرآن کریم اور کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ جس کا قدرے اعتراف آجکل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اس معنوی سزا کا یہ نتیجہ ہوا کہ وَكَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ۔ یعنی نصیحت جو ان کو کی گئی تھی کہ اس سے نفع اٹھانا بھول گئے۔ اور پھر فرمایا کہ ان کی یہ سزا ایسی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَافِيَةٍ مِنْهُمْ۔ یعنی آپ ہمیشہ ان کی کسی دغا فریب پر مطلع ہوتے رہیں گے۔ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ۔ بجز تھوڑے لوگوں کے جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ جو پہلے اہل کتاب کے دین پر تھے پھر سچے مسلمان ہو گئے۔

یہاں تک بنی اسرائیل کی بد اعمالیوں اور بد اخلاقیوں کا جو بیان آیا بظاہر اس کا مقتضی یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے انتہائی نفرت اور حقارت کا معاملہ کریں، ان کو پاس نہ آنے دیں۔ اس لئے آیت کے آخری جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ۔ فَأَعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ یعنی آپ ان کو معاف کریں اور ان کی بد عملی سے درگزر کریں۔ اُن سے منافرت کی صورت نہ رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایسے حالات کے

باوجود اپنے طبعی تقاضے پر عمل نہ کریں یعنی منافرت کا برتاؤ نہ کریں۔ کیونکہ ان کی سحت دلی اور جیسی کے بعد اگرچہ کسی وعظ و نیر کا ان کے لئے مؤثر ہونا مستبعد ہے۔ لیکن رواداری اور حسن خلق کا معاملہ ایسا کیمیا ہے کہ اس کے ذریعہ ان بے حسوں میں بھی حس پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ان میں حس پیدا ہو یا نہ ہو، بہر حال اپنے اخلاق و معاملات کو درست رکھنا تو ضروری ہے، احسان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ کا اور قرب حاصل ہو ہی جائے گا۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ - اس آیت سے پہلی آیت میں یہود کی عہد شکنی اور عذاب کا ذکر تھا، اس آیت میں کچھ نصاریٰ کا حال بیان فرمایا ہے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے عیسائیوں کی عہد شکنی کی یہ سزا بیان کی ہے کہ ان کے آپس میں افتراق اور بغض و عداوت ڈال دیا گیا جو قیامت تک باہمی عداوت چلتا رہے گا۔

اس پر آج کل کے عیسائیوں کے حالات سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ تو سب باہم متحد نظر آتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حال ان لوگوں کا بیان کیا گیا ہے جو واقعی عیسائی ہیں۔ اور عیسائی مذہب کے پابند ہیں اور جو خود اپنے مذہب کو بھی چھوڑ کر دہریئے بن گئے۔ وہ درحقیقت عیسائیوں کی فہرست سے خارج ہیں چاہے وہ قومی طور پر اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوں۔ ایسے لوگوں میں اگر وہ مذہبی افتراق اور باہمی عداوت نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیونکہ افتراق و اختلاف تو مذہب کی بنیاد پر تھا، جب مذہب ہی نہ رہا تو اختلاف بھی نہ رہا اور آیت میں بیان ان لوگوں کا ہے جو مذہباً نصاریٰ و عیسائی ہیں ان کا اختلاف و افتراق مشہور و معروف ہے۔

حاشیہ بیضاوی میں تیسیر سے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ میں اصل تین فرقے تھے، ایک مسطور یہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ دوسرا یعقوبیہ جو خود عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے ساتھ متحد مانتے تھے۔ تیسرا ملکاویہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک مانتے تھے۔ اور

ظاہر ہے کہ اتنے بڑے اختلاف عقائد کے ساتھ باہم عداوت ضروری ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ

اے کتاب والو! تحقیق آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا ظاہر کرتا ہے تم پر بہت سی چیزیں

تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ

جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے اور درگزر کرتا ہے بہت سی چیزوں سے بیشک تمہارے پاس

مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ⑮ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ

آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کر نیوالی جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو

اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ

تابع ہوا اس کی رضا کا سلامتی کی راہیں اور نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے

إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ⑯

روشنی میں اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ

بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا

قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ

تو کہہ دے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہے کہ ہلاک کرے

الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا

مسیح مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو اور جتنے لوگ ہیں زمین میں سب کو

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ درمیان ان دونوں کے ہے پیدا

مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑰ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

کرتا ہے جو چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور کہتے ہیں یہود

وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ

اور نصاری ہم بیٹے ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے تو کہہ پھر کیوں عذاب کرتا

بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ

جے تم کو تمہارے گناہوں پر کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو اسکی مخلوق میں بخشنے جس کو چاہے اور

وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا

عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ

بَيْنَهُمَا ذُو إِلَهِ الْمَصِيرُ ⑱

دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) تمہارے پاس ہمارے یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں (جن کے کمال علمی کا تو یہ حال ہے کہ کتاب کے مضامین) سے جن چیزوں کو تم پھپھالیتے ہو، ان میں سے بہت سی باتوں کو (جن کے اظہار میں کوئی شرعی مصالحت ظاہراً تحصیل علوم نہ فرمانے کے باوجود خالص وحی کے ذریعہ واقف ہو کر) تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں اور (کمال علمی و اخلاقی کا یہ عالم ہے کہ جن چیزوں کو تم نے چھپا لیا تھا ان میں سے) بہت سے امور کو (جاننے اور باخبر ہونے کے باوجود اخلاقاً ان کے اظہار سے) درگزر فرماتے ہیں (جبکہ ان کے اظہار میں کوئی شرعی مصالحت نہ ہو، صرف تمہاری رسوائی ہی ہوتی ہو۔ اور یہ کمال علمی دلیل نبوت ہے اور کمال اخلاقی اس کا مؤید اور مؤکد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے معجزات کے علاوہ خود تمہارے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور اسی رسول کے ذریعہ) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے۔ اور (وہ) ایک کتاب واضح (ہے) کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں۔ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں (یعنی جنت میں جانے کے طریقے جو خاص عقائد و اعمال ہیں تعلیم فرماتے ہیں کیونکہ درحقیقت مکمل سلامتی تو جنت ہی میں ہو سکتی ہے کہ نہ اس میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ زوال کا خطرہ) اور ان کو اپنی توفیق سے (کفر و معصیت کی تاریکیوں سے نکال کر) ایمان و طاعت کے (نور کی طرف لے آتے ہیں۔ اور ان کو ہمیشہ) راہِ راست پر قائم رکھتے ہیں۔ بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ مسیح بن مریم ہے، آپ ان سے یوں پوچھتے کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم (جن کو ہم اللہ کا عین سمجھتے ہو) اور ان کی والدہ (حضرت مریم) کو اور جتنے زمین میں آباد ہیں، ان سب کو (موت سے) ہلاک کرنا چاہیں تو (کیا) کوئی شخص ایسا ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے۔ (یعنی اتنی بات تو تو تم بھی مانتے ہو کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ کی قدرت میں ہے، تو جس ذات کا ہلاک کرنا دوسرے کے قبضہ میں ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے عقیدہ الوہیت مسیح کا باطل ہو گیا۔ اور جو حقیقتہً خدا اور سب کا معبود ہے یعنی اللہ تعالیٰ (اس کی یہ شان ہے کہ ان) ہی کے لئے خاص ہے حکومت آسمانوں پر اور زمین پر اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں ان پر اور وہ جس چیز کو (جس طرح) چاہیں پیدا کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔ اور یہود و نصاریٰ (دونوں فریق) دعویٰ

کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔ (مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری ایک خصوصیت ہے کہ ہم گناہ بھی کریں تو اس پر اتنی ناراضی نہیں ہوتی جتنی دوسروں پر ہوتی ہے جیسے باپ کو اپنے بیٹے کی نافرمانی پر اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا کسی غیر آدمی کے ایسے ہی فعل پر ہوتا ہے۔ ان کے اس خیال باطل کے ابطال کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ (ان سے) پوچھئے کہ اچھا پھر تم کو تمھارے گناہوں کے عوض (آخرت میں) عذاب کیوں دیں گے۔ (جس کے تم بھی قائل ہو جیسا کہ یہود کا قول تھا لَنْ نَمَسَّنَا النَّاسُ إِلَّا أَيَاهاً مَعْدُودًا۔ یعنی اگر ہمیں عذاب جہنم ہوا بھی تو چند روز ہی ہوگا۔ اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا قول قرآن میں مذکور ہے۔ اِنَّكَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَزَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ یعنی جس شخص نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتے ہیں۔ جو بوجہ التزام کے مثل اقرار نصاریٰ کے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کے عذاب کا جب تمھیں خود بھی اقرار ہے تو یہ بتلاؤ کہ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے یا محبوب کو عذاب بھی دیا کرتا ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو خدا کی اولاد کہنا باطل ہے یہاں یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات باپ بھی اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے لئے تادیباً سزا دیتا ہے تو سزا ہونا بیٹا ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ باپ کی سزا تادیب کے لئے ہوتی ہے تاکہ وہ آئندہ ایسا کام نہ کرے۔ اور آخرت میں تادیب کا کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ وہ دارالعمل نہیں دارالجزا ہے۔ وہاں آگے کوئی کام کرنے، یا کسی کام سے روکنے کا کوئی احتمال نہیں۔ جس کو تادیب کہا جائے، اس لئے وہاں جو سزا ہوگی وہ خالص سزا اور تعذیب ہی ہو سکتی ہے۔ جو اولاد یا محبوب ہونے کے قطعاً منافی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ تمھاری کوئی خصوصیت اللہ کے یہاں نہیں۔ بلکہ تم بھی منجملہ دوسری مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے جس کو چاہیں گے سزا دیں گے اور اللہ ہی کی ہر سب حکومت آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ان میں بھی اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ (اس کے سوا کوئی پتاہ نہیں)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں نصاریٰ کے ایک ہی قول کی تردید کی گئی ہے جو ان کے ایک

فرقہ کا عقیدہ ہے یعنی یہ کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) عین اللہ تعالیٰ ہیں۔ مگر تردید جس دلیل سے کی گئی ہے، وہ تمام فرقوں کے عقائد باطلہ پر حاوی ہے جو بھی توحید کے خلاف ہیں خواہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ، مویاتین خداؤں میں سے ایک خدا ہونے کا عقیدہ قاسدہ ہو۔ اس سے سب کا رد اور ابطال ہو گیا۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ کا ذکر فرمانے میں دو حکمتیں ہو سکتی ہیں اول تو یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا حق تعالیٰ کے سامنے یہ عجز کہ وہ اپنے آپ کو اللہ سے بچا سکتے ہیں نہ اپنی ماں کو جن کی خدمت و حفاظت کو شریفیت بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں اس فرقہ کے خیال کی بھی تردید ہو گئی، جو حضرت مریم کو تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے ہیں۔

اور اس جگہ حضرت مسیح اور مریم علیہما السلام کی موت کو بطور فرض کے ذکر فرمایا ہے، حالانکہ نزول قرآن کے وقت حضرت مریم کی موت محض فرضی نہیں تھی بلکہ واقع ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ یا تو تغلیب ہے۔ یعنی اصل میں موت عیسیٰ علیہ السلام کو بطور فرض کے بیان کرنا تھا، ماں کا ذکر بھی اسی عنوان کے ضمن میں کر دیا گیا اگرچہ ان کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت مریم پر ہم موت مسلط کر چکے ہیں، حضرت مسیح اور دوسری سب مخلوق پر بھی اسی طرح مسلط کر دینا ہمارے قبضہ میں ہے۔ اور یَخْلُقُ مَا يَشَاءُ میں عیسائیوں کے اسی عقیدہ باطلہ کے منشاء کو باطل کرنا ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنانے کا اصل منشاء ان کے یہاں یہ ہے کہ ان کی پیدائش ساری دنیا کے قاعدوں کے خلاف بغیر باپ کے صرف ماں سے ہوئی ہے۔ اگر وہ بھی انسان ہوتے تو قاعدہ کے مطابق ماں اور باپ دونوں کے ذریعہ پیدائش ہوتی۔

اس جملہ میں اس کا جواب دیدیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب طرح قدرت کا ملکہ حاصل ہے، جو چاہے، جس طرح چاہے پیدا کر دے۔ جیسا کہ آیت:-

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ -

میں اسی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تخلیق عام قانون قدرت سے الگ ہونا ان کی خدائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

دیکھو حضرت آدم علیہ السلام کو تو حق تعالیٰ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرما دیا تھا۔ ان کو سب قدرت ہے وہی خالق و مالک اور لائق عبادت ہیں۔ دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں ہو سکتا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ

اے کتاب والو آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا کھولتا ہے تم پر

عَلَى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن

رسولوں کے انقطاع کے بعد کبھی تم کہتے لگو کہ ہمارے پاس نہ آیا کوئی

بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ

خوشی یا ڈر سنانے والا سو آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۹

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب تمہارے پاس یہ ہمارے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آ پہنچے جو کہ تم کو (شریعت کی باتیں) صاف صاف بتاتے ہیں۔ ایسے وقت میں کہ رسولوں (کے آنے کا) سلسلہ (مدت سے) موقوف تھا (اور شرائع سابقہ مفقود اور گم ہو چکی تھیں اور انبیاء کا سلسلہ عرصہ دراز تک بند رہنے سے اُن گم شدہ شرائع کے دوبارہ دریافت ہونے کا امکان بھی نہ رہا تھا۔ اس لئے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت شدید تھی تو ایسے وقت آپ کا تشریف لانا بڑی نعمت اور غنیمت سمجھنا چاہیے) تاکہ تم (قیامت میں) یوں نہ کہنے لگو کہ دین کے معاملہ میں غلطی اور کوتاہی میں ہم اس لئے معذور ہیں کہ ہمارے پاس (کوئی رسول جو کہ) بشیر اور نذیر (ہو جس سے ہم کو دین کا صحیح علم اور عمل پر ابھار پیدا ہوتا) نہیں آیا سو (اب اس عذر کی گنجائش نہیں رہی کیونکہ) تمہارے پاس بشیر و نذیر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آچکے ہیں (اب نہ مالو تو اپنے انجام کو خود سمجھ لو) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (کہ جب چاہیں رحمت سے اپنے انبیاء بھیج دیں جب چاہیں حکمت سے ان کو روک لیں اس لئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جب مدت دراز سے انبیاء کا سلسلہ بند ہے تو اب کوئی رسول نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ سلسلہ ایک مدت تک موقوف رکھنا حق تعالیٰ کی حکمت سے تھا، اس نے سلسلہ نبوت بند اور ختم کر دینے کا کوئی اعلان اس وقت تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ خبریں بھی دیدی تھیں کہ آخر زمانے میں ایک خاص رسول خاص شان اور خاص صفات کے ساتھ آنے والے ہیں۔ جن پر نبوت کا اختتام ہوگا۔ اس اعلان کے مطابق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔

معارف و مسائل

عَلَىٰ ذَرْبِهِ مَنِ الرُّسُلِ - فترت کے لفظی معنی سُست ہونے، ساکن ہونے اور کسی کام کو معطل اور بند کر دینے کے آتے ہیں۔ اس آیت میں ائمہ تفسیر نے فترت کے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔ اور مراد اس سے کچھ عرصہ کے لئے سلسلہ نبوت و انبیاء پر بند رہنا ہے جو حضرت عیسیٰ کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک کا زمانہ ہے۔

زمانہ فترت کی تحقیق | حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے۔ اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں کبھی فترت نہیں ہوئی۔ صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصہ میں مبعوث ہوئے۔ اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچ سو سال کا عرصہ ہے۔ اس میں سلسلہ انبیاء پر بند رہا، اسی لئے اس زمانہ کو زمانہ فترت کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی آٹھ سو سال انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع ایضاح)

حضرت موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کی مدت، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کی مدت میں اور بھی مختلف روایات ہیں جن میں اس سے کم و بیش مدتی بیان ہوئی ہیں۔ مگر اصل مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امام بخاری رحمہ نے حضرت سلمان فارسی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا۔ اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا أَوَّلُ النَّاسِ بِعِيسَى - یعنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا، لَيْسَ بَيْنَنَا نَبِيٌّ یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

اور سورۃ یس میں جو تین رسولوں کا ذکر ہے وہ درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد تھے۔ جن کو لغوی معنی کے اعتبار سے رسول کہا گیا ہے۔

اور خالد بن مسنان عربی کا جو بعض نے اس زمانہ فترت میں ہونا بیان کیا ہے اس کے متعلق تفسیر روح المعانی میں بحوالہ شہاب بیان کیا ہے کہ ان کا نہی ہونا تو صحیح ہے مگر زمانہ اُن کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے بعد میں نہیں۔

زمانہ فترت کے احکام | آیت مذکورہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ اُن کے پاس نہ کوئی رسول اور نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ اُن کے نابین پہنچے، اور نہ پچھلے انبیاء کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے علاوہ کسی غلط کاری اور گمراہی میں مبتلا ہو جاویں تو وہ معذور سمجھے جاویں گے۔ وہ مستحق عذاب نہیں ہوں گے۔ اسی لئے حضرات فقہاء کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جاویں گے یا نہیں۔

جمہور کا رجحان یہ ہے کہ امید اسی کی ہے کہ وہ بخشدیے جاویں گے جبکہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط اُن کے پاس حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہو کر موجود تھا۔ بشرطیکہ وہ توحید کے مخالفت اور شرک میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ مسئلہ تو یہ کسی نقل کا محتاج نہیں۔ وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔

ایک سوال اور جواب | یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جن اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں خطاب ہے، اُن کے لئے اگرچہ زمانہ فترت میں کوئی رسول نہیں پہنچا۔ مگر اُن کے پاس تورات اور انجیل موجود تھی۔ ان کے علماء بھی تھے تو پھر قیامت میں ان کے لئے یہ عذر کرنے کا کیا موقع تھا کہ ہمارے پاس کوئی ہدایت نہیں پہنچی تھی۔ جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک تورات و انجیل اصلی باقی نہیں رہی تھی۔ تحریفات ہو کر ان میں جھوٹے قصے کہانیاں داخل ہو گئی تھیں۔ اس لئے اُن کا وجود عدم برابر تھا۔ اور اتفاق سے کہیں کوئی اصلی نسخہ کسی کے پاس گنم جگہ میں محفوظ رہا بھی تو وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ بعض علماء ابن تیمیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ تورات و انجیل کے اصلی نسخے کہیں کہیں موجود تھے۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کمالات کی طرف اشارہ | اس آیت میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمانا کہ ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل فترت کے بعد آئے ہیں۔ اس میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تم لوگوں کو چاہیے کہ آپ کے وجود کو غنیمت کبریٰ اور بڑی نعمت سمجھیں کیونکہ مدت دراز سے یہ سلسلہ بند

تھا، اب تمہارے لئے پھر کھولا گیا ہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کا تشریف لانا ایسے زمانے اور ایسے مقام میں ہوا ہے، جہاں علم اور دین کی کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ مخلوق خدا خدا سے نہ آشنا ہو کر بت پرستی میں لگ گئی تھی۔ ایسے زمانے میں ایسی قوم کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے جاہلیت کے زمانے میں ایسی بگڑی ہوئی قوم آپ کے حوالہ ہوئی۔ آپ کے فیضِ صحبت اور نورِ نبوت سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ قوم ساری دنیا کے لئے علم، عمل، اخلاق، معاملات، معاشرت اور تمام زندگی کے شعبوں میں استاد اور قابلِ تقلید قرار دی گئی۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کی پیغمبرانہ تعلیم کا تمام انبیاء سابقین میں افضل و اعلیٰ ہونا مشاہدہ سے ثابت ہو گیا۔ جو ڈاکٹر کسی مایوس علاج مریض کا علاج کرے اور ایسی جگہ میں کرے جہاں طبی آلات اور دوائیں بھی مفقود ہوں۔ اور پھر وہ اس کے علاج میں اتنا کامیاب ہو کہ یہ لب و دم مریض نہ صرف یہ کہ تندرست ہو گیا بلکہ ایک حاذق اور ماہر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ تو اس ڈاکٹر کے کمال میں کسی کو کیا شبہ رہ سکتا ہے۔

اسی طرح طویل زمانہ فترت کے بعد جبکہ ہر طرف کفر و معصیت کی ظلمت ہی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ آپ کی تعلیمات اور تربیت نے ایسا اُجالا کر دیا کہ اس کی نظیر کسی کچھلے دور میں نظر نہیں آتی تو سارے معجزات ایک طرف، تنہا یہ معجزہ انسان کو آپ پر ایمان لانے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر

إِذْ جَعَلْ فِيكُمْ أَنْبِيََاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ

جب پیدا کئے تم میں نبی اور کر دیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں

يُؤْت أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠﴾ يُقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ

دیا تھا کسی کو جہان میں اے قوم داخل ہو زمین

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ

پاک میں جو مقرر کر دی ہے اللہ نے تمہارے واسطے اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف

أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢١﴾ قَالُوا يٰمُوسَىٰ إِنَّ

پھر جا پڑو گے نقصان میں بولے اے موسیٰ وہاں

فِيهَا قَوْمٌ مَّاجِبَارُونَ ﴿٢٢﴾ وَإِنَّا لَنُدْخِلُهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا

ایک قوم ہے زبردست اور ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے یہاں تک کہ وہ نکل جاویں

مِنْهَا ۚ فَإِن يَّخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دُخِلُونَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَجُلَانِ

اسمیں سے پھر اگر وہ نکل جاویں گے اس میں سے تو ہم ضرور داخل ہونگے کہا دو مردوں نے

مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أُنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا إِذْ دُخِلُوا عَلَيْهِمُ

اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی نوازش تھی ان دو پر گھس جاؤ ان پر حملہ کر کے

الْبَابِ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ﴿٢٤﴾ وَعَلَى اللَّهِ

دروازہ میں پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے اور اللہ یہ بھروسہ

فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا يَمُوسَىٰ إِنَّا لَن

کرو اگر یقین رکھتے ہو بولے اے موسیٰ ہم ہرگز

لَنُدْخِلُهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَإِذَا هَبَّ أَنْتَ وَرَبُّكَ

نکل جاویں گے ساری عمر جب تک وہ رہیں گے اس میں سو تو جا اور تیرا رب اور تم

فَقَاتِلَا إِنَّا هَهُنَا قَاعِدُونَ ﴿٢٦﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا

دولوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں بولا اے رب میرے میرے

أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَآخِي فَأَفْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ

اختیار میں نہیں مگر میری جان اور میرا بھائی سو جدائی کر دے تو ہم میں اور اس نافرمان قوم

الْفَاسِقِينَ ﴿٢٧﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً

میں فرمایا تحقیق وہ زمین حرام کی گئی ہے ان پر چالیس برس

يَتِيمُونَ فِي الْأَرْضِ ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٨﴾

سرمارے پھریں گے ملک میں سو تو افسوس نہ کر نافرمان لوگوں پر

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی ذکر کے قابل ہے جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم (یعنی بنی اسرائیل)

سے (اول ترغیب جہاد کی تمہید میں یہ) فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر

ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے (جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام

اور حضرت یوسف علیہ السلام اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام وغیرہم

اور کسی قوم میں پیغمبروں کا ہونا ان کا دنیوی اور دینی شرف ہے یہ تو نعمت معنوی دی (اور جسکی نعمت یہ دی کہ) تم کو صاحب ملک بنایا (چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہو چکے ہو) اور تم کو (بعض بعض) وہ چیزیں دی ہیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں (جیسا دریا میں راستہ دینا دشمن کو عجیب طور پر عرق کرنا جس کے بعد دفعۃً غایت ذلت و زحمت سے نہایت رفعت و راحت میں پہنچ گئے) یعنی اس میں تم کو خاص امتیاز دیا پھر اس تہید کے بعد اصلی مقصود کے ساتھ ان کو خطاب فرمایا کہ، اے قوم میری (ان نعمتوں اور احسانوں کا مقتضا یہ ہے کہ تم کو جو اس جہاد کے متعلق حکم خداوندی ہوا ہے اس پر آمادہ ہو اور) اس متبرک ملک (یعنی شام کے دار الحکومت) میں (جہاں یہ عمالۃ حکمران ہیں جہاد کے ارادہ سے) داخل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے (اس لئے قصد کرتے ہی فتح ہوگی) اور پیچھے (وطن کی طرف) واپس مت چلو کہ پھر بالکل خسارہ میں پڑ جاؤ گے (دنیا میں بھی کہ تو بیع ملک سے محروم رہو گے اور آخرت میں کہ ترک فریضہ جہاد سے گنہگار رہو گے) کہنے لگے اے موسیٰ وہاں تو بڑے بڑے زبردست آدمی (رہتے) ہیں۔ اور ہم تو وہاں ہرگز قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ (کسی طرح) وہاں سے نہ نکل جائیں ہاں اگر وہ وہاں سے کہیں اور چلے جاویں تو ہم بے شک جانے کو تیار ہیں (موسیٰ علیہ السلام کی تائید قول کے لئے) ان دو شخصوں نے (بھی) جو کہ (اللہ سے) ڈرنے والوں (یعنی متقیوں) میں سے تھے (اور) جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا تھا (کہ اپنے عہد پر ثابت رہے) کہ ان کم ہمتوں کو سمجھانے کے طور پر، کہا کہ تم ان پر (چڑھائی کر کے اس شہر کے) دروازہ تک تو چلو سو جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اس وقت غالب آ جاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ جلدی فتح ہو جاوے گا، خواہ رعب سے بھاگ جائیں یا قہور ایہی مقابلہ کرنا پڑے) اور اللہ پر نظر رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو (یعنی تم ان کی توفیق پر نظر مت کرو مگر ان لوگوں پر نہ فہمائش کا اصرار نہ نہیں ہوا بلکہ ان دو بزرگوں کو تو انھوں نے قابل خطاب بھی نہ سمجھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے نہایت لائے بالی پن اور گستاخی کے ساتھ) کہنے لگے کہ اے موسیٰ ہم تو (ایک بات کہہ چکے ہیں کہ ہم) ہرگز کبھی بھی وہاں قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ لوگ وہاں موجود ہیں (اگر ایسا ہی لڑنا ضرور ہے) تو آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے جائیے اور دونوں (جا کر) لڑ بھر لیجئے ہم تو یہاں سے سرکٹے نہیں (موسیٰ علیہ السلام نہایت زچ اور پریشان ہوئے اور تنگ آ کر) دعا کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار (میں کیا کروں ان پر کچھ بس نہیں چلتا) ہاں اپنی جان پر اور اپنے بھائی پر البتہ (پورا) اختیار رکھتا ہوں کہ آپ ہم دونوں (بھائیوں) کے اور اس بے حکم قوم کے درمیان (مناسب) فیصلہ فرما دیجئے (یعنی جس کی حالت کا جو مقتضا

ہودہ ہر ایک کے لئے تجویز فرما دیجئے) ارشاد ہوا (بہتر) تو ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ ملک اُن کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا (اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا راستہ ہی نہ ملے گا) یوں ہی (چالیس برس تک) زمین میں سرمار گئے پھر یہ گئے (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فیصلہ سنا جس کا گمان نہ تھا خیال یہ تھا کہ کوئی معمولی تنبیہ ہو جاوے گی تو طبعاً مغوم ہونے لگے۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ جب ان سرکشوں کے لئے ہم نے یہ تجویز کیا تو یہی مناسب ہے) سو آپ اس بے حکم قوم (کی اس حالت زار) پر (ذرا) غم نہ کیجئے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں اس میثاق کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کے بارے میں بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ان کی عام عہد شکنی، اور میثاق کی خلاف ورزی اور اس پر سزاؤں کا بیان تھا۔ ان آیات مذکورہ میں ان کی عہد شکنی کا ایک خاص واقعہ مذکور ہے۔

وہ یہ ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر غرق دریا ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات پا کر حکومت مصر کے مالک بن گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مزید انعام اور اُن کے آبائی وطن ملک شام کو بھی اُن کے قبضہ میں واپس دلانے کے لئے بذریعہ موسیٰ علیہ السلام ان کو یہ حکم دیا کہ وہ جہاد کی نیت سے ارض مقدسہ یعنی ملک شام میں داخل ہوں۔ اور ساتھ ہی اُن کو یہ خود شجری بھی سنا دی کہ اس جہاد میں فتح اُن کی ہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس زمین کو ان کے حصہ میں لکھ دیا ہے وہ ضرور اُن کو مل کر رہے گی۔ مگر بنی اسرائیل ... اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انعامات، غرق فرعون اور فتح مصر وغیرہ کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لینے کے باوجود وہاں بھی عہد میثاق پر پورے نہ اترے۔ اور جہاد شام کے اس حکم الہی کے خلاف ضد کر کے بیٹھ گئے۔ جس کی سزا اُن کو قدرت کی طرف سے اس طرح ملی کہ چالیس سال تک ایک محدود علاقہ میں محصور و مقید ہو کر رہ گئے کہ بظاہر نہ ان کے گرد کوئی حصار تھا، نہ اُن کے ہاتھ پاؤں کسی قید میں جکڑے ہوئے تھے۔ بلکہ کھلے میدان میں تھے۔ اور اپنے وطن مصر کی طرف واپس چلے جانے کے لئے ہر روز صبح سے شام تک سفر کرتے تھے۔ مگر شام کو پھر وہیں نظر آتے تھے جہاں سے صبح چلے تھے۔ اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی

وفات ہو گئی۔ اور یہ لوگ اسی طرح وادی تیرہ میں حیران و پریشان پھرتے رہے۔ ان کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے دوسرے پیغمبران کی ہدایت کے لئے بھیجے۔

چالیس برس اس طرح پورے ہونے کے بعد پھر ان کی باقی ماندہ نسل نے اس وقت کے پیغمبر کی قیادت میں جہاد شام و بیت المقدس کا عزم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ پورا ہوا کہ یہ ارض مقدس تمہارے حصہ میں لکھ دی گئی ہے۔ اور یہ اجمال ہے اس واقعہ کا جو آیات متذکرہ میں بیان ہوا ہے۔ اب اس کی تفصیل قرآنی الفاظ میں دیکھئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ ہدایت ملی کہ اپنی قوم کو بیت المقدس اور ملک شام فتح کرنے کے لئے جہاد کا حکم دیں تو انھوں نے پیغمبران حکمت و موعظت کے پیش نظر حکم سنانے سے پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کے وہ انعامات یاد دلانے جو بنی اسرائیل پر اب تک ہو چکے تھے۔ ارشاد فرمایا:-

ادْكُرُوا النِّعْمَةَ الَّتِي عَلَيَّكُمْ اِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا وَجَعَلْنَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْكُفْرِ الْوَحْشَ وَاللَّشْكُ مَا لَمْ يَكُنْ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ فضل و انعام یاد کرو جو تم پر ہوا ہے کہ تمہاری قوم میں بہت سے انبیاء بھیجے اور تم کو صاحب ملک بنادیا اور تمہیں وہ نعمتیں بخشیں جو دنیا جہان میں کسی کو نہیں ملیں۔

اس میں تین نعمتوں کا بیان ہے جن میں سے پہلی نعمت ایک روحانی اور معنوی نعمت ہے کہ ان کی قوم میں مسلسل انبیاء بکثرت بھیجے گئے جس سے بڑھ کر آخری اور معنوی اعزاز کوئی نہیں ہو سکتا۔ تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ کسی قوم اور کسی امت میں انبیاء کی کثرت اتنی نہیں ہوتی کہ جتنی بنی اسرائیل میں ہوتی ہے۔

امام حدیث ابن ابی حاتم نے بروایت اعمش نقل کیا ہے کہ قوم بنی اسرائیل کے آخری دور میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہے۔ صرف اس دور میں ایک ہزار انبیاء بنی اسرائیل میں بھیجے گئے۔ دوسری نعمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، وہ بیوی اور ظاہری نعمت ہے کہ ان کو ملوک یعنی صاحب ملک و سلطنت بنادیا گیا۔ اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل جو مدت سے فرعون اور قوم فرعون کے غلام بنے ہوئے دن رات ان کے مظالم کا شکار رہتے تھے، آج اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو نیست و نابود کر کے ان کو ان کی حکومت و سلطنت کا مالک بنادیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انبیاء کے معاملہ میں تو ارشاد ہوا کہ جَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا یعنی تمہاری قوم میں سے بہت سے لوگوں کو انبیاء بنادیا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ پوری قوم انبیاء نہیں تھی۔ اور یہی حقیقت بھی ہے کہ انبیاء معدودے چند ہوتے ہیں

اور پوری قوم اُن کی اُمت اور متبع ہوتی ہیں۔ اور جہاں دنیا کے ملک و سلطنت کا ذکر آیا تو وہاں منرمایا۔ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا۔ یعنی بنا دیا تم کو ملوک جس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ تم سب کو ملوک بنا دیا۔ لفظ ملوک ملک کی جمع ہے۔ جس کے معنی عرف عام میں بادشاہ کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پوری قوم نبی اور پیغمبر نہیں ہوتی، اسی طرح کسی ملک میں پوری قوم بادشاہ بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ قوم کا ایک فرد یا چند افراد حکمران ہوتے ہیں۔ باقی قوم اُن کے تابع ہوتی ہے۔ لیکن قرآنی الفاظ نے ان سب کو ملوک قرار دیا۔

اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جو بیان القرآن میں بعض اکابر کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے کہ عرف عام میں جس قوم کا بادشاہ ہوتا ہے اس کی سلطنت و حکومت کو اسی پوری قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسے اسلام کے قرون وسطیٰ میں بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت کہلاتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں غزنوی اور غوریوں کی حکومت پھر مغلوں کی حکومت پھر انگریزوں کی حکومت پوری قوم کے افراد کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ اس لئے جس قوم کا ایک حکمران ہو وہ پوری قوم حکمران اور بادشاہ کہلاتی ہے۔

اس محاورہ کے مطابق پوری قوم بنی اسرائیل کو قرآن کریم نے ملوک قرار دیا۔ اِسْمِیْن اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت درحقیقت عوامی حکومت ہوتی ہے۔ عوام ہی کو اپنا امیر و امام منتخب کرنے کا حق ہوتا ہے اور عوام ہی اپنی اجتماعی رائے سے اس کو مَعزُوزِل بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے صریحاً اگرچہ فرد واحد حکمران ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ حکومت عوام ہی کی ہوتی ہے۔

دوسری وجہ وہ ہے جو ابن کثیر اور تفسیر منظرہ وغیرہ میں بعض سلف سے نقل کی ہیں کہ لفظ ملک بادشاہ کے مفہوم سے زیادہ عام ہے۔ ایسے شخص کو ملک کہ دیا جاتا ہے۔ جو آسودہ حال ہو، مکان، جائیداد، نوکر چاکر رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس وقت بنی اسرائیل سے ہر فرد ملک کا مہدوق تھا۔ اس لئے ان سب کو ملوک فرمایا گیا۔

تیسری نعمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ وہ معنوی اور ظاہری دونوں قسم کی نعمتوں کا مجموعہ ہے کہ فرمایا۔ وَ اَنْتُمْ مَّا لَمْ تَوْفِقُوْا اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی تم کو وہ نعمتیں عطا فرمائیں جو دنیا جہاں میں کسی کو نہیں دی گئیں ان نعمتوں میں معنوی ثمرات اور نبوت و رسالت بھی داخل ہے اور ظاہری حکومت و سلطنت اور مال و دولت بھی البتہ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ انھیں قرآن اُمت محمدیہ ساری امتوں سے افضل ہے۔

ارشاد قرآنی۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور كُنَّا لَكُمْ

اُمۃً وَسَطًا۔ اس پر شاہد ہے اور حدیث نبوی کی بے شمار روایات اس کی تائید میں ہیں۔ جواب یہ کہ اس آیت میں دنیا کے ان لوگوں کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کے موسوی عہد میں موجود تھے۔ کہ اس وقت پورے عالم میں کسی کو وہ نعمتیں نہیں دی گئی تھیں جو بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آئندہ زمانہ میں کسی امت کو ان سے بھی زیادہ نعمتیں مل جائیں یہ اس کے منافی نہیں۔

اس پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو قول نقل فرمایا گیا ہے۔ یہ تہید تھی اس حکم کے بیان کرنے کی جو اگلی آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ يَقُولُ اِذَا خَلَقْتُ الْاَرْضَ حَتَّىٰ اَلْمَقْدَاسَةِ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ یعنی اے میری قوم تم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ رکھی ہے۔

ارض مقدسہ سے کونسی زمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے اقوال بظاہر متعارض ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ بیت المقدس مراد ہے۔ بعض نے شہر قدس اور ایلیا کو ارض مقدسہ کا مصداق بتلایا ہے۔

بعض نے شہر اریحا کو جو نہاردن اور بیت المقدس کے درمیان دنیا کا قدیم ترین شہر تھا اور آج تک موجود ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی عظمت و وسعت کے عجیب و غریب حالات نقل کئے جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ اس شہر کے ایک ہزار حصے (وارڈ) تھے۔ ہر حصہ میں ایک ایک ہزار باغ تھے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ارض مقدسہ سے مراد دمشق، فلسطین اور بعض کے نزدیک اردن ہے۔ اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ کعب احباب نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی کتاب (غالباً توراۃ) میں دیکھا ہے کہ ملک شام پوری زمین میں اللہ کا خاص خزانہ ہے۔ اور اس میں اللہ کے مخصوص مقبول بندے ہیں۔ اس زمین کو مقدس اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔ یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں۔ اور صفات بات یہ ہے کہ ان اقوال میں تعارض کچھ نہیں۔ پورا ملک شام آخری روایات کے مطابق ارض مقدس ہے۔ بیان کرنے میں بعض حضرات نے ملک شام کے کسی حصہ کو بیان کر دیا۔ کسی نے پورے کو۔

قَالُوا يٰمُوسٰی۔ اس سے پہلے آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بذریعہ موسیٰ علیہ السلام

قوم عمالقہ سے جہاد کر کے ملک شام فتح کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ ملک شام کی زمین اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے لکھ دی ہے۔ اس لئے ان کی فتح یقینی ہے۔

اس آیت متذکرہ میں اس کا بیان ہے کہ اس کے باوجود بنی اسرائیل نے اپنی معرکہ کشمی اور کج طبعی کی وجہ سے اس حکم کو بھی تسلیم نہ کیا۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ اس ملک پر تو بڑے زبردست قوی لوگوں کا قبضہ ہے۔ ہم تو اس زمین میں اس وقت تک داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں قابض ہیں۔ ہاں وہ کہیں اور چلے جاویں تو بیشک ہم وہاں جاسکتے ہیں۔

واقعہ اس کا جو ائمہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور علی بن ابی طلحہ وغیرہ سے منقول ہے یہ ہے کہ اس وقت ملک شام اور بیت المقدس پر قوم عمالقہ کا قبضہ تھا جو قوم عاد کی کوئی شاخ اور بڑے ذلیل ڈول اور ہیبتناک قد و قامت کے لوگ تھے، جن سے جہاد کر کے بیت المقدس فتح کرنے کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ملا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے اپنی قوم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر ملک شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جانا بیت المقدس پر تھا۔ جب نہرا اردن سے پار ہو کر دنیا کے قدیم ترین شہر ارتجا پر پہنچے، تو یہاں قیام فرمایا۔ اور بنی اسرائیل کے انتظام کیلئے بارہ سرداروں کا انتخاب کرنا قرآن کریم کی کچھلی آیات میں بیان ہو چکا ہے۔ ان سرداروں کو آگے بھیجا تاکہ وہ ان لوگوں کے حالات اور محاذ جنگ کی کیفیات معلوم کر کے آئیں جو بیت المقدس پر قابض ہیں اور جن سے جہاد کرنے کا حکم ملا ہے۔ یہ حضرات بیت المقدس پہنچے تو شہر سے باہر ہی قوم عمالقہ کا کوئی آدمی مل گیا۔ اور وہ اکیلا ان سب کو گرفتار کر کے لے گیا۔ اور اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کیا کہ یہ لوگ ہم سے جنگ کرنے کے قصد سے آئے ہیں۔ شاہی دربار میں مشورہ ہوا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے یا کوئی دوسری سزا دی جائے۔ بالآخر رائے اس پر ٹھہری کہ ان کو آزاد کر دیں تاکہ یہ اپنی قوم میں جا کر عمالقہ کی قوت و شوکت کے ایسے عینی گواہ ثابت ہوں کہ کبھی ان کی طرف رنج کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

اس موقع پر اکثر کتب تفسیر میں اسرائیلی روایات کی لمبی چوڑی کہانیاں درج ہیں جن میں اس ملنے والے شخص کا نام عوج بن عنق بتلایا ہے۔ اور اس کی بے پناہ قد و قامت اور قوت و طاقت کو ایسی مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کسی سمجھدار آدمی کو اس کا نقل کرنا بھی بھاری ہے۔

امام تفسیر ابن کثیر نے فرمایا کہ عوج بن عنق کے جو قصے ان اسرائیلی روایات میں

مذکور ہیں نہ عقل ان کو قبول کر سکتی ہے اور نہ شرع میں ان کا کوئی جواز ہے۔ بلکہ یہ سب کذب و افترا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قوم عمالقہ کے لوگ چونکہ قوم عاد کے یقایا ہیں۔ جن کے ہیبتناک قد و قامت کا خود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے۔ اس قوم کا ڈیل ڈول اور قوت و طاقت ضرب المثل تھی۔ ان میں کا ایک آدمی قوم بنی اسرائیل کے بارہ آدمیوں کے گرفتار کر کے لے جانے پر قادر ہو گیا۔

بہر حال بنی اسرائیل کے بارہ سردار عمالقہ کی قید سے رہا ہو کر اپنی قوم کے پاس مقام اریحسا پر پہنچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عجیب و غریب قوم اور اس کی ناقابل قیاس قوت و شوکت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر تو ان سب باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فتح و کامیابی کی بشارت سنا دی تھی۔ بقول اکبرؑ

مجھ کو بے دل کر دے ایسا کون ہے

یا دمجھ کو آتش اُکا اُکھلوی ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ان کی قوت و شوکت کا حال سن کر اپنی جگہ کوہ استقامت بنے ہوئے اقدام جہاد کی فکر میں لگے رہے۔ مگر خطرہ یہ ہو گیا کہ بنی اسرائیل کو اگر حریت مقابل کی اس بے پناہ طاقت کا علم ہو گیا تو یہ لوگ پھسل جائیں گے۔ اس لئے ان بارہ سرداروں کو ہدایت فرمائی کہ قوم عمالقہ کے یہ حالات بنی اسرائیل کو ہرگز نہ بتائیں، بلکہ راز رکھیں۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دوستوں سے خفیہ طور پر اس کا تذکرہ کر دیا۔ صرف دو آدمی جن میں سے ایک کا نام یوشع بن نون اور دوسرے کا کالب بن یوئنا تھا۔ انھوں نے موسیٰ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

اور ظاہر ہے کہ بارہ میں سے جب دس نے راز فاش کر دیا، تو اس کا پھیل جانا قدرتی امر تھا۔ بنی اسرائیل میں جب ان حالات کی خبریں شائع ہونے لگیں تو لگے رونے، پیٹنے اور کہنے لگے کہ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ قوم فرعون کی طرح ہم بھی غرق دریا ہو جاتے۔ وہاں سے بچا لاکر ہمیں یہاں مروایا جا رہا ہے۔ انھیں حالات میں بنی اسرائیل نے یہ الفاظ کہے،

يٰۤمُوسٰى اِنَّ فِیْہَا قَوْمًا جَبَّارِیْنٌ وَاِنَّا لَنَدْخُلُہَا حٰثِیْنَ یَخْرُجُوْا مِنْہَا۔ یعنی اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑی زبردست قوم آباد ہے جن کا مقابلہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب تک وہ لوگ آباد ہیں موجود ہیں ہم وہاں جانے کا نام نہ لیں گے۔ اگلی آیت میں ہے کہ دو

شخص جو ڈرنے والے تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا تھا انھوں نے بنی اسرائیل کی یہ گفتگو سُن کر بطور نصیحت ان کو کہا کہ تم پہلے ہی کیوں ڈرے مرتے ہو، ذرا قدم اٹھا کر شہر بیت المقدس کے دروازہ تک تو چلو۔ ہمیں یقین ہے کہ تمھارا آتنا ہی عمل تمھاری فتح کا سبب بن جائے گا۔ اور دروازہ بیت المقدس میں داخل ہوتے ہی تم غالب ہو جاؤ گے۔ اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ یہ دو شخص جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک وہ ہی بارہ میں سے دوسرے ہیں جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر عمالقتہ کا پورا حال بنی اسرائیل کو بتایا تھا۔ یعنی یوشع بن نون، اور کالب بن یو قنا۔

قرآن کریم نے اس جگہ ان دونوں بزرگوں کی دو صفتیں خاص طور پر ذکر فرمائی ہیں۔ ایک الَّذِينَ يَخَافُونَ۔ یعنی یہ لوگ جو ڈرتے ہیں۔ اس میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس سے ڈرتے ہیں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ڈرنے کے لائق سارے عالم میں صرف ایک ہی ذات ہے۔ یعنی اللہ جل شانہ کیونکہ ساری کائنات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کی مشیت و اذن کے بغیر کوئی نہ کسی کو ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے۔ نہ ادنیٰ نقصان اور حیب ڈرتے کے لائق ایک ہی ذات ہے اور وہ متعین ہے تو پھر اس کے تعین کی ضرورت نہ رہی۔

دوسری صفت ان بزرگوں کی قرآن کریم نے یہ بتلائی کہ الْعَمَّ اللَّهُ عَلَيْهِمَا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص میں جہاں کوئی خوبی اور بھلائی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا انعام و عطا ہے۔ ورنہ ان بارہ سرداروں میں تو ایسا ظاہرہ باطنہ، پاؤں، آنکھ، کان اور قوائے ظاہرہ و باطنہ اور عقل و ہوش اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت و معیت یہ ساری ہی چیزیں سمجھی کو چاہل تھیں۔ اس کے باوجود اور سب بھیل گئے اور یہی دواپنی جگہ جسے رہے تو معلوم ہوا کہ اصل ہدایت انسان کے قولئے ظاہرہ و باطنہ اس کی سعی و عمل کے تابع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ البتہ اس انعام کے لئے سعی و عمل شرط ضروری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عقل و ہوش اور دانائی و ہوشیاری عطا فرمائی ہو وہ اپنی ان طاقتوں پر ناز نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے رشد و ہدایت طلب کرے معارف رومی نے خوب فرمایا ہے

ہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

غلامہ کلام یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنی برادری کو یہ نصیحت فرمائی کہ عمالقہ کی ظاہری قوت و شوکت سے نہ گھبرائیں۔ اللہ پر توکل کر کے بیت المقدس کے دروازہ تک چلے چلیں تو فتح اور غلبہ ان کا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ فیصلہ کہ دروازہ تک پہنچنے کے بعد ان کو غلبہ ضرور حاصل ہو جائے گا اور دشمن شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عمالقہ کے جائزہ لیے کی بنا پر ہو کہ وہ لوگ بڑے ڈیل ڈول اور طاقت و قوت کے باوجود دل کے کچے ہیں۔ جب حملہ کی خبر پائی گئی تو کھڑے نہ سکیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرمان الہی جو بطور بشارت فتح موسیٰ علیہ السلام سے سُن چکے تھے۔ اس پر یقین کامل ہونے کی وجہ سے یہ فرمایا ہو۔

مگر بنی اسرائیل نے جب اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی بات نہ سُنی تو ان دونوں بزرگوں کی کیا مٹنے۔ پھر وہی جواب اور نہ زیادہ بھونڈے انداز سے دیا کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں ہی جا کر ان سے مقابلہ کر لیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ اگر استہزاء کے طور پر ہوتا تو صحیح کفر تھا۔ اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے ساتھ رہنا۔ ان کے لئے میدان تہیہ میں دعائیں کرنا۔ جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ اس کا امکان نہ تھا۔

اس لئے ائمہ مفسرین نے اس کلمہ کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ آپ جائے اور ان سے مقابلہ کیجئے۔ آپ کا رب آپ کی مدد کرے گا۔ ہم تو مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ کفر کی حد سے نکل گیا۔ اگرچہ یہ جواب نہایت بھونڈا اور دل آزار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا۔

غزوہ تبوک میں نہتے اور بھوکے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک ہزار مسلح فوجیوں کا لشکر اکھڑا ہوا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر اپنے رب سے دعائیں فرمانے لگے۔ تو حضرت مقداد بن اسود صحابی آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ہے ہم ہرگز وہ بات نہ کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ کہ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں اور بائیں سے اور سامنے سے اور پیچھے سے مدافعت کریں گے۔ آپ بے شک ہو کر مقابلہ کی طیاری فرمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر بے حد مسرور ہوئے۔ اور صحابہ کرام میں بھی جوش جہاد کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مقداد

بن اسود کے اس کارنامہ پر مجھے بڑا رشک ہے۔ کاش یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایسے نازک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب دے کر اپنے سب عہد و میثاق توڑ ڈالے۔

قَالَ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ
لَكَ إِلَهٌ إِلَّا أَنَا

قوم کی انتہائی بے وفائی
اور حضرت موسیٰ علیہ السلام
کا انتہائی سوز و غم و استقلال

قوم بنی اسرائیل کے سابقہ حالات و واقعات اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملات کا جائزہ لینے والا اگر سرسری طور پر بھی اس کو سامنے رکھے کہ جو قوم بنی اسرائیل

صدیوں سے فرعون کی غلامی میں طرح طرح کی ذلتیں اور عذاب برداشت کر رہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی برکت سے ان کو خدائے عز و جل نے کہاں سے کہاں پہنچایا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے کیسے کیسے مظاہر

آئے۔ فرعون اور قوم فرعون کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ہاتھوں اپنے قائم کئے

ہوئے دربار میں شکست فاش ہوئی۔ جن ساحروں پر ان کا بھروسہ تھا۔ وہی اب حضرت

موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا دم بھرنے لگے۔ پھر اس خدائی

کا دعویٰ کرنے والا فرعون اور شاہی محلات میں بسنے والے آل فرعون سے خدائے عز و جل

کی قدرت قاہرہ نے کس طرح تمام محلات و مکانات اور ان کے ساز و سامان کو بیک وقت

خالی کرالیا۔ اور کس طرح بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے اسے غرق دریا کر دیا۔ اور کس طرح

معجزانہ طور پر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔ اور کس طرح وہ دولت جس پر فرعون یہ کہہ کر

فخر کیا کرتا تھا۔ اَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِّمَّا وَهَبَ لِي الْاَلَهُةُ تَجْعَلُنِي مِنْ مَّحْسِنِي۔ اللہ تعالیٰ نے

پورا ملک اور اس کی پوری ملک بغیر کسی قتل و قتال کے بنی اسرائیل کو عطا فرمادی۔

ان تمام واقعات میں اللہ جل شانہ کی قدرت قاہرہ کے مظاہر اس قوم کے سامنے آئے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قوم کو اول غفلت و جہالت سے پھر فرعون کی غلامی سے

نجات دلانے میں کیا کیا زور فرمایا سب برداشت کیں، ان سب چیزوں کے بعد جب اسی قوم

کو خدائی امداد و الغامات کے وعدوں کے ساتھ ملک شام پر جہاد کرنے کا حکم ملا تو ان لوگوں

اپنی اس دنارت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هَاهُنَا

قَاعِدٌ وَرَجَا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کہ ان حالات اور اس کے

بعد قوم کی ان حرکات کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ مگر یہاں تو اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسول ہیں،

کہ کوہ استقامت بنے ہوئے اپنی دھن میں لگے ہیں۔

قوم کی مسلسل عہد شکنی اور وعدہ فراموشی سے عاجز آکر اپنے رب کے سامنے صرف اتنا عرض کرتے ہیں۔ اِنِّیْ لَا اَمْلِکُ اِلَّا لَفْسِیْ وَآخِیْ۔ یعنی مجھے تو اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔ قوم عمالقہ پر جہاد کی مہم کو کس طرح سر کیا جائے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے قوم بنی اسرائیل میں سے کم از کم دو سردار یوشع بن نون اور کالیب بن یوفنا جھوٹے پوری طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا ثبوت دیا تھا اور قوم کو سمجھانے اور صحیح راستہ پر لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسلسل کوشش کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا بھی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ صرف اپنا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا۔ اس کا سبب وہی قوم بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی تھی کہ صرف حضرت ہارون علیہ السلام بوجہ نبی و پیغمبر ہونے کے معصوم تھے۔ اور ان کا طریق حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ باقی یہ دونوں سردار معصوم بھی نہ تھے۔ اس انتہائی ستم و غصہ کے عالم میں صرف اس کا ذکر کیا جس کا حق پر قائم رہنا یقینی تھا۔ اس اظہار کے ساتھ کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی فَادْفَنْ بِیْنَنَا وَبَیْنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ یعنی ہم دونوں اور ہماری قوم کے درمیان آپ ہی فیصلہ فرما دیجئے۔ اس دعا کا حاصل حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق یہ تھا کہ یہ لوگ جس سزا کے مستحق ہیں ان کو وہ سزا دی جائے اور ہم دونوں جس صورت حال کے مستحق ہیں ہم کو وہ عطا فرمایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ فَاِتَّخٰهُم مَّحَرَّمًا عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنِ سَنَةً طَبَعَتْ بِیْہُمْ اَرْضُیْنِ۔ یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام قرار دی گئی۔ اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جاسکیں گے۔ اور پھر یہ نہیں کہ ملک شام نہ جاسکیں گے۔ بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جاسکیں گے بلکہ اس میدان میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدائے عزوجل کی سزاؤں کے لئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں مشروط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے۔ بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و مکان اس کے لئے جیل بن جاتے ہیں۔

خاک و بار و آب و آتش بندہ اند : بامن تو مردہ با حق زندہ اند

چنانچہ یہ مختصر سامیدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہو، جس کی پیمائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیس فسخ لمبائی اور نو فسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہو جاتا ہے، اور بعض روایات کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل کے بیان کے موافق چھ لاکھ نفوس تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کر دیا کہ چالیس سال مسلسل اس تنگ دود میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں، یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پر پہنچ جائیں، مگر ہوتا یہ تھا کہ سالے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھر اگر وہ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں سے صبح چلے تھے۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ کسی قوم کو جو سزا دیتے ہیں وہ ان کے اعمال بد کی مناسبت سے ہوتی ہے، اس نافرمان قوم نے چونکہ یہ کلمہ بولا تھا کہ إِنَّا هُمْ نَأْتِي عِدُونَ یعنی ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انکو اس سزا میں چالیس سال تک کے لئے دہیں قید کر دیا، تاریخی روایات اس میں مختلف ہیں، کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی موجودہ نسل جس نے نافرمانی کی تھی، سبھی فنا ہو گئے، اور ان کی اگلی نسل باقی رہ گئی، جو اس چالیس سالہ قید سے نجات پانے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئی، یا ان میں سے بھی کچھ لوگ باقی تھے، بہر حال تشرآن کریم نے ایک تو یہ وعدہ کیا تھا کہ كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ یعنی ملک شام بنی اسرائیل کے حصہ میں لکھ دیا ہے، وہ وعدہ پورا ہونا ضرور تھا، کہ قوم بنی اسرائیل اس ملک پر قابض و مسلط ہو، مگر بنی اسرائیل کے موجودہ افراد نے نافرمانی کر کے اس انعام خداوندی سے اعراض کیا تو ان کو یہ سزا مل گئی کہ مَحْرَمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً یعنی چالیس سال تک وہ ارض مقدسہ فتح کرنے سے محروم کر دیئے گئے، پھر ان کی نسل میں جو لوگ پیدا ہوئے ان کے ہاتھوں یہ ملک فتح ہوا، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔

اس وادی تیبہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے مگر یہ وادی ان کے لئے قید اور سزا تھی، اور ان دونوں حضرات کے لئے نعمائے اہلبیہ کا منظر۔ یہی وجہ ہے کہ چالیس سالہ دور جو بنی اسرائیل پر معنوب ہونے کا گذرا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی برکت سے طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، کھلے میدان کی دھوپ سے عاجز آئے تو موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کی چھتری لگا دی، جس طرف یہ لوگ چلتے تھے بادل ان کے ساتھ تھا سایہ فگن

ہو کر چلتے تھے، پیاس اور پانی کی قلت کی شکایت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ایک ایسا پتھر عطا فرمادیا کہ وہ ہر جگہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، اور جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی، تو موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا اُس پر مارتے تھے تو بارہ چشمے اس میں سے جاری ہو جاتے تھے، بھوک کی تکلیف پیش آئی تو آسمانی غذا من و سلویٰ اُن پر نازل کر دی گئی، رات کو اندھیری کی شکایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے روشنی کا ایک مینار ان کے لئے کھڑا کر دیا جس کی روشنی میں یہ سب کام کاج کرتے تھے۔

غرض اس میدانِ تیرہ میں صرف معتبوب لوگ ہی نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دو محبوب پیغمبر اور ان کے ساتھ دو مقبول بزرگ یوشع بن نون اور کالب بن یوقا بھی تھے، ان کے طفیل میں اس قید و سزا کے زمانے میں بھی یہ انعامات اُن پر ہوتے رہے، اور اللہ تعالیٰ رحیم الرحاء ہیں، ممکن ہو کہ بنی اسرائیل کے ان افراد نے بھی ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کر لی ہو، اس کے بدلہ میں یہ انعامات ان کو مل رہے ہوں۔

صحیح روایات کے مطابق اسی چالیس سالہ دور میں اول حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہو گئی، اور اس کے ایک سال یا چھ مہینہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملکِ شام اُن کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی ناقابلِ قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔

آخر آیت میں جوارشاد فرمایا کہ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ، یعنی اس نافرمان قوم پر آپ ترس نہ کھائیں، یہ اس بناء پر کہ انبیاء علیہم السلام اپنی طبیعت اور فطرت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی امت کی تکلیف و پریشانی کو برداشت نہیں کر سکتے، اگر ان کو سزا ملے تو یہ بھی اس سے مغموں و متاثر ہوا کرتے ہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی کہ آپ ان کی سزا سے دل گیر نہ ہوں۔

وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنِ آدَمَ بِالْحَقِّ ۖ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا

اور سننا ان کو حالِ واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نیاز کی دونوں نے کچھ

فَتَقَبَّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ۚ قَالَ

نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی - کہا

لَا قُتْلَكَ قَالَ إِنَّمَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنَ السَّائِقِينَ ﴿٣٤﴾ لَكِنَّ

میں تجھ کو مار ڈالوں گا وہ بولا اللہ قبول کرتا ہی تو پرہیزگاروں سے ، اگر تو

بَسَطْتَ إِلَى يَدِكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسٍ بِيَدِي إِلَيْكَ

ہاتھ چلاوے گا مجھ پر مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر

لَا قُتْلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٥﴾ إِنِّي أُرِيدُ

مارنے کو میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا میں چاہتا ہوں کہ

أَنْ تَبُوءَ أَبِي ثَمِيٍّ وَإِثْمِي فَتَكُونُ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَ

تو حامل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں اور

ذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿٣٦﴾ فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ

یہی ہے سزا ظالموں کی ، پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنی بھائی کے

فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٣٧﴾ فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ

پھر اس کو مار ڈالا سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں ، پھر بھیجا اللہ تم نے ایک کو اجو کر دیتا تھا

فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْعَةً أَخِيهِ قَالَ يُوَارِي

زمین کو تاکہ اس کو دکھلا دے کس طرح چھپانا ہے لاش اپنے بھائی کی بولا اے افسوس

أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْعَةً

مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہوں برابر اس کو سے کی کہ میں چھپاؤں لاش اپنے

أَخِي ۖ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٣٨﴾ مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ بَشَعَ

بھائی کی پھر لگا بچھٹانے ، اس سبب سے ،

كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ

لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے

أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَانَتْ مِثْلَ الْقَتْلِ النَّاسِ جَمِيعًا وَمَنْ

یا بغیر فساد کر نیے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے

أَحْيَاهَا فَكَانَتْ مِثْلَ الْحَيَاةِ النَّاسِ جَمِيعًا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ

زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو اور لاکھے ہیں اُن کے پاس

رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّا كَثِيرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فِي الْأَرْضِ

رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں

لَمُسْرِفُونَ ﴿۳۲﴾

دست درازی کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان اہل کتاب کو (حضرت) آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا (یعنی ہابیل وقابیل کا) قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنائیے (تاکہ ان کو انتساب بالصلحین کا گھمنڈ جاتا ہے جس کا سخن ابناء اللہ میں اظہار ہو رہا ہے) اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا جبکہ دونوں نے (اللہ تعالیٰ کے نام کی) ایک ایک نیاز پیش کی اور ان میں سے ایک کی (یعنی ہابیل کی) تو مقبول ہو گئی اور دوسرے کی (یعنی قابیل کی) مقبول نہ ہوئی، (کیونکہ جس معاملہ کے فیصلہ کے لئے یہ نیاز چڑھائی گئی تھی اس میں ہابیل حق پر تھا، اس لئے اس کی نیاز قبول ہو گئی، اور قابیل حق پر نہ تھا اس کی قبول نہ ہوئی، در نہ پھر فیصلہ نہ ہوتا، بلکہ اور غلط و اشتباہ ہو جاتا جب) وہ دوسرا (یعنی قابیل اس میں بھی ہارا تو چھٹا کر) کہنے لگا کہ میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا، اس ایک نے (یعنی ہابیل نے) جواب دیا (کہ تیرا ہارنا تو تیری ہی ناحق پرستی کی وجہ سے ہے میری کیا خطا، کیونکہ) خدا تعالیٰ متقیوں کی کا عمل قبول کرتے ہیں (میں نے تو تقویٰ اختیار کیا اور خدا کے حکم پر رہا، خدا سے تعالیٰ نے میری نیاز قبول کی، تو نے تقویٰ چھوڑ دیا اور خدا کے حکم سے منہ موڑا تیری نیاز قبول نہیں کی، سو اس میں تیری خطا ہے یا میری، انصاف کر، لیکن اگر پھر بھی تیرا یہی ارادہ ہے تو تُو جان، میں نے تو بختہ قصد کر لیا ہے) اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرے گا تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں (کیونکہ) میں تو خدا سے پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں (کہ باوجودیکہ تیرے جواز قتل کا بظاہر ایک سبب موجود ہے، یعنی یہ کہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے، مگر اس وجہ سے کہ یہ جواز اب تک کسی نصِ حسرتی سے مجھ کو محقق نہیں ہوا، اس لئے اس کے ارتکاب کو احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں، اور اس شبہ کی وجہ سے خدا سے ڈرتا ہوں، اور یہ ہمت تجھی کو ہے کہ باوجودیکہ میرے جواز قتل کا کوئی امر مقتضی نہیں بلکہ مانع موجود ہے لیکن پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا، میں یوں چاہتا ہوں کہ) مجھ سے کہ اگر وہ کام نہ ہو تو مجھ پر کتنا ہی

ظلم کیوں نہ کرے جس سے کہ، تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے، پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جاوے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی سوریوں تو پہلے ہی سے قتل کا ارادہ کر چکا تھا یہ جو سنا کہ مدافعت بھی نہ کرے گا، چاہتے تو تھا کہ گداختہ ہو جاتا مگر بے فکر ہو کر اور بھی اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا (پھر) آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے (کینحت) بڑے نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا (دنیا میں تو یہ نقصان کہ اپنا قوت بازو اور راحت روح گم کر بیٹھا، اور آخرت میں یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا ہو گا، اب جب قتل سے فارغ ہوا تو اب حیران ہے کہ لاش کو کیا کر دے جس سے یہ راز پوشیدہ رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو) پھر (آخر) اللہ تعالیٰ نے ایک کو (روہاں) بھیجا کہ وہ (چونچ اور بچوں سے) زمین کو کھودتا تھا (اور کھود کر ایک دوسرے کوٹے کو کہ وہ مرا ہوا تھا اس کو گرٹھے میں ڈھکیل کر اس پر مٹی ڈالتا تھا) تاکہ وہ (کوٹا) اس (قابیل) کو تعلیم دے کہ اپنے بھائی (ہابیل) کی لاش کو کس طریقہ سے چھپا دے (قابیل یہ واقعہ دیکھ کر اپنے جی میں بڑا ذلیل ہوا کہ مجھ کو کوٹے کے برابر بھی فہم نہیں، اور غایت حسرت سے) کہنے لگا کہ افسوس میری حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گذر کہ اس کوٹے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا (سو اس بد حالی پر) بڑا شرمندہ ہوا، اسی (واقعہ کی) وجہ سے (جس سے قتل ناحق کے مفاسد ثابت ہوتے ہیں) ہم نے (تمام مکلفین پر عموماً اور) بنی اسرائیل پر (خصوصاً) یہ (حکم) لکھ دیا (یعنی معتبر کر دیا) کہ (قتل ناحق اتنا بڑا گناہ ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے (جو ناحق مقتول ہوا ہو) یا بدو ن کسی (شر) فساد کے جو زمین میں اس سے پھیلا ہو (خواہ مخواہ) قتل کر ڈالے تو اس کو بعض اعتبار سے ایسا گناہ ہو گا کہ) گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا، (وہ بعض اعتبار یہ ہے کہ اس گناہ پر جرأت کی، خدائے تعالیٰ کی نافرمانی کی، خدائے تعالیٰ اس سے ناراض ہو کر دنیا میں مستحق قصاص ہوا، آخرت میں مستحق دوزخ ہوا، یہ امور ایک کے اور ہزار کے قتل کرنے میں مشترک ہیں) گوشت و شدت و اشتدیت کا تعادلت ہو، اور یہ در قیدیں اس لئے لگائیں کہ قصاص میں قتل کرنا جائز ہے، اسی طرح دوسرے اسباب جواز قتل سے بھی جن میں قطع طریق جو آگے مذکور ہے، اور کفر حربی جس کا ذکر احکام جہاد میں چکا ہو سب داخل ہے، قتل کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے) اور (یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جیسا ناحق قتل کرنا گناہ عظیم ہے، اسی طرح کسی کو قتل غیر واجب ہے بجا لینا اس میں ثواب بھی ایسا ہی عظیم ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بچا لے تو (اس کو ایسا ثواب ملیگا کہ)

گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا، (غیر واجب کی قید اس لئے لگائی کہ جس شخص کا قتل شرعاً واجب ہو اس کی امداد یا سفارش حرام ہے، اور اس مضمون احیاء کے لکھنے سے بھی تشدید قتل کی ظاہر ہو گئی کہ جب احیاء ایسا محمود ہے تو ضرور قتل مذموم ہوگا، اس لئے اس کا ترتیب و تسبب بھی بواسطہ عطف کے مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ پر صیح ہو گیا، اور بنی اسرائیل کے پاس (اس مضمون کے لکھ دینے کے بعد) ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائل واضحہ (نبوت کے) لیکر آئے، اور وقتاً فوقتاً اس مضمون کی تاکید کرتے رہے، مگر پھر اس (تاکید و اہتمام) کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنے والے ہی رہے اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا حتیٰ کہ بعض نے خود ان انبیاء ہی کو قتل کر دیا۔

معارف و مسائل

قِصَّةٖ بِأَبْلِیٰ وَقَابِلِ | ان آیات میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ آپ اہل کتاب کو یا پوری امت کو حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح سنا دیجئے۔

قرآن مجید پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کریم کوئی قصہ کہانی یا تاریخ کی کتاب نہیں جس کا مقصد کسی واقعہ کو اوّل سے آخر تک بیان کرنا ہو، لیکن واقعات ماضیہ اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت اپنے دامن میں بہت سی عبرتیں اور نصیحتیں رکھتی ہے، وہی تاریخ کی اصلی روح ہے، اور ان میں بہت سے حالات و واقعات لیے بھی ہوتے ہیں، جن پر مختلف احکام شرعیہ کی بنیاد ہوتی ہے، انہی قوائد کے پیش نظر قرآن کریم کا اسلوب ہر جگہ یہ ہے کہ موقع بہ موقع کوئی واقعہ بیان کرتا ہے، اور اکثر پورا واقعہ بھی ایک جگہ بیان نہیں کرتا، بلکہ اس کے جتنے حصّے سے اس جگہ کوئی مقصد متعلق ہوتا ہے اس کا وہی ٹکڑا یہاں بیان کر دیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا یہ قصہ بھی اسی اسلوبِ حکیم پر نقل کیا جا رہا ہے، اس میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بہت سی عبرتیں اور مواظپیں، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام شرعیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اب پہلے الفاظِ قرآن کی تشریح اور اس کے تحت میں اصل قصہ دیکھئے، اس کے بعد اس کے متعلقہ احکام و مسائل کا بیان ہوگا۔

اس سے پہلی آیات میں بنی اسرائیل کو حکمِ جہاد اور اس میں ان کی کم ہمتی اور بزدلی

کا ذکر تھا، اس قصہ میں اس کے بالمقابل قتل ناحق کی بُرائی اور اس کی تباہ کاری کا بیان کر کے قوم کو اس اعتدال پر لاتا مقصود ہے کہ جس طرح حق کی حمایت اور باطل کو مٹانے میں قتل و قتال سے دم چرانا غلطی ہے، اسی طرح ناحق قتل و قتال پر اقدام دین و دنیا کی تباہی ہے۔ پہلی آیت میں **إِبْنِیْ اٰدَمَ** کا لفظ مذکور ہے، یوں تو ہر انسان آدمی اور آدم کی اولاد ہے، ہر ایک کو ابن آدم کہا جاسکتا ہے، لیکن جہور علماء تفسیر کے نزدیک اس جگہ **إِبْنِیْ اٰدَمَ** سے حضرت آدم علیہ السلام کے دو صلیبی اور حقیقی بیٹے مراد ہیں، یعنی ہابیل وقابیل، ان دونوں کا قصہ بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا:

تاریخی روایات کی نقل میں احتیاط اور سچائی واجب ہے | **وَ اَنْتُمْ عَلَیْہِمْ نَبَا اِبْنِیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ**، "یعنی ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح صحیح واقعہ کے مطابق سناریجے،" اس میں **بِالْحَقِّ** کے لفظ سے تاریخی روایات کی نقل میں ایک اہم اصول کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تاریخی روایات کی نقل میں بڑی احتیاط لازم ہے، جس میں نہ کوئی جھوٹ ہو نہ کوئی تبلیس اور دھوکہ اور نہ اصل واقعہ میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی زیادتی (ابن کثیر)

قرآن کریم نے صرف اسی جگہ نہیں بلکہ دوسرے مواقع میں بھی اس اصول پر قائم رہنے کی ہدایات دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہے **اِنَّ هٰذَا اَلْهُوَ الْقَصَصُ الْحَقِیْ**، دوسری جگہ ارشاد ہے **غٰثُ نَقْصٍ عَلَیْكَ نَبَا ہُمْ بِالْحَقِّ**، تیسری جگہ ارشاد ہے **ذٰلِكَ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ**، ان تمام مواقع میں تاریخی واقعات کے ساتھ لفظ حق لاکر اس بات کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے کہ نقل واقعات میں حق و صدق کی رعایت لازمی ہے، روایات و حکایات کی بناء پر جس قدر مفسد دنیا میں ہوتے ہیں ان سب کی بنیاد عام طور پر نقل واقعات میں بے احتیاطی ہوتی ہے، ذرا سا لفظ اور عنوان بدل دینے سے واقعہ کی حقیقت منہ ہو جاتی ہے، پچھلی اقوام کے مذاہب و شرائع اسی بے احتیاطی کی راہ سے ضائع ہو گئے، اور ان کی مذہبی کتابیں چند بے سند بے تحقیق کہانیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئیں اس جگہ ایک لفظ **بِالْحَقِّ** کا اضافہ کر کے اس اہم مقصد کی طرف اشارہ فرمادیا گیا۔

اس کے علاوہ اسی لفظ میں قرآن کریم کے مخاطبین کو اس طرف بھی رہنمائی کرنا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو اُمّی محض ہیں، اور ہزاروں سال پہلے کے واقعات بالکل سچے اور صحیح بیان فرما رہے ہیں تو اس کا سبب بجز وحی الہی اور نبوت کے کیا ہو سکتا ہے۔ اس تمہید کے بعد ان دونوں بیٹوں کا واقعہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمایا: **اِذْ خَرَّبَا قُرْبٰنًا فَتَقَبَّلَ مِنْ اٰحَدِہُمَا ذَاکُم مِّنْ قَبْلِ مِّنْ الْاٰخِرِ**، یعنی ان دونوں نے اللہ تعالیٰ

کے لئے اپنی اپنی متربانی پیش کی، مگر ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی، لفظ قربان، عربی لغت کے اعتبار سے اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کسی کے قرب کا ذریعہ بنایا جائے، اور اصطلاح شرع میں اس ذبیحہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔

اس متربانی کے پیش کرنے کا واقعہ جو صحیح اور قوی سندوں کے ساتھ منقول ہو اور ابن کثیر نے اس کو علماء سلف و خلف کا متفقہ قول قرار دیا ہے یہ ہے کہ جب حضرت آدم اور حوا علیہما السلام دنیا میں آئے اور والد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ایک حمل سے ان کے دو بچے توام پیدا ہوئے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی، اس وقت جبکہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں بجز بہن بھائیوں کے کوئی اور نہ تھا، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا تو اللہ جل شانہ نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے شریعت آدم علیہ السلام میں یہ خصوصی حکم جاری فرمادیا تھا کہ ایک حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہو وہ تو آپس میں حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں، اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے، لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی، بلکہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج و مناکحت جائز ہوگا لیکن ہوا یہ کہ پہلے لڑکے قابیل کی ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ حیمہ و جمیل تھیں اور دوسرے لڑکے ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بدشکل تھی، جب نکاح کا وقت آیا تو حسب ضابطہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بدشکل لڑکی قابیل کے حصہ میں آئی، اس پر قابیل ناراض ہو کر ہابیل کا دشمن ہو گیا، اور اس پر اصرار کرنے لگا کہ میرے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی ہے وہی میرے نکاح میں دی جائے، حضرت آدم علیہ السلام نے شرعی قاعدہ کے موافق اس کو قبول نہ فرمایا، اور ہابیل و قابیل کے درمیان رفع اختلاف کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی متربانی اللہ کے لئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہو جائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ متربانی اسی کی قبول ہوگی جس کا حق ہے، یعنی ہابیل کی۔

اس زمانہ میں متربانی قبول ہونے کی ایک واضح اور کھلی ہوئی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور متربانی کو کھا جاتی تھی، اور جس قربانی کو آگ نہ کھائے تو یہ علامت اس کے نامقبول ہونے کی ہوتی تھی۔

اب صورت یہ پیش آئی کہ ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں، اس نے ایک

عمدہ ذنبہ کی قسربانی کی، قابیل کا شکار آدمی تھا، اس نے کچھ غلہ، گندم وغیرہ قربانی کے لئے پیش کیا، اور ہوا یہ کہ حسب دستور آسمان سے آگ آئی، ہابیل کی قربانی کو کھا گئی، اور قابیل کی قسربانی جوں کی توں پڑی رہ گئی، اس پر قابیل کو اپنی ناکامی کے ساتھ رسوائی کا غم و غصہ اور بڑھ گیا، تو اس سے رہا نہ گیا، اور کھلے طور پر اپنے بھائی سے کہہ دیا: لَا قُتُلْتَنِي، یعنی میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔

ہابیل نے اس وقت بھی غصہ کی بات کا جواب غصہ کے ساتھ دینے کے بجائے ایک ٹھنڈی اور اصولی بات کہی جس میں اس کی ہمدردی و خیر خواہی بھی تھی کہ: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہو کہ متقی پرہیزگار کا عمل قبول فرمایا کرتے ہیں۔ اگر تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے تو تمہاری قربانی بھی قبول ہوتی، تم نے ایسا نہیں کیا تو قسربانی قبول نہ ہوتی، اس میں میرا کیا قصور ہو؟

اس کلام میں حاسد کے حسد کا علاج بھی ذکر کر دیا گیا ہے، کہ حاسد کو جب یہ نظر آئے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے کوئی خاص نعمت عطا فرمائی ہے جو اس کو حاصل نہیں تو اس کو چاہئے کہ اپنی محرومی کو اپنی عملی کوتاہی اور گناہوں کے سبب سمجھ کر ان سے تائب ہونے کی فکر کرے، نہ یہ کہ دوسرے سے اس نعمت کے زوال کی فکر میں پڑ جائے، کیونکہ یہ اس کے فائدہ کے بجائے ضرر کا سبب ہے، کیونکہ مقبولیت عند اللہ کا مدار تقویٰ پر ہے (مظہری)

قبولیت عمل کا مدار | یہاں ہابیل و قابیل کی باہمی گفتگو میں ایک ایسا جملہ آگیا جو ایک اہم اخلاص و تقویٰ پر ہو | اصول کی حیثیت رکھتا ہے، کہ اعمال و عبادات کی قبولیت تقویٰ اور

خوف خدا پر موقوف ہے، جس میں تقویٰ نہیں اس کا عمل مقبول نہیں، اسی وجہ سے علمائے سلف نے فرمایا ہے کہ یہ آیت عبادت گزاروں اور عمل کرنے والوں کے لئے بڑا تازیانہ ہے یہی وجہ تھی کہ حضرت عامر بن عبد اللہ اپنی وفات کے وقت رو رہے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو عمر بھر اعمال صالحہ اور عبادت میں مشغول رہے، پھر رونے کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: تم یہ کہتے ہو اور میرے کانوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گونج رہا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری کوئی عبادت قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا تو یہ وہ نعمت ہے کہ ساری زمین سونا بن کر اپنے قبضہ میں آجائے تو بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھوں۔

اسی طرح حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ اگر یہ بات یقینی طور پر طے ہو جائے

کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہو گئی تو میرے لئے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:
”میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور اہل تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا، اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا، اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔“

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے، اور جو عمل مقبول ہو جائے وہ چھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے۔ (ابن کثیر)

جرم و سزا کے چند شرعی ضابطے

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ

یہی سزا ہے اُن کی جو لڑتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں

فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ

ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھا جائے یا کٹے جاویں انکے ہاتھ

وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ

اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کر دیئے جاویں اس جگہ سے یہ

لَهُمْ خَزَائِفٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۳۳

اُن کی رُسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے،

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا

مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے تو جان لو کہ

أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۳۴

اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑتے ہیں اور اس لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ، ملک میں فساد (یعنی بد امنی) پھیلاتے

پھرتے ہیں (مراد اس سے رہزنی یعنی ڈکیتی ہے، ایسے شخص پر جس کو اللہ نے قانون شرعی سے جس کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوا ہے امن دیا ہو یعنی مسلمان پر اور ذمی پر اور اسی لئے اس کو اللہ اور رسولؐ سے لڑنا کہا گیا ہے، کہ اس نے اللہ کے دیئے ہوئے امن کو توڑا، اور چونکہ رسولؐ کے ذریعہ سے اس کا ظہور ہوا اس لئے رسولؐ کا تعلق بھی بڑھا دیا غرض جو لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں، ان کی یہی سزا ہے کہ (ایک حالت میں تو) قتل کئے جائیں (وہ حالت یہ ہے کہ ان رہزنیوں نے کسی کو صرف قتل کیا ہو اور مال لینے کی نوبت نہ آئی ہو) یا (اگر دوسری حالت ہوئی ہو تو) سولی دیئے جائیں (یہ وہ حالت ہے کہ انھوں نے مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو) یا (اگر تیسری حالت ہوئی ہو تو) ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے (یعنی داہنا ہاتھ بائیں پاؤں) کاٹ دیئے جائیں (یہ وہ حالت ہے کہ صرف مال لیا قتل نہ کیا ہو) یا (اگر چوتھی حالت ہوئی ہو تو) زمین پر (آزادانہ آباد رہنے) سے نکال (کر جیل میں بھیج) دیئے جائیں (یہ وہ حالت ہے کہ نہ مال لیا ہو نہ قتل کیا ہو قصد کرنے کے بعد ہی گرفتار ہو گئے ہوں) یہ (سزائے مذکور تو) اُن کے لئے دنیا میں سخت رسوائی (اور ذلت) ہے، اور ان کو آخرت میں (جو) عذاب عظیم ہوگا (سوا لگ) ہاں مگر جو لوگ قبل اس کے کہ ستم ان کو گرفتار کر دتوبہ کر لیں تو (اس حالت میں) جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ (اپنے حقوق) بخش دیں گے (اور توبہ قبول کرنے میں) ہر بانی فرمادیں گے (مطلب یہ کہ اوپر جو سزائے مذکور ہوئی ہے، وہ حد اور حق اللہ کے طور پر ہے جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا قصاص و حق العبد کے طور پر نہیں جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف ہو جاتا ہے، پس جبکہ قبل گرفتاری کے ان لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہو جائے تو حد ساقط ہو جاوے گی، جو کہ حق اللہ تھا، البتہ حق العبد باقی رہے گا، پس اگر مال لیا ہوگا اس کا ضمان دینا ہوگا، اور اگر قتل کیا ہوگا تو اس کا قصاص لیا جاوے گا، لیکن اس ضمان و قصاص کے معاف کرنے کا حق صاحب مال و ولی مقتول کو حاصل ہوگا۔

معارف مسائل

<p>پہلی آیتوں میں ہابیل کا واقعہ قتل اور اس کا جرم عظیم ہونا مذکور تھا، مذکورہ آیات میں اور ان کے بعد قتل و غارت گری، ڈاکہ زنی اور چوری کی شرعی سزائوں کا بیان ہے، ڈاکہ اور چوری کی سزائوں کے درمیان خوفِ خدا اور بذریعہ طاعات اس کا قرب حاصل کرنے کی تلقین ہے، قرآن کریم کا</p>	<p>شرائی قوانین کا عجیب غریب انقلابی اسلوب</p>
--	--

یہ اسلوب نہایت لطیف طریقہ پر ذہنی انقلاب پیدا کرنے والا ہے، کہ وہ دنیا کی تعزیرات کی کتابوں کی طرح صرف جرم و سزا کے بیان پر کفایت نہیں کرتا، بلکہ ہر جرم و سزا کے ساتھ خوفِ خدا و آخرت مستحضر کر کے انسان کا رخ ایک ایسے عالم کی طرف موڑ دیتا ہے، جس کا تصور اس کو ہر عیب و گناہ سے پاک کر دیتا ہے، اور اگر حالات و واقعات پر غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ خوفِ خدا و آخرت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون پولیس فوج دنیا میں انسدادِ جرم کی ضمانت نہیں دے سکتی، قرآن کریم کا یہی اسلوب حکیمانہ اور مرتبیانہ طرز ہے، جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا، اور ایسے انسانوں کا ایک معاشرہ پیدا کیا جو اپنے تقدس میں فرشتوں سے بھی اونچا مقام رکھتے ہیں۔

شرعی سزاؤں کی | ڈاکہ اور چوری کی شرعی سزائیں جن کا ذکر آیات مذکورہ میں ہے، انکی تین قسمیں | تفصیل اور متعلقہ آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ان سزاؤں سے متعلق شرعی اصطلاحات کی کچھ وضاحت کر دی جائے، جن سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سے لکھے پڑھے لوگوں کو بھی اشکالات پیش آتے ہیں، دنیا کے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہو، تعزیرات ہند، تعزیرات پاکستان وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، وہ ہر قسم کے جرائم اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں، لیکن شریعتِ اسلام میں ... معاملہ ایسا نہیں، بلکہ جرائم کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئیں۔ حدود، قصاص، تعزیرات، ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہو اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے، اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لئے ہر ایسے جرم میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے۔

لیکن بعض جرائم میں حق اللہ کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور بعض میں حق اللہ کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، اور احکام میں مدارِ کار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے۔ دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعتِ اسلام نے خاص خاص جرائم کے علاوہ باقی جرائم کی سزاؤں کے لئے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مکان اور ہر ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا انسدادِ جرم کے لئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی

اسلامی حکومت شرعی قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے خستیا رات پر کوئی پابندی لگا دے اور جبرائیم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کر دے، جیسا کہ قرآن متاخرہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت..... رائج ہے۔

اب سمجھئے کہ جن جبرائیم کی کوئی سزا قرآن و سنت نے متعین نہیں کی بلکہ حکام کی صواب دید پر رکھا ہے، ان سزاؤں کو شرعی اصطلاح میں "تعزیرات" کہا جاتا ہے، اور جن جبرائیم کی سزائیں قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں وہ دو قسم پر ہیں، ایک وہ جن میں حق اللہ کو غالب قرار دیا گیا ہے ان کی سزا کو "حد" کہا جاتا ہے جس کی جمع "حدود" ہے، دوسرے وہ جن میں حق العبد کو از روئے شرع غالب مانا گیا ہے، اس کی سزا کو "قصاص" کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے حدود و قصاص کا بیان پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ خود کر دیا ہے، باقی تعزیری جبرائیم کی تفصیلات کو بیان رسولؐ اور حکام وقت کی صواب دید پر چھوڑ دیا، خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن جبرائیم کی سزا کو بطور حق اللہ متعین کر کے جاری کیا ہے ان کو حد و د کہتے ہیں، اور جن کو بطور حق العبد جاری فرمایا ہے ان کو قصاص کہتے ہیں، اور جن جبرائیم کی سزا کا تعین نہیں فرمایا اس کو تعزیر کہتے ہیں، سزا کی ان تینوں قسموں کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جو لوگ اپنے عربِ عام کی بنا پر ہر جرم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور شرعی اصطلاحات کے فرق پر نظر نہیں کرتے ان کو شرعی احکام میں بکثرت مغالطے پیش آتے ہیں۔

تعزیری سزائیں حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جاسکتی ہیں، سخت سخت بھی اور معاف بھی کی جاسکتی ہیں، ان میں حکام کے خستیا رات وسیع ہیں، اور حدود میں کسی حکومت یا کسی حاکم دایم کو ادنیٰ تغیر و تبدل یا کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے، اور نہ زمان و مکان کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی امیر و حاکم کو اس کے معاف کرنے کا حق ہے، شریعت اسلام میں حدود صرف پانچ ہیں، ڈاکہ، چوری، زنا، تہمت زنا کی سزائیں، یہ سزائیں قرآن کریم میں منصوص ہیں، پانچویں شراب خوردگی کی حد ہے، جو اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے، اس طرح کل پانچ جبرائیم کی سزائیں متعین ہو گئیں، جن کو "حدود" کہا جاتا ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حاکم دایم کم یا معاف نہیں کر سکتا، اسی طرح توبہ کر لینے سے بھی دنیوی سزا کے حق میں معافی نہیں ہوتی، ہاں آخرت کا گناہ مخلصانہ توبہ سے معاف ہو کر وہاں کا کھانا بیاق ہو جاتا ہے، ان میں سے صرف ڈاکہ کی سزائیں

ایک استثناء ہے کہ ڈاکو اگر گرفتاری سے قبل توبہ کرے اور معاملات سے اس کی توبہ پراطمینان ہو جائے تو بھی یہ حد ساقط ہو جائے گی، گرفتاری کے بعد کی توبہ معتبر نہیں، اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے قبل سے ہو یا بعد میں، تمام تعزیری جرائم میں حق کے موافق سفارشات سنی جاسکتی ہیں، حدود اللہ میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں، ادران کا سننا بھی جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں، ادران کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے، کہ ان میں کسی کو کسی کی بیشی کی کسی حال میں اجازت نہیں، نہ کوئی ان کو معاف کر سکتا ہے، جہاں سزا اور قانون کی یہ سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو معتدل کرنے کے لئے تکمیل جرم اور تکمیل ثبوت جرم کے لئے شرطیں بھی نہایت کڑی رکھی گئی ہیں، ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے، بلکہ ادنیٰ سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد ساقط ہو جاتی ہے، اسلام کا مسلم قانون اس میں یہ ہے کہ **اَلْحُكْمُ وَدُنْتَدَارِعُ بِالشُّبُهَاتِ** یعنی حدود کو ادنیٰ شبہ سے ساقط کر دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جن صورتوں میں حد شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو ہرم پر اور جرات پیدا ہو، بلکہ حاکم اس کے مناسب حال اس کو تعزیری سزا دے گا، اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں، جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسداد جرائم کا مکمل انتظام ہے، فرض کیجئے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے، اور گواہ عادل ثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہو سکتا، مگر اذروئے قانون شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دیدی جائے، بلکہ حاکم وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہوگی، یا چوری کے ثبوت کے لئے جو شرائط مستر ہیں ان میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہو سکتی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہو گیا، بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسب حال دی جائیں گی۔

قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن میں متعین ہے، کہ جان کے بدلہ میں جان لی جائے زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دی جائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت حق اللہ نافذ کیا گیا ہے، اگر صاحب حق انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہوگا، اور حد

ساقط نہ ہوگی، مثلاً جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کر دے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی، بخلاف قصاص کے کہ اس میں حق العبد کی حیثیت کو قرآن و سنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہو جانے کے بعد اس کو دلی مقتول کے حوالہ کر دیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے، اور اس کو قتل کر دے، اور چاہے معاف کر دے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھکی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ مشہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاء مقتول کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرات بڑھ جائے گی، اور قتل کی واردات عام ہو جائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو دلی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کر دیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لئے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کر سکتی ہے۔

یہاں تک شرعی سزاؤں حدود، قصاص، اور تعزیرات کی اصطلاحات شرعیہ اور ان کے متعلق ضروری معلومات کا بیان ہوا، اب ان کے متعلق آیات کی تفسیر اور حدود کی تفصیل دیکھئے، پہلی آیت میں ان لوگوں کی سزا کا بیان ہے جو اللہ اور رسول کے ساتھ مقابلہ اور محاربہ کرتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اللہ و رسول کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے، اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں، لفظ محاربہ حرب سے ماخوذ ہے، اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ سلم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی امن اور سلامتی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بد امنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اکاؤ کا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت بھی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہو جائے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا تحت صریح اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے، اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جاسکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنیوالے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں (تفسیر مظہری)

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ اس آیت میں محاربہ کو اللہ اور رسول کی طرف

منسوب کیا ہے، حالانکہ ڈاکو یا بغاوت کرنے والے جو مقابلہ یا محاربہ کرتے ہیں وہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ کوئی طاقت و جماعت جب طاقت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کو توڑنا چاہے تو اگرچہ ظاہر میں اس کا مقابلہ عوام اور انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کی جنگ حکومت کے ساتھ ہے، اور اسلامی حکومت میں جب قانون اللہ اور رسول کا نافذ ہو تو یہ محاربہ بھی اللہ و رسول ہی کے مقابلہ میں کہا جائیگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس سزا کا ذکر ہے یہ اُن ڈاکوؤں اور باغیوں پر عائد ہوتی ہے جو اجتماعی قوت کے ساتھ حملہ کر کے امن عامہ کو ہرباد کریں، اور قانون حکومت کو علانیہ توڑ نیکی کوشش کریں، اور ظاہر ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، مال لوٹنے، آبرو پر حملہ کرنے سے لیکر قتل و خونریزی تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں، اسی سے مقاتلہ اور محاربہ میں فرق معلوم ہو گیا کہ لفظ مقاتلہ خون ریز لڑائی کے لئے بولا جاتا ہے گو کوئی قتل ہو یا نہ ہو، اور گوسفٹ مال بھی گوتا جائے، اور لفظ محاربہ طاقت کے ساتھ بد امنی پھیلانے اور سلامتی کو سلب کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لئے یہ لفظ اجتماعی طاقت کے ساتھ عوام کی جان و مال و آبرو میں سے کسی چیز پر دست درازی کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کو رہزنی، ڈاکہ، اور بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس جرم کی سزا قرآن کریم نے خود متعین فرمادی اور بطور حق اللہ یعنی سرکاری جرم کے نافذ کیا جس کو اصطلاح شرع میں حد کہا جاتا ہے، اب سنئے کہ ڈاکہ اور رہزنی کی شرعی سزا کیا ہے آیت مذکورہ میں رہزنی کی چار سزائیں مذکور ہیں :

اَنْ يَّقْتُلُوْا اَوْ يُّصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يَنْقَوْا مِنْ اَلْسِنٍ۔ یعنی اُن کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھایا جائے یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے، ان میں سے پہلی تین سزائیں مباغہ کا لفظ باب تفعیل سے استعمال فرمایا جو تکرار فعل اور شدت پر دلالت کرتا ہے، اس میں صیغہ جمع استعمال فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ ان کا قتل یا سولی چڑھانا یا ہاتھ پاؤں کاٹنا عام سزائوں کی طرح نہیں کہ جس جرم ثابت ہو صرف اسی فرد پر سزا جاری کی جائے بلکہ یہ جرم جماعت میں سے ایک فرد سے بھی صادر ہو گیا تو پوری جماعت کو قتل یا سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

نیز اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ قتل و صلب وغیرہ قصاص کے طور پر نہیں کہ اولیاء مقتول کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائے، بلکہ یہ حد شرعی بحیثیت حق اللہ کے نافذ کی گئی ہے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے وہ معاف بھی کر دیں تو شرعاً سزا معاف نہ ہوگی،

یہ دونوں حکم بصیغہ تفعیل ذکر کرنے سے مستفاد ہوئے (تفسیر مظہری وغیرہ)
 رہزنی کی یہ چار سزائیں حرف آؤ کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، جو چند چیزوں میں خستیا رہنے
 کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور تقسیم کار کے لئے بھی، اسی لئے فقہاء امت صحابہ و تابعین
 کی ایک جماعت حرف آؤ کو تخیر کے لئے قرار دے کر اس طرف گئی ہے کہ ان چار سزاؤں میں
 امام دامیر کو شرعاً خستیا روایا گیا ہو کہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت
 پر نظر کر کے ان کے حسب حال یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔

سعید بن مسیبؓ، عطاء بن داؤدؓ، حسن بصریؓ، ضحاکؓ، نخعیؓ، مجاہدؓ اور ائمہ اربعہ میں سے امام
 مالکؓ کا یہی مذہب ہے، اور امام ابو حنیفہؓ، شافعیؓ، احمد بن حنبلؓ اور ایک جماعت صحابہ و
 تابعینؓ نے حرف آؤ کو اس جگہ تقسیم کار کے معنی میں لیکر آیت کا مفہوم یہ قرار دیا کہ رہزنیوں
 اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں، اس کی تائید ایک حدیث سے
 بھی ہوتی ہے، جس میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 ابو بردہ سلمیٰ سے معاہدہ صلح کا فرمایا تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی، اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے
 لئے مدینہ طیبہ آرہے تھے، ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں حبشہ نیل امین یہ حکم سزا لیکر نازل
 ہوئے، کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھایا جائے، اور جس نے
 صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے، اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال
 لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں، اور جو ان میں سے مسلمان
 ہو جائے اُس کا جرم معاف کر دیا جائے، اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کیا صرف
 لوگوں کو ڈرایا جس سے امن عامہ مختل ہو گیا، اس کو جلا وطن کیا جائے، اگر ان لوگوں نے
 دارالاسلام کے کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا تو ان کی سزا
 اَنْ يُقَتَّلُوْا یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے اگرچہ فعل قتل بلا واسطہ صرف بعض افراد
 سے صادر ہوا ہو، اور اگر کسی کو قتل بھی کیا مال بھی لوٹا تو ان کی سزا یُصَلَّبُوْا ہے، یعنی
 ان کو سولی چڑھایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے، پھر نذرہ
 وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے، اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے کسی کو قتل نہیں کیا
 تو ان کی سزا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْہُمْ وَاَرْجُلُہُمْ مِّنْ خِلَافِیْنِ ہے، یعنی اُن کے دہنے ہاتھ
 گٹھوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنوں پر سے کاٹ دیئے جائیں، اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا
 عمل بلا واسطہ اگرچہ بعض سے صادر ہوا ہو، مگر سزا سب کے لئے یہی ہوگی، کیونکہ کرنے
 والوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ساتھیوں کے تعاون و امداد کے بھروسہ پر کیا ہے، اس لئے

سب شریک جرم ہیں اور اگر ابھی تک قتل و غارت گری کا کوئی جرم اُن سے صادر نہیں ہوا تھا، کہ پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی سزا اَوْ يَنْفَوْا مِنْ الْاَرْضِ ہے، یعنی ان کو زمین سے نکال دیا جائے۔

زمین سے نکالنے کا مفہوم ایک جماعت فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے، اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے نکال دیا جائے، حضرت فاروق اعظمؓ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے مسلح حملوں میں آجکل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل و خوں ریزی ہی پر اکتفا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت درمی اور اغوا وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا، اس قسم کے تمام جرائم کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے، اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام رامیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو اُن کے مناسب حال دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہنچے تو حد زنا جاری کرے۔

اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا، مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا، تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا (تفسیر مظہری)

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ لَكُمْ لَهٗمْ خِزْيًا فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی یہ سزائے شرعی جو دنیا میں اُن پر جاری کی گئی ہے، یہ تو دنیا کی رسوائی ہے اور سزا کا ایک نمونہ ہے، اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور دیرپا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود و قصاص یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی، ہاں سزا یافتہ شخص دل سے توبہ کر لے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی دوسری آیت اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ج میں ایک استثناء ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکو اور باغی اگر حکومت کے گھیرے میں آئے اور اُن پر قابو پانے سے پہلے پہلے جب کہ ان کی قوت و طاقت بحال ہے، اس حالت میں اگر توبہ کر کے رہزنی سے خود ہی باز آجائیں تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی اُن سے ساقط ہو جائے گی، یہ استثناء عام قانون حدود سے مختلف ہے، کیونکہ دوسرے جرائم چوری زنا وغیرہ میں جرم کرنے اور قاضی کی عدالت

میں جرم ثابت ہو جانے کے بعد اگر مجرم سچے دل سے توبہ بھی کر لے تو گو اس توبہ سے آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی، مگر دنیا میں حد شرعی معاف نہ ہوگی، جیسا کہ چند آیتوں کے بعد چوری کی سزا کے تحت میں اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

حکمت اس استثناء کی یہ ہو کہ ایک طرف ڈاکوؤں کی سزائیں یہ شدت اختیار کی گئی ہو کہ پوری جماعت میں کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہو اس لئے دوسری طرف اس استثناء کے ذریعہ معاملہ کو ہلکا کر دیا گیا، کہ توبہ کر لیں تو سزا سے دنیا بھی معاف ہو جائے، اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے..... کہ ایک طاقت ور جماعت پر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا، اس لئے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا، کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔

نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہو کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو اور ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہو اس لئے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی، اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھے جمع کر کے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمْ لَا تَقۡتُلُوْا اٰمِنًا رَّحۡمَۃُ اللّٰهِ قَارِیۡۤیۡۤہٗۤا کے پاس پہنچے، اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی اور ہزنی سے توبہ کر کے مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابو ہریرہؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر امیر مدینہ کے پاس لے گئے، اور قرآن کی آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔

حکومت بھی ان کے فساد و ہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کی خوشی ہوئی۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کر کے نکل گیا، اور قتل و غارت گری کو پیشہ بنالیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کر کے واپس آیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

یہاں یہ بات قابلِ یادداشت ہو کہ حد شرعی کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہو جائیں، بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہو تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد تو ادلیا، مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے

سے معاف ہو جائے گا، اور جو کوئی مالی نقصان کسی کو پہنچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف کرنا لازم ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا غور توبہ کا ایک جز ہے، بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی، اس لئے کسی ڈاکو کو تائب اُسی وقت مانا جائے گا جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور

جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ

جہاد کرو اس کی راہ میں تاکہ تمہارا بھلا ہو جو لوگ کافر ہیں اگر

أَن لَّهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ

ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ بدلہ میں دیں

عَذَابٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ

اپنے قیامت کے دن عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے عذاب

أَلِيمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيدُونَ أَن يُخْرِجُوكَ مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ

دردناک ہر چاہیں گے کہ بھل جاویں آگ سے اور وہ اس سے

بِخَرَجِينَ مِّنْهَا زَوْ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿۳۷﴾ وَالسَّارِقُ وَ

بچکنے والے نہیں اور ان کے لئے عذاب دائمی ہے اور چوری کرنیوالا مرد اور

السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا كَسْبَ النَّارِ كَالْ

چوری کرنیوالی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ سزائیں ان کی کمائی کی، تنبیہ ہے

مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۸﴾ فَسَنُتَابِعُكَ بِعَدِ

اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب ہر حکمت والا پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے

خُلَيْسِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

پیچھے اور اصلاح کی تو اللہ قبول کرتا ہر اس کی توبہ بے شک اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۳۹﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

ہربان ہے تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

عذاب کرے جس کو چاہے اور بخشتے جس کو چاہے اور اللہ سب چیز پر

قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

تادر ہے

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کے احکام کی مخالفت) سے ڈرو (یعنی معاصی چھیڑ دو) اور (طاعت کے ذریعہ) خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو (یعنی طاعات ضروریہ کے پابند رہو)، اور (طاعات میں سے بالخصوص) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو امید ہے کہ اس طریق سے (تم (پورے) کامیاب ہو جاؤ گے اور کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حاصل ہونا اور دوزخ سے نجات ہی) یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر (بالفرض) ان میں سے ہر ایک کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں (جس میں کافران دوزخ بھی آگئے) اور (اپنی چیزوں پر کیا منحصر ہو بلکہ) ان چیزوں کے ساتھ اتنی ہی چیزیں اور بھی ہوں تاکہ وہ اس کو دے کر دوزخ قیامت کے عذاب سے چھوٹ جاویں تب بھی وہ چیزیں ہرگز اسے قبول نہ کی جادیں گی اور عذاب سے نہ بچیں گے بلکہ) ان کو دردناک عذاب ہوگا (پھر بعد عذاب میں داخل ہو جانے کے) اس بات کی خواہش (و تمنا) کریں گے کہ دوزخ سے (کسی طرح) نکل آویں اور (یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی اور) وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے اور ان کو عذاب دائمی ہوگا (یعنی کسی تدبیر سے نہ سزا ملے گی نہ دوام سزا ملے گا)

اور جو مرد چوری کرے اور (اسی طرح) جو عورت چوری کرے سو (ان کا حکم یہ ہے کہ) اے محکم، ان دونوں کے واسطے ہاتھ (گٹے پرے) کاٹ ڈالو ان کے (اس) کردار کے عوض میں (اور یہ عوض) بطور سزا کے (ہے) اللہ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے ہیں، (جو سزا چاہیں مسترر فرمادیں اور) بڑی حکمت والے ہیں (کہ مناسب ہی سزا مسترر فرماتے ہیں) پھر جو شخص (موافق قاعدہ شرعیہ کے) توبہ کرے اپنی اس زیادتی (یعنی چوری) کرنے کے بعد اور (آئندہ کے لئے) اعمال کی درستی رکھے (یعنی چوری وغیرہ نہ کرے) اپنی توبہ پر قائم رہے) توبہ اللہ تعالیٰ اس (کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توبہ فرما دیں گے (کہ توبہ سے پچھلا گناہ معاف فرما دیں گے) اور استقامت علی التوبہ سے مزید عنایت

فرمادیں گے، بیشک خدا تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (کہ اس کا گناہ معاف کر دیا) بڑی رحمت والے ہیں (کہ آئندہ بھی مزید عنایت کی اے مخاطب) کیا تم نہیں جانتے (یعنی سب جانتے ہیں) کہ اللہ ہی کے لئے ثابت ہو حکومت سب آسمانوں کی اور زمین کی وہ جس کو چاہیں سزا دیں اور جو چاہیں معاف کر دیں، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

معارف و مسائل

آیات متذکرہ سے پہلی آیات میں ڈاکہ اور بغاوت کی شرعی سزا اور اس کے احکام کی تفصیل مذکور تھی، اور آگے تین آیتوں کے بعد چوری کی شرعی سزا کا بیان آنے والا ہے، اس کے درمیان تین آیتوں میں تقویٰ، طاعت و عبادت، جہاد کی ترغیب اور کفر و عناد اور معصیت کی تباہ کاری کا بیان فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کے اس طرز خاص میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ محض حاکمانہ طور پر تعزیر و سزا کا قانون بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ مرتبہ انداز میں ذہنوں کو جہرا تم سے باز رہنے کے لئے ہموار بھی کرتا ہے، خدا تعالیٰ اور آخرت کے خوف اور جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو مستحضر کر کے ان کے قلوب کو جرم سے متنفر بناتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر قانون جرم و سزا کے پیچھے **اتَّقُوا اللَّهَ** وغیرہ کا اعادہ کیا جاتا ہے، یہاں بھی پہلی آیت میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے؛ **أَوَّلَ اتَّقُوا اللَّهَ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حقیقی طور پر خفیہ و علانیہ جرائم سے روک سکتی ہے۔

دوسرا ارشاد ہے **وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ** یعنی اللہ کا قرب تلاش کرو، لفظ **وسیلہ** و **وَسَلٌ** مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ملنے اور جڑ پونے کے ہیں، یہ لفظ سین اور صا دو دونوں سے تفسیر کیا ایک ہی معنی میں آتا ہے، فرق اتنا ہے کہ **وَسَلٌ** بالصاد مطلقاً ملنے اور جوڑنے کے معنی میں ہے، اور **وَسَلٌ** بالسين رغبت و محبت کے ساتھ ملنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ صحاح جوہری اور مفردات القرآن راغب اصفہانی میں اس کی تصریح ہے، اس لئے صا دو کے ساتھ **وُصِّلَ** اور **وُصِّلَ** ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان میل اور جوڑ پیدا کر دے، خواہ وہ میل اور جوڑ رغبت و محبت سے ہو یا کسی دوسری صورت سے اور سین کے ساتھ لفظ **وسیلہ** کے معنی اس چیز کے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے سے محبت و رغبت کے ساتھ ملا دے۔ (لسان العرب، مفردات راغب)

اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ہر وہ چیز ہے جو بندہ کو رغبت و محبت کے ساتھ اپنے معبود

کے قریب کر دے، اس لئے سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اس آیت میں وسیلہ کی تفسیر طاعت و قربت اور ایمان و عمل صالح سے کی ہے، بروایت حاکم حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ وسیلہ سے مراد قربت و طاعت ہی، اور ابن جریرؒ نے حضرت عطاءؓ اور مجاہدؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ اور ابن جریرؒ وغیرہ نے حضرت قتادہؒ سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل کی ہے: تَقَرَّبُوا إِلَيْهِ بِطَاعَتِهِ وَالْعَمَلِ بِمَا يُرْضِيهِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرو، اس کی فرمانبرداری اور رضامندی کے کام کر کے، اس لئے آیت کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرو، بذریعہ ایمان اور عمل صالح کے۔

اور منذر حسد کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وسیلہ ایک اعلیٰ درجہ ہے جنت کا جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے، تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ درجہ مجھے عطا فرمائے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مؤذن اذان کہے تو تم بھی وہی کلمات کہتے رہو جو مؤذن کہتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھو اور میرے لئے وسیلہ کی دعا کرو۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وسیلہ ایک خاص درجہ ہے جنت کا، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اور آیت مذکورہ میں ہر مومن کو وسیلہ طلب کرنے اور ڈھونڈنے کا حکم بظاہر اس خصوصیت کے منافی ہے، مگر جواب واضح ہے کہ جس طرح ہدایت کا اعلیٰ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اور آپ ہمیشہ اس کے لئے دعا کیا کرتے تھے، مگر اس کے ابتدائی اور متوسط درجات تمام مؤمنین کے لئے عام ہیں، اسی طرح وسیلہ کا اعلیٰ درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے، اور اس کے نیچے کے درجات سب مؤمنین کے لئے، آپ ہی کے واسطے اور ذریعہ سے عام ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر منظر میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ لفظ وسیلہ میں محبت و رغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہوا کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے، اور محبت پیدا ہوتی ہے اتباع سنت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہر قَاتِلِغَوْنِي يُحِبِّبْكُمْ اللَّهُ، اس لئے جتنا کوئی اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کو حاصل ہوگی، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک

محبوب ہو جائے گا، اور جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔
لفظ وسیلہ کی لغوی تشریح اور صحابہ و تابعین کی تفسیر سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الہی کے اسباب میں سے ہے، اور اسی لئے اُن کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگی، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

اور ایک روایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ وَ اَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ نَّبِیِّ الرَّحْمَۃِ (منار)

آیت مذکورہ میں اول تقویٰ کی ہدایت فرمائی گئی، پھر اللہ تعالیٰ سے ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعہ اقرب حاصل کرنے کی، آخر میں ارشاد فرمایا: وَجَاهِدْ وَاِنِّیْ سَبِیْلُہِ، یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں، اگرچہ اعمال صالحہ میں جہاد بھی داخل تھا، لیکن اعمال صالحہ میں جہاد کا اعلیٰ مقام بتلانے کے لئے اس کو علیحدہ کر کے بیان فرما دیا گیا، جیسا کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وَذَرَوْا سَابِیْہِ الْجَہَادِ، یعنی اسلام کا اعلیٰ مقام جہاد کا دوسرے اس جگہ جہاد کو اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ حکمت بھی ہے کہ پچھلی آیتوں میں فساد فی الارض کا حرام دنا جائز ہونا اور اس کی دنیوی و اخروی سزاؤں کا بیان آیا تھا، جہاد بھی ظاہر کے اعتبار سے فساد فی الارض کی صورت معلوم ہوتی ہے، اس لئے ممکن تھا کہ کوئی ناواقف جہاد اور فساد میں فرق نہ سمجھے، اس لئے فساد فی الارض کی ممانعت کے بعد جہاد کا حکم اہمیت کے ساتھ ذکر کر کے دونوں کے فرق کی طرف لفظ فی سَبِیْلُہِ سے اشارہ فرما دیا کیونکہ ڈاکہ، بغاوت وغیرہ میں جو قتل و قتال اور مال ٹوٹا جاتا ہے وہ محض اپنی ذاتی اغراض و خواہشات اور ذلیل مقاصد کے لئے ہوتا ہے، اور جہاد میں اگر اس کی نوبت آئے بھی تو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور ظلم و جور کو مٹانے کے لئے ہے جن میں زمین آسمان کا فرق ہے، دوسری اور تیسری آیت میں کفر و شرک اور معصیت کا وبال عظیم ایسے انداز میں بتلایا گیا ہے کہ اس پر ذرا بھی غور کیا جائے تو وہ انسان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دے، اور کفر و شرک اور معصیت سب کو چھوڑنے پر مجبور کر دے۔

وہ یہ ہے کہ عام طور پر انسان جن گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات و

ضروریات یا اہل و عیال کی خواہشات کے لئے ہوتا ہے اور ان سب کا حصول مال و دولت جمیع کرنے سے ہوتا ہے، اس لئے مال و دولت جمع کرنے میں حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر لگ جاتا ہو اس آیت میں اللہ جل شانہ نے اُن کی اس بدستی کے علاج کے لئے فرمایا کہ آج چند روزہ زندگی اور اس کی راحت کے لئے جن چیزوں کو تم ہزاروں محنتوں کو ششوں کے ذریعہ جمع کرتے ہو اور پھر بھی سب جمع نہیں ہوتیں، اس ناجائز ہوس کا انجام یہ ہے کہ قیامت کا عذاب جب سامنے آئے گا تو اس وقت اگر یہ لوگ چاہیں کہ دنیا میں حاصل کئے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان سب کو فدیہ دے کر اپنے آپ کو عذاب سے بچالیں تو یہ ناممکن ہے، بلکہ فرض کر لو کہ ساری دنیا کا مال و دولت اور پورا سامان اسی ایک شخص کو مل جائے، اور پھر اسی پر بس نہیں، اتنا ہی اور بھی مل جائے اور یہ سب کو اپنے عذاب سے بچنے کے لئے فدیہ بنانا چاہے تو کوئی چیز قبول نہ ہوگی، اور اس کو عذابِ آخرت سے نجات نہ ہوگی۔

تیسری آیت میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کفار کا یہ عذاب دائمی ہوگا، جس سے وہ کبھی نجات نہ پائیں گے۔

چوتھی آیت میں پھر جرائم کی سزاؤں کی طرف عود کیا گیا، اور چوری کی سزائے شرعی کا بیان فرمایا گیا، شرعی سزاؤں کی تین قسمیں جو پہلے بیان ہو چکی ہیں چوری کی سزا ان کی قسم حد میں داخل ہے، کیونکہ قرآن کریم نے اس سزا کو خود متعین فرمایا، حکام کی صوابدید پر نہیں چھوڑا اور بطور حق اللہ کے متعین فرمایا ہے، اس لئے اس کو حدِ سرقة کہا جاتا ہے، آیت میں ارشاد ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝۴۱

وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۴۲

یعنی چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو ان کے کردار کے بدلہ میں، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شرعی احکام میں خطاب عظیم پر مردوں کو ہوتا ہے اور عورتیں بھی اس میں تبعاً شامل ہوتی ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور جملہ احکام میں قرآن و سنت کا یہی اصول ہے، لیکن چوری کی سزا اور زنا کی سزا میں صرف مردوں کے ذکر پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں صنفوں کو الگ الگ کر کے حکم دیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ معاملہ حد و دکا ہے جن میں ذرا سا بھی شبہ پڑ جائے تو ساقط ہو جاتی ہیں، اس لئے عورتوں کے لئے ضمنی خطاب پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ تصریح کے ساتھ ذکر فرمایا۔

دوسری بات اس جگہ قابل غور یہ ہے کہ لفظ سرقة کا لغوی مفہوم اور شرعی تعریف کیا ہے؟

قائوس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپکر لے لے، اس کو سرقت کہتے ہیں، یہی اس کی شرعی تعریف ہے، اور اس تعریف کی رو سے سرقت ثابت ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہوتی ہیں:

ادل یہ کہ وہ مال کسی منسوب یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو، اور نہ ایسی چیزیں ہوں جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہ عام کے ادالے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہی، یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حد سرقت اس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کر سکتا ہے۔

دوسری چیز تعریف سرقت میں مال محفوظ ہوتا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگران چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہوتا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حد سرقت کا مستوجب نہیں ہوگا، اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہو جائے تو بھی حد ساقط ہو جائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقت عائد نہیں ہوگی، اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے..... کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لٹا جائے تو وہ سرقت نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہو چکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقت اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہمارے عرف میں جس کو چور کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حد سرقت یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حد شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ جن صورتوں میں چوری کی حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکم وقت اپنی صوابدید کے مطابق اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے جو جسمانی، کوڑوں کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ جن صورتوں میں سرقت کی کوئی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے حد شرعی جاری نہ ہو تو وہ شرعاً جائز و حلال ہے، کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ یہاں گناہ

اور عذاب آخرت کا ذکر نہیں، دنیوی سزا اور وہ بھی خاص قسم کی سزا کا ذکر ہے، ویسے کسی شخص کا مال بغیر اس کی خوش دلی کے کسی طرح بھی لے لیا جائے تو وہ حرام اور عذاب آخرت کا موجب ہے، جیسا کہ آیت قرآن کریم لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چوری میں جو الفاظ قرآن کریم کے آتے ہیں وہی زنا کی سزا میں ہیں، مگر چوری کے معاملہ میں مرد کا ذکر پہلے عورت کا بعد میں ہے، اور زنا میں اس کے برعکس عورت کا ذکر پہلے کیا گیا، چوری کی سزا میں ارشاد ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ اور زنا کی سزا میں فرمایا ہے: الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي، اس عکس ترتیب کی حکمتیں حضرات مفسرین نے کئی لکھی ہیں، اُن میں زیادہ دل کو لگنے والی بات یہ ہے کہ چوری کا جرم مرد کے لئے بہ نسبت عورت کے ... زیادہ شدید ہے، کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کی وہ قوت بخشی ہے جو عورت کو حاصل نہیں، اس پر کسب معاش کے اتنے دروازے کھلے ہونے کے باوجود چوری کے ذلیل جبرم میں مبتلا ہو، یہ اس کے جرم کو بڑھا دیتا ہے، اور زنا کے معاملہ میں عورت کو حق تعالیٰ طبعی حیا و شرم کے ساتھ ایسا ماحول بخشا ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے اس بے حیائی پر اترنا اس کے لئے نہایت شدید جرم ہے، اس لئے چوری میں مرد کا ذکر مقدم ہے اور زنا میں عورت کا۔

آیت مذکورہ کے الفاظ میں چوری کی شرعی سزا بیان کرنے کے بعد دو جملے ارشاد فرمائے ہیں، ایک جَزَاءً يَمْتَلِكُهَا یعنی یہ سزا بدلہ ہے اُن کی بدکرداری کا، دوسرا جملہ فَسْوَءٌ نکال دینا اللہ اس میں دو لفظ ہیں نکال اور مِنَ اللہ، لفظ "نکال" کے معنی عربی لغت میں ایسی سزا کے ہیں جس کو دیکھ کر دوسروں کو بھی سبق ملے، اور اقدام جرم سے باز آجائیں، اس لئے "نکال" کا ترجمہ ہمارے محاورہ کے موافق عبرت خیز سزا کا ہو گیا، اس میں اشارہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا خاص حکمت پر مبنی ہے، کہ ایک پر سزا جاری ہو جائے، تو سب کے سب کانپ اٹھیں، اور اس جبرم قبیح کا انسداد ہو جائے، دوسرا لفظ مِّنَ اللہ کا بڑھا کر ایک اہم مضمون کی طرف اشارہ فرمایا جو یہ ہے کہ چوری کے جرم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کا مال بغیر حق کے لے لیا، جس سے اس پر ظلم ہوا، دوسری یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی، پہلی حیثیت سے یہ سزا مظلوم کا حق ہے، اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس کا حق ہے اگر وہ سزا کو معاف کر دے تو معاف ہو جائے گی، جیسا قصاص کے تمام مسائل میں یہی معمول ہے، دوسری حیثیت سے یہ سزا حق اللہ کی خلاف ورزی

کی ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس شخص کی چوری کی ہے، اگر وہ معاف بھی کر دے تو معاف نہ ہو، جب تک خود اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمادیں، جس کو اصطلاح شرع میں حد یا حدود کہا جاتا ہے۔ لفظ مِنَ اللّٰہِ سے اس دوسری حیثیت کو متعین کر کے اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ سزا حد سے قصاص نہیں ہے، یعنی سرکاری جرم کی حیثیت سے یہ سزا دی گئی ہے، اس لئے جس کی چوری کی ہے اس کے معاف کرنے سے بھی سزا ساقط نہیں ہوگی۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ، فرمایا کہ اس شبہ کا جواب دیدیا جو آجکل عام طور پر زبان زد ہے کہ یہ سزا بڑی سخت ہے، اور بعض گستاخ یا نادان واقف تو یوں کہنے سے بھی نہیں جھجکتے کہ یہ سزا وحشیانہ ہے، نعوذ باللہ منہ، اشارہ اس کی طرف فرمایا کہ اس سخت سزا کی تجویز محض اللہ تعالیٰ کے قوسی اور زبردست ہونے کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے حکیم ہونے پر بھی مبنی ہے، جن شرعی سزائوں کو آجکل کے عقلاء یورپ سخت اور وحشیانہ کہتے ہیں انکی حکمت اور ضرورت اور فوائد کی بحث انہی آیات کی تفسیر کے بعد مفصل آئے گی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ یعنی جو شخص اپنی بدکرداری اور چوری سے باز آگیا اور اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے کیونکہ اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہیں۔ ڈاکہ زنی کی شرعی سزا جس کا بیان چند آیات پہلے آیا ہے اس میں بھی معافی کا ذکر ہے، اور چوری کی سزا کے بعد بھی معافی کا ذکر ہے، لیکن دونوں جگہ کی معافی کے بیان میں ایک خاص فرق ہے، اور اسی فرق کی بناء پر دونوں سزائوں میں معافی کا مفہوم فقہاء کے نزدیک مختلف ہے، ڈاکہ زنی کی سزا میں توبہ تعالیٰ نے بطور استثناء کے ذکر فرمایا: إِلَّا الْكَاذِبِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْرَأَ عَلَيْهِمُ السَّيْرَ، جس کا حاصل یہ ہے کہ ڈاکہ زنی کی جو شرعی سزا آیت میں مذکور ہے، اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ ڈاکوؤں پر حکومت کا قابو چلنے اور گرفتار ہونے سے پہلے جو توبہ کرے اس کو یہ سزا شرعی معاف کر دی جائے گی، اور چوری کی سزا کے بعد جو معافی کا ذکر ہے اس میں اس سزائے دنیوی سے استثناء نہیں، بلکہ آخرت کے اعتبار سے ان کی توبہ مقبول ہونے کا بیان ہے، جس کی طرف فَإِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيْهِمْ میں اشارہ موجود ہے، کہ حکام وقت اس توبہ کی وجہ سے شرعی سزا نہ چھوڑیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے جرم کو معاف فرما کر آخرت کی سزا سے نجات دیں گے، اسی لئے حضرات فقہاء تقریباً اس پر متفق ہیں کہ ڈاکہ اگر گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کر لیں تو ڈاکہ کی شرعی سزا ان پر جاری نہ ہوگی، مگر چور اگر چوری کرنے کے بعد خواہ گرفتاری سے پہلے یا بعد میں چوری سے توبہ کرے تو

حد سرقہ جو دنیوی سزا ہو وہ معاف نہ ہوگی، گناہ کی معافی ہو کر آخرت کے عذاب سے نجات پا جانا اس کے منافی نہیں۔

بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا: **أَلَمْ تَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِنْ يَشَاءُ وَيَعْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** ”یعنی کیا آپ کو معلوم نہیں... کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت و حکومت صرف اللہ کی ہے، اور اس کی یہ شان ہے کہ جس کو چاہتا ہو عذاب دیتا ہی جس کو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“

اس آیت کا ربط و مناسبت پچھلی آیات سے یہ ہے کہ پچھلی آیات میں ڈاکہ اور چوری کی حد شرعیہ جن میں ہاتھ پاؤں یا صرف ہاتھ کاٹ ڈالنے کے سخت احکام ہیں، ظاہر نظر میں یہ احکام شرافت انسانی اور اس کے اکرم المخلوقات ہونے کے منافی ہیں، اس مشبہ کے ازالہ کے لئے اس آیت میں اللہ جل شانہ نے پہلے اپنا مالک حقیقی ہوتا سا اے جہان کے لئے بیان فرمایا، پھر اپنی قادر مطلق ہونے کا ذکر فرمایا، اور ان کے درمیان یہ ارشاد فرمایا کہ وہ صرف سزایا عذاب ہی نہیں دیتے، بلکہ معاف بھی فرماتے ہیں، اور اس معافی اور سزا کا مدار ان کی حکمت پر ہے، کیونکہ وہ جس طرح مالک مطلق اور قادر مطلق ہیں اسی طرح حکیم مطلق بھی ہیں جس طرح اُن کی قدرت و سلطنت کا احاطہ کوئی انسانی طاقت نہیں کر سکتی، اسی طرح ان کی حکمتوں کا پورا احاطہ بھی انسانی عقل و دماغ نہیں کر سکتے، اور اصول کے ساتھ غور و فکر کرنے والوں کو بقدر کفایت کچھ علم ہو بھی جاتا ہے جس سے اُن کے قلوب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اسلامی سزائوں کے متعلق اہل یورپ اور ان کی تعلیم و تہذیب سے متاثر لوگوں کا یہ عام اعتراض ہے کہ یہ سزائیں سخت ہیں، اور بعض نا عاقبت اندیش لوگ تو یہ کہنے سے بھی باز نہیں آتے کہ یہ سزائیں وحشیانہ اور شرافت انسانی کے خلاف ہیں۔

اس کے متعلق پہلے تو یہ سامنے رکھئے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن کریم نے صرف چار جرموں کی سزائیں خود مفترا اور معین کر دی ہیں، جن کو شرعی اصطلاح میں حد کہا جاتا ہے، ڈاکہ کی سزا داہنا ہاتھ اور بایاں پیر، چوری کی سزا داہنا ہاتھ پہونچے پر سے کاٹنا، زنا کی سزا بعض صورتوں میں سو کوڑے لگانا اور بعض میں سنگسار کر کے قتل کر دینا، زنا کی جھوٹی ہمت کسی پر لگانے کی سزا انٹی کوڑے پانچویں حد شرعی شراب پینے کی ہے، جو باجماع صحابہ انٹی کوڑے مقرر کئے گئے ہیں، ان پانچ جرائم کے سوا تمام جرائم کی سزا حاکم وقت کی صواب دید پر ہے، کہ جرم اور مجرم اور اس کے ماحول پر نظر کر کے جتنی اور جیسی چاہے سزا دے اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سزائوں کی تحدید و تعیین کا کوئی خاص نظام اہل علم و

اہل رائے کے مشورہ سے مقرر کر کے قاضی یا جج کو ان کا پابند کر دیا جائے، جیسا کہ آجکل عموماً اسمبلیوں کے ذریعہ تعزیری قوانین متعین کئے جاتے ہیں، اور قاضی یا جج معترضہ حدود کے اندر سزا جاری کرتے ہیں، البتہ ان پانچ جرائم میں جن کی سزائیں قرآن یا اجماع سے متعین کر دی گئی ہیں، اور ان میں کسی فرد یا جماعت یا اسمبلی کو تغیر و تبدل کا کوئی اختیار نہیں ہو، مگر ان میں بھی اگر جرم کا ثبوت شریعت کے مقرر کردہ ضابطہ شہادت سے نہ ہو سکے، یا جرم کا ثبوت تو ملے مگر اس جرم پر جن شرائط کے ساتھ یہ سزا جاری کی جاتی ہے وہ شرائط مکمل نہ ہوں، اور نفسِ جسمِ قاضی یا جج کے نزدیک ثابت ہو تو اس صورت میں بھی حدِ شرعی جاری نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی، اسی کے ساتھ یہ شرعی ضابطہ بھی معتبر اور مسلم ہے کہ شبہ کا فائدہ مجرم کو پہنچتا ہے، ثبوت جرم یا جرم کی شرائط میں سے کسی چیز میں شبہ پڑ جائے تو حدِ شرعی ساقط ہو جاتی ہے، مگر نفسِ جرم کا ثبوت ہو جائے تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ جرائم میں بہت سی صورتیں ایسی نکلیں گی کہ ان میں حدودِ شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوگا، بلکہ تعزیری سزائیں صواب دید حاکم کے مطابق دی جائیں گی، تعزیری سزائیں چونکہ شریعتِ اسلام نے متعین نہیں کیں بلکہ ہر زمانہ اور ہر ماحول کے مطابق عام قوانین ممالک کی طرح ان میں تغیر و تبدل اور کمی بیشی کی جاسکتی ہے، اس لئے ان پر تو کسی کو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، اب بحث صرف پانچ جرائم کی سزاؤں میں اور ان کی بھی مخصوص صورتوں میں رہ گئی، مثال کے طور پر چوری کر لے لیجئے، اور دیکھئے کہ شریعتِ اسلام میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مطلقاً ہر چوری پر عائد نہیں، کہ جس کو عرفِ عام میں چوری کہا جاتا ہے، بلکہ سرقہ جس پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس کی ایک مخصوص تعریف ہے، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، کہ کسی کا مال محفوظ جگہ سے سامانِ حفاظت توڑ کر ناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے اس تعریف کی رو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتا ہے، حدِ سرقہ کی تعریف سے بچل جاتی ہیں، مثلاً محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام پبلک مقامات مثلاً مسجد، عید گاہ، پارک، کلب، اسٹیشن، وٹینگ روم، ریل، جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی بے نی چوری کرے، یا درختوں پر لگے ہوئے پھل چرائے، یا شہد کی چوری کرے تو اس پر حدِ سرقہ جاری نہیں ہوگی، بلکہ عام ممالک کے قوانین کی طرح تعزیری سزا دی جائے گی اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور و معمار ہو، یا کوئی دوست عزیز ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگرچہ عرفی چوری میں داخل اور تعزیری سزا کا مستحق ہے، مگر ہاتھ کاٹنے کی

شرعی سزا اس پر جاری نہ ہوگی، کیونکہ وہ آپ کے گھر میں آپ کی اجازت سے داخل ہوا، اس کے حق میں حفاظت مکمل نہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی کے ہاتھ میں سے زیور یا نقد چھین لیا، یا دھوکہ دے کر کچھ وصول کر لیا، یا امانت لے کر مگر گیا، یہ سب چیزیں حرام و ناجائز اور عینی چوری میں ضرور داخل ہیں، مگر ان سب کی سزا تعزیری ہے، جو حاکم کی صواب دید پر موقوف ہے، شرعی سرقہ کی تعریف میں داخل نہیں، اس لئے اس پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

اسی طرح کفن کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، کیونکہ اول تو وہ محفوظ جگہ نہیں، دوسرے کفن میت کی ملکیت نہیں، ہاں اس کا یہ فعل سخت حرام ہے، اس پر تعزیری سزا حسب صواب دید حاکم جاری کی جائیگی، اسی طرح اگر کسی نے ایک مشترک مال میں چوری کر لی جس میں اس کا بھی کچھ حصہ ہے، خواہ میراث کا مشترک مال تھا یا شرکت تجارت کا مال تھا، تو اس صورت میں چونکہ لینے والے کی ملکیت کا بھی کچھ حصہ اس میں شامل ہے اس ملکیت کے مشابہ کی وجہ سے حد شرعی ساقط ہو جائے گی تعزیری سزا دی جائے گی۔

یہ سب شرائط تو تکمیل حرم کے تحت میں ہیں، جن کا اجمالی خاکہ آپ نے دیکھا ہے اب دوسری چیز تکمیل ثبوت ہے، حدود کے نفاذ میں شریعت اسلام نے ضابطہ شہادت بھی عام معاملات سے ممتاز اور بہت محتاط بنایا ہے، زنا کی سزا میں تو دو گواہوں کے بجائے چار گواہوں کو شرط قرار دیا، اور وہ بھی جبکہ وہ ایسی عینی گواہی دیں جس میں کوئی لفظ مشتبہ نہ ہے، چوری وغیرہ کے معاملہ میں اگرچہ دو ہی گواہ کافی ہیں مگر ان دو کے لئے عام شرائط شہادت کے علاوہ کچھ مزید شرطیں عائد کی گئی ہیں، مثلاً دوسرے معاملات میں مواقع ضرورت میں قاضی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کسی فاسق آدمی کے بارے میں اگر قاضی کو یہ اطمینان ہو جائے کہ عملی فاسق ہونے کے باوجود یہ جھوٹ نہیں بولتا تو قاضی اس کی گواہی کو قبول کر سکتا ہے، لیکن حد و د میں قاضی کو اس کی گواہی قبول کرنے کا اختیار نہیں، عام معاملات میں ایک مرد و عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے، مگر حد و د میں دو مردوں کی گواہی ضروری ہے، عام معاملات میں شریعت اسلام نے شہادی کو رجحانی مدت دراز گزر جانے کو، کوئی عذر نہیں قرار دیا واقعہ کے کتنے ہی عرصہ کے بعد کوئی گواہی دے تو قبول کی جاسکتی ہے، لیکن حد و د میں اگر فوری گواہی نہ دی بلکہ ایک ہمینہ یا اس سے زائد دیر کر کے گواہی دی تو وہ قابل قبول نہیں۔ حد سرقہ کے نفاذ کی شرائط کا اجمالی خاکہ جو اس وقت بیان کیا گیا ہے، یہ سب فقہ حنفی کی نہایت مستند کتاب بدائع الصنائع سے ماخوذ ہے۔

حاصل ان تمام شرائط کا یہ ہے کہ حد شرعی صرف اس صورت میں جاری ہوگی جبکہ شریعت مقدسہ کے مسترکرہ ضابطہ کے مطابق جرم بھی مکمل ہو، اور اس کا ثبوت بھی مکمل، اور مکمل بھی ایسا کہ اس کا کوئی پہلو مشتبہ نہ رہے، اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے جہاں ان جرائم کی سزائیں بمقتضائے حکمت سخت مسترر کی ہیں، وہیں حدود شرعیہ کے نفاذ میں انتہائی احتیاط بھی ملحوظ رکھی ہے، حدود کا ضابطہ شہادت بھی عام معاملات کے ضابطہ شہادت سے مختلف اور انتہائی احتیاط پر مبنی ہے، اس میں ذرا سی کمی رہ جائے تو حد شرعی تعزیری سزا میں منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح تکمیل جرم کے سلسلہ میں کوئی کمی پائی جائے جب بھی حد شرعی ساقط ہو کر تعزیری سزا رہ جاتی ہے، جس کا عملی رُخ یہ ہوتا ہے کہ حدود شرعیہ کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر کبھی پیش آتی ہے، عام حالات میں حدود والے جرائم میں بھی تعزیری سزائیں جاری کی جاتی ہیں، لیکن جب کہیں تکمیل جرم تکمیل ثبوت کے ساتھ جمع ہو جائے گو وہ ایک فی صدی ہی ہو تو سزا نہایت سخت عبرتناک دی جاتی ہے، جس کی ہیبت لوگوں کے قلب و دماغ پر مسلط ہو جائے، اور اس جرم کے پاس جاتے ہوئے بھی بدن پر لرزہ پڑنے لگے جو ہمیشہ کے لئے انسداد جرم اور امن عامہ کا ذریعہ بنتی ہے، بخلاف مردودہ تعزیری قوانین کے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نظر میں ایک کھیل ہیں جس کو وہ بڑی خوشی سے کھیلتے ہیں، جیل خانہ میں بیٹھے ہوئے بھی آئندہ اس جرم کو خوبصورتی سے کرنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں، جن ممالک میں حدود شرعیہ نافذ کی جاتی ہیں ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی، کہ وہاں نہ آپ کو بہت سے لوگ ہاتھ کٹے ہوئے نظر آئیں گے، نہ ساہا سال میں آپ کو کوئی سنگساری کا واقعہ نظر پڑتا ہے، مگر ان شرعی سزائوں کی دھاک قلوب پر ایسی ہے کہ وہاں چوری، ڈاکہ اور بے حیائی کا نام نظر نہیں آتا سعودی عربیہ کے حالات سے عام مسلمان براہ راست واقف ہیں، کیونکہ حج و عمرہ کے سلسلہ میں ہر طبقہ و ہر ملک کے لوگوں کی وہاں حاضری رہتی ہے، دن میں پانچ مرتبہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں، لاکھوں کا سامان ان میں پڑا ہوا ہے، اور ان کا مالک بغیر دکان بند رکھے ہوئے نماز کے وقت حرم شریف میں پہنچ جاتا ہے، اور نہایت اطمینان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد آتا ہے، اس کو کبھی یہ وسوسہ بھی پیش نہیں آتا کہ اس کی دکان سے کوئی چیز غائب ہو گئی ہوگی، پھر یہ ایک دن کی بات نہیں، عمر یوں ہی گزرتی ہو، دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک میں ایسا کر کے دیکھئے تو ایک دن میں سینکڑوں چوریاں اور ڈاکے پڑ جائیں گے، تہذیب انسانی اور حقوق انسانی کے دعویدار عجیب ہیں

کہ جہائم پیشہ لوگوں پر تو جسم کھاتے ہیں مگر پورے عالم انسانیت پر رحم نہیں کھاتے، جن کی زندگی ان جہائم پیشہ لوگوں نے اجیرن بنا رکھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک مجرم پر ترس کھانا پوری انسانیت پر ظلم کرنے کا مرادف اور امن عامہ کو مختل کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ رب العالمین جو نیکوں، بدوں، اقیانوں، اولیاء اور کفار و فجار سب کو رزق دیتا ہے، سانپوں، بچھوؤں، شیروں، بھیڑیوں کو رزق دیتا ہے، اور جس کی رحمت سب پر وسیع ہے، اس نے جب حدود شرعیہ کے احکام و شرائط میں نازل فرمائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمْ آفَافَةٌ فِي ذُنُوبِهِمْ، یعنی اللہ کی حدود جاری کرنے میں ان مجرموں پر ہرگز ترس نہ کھانا چاہئے، اور دوسری طرف قصاص کو عالم انسانی کی حیات قرار دیا، وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ، معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حدود کے خلاف کرنیوالے چاہتے ہی نہیں کہ جہائم کا انسداد ہو، ورنہ جہاں تک رحمت و شفقت کا معاملہ ہے وہ شریعت اسلام سے زیادہ کون سکھا سکتا ہے، جس نے عین میدان جنگ میں اپنے قاتل دشمنوں کا حق پہچاننا، اور حکم دیا ہے کہ عورت سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، بچہ سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، بوڑھا سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، مذہبی عالم جو ہتھارے مقابلہ پر قتال میں شریک نہ ہو اپنے طرز کی عبادت میں مشغول ہو اس کو قتل نہ کرو۔

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان اسلامی سزاؤں پر اعتراض کے لئے اُن لوگوں کی زبانیں اٹھتی ہیں جن کے ہاتھ ابھی تک ہیر و شمشیر کے لاکھوں بے گناہ بے قصور انسانوں کے خون سے رنگین ہیں، جن کے دل میں شاید کبھی مقاتلہ اور مقابلہ کا تصور بھی نہ آیا ہو، ان میں عورتیں بچے، بوڑھے سب ہی داخل ہیں، اور جن کی آتش غضب ہیر و شمشیر کے حادثہ سے بھی ٹھنڈی نہیں ہوتی بلکہ روز کسی خطرناک سے خطرناک نئے بم کے بنانے اور تجربہ کرنے میں مشغول ہیں، ہم اس کے علاوہ کیا کہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی آنکھوں سے خود غرضی کے پردے ہٹا دے اور دنیا میں امن قائم کرنے کے صحیح اسلامی طریقوں کی طرف ہدایت کرے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ

اے رسول غم نہ کر ان کا جو دوڑ کر گرتے ہیں کفر میں

الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَحْوَاهُمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ

وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اپنے منہ سے اور ان کے دل مسلمان نہیں

وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ

اور وہ جو یہودی ہیں جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لئے وہ جاسوس ہیں دوسری

اٰخِرِيْنَ لَمْ يَأْتُوْكَ يَحْرِفُوْنَ اَلْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِ

جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئی بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اَوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُوْتُوْهُ فَاٰخِذُوْا

کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا ، اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا

وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْْءًا وَّلِلّٰكَ

اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اللہ کے ہاں یہ وہی

الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرْ قُلُوْبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے ، اُن کو دُنیا میں

خِزْيٌ ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَتُّوْنَ

ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑا عذاب ہے جاسوس کرنے والے

لِّلْكَذِبِ اَكْلُوْنَ لِّلْسُحْرِ اِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُم

جھوٹ بولنے کے لئے اور بڑے حرام کھانوں کے سوا اگر آویں وہ تیرے پاس تو فیصلہ کر دے اُن میں

اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يُّضُرُّوكَ

یا مَنہ پھیر لے اُن سے اور اگر تو مَنہ پھیر لے گا اُن سے تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ

شَيْْءًا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ

سکھیں گے ، اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر ان میں انصاف سے بے شک اللہ

يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحْكُمُوْكَ وَعِنْدَ هُمْ

دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور ان کے پاس

التَّوْرَةُ فِيْمَا حَكَمَ اللّٰهُ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

تو توریت پر جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے پیچھے پھرے جاتے ہیں ،

وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالسَّٰمِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں

رَبِطُ آيَاتِ | سورہ مائدہ کے تیسرے رکوع سے اہل کتاب کا ذکر چلا آ رہا تھا، درمیان میں قدر قلیل اور بعض مضامین خاص خاص مناسبات سے آگئے تھے، اب

آگے پھر اہل کتاب ہی کا ذکر دُرُتک چلا گیا ہے، اہل کتاب میں یہود و نصاریٰ کے دو فرقے تو تھے ہی، ایک تیسرا فرقہ اور شامل ہو گیا تھا، جو حقیقت میں یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر مسلمان ہو گئے تھے، مسلمانوں کے سامنے اپنا اسلام ظاہر کرتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں میں بیٹھتے تو اسلام اور مسلمانوں کا استہزاء کرتے تھے، مذکورہ تین آیتیں انہی تینوں فرقوں کے ایسے اعمال سے اور حالات سے متعلق ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے مقابلہ میں اپنی خواہشات اور رائیوں کو مقدم رکھتے ہیں، اور احکام و ہدایات میں تاویلیں کر کے اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی فکر میں رہتے ہیں، آیات مذکورہ میں ایسے لوگوں کی دنیاوی آخرت میں رسوائی اور انجام بد کا بیان ہے، اس کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اصولی ہدایاں اور احکام شرعیہ کا بیان ہے۔

شان نزول آیات مذکورہ کے نزول کا سبب دو واقعات ہیں، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینہ کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی قبائل میں پیش آئے، ایک واقعہ قتل و قصاص کا اور دوسرا واقعہ زنا اور اس کی سزا کا۔ یہ بات تو کسی تاریخ عالم کے جاننے والے پر مخفی نہیں کہ اسلام سے پہلے ہر جگہ ہر خطہ اور ہر طبقہ میں ظلم و جور کی حکومت تھی، قوی ضعیف کو، عزت والا بے عزت کو غلام بنائے رکھتا تھا، قوی اور عزت والے کے لئے قانون اور تھا، اور کمزور و بے عزت کے لئے قانون دوسرا تھا، جیسے آج بھی اپنے آپ کو مہذب اور متمدن کہنے والے بہت سے ممالک میں کالے اور گورے کا قانون الگ الگ ہے، محسن انسانیت رسول عسری صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آکر ان امتیازات کو مٹایا، اولادِ آدم کے حقوق کی مساوات کا اعلان کیا، اور انسان کو انسانیت اور آدمیت کا سبق دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف لانے سے پہلے حوالی مدینہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، ان میں سے بنو نضیر قوت و شوکت اور دولت و عزت میں بنو قریظہ سے زیادہ تھے، یہ لوگ آئے دن بنو قریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور وہ چار دنا چار اس کو سہتے تھے، یہاں تک کہ بنو نضیر نے بنو قریظہ کو اس ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا کہ اگر بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دے تو اس کا قصاص یعنی جان کے بدلے میں جان لینے کا اُن کو حق نہ ہوگا، بلکہ صرف ستر و ستر کجوریں اس کے خوں بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی، (ستر عربی اوزان کا ایک پیمانہ ہے، جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً پانچ من دس سیر کا ہوتا ہے) اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ بنو قریظہ کا کوئی آدمی بنو نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دے تو قانون یہ

ہوگا کہ اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے گا، اور ان سے خون بہا بھی لیا جائے گا، اور وہ بھی بنو نضیر کے خون بہا سے دوگنا یعنی ایک سو چالیس و سق کھجوریں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کا مقتول اگر عورت ہوگی تو اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے ایک مرد کو قتل کیا جائیگا، اور اگر مقتول مرد ہو تو اس کے معاوضہ میں بنو قریظہ کے دو مردوں کو قتل کیا جائے گا اور اگر بنو نضیر کے غلام کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں بنو قریظہ کے آزاد کو قتل کیا جائے گا، اور اگر بنو نضیر کے آدمی کا کسی نے ایک ہاتھ کاٹا ہے تو بنو قریظہ کے آدمی کے دو ہاتھ کاٹے جائیں گے، ایک کان کاٹا ہے تو ان کے دو کان کاٹے جائیں گے، یہ قانون تھا جو اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کے درمیان رائج تھا اور بنو قریظہ اپنی کمزوری کی بناء پر اس کے ماننے پر مجبور تھے۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور مدینہ ایک دارالاسلام بن گیا، یہ دونوں قبائل ہنوز نہ اسلام میں داخل ہوئے تھے نہ کسی معاہدہ کی رو سے اسلامی احکام کے پابند تھے، مگر اسلامی قانون کی عدل گستری اور عام سہولتوں کو دور سے دیکھ رہے تھے، اس عرصہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنو قریظہ کے ایک آدمی نے بنو نضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالا، تو بنو نضیر نے معاہدہ مذکور کے مطابق بنو قریظہ سے دوگنی دیت یعنی خون بہا کا مطالبہ کیا، بنو قریظہ اگرچہ نہ اسلام میں داخل تھے، نہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کا کوئی معاہدہ تھا، لیکن یہ لوگ یہودی تھے، ان میں بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی تھے، جو تورات کی پیشینگوئیوں کے مطابق جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی آخر الزماں ہیں، جن کے آنے کی خوش خبری توریت نے دی ہے، مگر تعصب مذہبی یا دنیوی لالچ کی وجہ سے ایمان نہ لائے تھے، اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آپ کا مذہب مساوات انسانی اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے، اس لئے بنو نضیر کے ظلم سے بچنے کے لئے ان کو ایک سہارا ملا اور انھوں نے دوگنی دیت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم تم ایک ہی خاندان سے ہیں، ایک ہی وطن کے باشندے ہیں، اور ہم دونوں کا مذہب بھی ایک یعنی یہودیت ہے، یہ غیر منصفانہ معاملہ جو آج تک تمھاری زیر دستی اور ہماری کمزوری کے سبب ہوتا رہا، اب ہم اس کو گوارا نہ کریں گے۔

اس جواب پر بنو نضیر میں اشتعال پیدا ہوا، اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، مگر پھر کچھ بڑے بوڑھوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے، بنو قریظہ کی تو یہ عین مراد تھی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے ظلم کو برقرار نہ رکھیں گے، بنو نضیر بھی باہمی گفت و شنید اور صلح کی

بنام پر اس کے لئے مجبور تو ہو گئے، مگر اس میں یہ سازش کی کہ آپ کے پاس مقدمہ لے جانے سے پہلے کچھ ایسے لوگوں کو آگے بھیجا جو اصل میں تو انہی کے ہم مذہب یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر اسلام کا اہلار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے تھے، اور مطلب ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ کسی طرح مقدمہ اور اس کے فیصلہ سے پہلے اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ اور نظریہ معلوم کر لیں، اور یہی تاکید ان لوگوں کو کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مطالبہ کے موافق فیصلہ فرمادیا تو اس کو قبول کر لینا اور اس کے خلاف کوئی حکم آیا تو ماننے کا وعدہ نہ کرنا۔

سبب نزول کا یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بغوی نے نقل کیا ہے، اور مسند احمد و ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس کا خلاصہ منقول ہے۔ (منظری)

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ زنا کا ہے، جس کی تفصیل بغویؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں یہ واقعہ پیش آیا اور تو رات کی مقرر کردہ سزا کے موافق ان دونوں کو سنگسار کرنا لازم تھا، مگر یہ دونوں کسی بڑے خاندان کے آدمی تھے، یہودیوں نے اپنی قدیم عادت کے موافق یہ چاہا کہ ان کے لئے سزائیں نرمی کی جائے، اور ان کو یہ معلوم تھا کہ مذہب اسلام میں بڑی سہولتیں دی گئی ہیں، اس بنا پر اپنے نزدیک یہ سمجھا کہ اسلام میں اس سزا میں بھی تخفیف ہوگی، خیبر کے لوگوں نے اپنی برادری بنی قریظہ کے لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ اس معاملہ کا فیصلہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کرا دیں، اور دونوں مجرموں کو بھی ساتھ بھیج دیا، منشاء ان کا بھی یہ تھا کہ اگر آپ کوئی ہلکی سزا جاری کر دیں تو مان لیا جائے ورنہ انکار کر دیا جائے، بنو قریظہ کو پہلے تو تردد ہوا کہ معلوم نہیں آپ کیسا فیصلہ کریں اور وہاں جانے کے بعد ہمیں ماننا پڑے، مگر کچھ دیر گفت و گو کے بعد یہی فیصلہ رہا کہ ان کے چند سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان مجرموں کو لے جائیں اور آپ ہی سے اس کا فیصلہ کرائیں۔

چنانچہ کعب ابن اشرف وغیرہ کا ایک وفد ان کو ساتھ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ شادی شدہ مرد و عورت اگر بدکاری میں مبتلا ہوں تو ان کی کیا سزا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا تم میرا فیصلہ مانو گے؟ انھوں نے اقرار کیا، اس وقت جبریل امین اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لے کر نازل ہوئے، کہ ان کی سزا سنگسار کر کے قتل کر دینا ہے، ان لوگوں نے جب یہ فیصلہ سنا تو بوکھلا گئے، اور ماننے سے انکار کر دیا۔ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ ان لوگوں سے

یہ کہیں کہ میرے اس فیصلہ کو ماننے یا نہ ماننے کے لئے ابن صوریہ کو حکم بنا دو، اور ابن صوریہ کے حالات و صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دی، آپ نے آنے والے وفد سے کہا کہ کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو جو سفید رنگ مگر ایک آنکھ سے معذور ہے، فدک میں رہتا ہے جس کو ابن صوریہ کہا جاتا ہے، سب نے اقرار کیا، آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ اس کو کیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ علماء یہود میں روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی عالم نہیں، آپ نے فرمایا، اس کو بلاؤ۔

چنانچہ وہ آگیا، آپ نے اس کو قسم دے کر پوچھا کہ اس صورت میں تو رات کا حکم کیا ہے؟ یہ بولا، کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم آپ نے مجھ کو دی ہے، اگر آپ قسم نہ دیتے اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ غلط بات کہنے کی صورت میں تو رات مجھے جلا ڈالے گی تو میں یہ حقیقت ظاہر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ حکم اسلام کی طرح تو رات میں بھی یہی حکم ہے کہ ان دونوں کو سنگسار کر کے قتل کرایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم پر کیا آفت آئی کہ تم تو رات کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو، ابن صوریہ نے بتلایا کہ اصل بات یہ ہے کہ زنا کی سزا شرعی تو ہمارے مذہب میں یہی ہے، مگر ہمارا ایک شہزادہ اس جرم میں مبتلا ہو گیا، ہم نے اس کی رعایت کر کے چھوڑ دیا، سنگسار نہیں کیا، پھر یہی جرم ایک معمولی آدمی سے سرزد ہوا، اور ذمہ داروں نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو مجرم کے جتھے کے لوگوں نے احتجاج کیا کہ اگر شرعی سزا اس شخص دینی ہے تو اس سے پہلے شہزادے کو دوا ورنہ ہم اس پر یہ سزا جاری نہ ہونے دیں گے، یہ بات بڑھی تو سب نے مل کر صلح کر لی کہ سب کے لئے ایک ہی ہلکی سزا تجویز کر دی جائے، اور تو رات کا حکم چھوڑ دیا جائے، چنانچہ ہم نے کچھ مار پیٹ اور منہ کالا کر کے جلوس نکالنے کی سزا تجویز کر دی، اور اب یہی سب میں راج ہو گیا۔

خلاصہ تفسیر

اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ کفر (کی باتوں) میں دوڑ دوڑ کرتے ہیں (یعنی بے تکلف رغبت سے ان باتوں کو کرتے ہیں) آپ کو وہ مغموں نہ کریں (یعنی آپ ان کے کفریات سے مغموں و متأسف نہ ہوں) خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے منہ سے تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل یقین (یعنی ایمان) لائے نہیں (مراد منافقین ہیں جو کہ ایک واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر تھے)

اور خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو کہ یہودی ہیں (جیسا دوسرے واقعہ میں یہ لوگ حاضر ہوئے تھے) یہ (دونوں قسم کے) لوگ (پہلے سے) دین کے باب میں اپنے علمائے محرفین سے (غلط باتیں سننے کے عادی ہیں) اور انہی غلط باتوں کی تائید کی جستجو میں یہاں آکر، آپ کی باتیں دوسری قوم کی خاطر سے کان دھردھرتے ہیں جس قوم کے یہ حالات ہیں کہ (ایک تو) وہ آپ کے پاس (فرط تکبر و عداوت سے خود) نہیں آئے (بلکہ دوسروں کو بھیجا، اور دوسروں کو بھیجا بھی تو طلب حق کے لئے نہیں بلکہ شاید اپنے احکام محرفہ کے موافق کوئی بات مل جائے، کیوں کہ پہلے سے) کلام (الہی) بعد اس کے کہ وہ (کلام) اپنے (صحیح) موقع پر (قائم) ہوتا ہو (لفظاً یا معنی دونوں طرح) بدلتے رہتے ہیں (چنانچہ اسی عادت کے موافق خوں بہا اور رجم کے حکم کو بھی اپنے رسم مخترع سے بدل دیا، پھر اس احتمال سے کہ شاید مشرعبت محمدیہ سے اس رسم کو سہارا لگ جائے یہاں اپنے جاسوسوں کو بھیجا، تیسرے صرف یہی نہیں کہ اپنی رسم محرف کے موافق بات کی تلاش ہی تک رہتے بلکہ مزید یہ ہے کہ جانے والوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو (دہاں جا کر) یہ حکم (محرف) ملے تب تو اس کو قبول کر لینا (یعنی اس کے موافق عمل کر کے) کرنے کا اصرار کر لینا، اور اگر تم کو یہ حکم (محرف) نہ ملے تو (اس کے قبول کرنے سے) احتیاط رکھنا (پس اس بھیجے والی قوم میں جن کی جاسوسی کرنے یہ لوگ آئے ہیں چند خرابیاں ہوئیں، اول تکبر و عداوت جو سبب ہو خود حاضر نہ ہونے کا، دوسرے طلب حق نہ ہونا بلکہ حق کو محرف کر کے اس کی تائید کی فکر ہونا، تیسرے اوروں کو بھی قبول حق سے روکنا، یہاں تک آنے والوں اور بھیجے والوں کی الگ الگ مذمت تھی، آگے ان سب کی مذمت ہے) اور (اصل یہ ہے کہ) جس کا خراب (اور گمراہ) ہونا خدا ہی کو منظور ہو (گویہ تخلیقی منظوری اس گمراہ کے عزم گمراہی کے بعد ہوتی ہے) تو اس کے لئے اللہ سے (اے عام مخاطب) تیرا کچھ زور نہیں چل سکتا کہ اس گمراہی کو نہ پیدا ہونے دے، یہ تو ایک عام قاعدہ ہوا اب یہ سمجھو کہ) یہ لوگ ایسے (ہی) ہیں خدا تعالیٰ کو ان کے دلوں کا (کفریات سے) پاک کرنا منظور نہیں ہوا کیونکہ یہ عزم ہی نہیں کرتے، اس لئے اللہ تعالیٰ تطہیر تخلیقی نہیں فرماتے بلکہ ان کے عزم گمراہی کی وجہ سے تخلیقاً ان کا خراب ہی ہونا منظور ہے، پس قاعدہ مذکور کے موافق کوئی شخص ان کو ہدایت نہیں کر سکتا، مطلب یہ ہے کہ جب یہ خود خراب رہنے کا عزم رکھتے ہیں اور عزم کے بعد اس فعل کی تخلیق عادت الہیہ ہو، اور تخلیق الہی کو کوئی روک نہیں سکتا، پھر ان کے اوپر آنے کی توقع کیا کی جائے، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تسلی ہو سکتی ہے، جس سے کلام شروع بھی ہوا تھا، پس آغاز و انجام کلام کا مضمون

تسلّی سے ہوا، آگے ان اعمال کا ثمرہ فرماتے ہیں کہ ان (سب) لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہو اور آخرت میں ان (سب) کے لئے سزائے عظیم ہے (یعنی دوزخ، چنانچہ منافقین کی یہ رسوائی ہوئی کہ مسلمانوں کو ان کا نفاق معلوم ہو گیا، اور سب ذلت سے دیکھتے تھے اور یہود کے قتل و قید و جلا وطنی کا ذکر روایات میں مشہور ہے، اور عذاب آخرت ظاہر ہی ہے) یہ لوگ (دین کے باب میں) غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں (جیسا پہلے آچکا) بڑے حرام (مال) کے کھانے والے ہیں، (اسی حرص نے ان کو احکام میں غلط بیانی کا جس کے عوض کچھ نذرانہ وغیرہ ملتا ہو) جو کر دیا، جب ان لوگوں کی یہ حالت ہے، تو اگر یہ لوگ اپنا کوئی مسئلہ لے کر آپ کے پاس (فیصلہ کرانے) آویں تو (آپ مختار ہیں) خواہ آپ ان کے معاملہ میں فیصلہ کر دیجے یا ان کو ٹال دیجے اور اگر آپ (کی یہی رائے قرار پائے کہ آپ ان کو ٹال ہی دیں تو) یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید ناخوش ہو کر عداوت نکالیں کیونکہ ان کی مجال نہیں کہ آپ کو ذرا بھی ضرر پہنچا سکیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے نگہبان ہیں) اور اگر فیصلہ کرنے پر رائے قرار پائے اور آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل (یعنی قانون اسلام) کے موافق فیصلہ کیجئے، بیشک حق تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں، (اور اب وہ عدل منحصر ہو گیا ہو قانون اسلام میں، پس وہی لوگ محبوب ہوں گے جو اس قانون کے موافق فیصلہ کریں) اور تعجب کی بات ہو کہ وہ (دین کے معاملہ میں) آپ سے کیسے فیصلہ کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تو رات (موجود) ہی، جس میں اللہ کا حکم (لکھا) ہے (جس کے ماننے کا ان کو دعویٰ ہے، اول تو یہی بات بعید ہی) پھر (یہ تعجب اس سے اور بختہ ہو گیا کہ) اس (فیصلہ لانے) کے بعد (جب آپ کا فیصلہ سنتے ہیں تو اس فیصلہ سے بھی) ہٹ جاتے ہیں (یعنی اول تو اس حالت میں فیصلہ لانے ہی سے تعجب ہوتا تھا، لیکن اس احتمال سے رفع ہو سکتا تھا کہ شاید آپ کا حق پر ہونا ان پر واضح ہو گیا ہو اس لئے آگے ہوں، لیکن جب اس فیصلہ کو نہ مانا تو وہ تعجب پھر تازہ ہو گیا کہ اب تو وہ احتمال بھی نہ رہا، پھر کیا بات ہو گی جس کے واسطے یہ فیصلہ لائے ہیں) اور (اسی سے ہر عاقل کو اندازہ ہو گیا کہ) یہ لوگ ہرگز اعتقاد... والے نہیں (یہاں اعتقاد سے نہیں آئے اپنے مطلب کے واسطے آئے تھے اور جب نہ ماننا عدم اعتقاد کی دلیل ہو تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو اعتقاد نہیں اسی طرح اپنی کتاب کے ساتھ بھی پورا اعتقاد نہیں ورنہ اس کو چھوڑ کر کیوں آتے، غرض دونوں طرف سے گئے، کہ جسے انکار ہو اس کے بھی اعتقاد نہیں اور جس سے دعویٰ اعتقاد ہے اس سے بھی نہیں۔

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں اور ان کے بعد کی آیات جن اسباب و واقعات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں اُن کا تفصیلی بیان پہلے آچکا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں کی یہ پُرانی خصلت تھی کہ کبھی اتر بابروری کے تحت، کبھی جاہ و مال کے لالچ میں لوگوں کی خواہش کی مطابقت فرمائی بنا دیا کرتے تھے، خصوصاً سزاؤں کے معاملہ میں یہ عام رواج ہو گیا تھا کہ جب کسی بڑے آدمی سے جرم سرزد ہوتا تو تورات کی سخت سزا کو معمولی سزا میں تبدیل کر دیتے تھے، ان کے اسی حال کو آیت مذکورہ میں ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے: يُخَوِّرُكَ الْكَافِرُ بَعْدَ مَا وَضَعَكَ

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور شریعت اسلام کا عجیب و غریب نظام ان کے سامنے آیا جس میں سہولت و آسانی کی بڑی رعایتیں بھی تھیں اور جسراحم کے انسداد کے لئے سزاؤں کا ایک معقول انتظام بھی، اس وقت ان لوگوں کو جو تورات کی سخت سزاؤں کو بدل کر آسان کر لیا کرتے تھے یہ موقع بھی ہاتھ آیا کہ ایسے معاملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنادیں، تاکہ آپ کی شریعت کے آسان اور نرم احکام سے فائدہ بھی اٹھالیں، اور تحریف تورات کے مجرم بھی نہ بنیں، مگر اس میں بھی یہ شرارت رہتی تھی کہ باقاعدہ حکم بنانے سے پہلے کسی ذریعہ سے اپنے معاملے کا حکم بطور فتویٰ کے معلوم کر لیں، پھر آپ کا یہ حکم اگر اپنی خواہشات کے موافق ہو تو حکم بنا کر فیصلہ کرالیں ورنہ چھوڑ دیں، اس سلسلہ کے جو واقعات ذکر کئے گئے ہیں ان میں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچی تھی اس لئے شروع آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اس پر آپ مغرور نہ ہوں یہ انجام کار آپ کے لئے خیر ہے۔

پھر یہ اطلاع دی کہ یہ لوگ مخلصانہ طور پر آپ کو حکم نہیں بنارہے، بلکہ انکی نیتوں میں فساد ہے، پھر بعد کی آیت میں آپ کو اختیار دیا کہ آپ چاہیں ان کے معاملہ کا فیصلہ فرمادیں، یا ٹال دیں، آپ کو اختیار ہے، اور یہ بھی اطلاع دیدی کہ اگر آپ ٹالنا چاہیں تو یہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، آیت فَاَحْكُم بَيْنَهُم اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ الآیۃ کا یہی مضمون ہے، اور اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے کہ اگر آپ فیصلہ دینا ہی پسند کریں تو اس میں آپ کو یہ ہدایت دی گئی کہ فیصلہ عدل و انصاف کے مطابق ہونا چاہئے جس کا مطلب یہ تھا کہ فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرمادیں، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی بعثت کے بعد تمام پہلی شریعتیں اور ان کے قوانین منسوخ ہو چکی ہیں، جب ان کے جن کو قرآن کریم اور شریعت مصطفویٰ میں باقی رکھا گیا ہے، اسی لئے بعد کی آیات میں قانون الہی کے خلاف کسی دوسرے قانون یا رسم و رواج پر فیصلہ صادر کرنے کو ظلم اور فسق و کفر قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں | یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ یہودی جمہوروں نے
کے مقدمات کا مضابطہ | اپنے مقدمات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں

بھیجا نہ ان کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان تھا، نہ یہ کہ مسلمانوں کے زیر حکم ذمی تھے، البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا معاہدہ ترک جنگ کا ہو گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں مال دیں اور چاہیں فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرمادیں، کیونکہ ان لوگوں کی کوئی ذمہ داری اسلامی حکومت پر نہیں ہے، اور اگر یہ ذمی ہوتے اور اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرتے تو حاکم مسلم پر فیصلہ کرنا فرض ہوتا، مال دینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ ان کے حقوق کی نگرانی اور ان کو ظلم سے بچانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، جیسے مسلمانوں کے حقوق اور ان سے ظلم کا رفع کرنا حکومت اسلامیہ کا فرض ہے، اسی لئے آئندہ آنے والی ایک آیت میں یہ بھی ارشاد ہے: وَإِنْ أَحْكَمَ بَيْنَهُمْ يَمَّا أَتُوا لَإِنَّ اللَّهَ وَأَلَّا تَتَّبِعَ أَهْوَاءَهُمْ، یعنی اگر یہ لوگ اپنا معاملہ آپ کے پاس لائیں تو آپ اس کا فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق فرمادیں۔

اس آیت میں اختیار دینے کے بجائے ایک متعین فیصلہ، حکم کرنے کا ارشاد ہے، امام ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں ان دونوں کی تطبیق اسی طرح کی ہے کہ پہلی آیت جس میں اختیار دیا گیا ہے وہ ان غیر مسلموں سے متعلق ہے جو ہماری حکومت کے باشندے یا ذمی نہیں بلکہ اپنی جگہ رہتے ہوئے ان سے کوئی معاہدہ ہو گیا ہے، جیسے بنو قریظہ و بنو نضیر کا حال تھا کہ اسلامی حکومت سے ان کا اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا، کہ ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ جنگ نہ کرنے کے پابند ہو گئے تھے۔

اور دوسری آیت ان غیر مسلموں کے متعلق ہے جو مسلمانوں کے ذمی اسلامی مملکت کے شہری اور زیر حکومت رہتے ہیں۔

اب یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پہلی آیت اختیار اور دوسری آیت دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت یہ ہے کہ جب ان غیر مسلموں کے معاملہ میں فیصلہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم یعنی اپنی شریعت کے مطابق کریں، ان غیر مسلموں کی خواہشات

یا ان کے مذہب کے مطابق فیصلہ نہ دیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ یہ حکم ان معاملات کے متعلق ہے جن کا ذکر ان آیات کے شان نزول میں آپ سن چکے ہیں کہ ایک معاملہ سزائے قتل اور نخل بہا کا تھا، دوسرا زنا اور اس کی سزا کا، ان جیسے معاملات یعنی جرائم کی سزاؤں میں ساری دنیا کا یہی دستور ہے کہ پورے ملک کا ایک ہی قانون ہوتا ہے، جس کو جنرل قانون کہتے ہیں، اس جنرل قانون میں طبقات یا مذاہب کی وجہ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مثلاً چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، تو یہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ہر باشندہ ملک کے لئے یہی سزا ہوگی، اسی طرح قتل و زنا کی سزائیں بھی سب کے لئے عام ہوں گی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر مسلموں کے شخصی اور خالص مذہبی معاملات کا فیصلہ بھی شریعت اسلام کے مطابق کرنا ضروری ہو۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب اور خنزیر کو مسلمانوں کے لئے تو حرام قرار دیا، اور اس پر سزا مقرر فرمائی، مگر غیر مسلموں کو اس میں آزاد رکھا، غیر مسلموں کے نکاح، شادی وغیرہ شخصی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں فرمائی، ان کے مذہب کے مطابق جو نکاح صحیح ہیں ان کو قائم رکھا۔

مقام محسر کے مجوسی اور نجران اور وادی قرآسی کے یہودی و نصاریٰ اسلامی حکومت کے ذمہ بنے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ مجوسیوں کے نزدیک اپنی ماں بہن سے بھی نکاح حلال ہے، اسی طرح یہود و نصاریٰ میں بغیر عدت گزارے یا بغیر گواہوں کے نکاح معتبر ہے، مگر آپ نے ان کے شخصی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرمائی اور ان کے نکاحوں کو برقرار تسلیم کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے باشندے ہیں ان کے شخصی اور ذاتی اور مذہبی معاملات کا فیصلہ انہی کے مذہب و خیال پر چھوڑا جائے گا، اور اگر فصلی مقدمات کی ضرورت پیش آئے گی تو انہی کے مذہب کا حاکم مقرر کر کے فیصلہ کرایا جائیگا۔ البتہ اگر یہ حاکم مسلم کے پاس رجوع ہوں اور اس کے فیصلہ پر فریقین رضا مند ہوں تو پھر مسلم حاکم فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق ہی کرے گا، کیونکہ اب وہ فریقین کی طرف سے بنائے ہوئے ثالث کا حکم رکھتا ہے، آیت کریمہ وَإِنْ أَحْكَمْتُمْ بَيْنَهُمْ فَإِنَّكُمْ جو آگے آنے والی ہے، اس میں شریعت اسلام کے مطابق فیصلہ دینے کا حکم جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے یا تو اس بنا پر کہ معاملہ قانون عام یعنی جنرل قانون کا ہے جس میں کسی فرقہ کو مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا، اور یا اس بنا پر کہ یہ لوگ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو حکم تسلیم کر کے آپ ہی سے فیصلہ کرنے کے لئے آئے تو ظاہر ہے کہ آپ کا فیصلہ وہی ہونا چاہئے جس پر آپ کا ایمان ہے اور آپ کی شریعت کا حکم ہے۔

بہر حال آیات مذکور میں سے پہلی آیت میں اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، اس کے بعد یہودیوں کی سازش سے آپ کو باخبر کیا گیا: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ سے آخر تک اسی کا بیان ہے، جس سے یہ انکشاف کرایا گیا کہ آپ کی خدمت میں آنے والا وفد منافقین کا ہے، جن کا خفیہ گٹھ جوڑ یہودیوں کے ساتھ ہوا اور انہی کا بھیجا ہوا آرہا ہے، اس کے بعد آنے والے وفد کی چند بری خصلتوں کا بیان فرما کر مسلمانوں کو اس کی بُرائی پر متنبہ فرمایا اور ضمنی طور پر یہ ہدایت فرمادی کہ یہ خصلتیں کافرانہ ہیں، ان سے بچنے اور دور رہنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہودی کی ایک بری خصلت | پہلی خصلت یہ بتلائی سَمْعُونَ رَدَّكَ یعنی یہ لوگ جھوٹی اور غلط باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے کو عالم کہلانے والے غدار یہودیوں کے ایسے اندھ متبع ہیں کہ احکامِ توراۃ کی کھلی خلاف ورزی دیکھنے کے باوجود ان کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور ان کی غلط سلط بیان کی ہوئی کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔

عوام کے لئے علماء | اس میں جس طرح تحریف کرنے والوں اور احکامِ خدا اور رسول میں غلط کے اتباع کا ضابطہ | چیزیں شامل کرنے والوں کے لئے وعیدیں ہیں، اسی طرح ان لوگوں کو بھی سخت مجرم قرار دیا ہے جو ایسے لوگوں کو امام بنا کر موضوع اور غلط روایات سننے کے عادی ہو گئے ہیں اس میں مسلمانوں کے لئے ایک اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگرچہ جاہل عوام کے لئے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کر لیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے، کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لئے کونسا ڈاکٹر ماہر ہے، کونسا حکیم اچھا ہے، اس کی ڈگریاں کیا ہیں، اس کے مطب میں جانے والے زیر علاج لوگوں پر کیا گزرتی ہے، اپنی امکانی تحقیق کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابلِ ملامت نہیں ہوتا، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا، اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خود گمشدگی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لئے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انھوں نے اپنی بستی کے

اہل علم و فن اور تجسربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدی بنایا اور اس کے فتوے پر عمل کیا تو وہ عند الناس بھی معذور سمجھا جائے گا، اور عند اللہ بھی، ایسے ہی معاملہ کے متعلق حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، فَإِنَّ إِيْتِمَاعَ عَلَى مَنِّ آفَتِي، یعنی ایسی صورت میں اگر عالم اور مفتی نے غلطی کر لی اور کسی مسلمان نے اُن کے غلط فتوے پر عمل کر لیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اُس عالم و مفتی پر ہے، اور وہ بھی اُس وقت جبکہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو یا امکانی غور و خوض میں کمی کی ہو یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا، اور لوگوں کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم و مقتدی قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے، اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی اور عالم پر نہیں ہر بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے، جس نے تحقیق کئے بغیر اپنے ایمان کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دی، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد قرآنی آیا ہے سَمِعُونَ لَكِن يَلْعَنُونَ، یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم و عمل اور امانت و دیانت کی تحقیق کئے بغیر اُن کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ حال یہودیوں کا بیان کیا ہے، اور مسلمانوں کو سنایا ہے کہ وہ اس سے محفوظ رہیں، لیکن آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بہت بڑی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار، چست و چالاک ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو بہتر سے بہتر ڈاکٹر حکیم کو تلاش کرتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل بیرسٹر ڈھونڈھ لاتے ہیں، کوئی مکان بنانا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکیٹیکٹ اور انجینیر کا مشورہ لگاتے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور کمرہ دیکھا اور کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن لیا، اس کو مقتدار، عالم، مفتی، رہبر بنا لیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس نے باقاعدہ کسی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے یا نہیں؟ علماء ماہرین کی خدمت میں رہ کر علم دین کا کچھ ذوق پیدا کیا ہے یا نہیں، کچھ عملی خدمات کی ہیں یا نہیں، سچے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر کچھ تقویٰ و طہارت پیدا کی ہے یا نہیں؟

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل و اعظول اور دکاندار پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جا پڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ کہانیاں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر

زد نہ پڑے، وہ خوش ہیں کہ ہم دین پر چل رہے ہیں، اور بڑی عبادت کر رہے ہیں، مگر حقیقت وہ ہوتی ہے جس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: الَّذِينَ بَيْنَ صَلَاتِهِمْ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا، یعنی وہ لوگ ہیں جنکی
سعی و عمل دنیا ہی میں برباد ہو چکی ہے، اور وہ اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے بڑا اچھا
عمل کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان منافق یہودیوں کا حال سَمْعُونَ يَلْعَنُونَ کے
لفظوں میں بیان کر کے ایک اہم اور بڑا اصول بتلادیا، کہ جاہل عوام کو علماء کی پرہیزی تو
ناگزیر ہے، مگر ان پر لازم ہے کہ بلا تحقیق کسی کو عالم و مفتی نہ بنالیں اور نا واقف لوگوں
سے غلط سلط باتیں سننے کے عادی نہ ہو جائیں۔

یہودی کی ایک دوسری ان منافقین کی دوسری بُری خصلت یہ بتلائی کہ سَمْعُونَ يَلْعَنُونَ
الْآخَرِينَ كَمَا يَنُفِّرُونَ، یعنی یہ لوگ بظاہر تو آپ سے ایک دینی

معاملہ کا حکم پوچھتے آئے ہیں، لیکن درحقیقت ان کا مقصد نہ دین ہے، نہ دینی معاملہ
کا حکم معلوم کرنا ہے، بلکہ یہ ایک ایسی یہودی قوم کے جاسوس ہیں جو اپنے تکبر کی وجہ سے
آپ تک خود نہیں آئے، ان کی خواہش کے مطابق صرف یہ چاہتے ہیں کہ سزا سے زنا کے
بارے میں آپ کا نظریہ معلوم کر کے ان کو بتلا دیں، پھر مانڈہ مانڈے کا فیصلہ خود کریں گے اس
میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ کسی عالم دین سے فتویٰ دریافت کرنے کے لئے ضروری
ہو کہ دریافت کرنے والے کی نیت حکم خدا و رسول کو معلوم کر کے اس کا اتباع کرنا ہو
محض مفتیوں کی رائے معلوم کر کے اپنی خواہش کے موافق حکم تلاش کرنا کھلا ہوا اتباع نفس
شیطان ہے اس سے بچنا چاہئے۔

تیسری بُری خصلت | تیسری بُری خصلت ان لوگوں کی یہ بیان فرمائی کہ یہ لوگ اللہ کے
کتاب اللہ کی تحریف | کلام کو اس کے موقع سے ہٹا کر غلط معنی پہناتے اور احکام خدا تعالیٰ

کی تحریف کرتے ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ توراۃ کے الفاظ میں کچھ رد و
بدل کر دیں اور یہ بھی کہ الفاظ تو وہی رہیں اُن کے معنی میں لغو قسم کی تاویل و تحریف کریں
یہودی ان دونوں قسموں کی تحریف کے عادی ہیں۔

مسلمانوں کے لئے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے
خود ذمہ لیا ہے، اس میں لفظی تحریف کی تو کوئی جرات نہیں کر سکتا، کہ لکھے ہوئے صحیفوں
کے علاوہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ کلام میں ایک زیر و زبر کی غلطی کوئی کرتا ہی

تو فوراً پکڑا جاتا ہے، معنوی تحریف بظاہر کی جاسکتی ہو اور کرنے والوں نے کی بھی ہے، مگر اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا ہے کہ اس امت میں قیامت تک ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو قرآن و سنت کے صحیح مفہوم کی حامل ہوگی، اور تحریف کرنے والوں کی قلعی کھول دے گی۔

چوتھی بُری خصلت | دوسری آیت میں ان کی ایک اور بُری خصلت یہ بیان فرمائی ہے: **رَشُوتٌ خَوْرٰی** اَشْكُلُوْنَ لِلْسُّحْتِ، یعنی یہ لوگ سُحت کھانے کے عادی ہیں، سُحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں، اسی معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے **فَيُسْحِكُمْ بِعَذَابٍ**، یعنی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تمہارا استیصال کر دے گا، یعنی تمہاری جڑ بنیاد ختم کر دی جائے گی، قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سُحت سے مراد رشوت ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ابراہیم نخعی، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، ضحاک وغیرہ ائمہ تفسیر نے اس کی تفسیر رشوت سے کی ہے۔

رشوت کو سُحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہو بلکہ پورے ملک و ملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک و ملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لئے شریعت اسلام میں اس کو سُحت فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے امراء و حکام کو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دیکر حرام کر دیا گیا ہے (جصاص)

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں، اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے (جصاص)

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہو اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رُو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہو، یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے، وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے، یا صوم و صلوٰۃ

اور حج اور تلاوت قرآن عبادات ہیں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، اُن پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے، تعلیم قرآن اور امامت اس سے مستثنیٰ ہیں (علیٰ فتویٰ المتأخرین) پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت لینے کا گناہ گار ہی، اور یہ مال اس کے لئے محبت اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوسرا شدید جرم، حق تلفی اور حکم خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ

ہم نے نازل کی توریت کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر

الَّذِينَ اسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبِّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا

جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم اس واسطے

أَسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا

کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے سو ستم نہ

تَخْشَوُا النَّاسَ وَآخِشُوا ۚ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا

ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خرید و میری آیتوں پر مول تھوڑا،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿۴۴﴾

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہ ہی لوگ ہیں کافر،

وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنُ بِالْعَيْنِ

اور لکھ دیا ہم نے اُن پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے جی، اور آنکھ کے بدلے آنکھ،

وَالْأَنْفُ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنُ بِالْأُذُنِ وَالسِّنُّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحُ قِصَاصٌ فَمَنْ

اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ لگے برابر پھر

تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارٌ ۚ لَّهُ ط وَ مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ

جس نے معاف کر دیا تو وہ گناہ سے پاک ہو گیا اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے

اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم

اتارا سو وہی لوگ ہیں ظالم، اور پیچھے بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر

بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَ

عیسیٰ مریم کے بیٹے کو تصدیق کرنے والا توریت کی جو آگے سے تھی اور

اتَّبِعْنَاهُ إِلَّا نَجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ ۖ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

اس کو دی ہم نے انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے

يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾

اگلی کتاب توریت کی اور راہ بتلانے والی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو

وَلِيَحْكُمَ أَهْلَ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ لَّمْ

اور چاہتے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اس میں اور جو کوئی حکم

يَحْكُمُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٣٧﴾ وَ

نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے سو وہی لوگ ہیں نامسلمان ، اور

أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ

مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ

کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان سو تو حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا

اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلِّ

اللہ نے اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا ہر ایک کو

جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ

تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک

أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا

دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہوں اپنے دیئے ہوئے حکموں میں سو تم دوڑ کر

الْخَيْرَاتِ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ

لو خوبیاں ، اللہ کے پاس تم سب کو پہنچا ہو پھر بتا دے گا جس بات میں

فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٣٨﴾ وَإِنْ أَحْكَمُ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ

تم کو اختلافات تھا اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا

اور مت چل ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکان دیں کسی ایسے حکم سے جو

أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ

اللہ نے اتارا تجھ پر پھر اگر نہ مانیں تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے کہ پہنچا دے

يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿۳۹﴾

ان کو کچھ سزا ان کے گناہوں کی اور لوگوں میں بہت ہیں فاسق انسان

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنْ اللَّهِ حُكْمًا

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا اور اللہ سے بہتر کون ہو حکم کر نیوالا

لَقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۴۰﴾

یقین کر نیوالوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر

رابطہ | سورۃ مائدہ کا ساتواں رکوع ہوا اس میں حق تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کو یکجائی طور پر ایک اہم اور خاص حکم شرع پر متنبہ فرمایا ہے، جس کا ذکر سورۃ مائدہ میں متفرق طور پر اور خاص حکم شرع پر متنبہ فرمایا ہے، اور وہ معاملہ ہے اللہ جل شانہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کا اور اس کے بھیجے ہوئے احکام میں تغیر و تبدل اور تحریف و تاویل کا جو یہود و نصاریٰ کی دائمی نصلت و عادت بن گیا تھا۔

اس رکوع میں حق تعالیٰ نے اوّل اہل تورات یہود کو مخاطب فرمایا کہ ان کو اس کج روی اور اس کے انجام بد پر ابتدائی دو آیتوں میں متنبہ فرمایا، اور اس کے ضمن میں قصاص کے متعلق بعض احکام بھی اس مناسبت سے ذکر فرمادیے کہ پچھلی آیتوں میں جو واقعہ یہود کی سازش کا ذکر کیا گیا ہے وہ قصاص کے متعلق تھا کہ بنو نضیر دیت اور قصاص میں مساوات کے قائل نہ تھے بلکہ بنو قریظہ کو اپنے سے کم دیت لینے پر مجبور کر رکھا تھا، ان دونوں آیتوں میں یہود کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا کرنے والوں کو کافرا و زطالم قرار دیا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں اہل انجیل نصاریٰ کو اسی مضمون کا خطاب فرمایا کہ اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے خلاف کوئی قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی، اور ایسا

کرنے والوں کو سرکش و نافرمان قرار دیا۔

اس کے بعد چوتھی پانچویں اور چھٹی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر مسلمانوں کو اسی مضمون کے متعلق ہدایات دی گئیں کہ وہ اہل کتاب کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں، کہ جاہ و مال کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدلنے لگیں، یا اس کے قانون کے خلاف کوئی قانون اپنی طرف سے جاری کرنے لگیں۔

اس کے ضمن میں ایک اور اہم اصولی مسئلہ یہ بھی بیان فرما دیا کہ اگرچہ اصول عقائد اور اطاعت حق جل شانہ کے معاملہ میں تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی طریقہ کے پابند ہیں، لیکن بہ تقاضائے حکمت ہر پیغمبر کو اس کے زمانہ کی مناسب شریعت دی گئی ہے جس میں بہت سے فروعی اور جزوی احکام مختلف ہیں، اور یہ بتلایا کہ ہر پیغمبر کو جو شریعت دی گئی، اس کے زمانہ میں وہی مقتضائے حکمت اور واجب الاتباع تھی، اور جب اس کو منسوخ کر کے دوسری شریعت لائی گئی تو اس وقت وہی عین حکمت و مصلحت اور واجب الاتباع ہو گئی، اس میں شریعتوں کے مختلف ہوتے رہنے اور بدلتے رہنے کی ایک خاص حکمت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

ہم نے (موسیٰ علیہ السلام) کو ریت نازل فرمائی تھی جس میں (عقائد صحیحہ کی بھی) ہدایت تھی اور (احکام عملیہ کا بھی) وضوح تھا، انبیاء (بنی اسرائیل) جو کہ (باوجود لاکھوں آدمیوں کے مقتدا و مطاع ہونے کے) اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس (توراة) کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور (اسی طرح ان میں کے) اہل اللہ اور علماء بھی (اسی کے موافق) کہ وہی اس وقت کی شریعت تھی حکم دیتے تھے، بوجہ اس کے کہ ان (اہل اللہ و علماء) کو اس کتاب اللہ پر عمل کرنے اور کرانے کی نگہداشت کا حکم (حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے) دیا گیا تھا اور وہ اس کے (یعنی اس پر عمل کرنے کرانے کے) اقرار ہی ہو گئے تھے (یعنی چونکہ ان کو اس کا حکم ہوا تھا اور انھوں نے اس حکم کو قبول کر لیا تھا، اس لئے ہمیشہ اس کے پابند رہے) سو (اے اس زمانہ کے رؤساء علماء یہود جب ہمیشہ سے تمھارے سب مقتدا، توراة کو مانتے آئے ہیں تو) تم بھی (تصدیق رسالت محمدیہ کے باب میں جس کا حکم توریت میں ہی) لوگوں سے (یہ) اندیشہ مت کرو کہ ہم تصدیق کر لیں گے تو عام لوگوں کی نظر میں ہماری جاہ میں فرق آئے گا، اور (صرف) مجھ سے ڈرو کہ تصدیق نہ کرنے پر سزا دی جائے گی، اور میرے احکام کے بدلہ میں (دنیا کی) متاعِ قلیل (جو کہ تم کو اپنے عوام سے وصول ہوتی ہے) مت لو کہ یہی حجتِ جاہ و حجتِ مال تم کو باعث

ہوتی ہیں تصدیق نہ کرنے پر) اور (یا درکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (بلکہ غیر حکم شرعی کو قصداً حکم شرعی بتلا کر اس کے موافق حکم کرے) سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں (جیسا اے یہود تم کر رہی ہو کہ عقائد میں بھی مثل عقیدۃ رسالت محمدیہ اور اعمال میں بھی جیسے حکم رجم وغیرہ اپنے مختصرات کو حکم الہی بتلا کر ضلال و اضلال میں مبتلا ہو رہے ہو) اور ہم نے ان (یہود) پر اس (توراة) میں یہ بات فرض کی تھی کہ (اگر کوئی کسی کو ناحق قتل یا زخمی کرے اور صاحب حق دعویٰ کرے تو) جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور (اسی طرح دوسرے) خاص زخموں کا بھی بدلہ ہی پھر جو شخص (اس قصاص یعنی بدلہ لینے کا مستحق ہو کر بھی) اس (قصاص) کو معاف کر دے وہ (معاف کرنا) اس (معاف کر نیوالے) کے لئے (اس کے گناہوں کا) کفارہ (یعنی گناہوں کے دور ہونے کا سبب) ہو جائیگا (یعنی معاف کرنا موجب ثواب ہے) اور (چونکہ یہود نے ان احکام کو چھوڑ رکھا تھا اس لئے مکرر وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (جس کے معنی اوپر گزرے) سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھائے ہیں (یعنی بہت برا کام کر رہی ہیں) اور ہم نے ان (نبیوں) کے پیچھے جن کا ذکر **يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ** میں آیا ہے (عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) کو اس حالت میں (پیغمبر بنا کر) بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے (جو کہ لوازم رسالت سے ہے کہ تمام کتب الہیہ کی تصدیق کرے) اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں (توریت ہی کی طرح عقائد صحیحہ کی ہدایت تھی اور) احکام عملیہ کا بھی (وضوح تھا اور وہ) (انجیل) اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق (بھی) کرتی تھی (کہ یہ بھی لوازم کتاب الہی سے ہے) اور وہ سر آہد ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے اور ہم نے انجیل دے کر حکم کیا تھا کہ (انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہو اس کے موافق حکم کیا کریں اور) (اے اس زمانہ کے نصاریٰ سن رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (اور اس کے معنی اوپر گزر چکے ہیں) تو ایسے لوگ بالکل بے حسمی کرنے والے ہیں (اور انجیل رسالت محمدیہ کی خبر دے رہی ہے، تو تم اس کے خلاف کیوں چل رہے ہو) اور (توراة و انجیل کے بعد) ہم نے یہ کتاب (مسیحی بعترآن) آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق (درستی) کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو (آسمانی) کتابیں (آج بھی) ہیں (جیسے توراة و انجیل و زبور) ان کی بھی تصدیق کرتی ہے

(کہ وہ نازل من اللہ ہیں) اور چونکہ وہ کتاب مسمیٰ بقرآن قیامت تک محفوظ و معمول رہے گی اور اس میں ان کتب سماویہ کی تصدیق موجود ہے اس لئے وہ کتاب (ان کتابوں کے صادق ہونے کے مضمون) کی ہمیشہ کے لئے محافظ ہے (کیونکہ قرآن میں ہمیشہ یہ محفوظ رہے گا کہ وہ کتب نازل من اللہ ہیں جب قرآن ایسی کتاب ہو) تو ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات میں (جب کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہو اس سے دور ہو کر ان کی (خلاف شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عمل درآمد نہ کیجئے (جیسا اب تک باوجود ان کی درخواست و التماس کے آپ نے صاف انکار فرمایا، یعنی یہ آپ کی رائے نہایت ہی درست ہے اسی پر ہمیشہ قائم رہتے، اور اے اہل کتاب تم کو اس قرآن کے حق جاننے سے اور اس کے فیصلہ کو ماننے سے کیوں انکار ہے؟ کیا دین جدید کا آنا کچھ تعجب کی بات ہے؟ آخر) تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے (اس کے قبل) ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی (مثلاً یہود کی شریعت و طریقت توراۃ تھی، اور نصاریٰ کی شریعت اور طریقت انجیل تھی، پھر اگر امت محمدیہ کے لئے شریعت و طریقت قرآن مقرر کیا گیا، جس کا حق ہونا بھی دلائل سے ثابت ہے تو وجہ انکار کیا) اور اگر اللہ تعالیٰ کو (سب کا ایک ہی طریقہ رکھنا) منظور ہوتا تو (وہ اس پر بھی قدرت رکھتے تھے) تم سب (یہود و نصاریٰ و اہل اسلام) کو (ایک ہی شریعت دے کر) ایک ہی امت میں کر دیتے (اور شرع جدید نہ آتی جس سے تم کو خوش ہوتا ہے) لیکن (اپنی حکمت سے) ایسا نہیں کیا (بلکہ ہر امت کو جدا جدا طریقہ دیا) تاکہ جو دین تم کو (ہر زمانہ میں نیا) دیا ہے اس میں تم سب کا (تمھارے اظہارِ اطاعت کے لئے) امتحان فرما دیں (کیونکہ اکثر طبعی امر ہے کہ نئے طریقہ سے وحشت اور مخالفت کی طرف حرکت ہوتی ہے، لیکن جو شخص عقل صحیح و انصاف سے کام لیتا ہے، وہ اس ظہورِ حقیقت کے بعد اپنی طبیعت کو موافقت پر مجبور کر دیتا ہے اور یہ ایک امتحانِ عظیم ہے، پس اگر سب کی ایک ہی شریعت ہوتی تو اس شریعت کی ابتداء کے وقت جو لوگ ہوتے ان کا امتحان تو ہو جاتا، لیکن دوسرے جو ان کے مقلد اور اس طریق سے مالوف ہوتے ان کا امتحان نہ ہوتا، اور اب ہر امت کا امتحان ہو گیا، اور امتحان کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو جس چیز سے روکا جائے خواہ معمول ہو یا ممتدک اس پر حرص ہوتی ہے، اور یہ امتحان شرائع کے تعدد میں اقویٰ ہے، کہ منسوخ سے رد کا جاتا ہے، اور شریعت کے اتحاد میں گو معاصی سے

روکتے، لیکن ان میں حقیقت کا تو شبہ نہیں ہوتا، اس لئے امتحان اس درجہ کا نہیں، ان دونوں امتحانوں کا مجموعہ ہر امت کے سلف اور خلف سب کو عام ہو گیا، جیسا کہ صورت اول کو صرف سلف سے خصوصیت ہے، پس جب شرع جدید میں یہ حکمت ہے، تو رتھب کو چھوڑ کر مفید باتوں کی طرف (یعنی ان عقائد و اعمال و احکام کی طرف جن پر قرآن مشتمل ہے) دوڑو (یعنی قرآن پر ایمان لا کر اس پر چلو ایک روز) تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم رہا وجود و ضوح حق کے دنیا میں خواہ مخواہ) اختلاف کیا کرتے تھے (اس لئے اس اختلاف بے جا کو چھوڑ کر حق کو جو کہ اب منحصر ہے قرآن میں قبول کرو) اور چونکہ ان اہل کتاب نے ایسی بلند پروازی کی کہ آپ سے درخواست اپنے موافق مقدمہ طے کر دینے کی کرتے ہیں، جہاں کہ اس کا احتمال ہی نہیں، اس لئے ان کے حوصلے پست کرنے کو اور اس کو سنا کر ہمیشہ ہمیشہ ان کے ناامید کر دینے کو ہم (مکرر) حکم دیتے ہیں کہ آپ ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملہ میں (جب کہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور ان کی (خلاف شرع) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عمل نہ آد نہ کیجئے (جیسا اب تک بھی نہیں کیا) اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے (آئندہ بھی مثل سابق احتیاط رکھتے کہ وہ آپ کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی بچلا دیں) یعنی گو اس کا احتمال نہیں لیکن اس کا قصد بھی رہے تو موجب ثواب بھی ہے) پھر زیادہ وجود و ضوح قرآن اور اس کے فیصلہ کے حق ہونے کے بھی) اگر یہ لوگ (قرآن سے اور آپ کے فیصلہ سے جو موافق قرآن کے ہوگا) اعراض کریں تو یقین کر لیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہو کہ ان کے بعض جرموں پر (دنیا ہی میں) ان کو سزا دیدیں (اور وہ بعض جرم فیصلہ نہ ماننا ہے اور حقانیت قرآن کے نہ ماننے کی سزا پوری آخرت میں ملے گی، کیونکہ پہلا جرم فحش ہونے کے خلاف ہے، اور دوسرا جرم ایمان کے خلاف حریت کی سزا دنیا میں ہوتی ہے اور کفر کی سزا آخرت میں) چنانچہ یہی کی گئی اور عہد شکنی جب سے مجاوز ہوئی تو ان کو سزا قتل اور قید اور اخراج وطن کی دی گئی) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے یہ حالات سن کر آپ کو بے ضرر ہوگا، لیکن آپ زیادہ غم نہ کیجئے، کیونکہ زیادہ آدمی تو (دنیا میں ہمیشہ سے) بے حکم ہی ہوتے (آئے) ہیں یہ لوگ (فیصلہ قرآنی سے جو کہ عین عدل ہے اعراض کر کے) پھر کیا زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (جس کو انھوں نے برخلاف شرائع سماویہ کے خود مخترع کر لیا تھا، جس کا ذکر دو اقوال کے ضمن میں اس رکوع سے پہلے رکوع یا ایہا الذین آمنوا

کی تمہید میں گزر چکا ہے، حالانکہ وہ سراسر عدل اور دلیل کے خلاف ہے، یعنی اہل علم ہو کر علم سے اعراض کرنا اور جہل کا طالب ہونا عجب در عجب ہے، اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہوگا (بلکہ کوئی مساوی بھی نہیں، پس خدائی فیصلہ کو چھوڑ کر دوسرے کے فیصلہ کا طالب ہونا عین جہل نہیں تو کیا ہے، لیکن یہ بات بھی) یقیناً (دو ایمان) رکھنے والوں (ہے) کے نزدیک (کیونکہ اس کا سمجھنا موقوف ہے قوت عقلیہ کی صحت پر اور وہ کفار اس کے بے نصیب ہیں)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا:

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ، یعنی ہم نے اپنی کتاب توراۃ بھیجی جس میں حق کی طرف رہنمائی اور ایک خاص نور تھا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ آج جو شریعت توراۃ کو منسوخ کیا جا رہا ہے تو اس میں توراۃ کی کوئی تنقیص نہیں، بلکہ تغیر زمانہ کے سبب تغیر احکام کی ضرورت کے ماتحت ایسا کیا گیا، ورنہ توراۃ بھی ہماری نازل کردہ کتاب ہے، اس میں بنی اسرائیل کے لئے اصول ہدایت بھی مذکور ہیں، اور ایک خاص نور بھی ہے، جو روحانی طور پر ان کے قلوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: يَحْكُمُ بِهِمَا الَّذِينَ لَئِن آسَأَلْتُمُوهُنَّ لَيَنَّيَنَّ هَآؤَآلَ السَّابِّئِينَ وَالْأَخْبَارُ۔ یعنی توراۃ کو ہم نے اس لئے نازل کیا تھا کہ جب تک اس کی شریعت کو منسوخ نہ کیا جائے اس وقت تک آنے والے انبیاء اور ان کے نائب اللہ والے اور علماء سب اسی توراۃ کے مطابق فیصلے کیا کریں، اسی قانون کو دنیا میں چلایا کریں، اس میں انبیاء علیہم السلام کے نائبین کو دو قسموں میں ذکر فرمایا ہے، پہلے رَسَبِيُونِ دوسرے أَخْبَار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے جس کے معنی ہیں اللہ والا، اور اخبار جبر کی جمع ہے، یہ ہونے کے محاور میں عالم کو جبر کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ باظاہر ہے کہ جو اللہ والا ہوگا ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہو سکتا، اور بغیر احکام الہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ والا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کہہ جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو، ورنہ وہ عالم جو احکام الہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض و واجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ و رسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے

مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرمایا کہ اگرچہ اللہ والے کے لئے علم ضروری اور عالم کے لئے عمل ضروری ہے، لیکن جن پر جن رنگ کا غلبہ ہو اس کے اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات و عمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو، اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کر لیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر، وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص عملی مہارت پیدا کر کے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض و واجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ دوسری نقلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو تجربی عالم کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت و طریقت اور علماء و مشائخ کی اصلی وحدت کو بھی بتلادیا، اور طریقہ کار اور غالب مشغلہ کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کر دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ علماء اور صوفیاء کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے طریق کار صورت متغائر نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: **بِمَا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شَهِدًا**، یعنی یہ انبیاء اور ان کے دونوں قسم کے نائبین علماء و مشائخ تورات کے احکام جاری کرنے کے پابند اس لئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی حفاظت ان کے ذمہ لگا دی تھی اور انھوں نے اس کی حفاظت کا عہد و پیمان کر لیا تھا۔

یہاں تک تورات کے کتاب الہی ہونے اور ہدایت و نور ہونے کا اور اس کا ذکر تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے نائبین مشائخ اور علماء نے اس کی حفاظت فرمائی، اس کے بعد موجودہ زمانہ کے یہودیوں کو ان کی کجروی پر اور اس کجروی کے اصلی سبب پر متنبہ فرمایا گیا کہ تم نے بجائے اس کے کہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر تورات کی حفاظت کرتے، اس کے احکام میں تحریف و تغیر و تبدل کر دیا کہ تورات میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کی خبر اور یہود کو ان پر ایمان لانے کی ہدایت مذکور تھی، ان لوگوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بجائے آپ کی مخالفت شروع کر دی اور ساتھ ہی ان کی اس جہلک غلطی کا سبب بھی بیان فرمادیا، کہ وہ تمھاری حب چاہ اور حب مال ہے، تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق جاننے کے باوجود آپ کے

اتباع سے اس لئے گھبراتے ہو کہ اب تو تم اپنی قوم کے مقتدا مانے جاؤ، یہودی عوام تمہارے پیچھے چلتے ہیں، اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو تم ایک فرد مسلم کی حیثیت میں آ جاؤ گے یہ چودھراہٹ ختم ہو جائے گی، دوسرے ان لوگوں نے یہ پیشہ بنا لیا تھا کہ بڑے لوگوں کے رشوت لے کر ان کے لئے احکام توراۃ میں تحریف کر کے آسانیاں پیدا کر دی تھیں، اس پر متنبہ فرمانے کے لئے موجودہ زمانہ کے یہود کو فرمایا کہ:

فَلَا تَخْشَوْا النَّاسَ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ
 لوگوں سے نہ ڈرو کہ وہ تمہارا اتباع چھوڑ دیں گے یا مخالف ہو جائیں گے، اور تم دنیا کی متاعِ قلیل لے کر ان کے لئے احکامِ الہی میں گڑبڑ نہ کرو کہ یہ تمہارے لئے دین و دنیا کی بربادی ہے، کیونکہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ، یعنی جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو واجب نہیں سمجھتے اور ان پر فیصلہ نہیں دیتے، بلکہ ان کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں، وہ کافر و منکر ہیں، جن کی سزا دائمی عذابِ جہنم ہے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں احکامِ قصاص اس حوالہ سے بیان کئے گئے ہیں کہ ہم نے یہ احکام توراۃ میں نازل کئے ہیں، ارشاد ہے: وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ يَكْفِيَ بِالنَّفْسِ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنِ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصًا، یعنی ہم نے یہود کے لئے توراۃ میں یہ حکم قصاص نازل کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کا بدلہ ہے۔

بنو قریظہ، بنو نضیر کا جو مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا کہ بنو نضیر نے اپنی قوت و شرکت کے بل بوتہ پر بنو قریظہ کو اس پر مجبور کر رکھا تھا کہ بنو نضیر کے کسی آدمی کو ان کا آدمی قتل کر دے تو اس کا قصاص بھی جان کے بدلے جان سے لیا جائے اور اس کے علاوہ خون بہا یعنی دیت بھی لی جائے، اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ بنو نضیر کا آدمی بنو قریظہ کے آدمی کو مار ڈالے تو کوئی قصاص نہیں، صرف دیت یعنی خون بہا دیا جائے وہ بھی بنو نضیر سے آدھا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی اس چوری کا پردہ چاک کر دیا کہ خود توراۃ میں... بھی قصاص اور دیت کی مساوات کے احکام موجود ہیں یہ لوگ جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتے ہیں، اور محض حیلہ جوئی کے لئے اپنا مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس لاتے ہیں۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ یعنی جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر حکم نہ دیں وہ ظالم ہیں، کیونکہ احکام خداوندی کے منکر اور باغی ہیں، تیسری آیت میں اول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ذکر ہے کہ وہ پھلی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، پھر انجیل کا ذکر ہے کہ وہ بھی توریت کی طرح ہدایت اور نور ہے۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا کہ اہل انجیل کو چاہئے کہ جو قانون اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے اس کے مطابق احکام نافذ کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف حکم جاری کریں وہ نافرمان اور سرکش ہیں۔

پانچویں اور چھٹی آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے انجیل کا بھی محافظ ہو کہ ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا جو اپنے سے پہلی کتابوں توریت

وانجیل کی تصدیق بھی کرتا ہے، اور ان کا محافظ بھی ہے، کیونکہ جب اہل توریت نے توریت میں اور اہل انجیل نے انجیل میں تحریف اور تغیر و تبدل کیا تو قرآن ہی وہ محافظ و نگران ثابت ہوا جس نے ان کی تحریفات کا پردہ چاک کر کے حق اور حقیقت کو روشن کر دیا اور توریت و انجیل کی اصل تعلیمات آج بھی قرآن ہی کے ذریعہ دنیا میں باقی ہیں جبکہ ان کتابوں کے وارثوں اور ان کی پیروی کے مدعیوں نے ان کا حلیہ ایسا بگاڑ دیا ہے کہ حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا، آخر آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی حکم دیا گیا جو اہل توریت اور اہل انجیل کو دیا گیا تھا، کہ آپ کے احکام اور فیصلے سب اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق ہونے چاہئیں، اور یہ لوگ جو آپؐ اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے ہیں، ان کے مکر سے باخبر ہیں، اس ارشاد کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یہود کے چند علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم یہود کے علماء اور پیشوا ہیں، اگر ہم مسلمان ہو گئے تو وہ بھی سب مسلمان ہو جائیں گے، لیکن ہماری ایک شرط یہ ہے کہ ہمارا ایک مقدمہ آپ کی قوم کے لوگوں کے ساتھ ہے ہم یہ مقدمہ آپ کے پاس لائیں گے، آپ اس میں فیصلہ ہمارے موافق فرمادیں، تو ہم مسلمان ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے مسلمان ہو جانے کے پیش نظر عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف فیصلہ ہرگز نہ دیں، اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مسلمان ہوں گے یا نہیں۔

شرائع انبیاء میں جزوی اختلاف | اس آیت میں دوسری ہدایت کے ساتھ ایک اہم اصولی سوال کا جواب بھی بیان فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ جب تمام انبیاء علیہم السلام اور اس کی حکمت

اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، اور ان پر نازل ہونے والی کتابیں اور صحیفے اور ان کی شریعتیں سب اللہ جل شانہ کی ہی طرف سے ہیں، تو پھر ان کی کتابوں اور شریعتوں میں اختلاف کیوں ہے؟ اور آنے والی شریعت و کتاب پچھلی شریعت و کتاب کو منسوخ کیوں کرتی ہے، اس کا جواب مع حکمت خداوندی کے اس آیت میں بیان کیا گیا، لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ

فِيهَا آثَكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ، یعنی ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص طریقہ عمل بنایا ہے، جس میں اصول مشترک اور متفق علیہ ہونے کے باوجود فردی احکام میں کچھ اختلافات بمصلحت ہوتے ہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت ایک ہی ملت بنا دیتا، سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لئے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش برآواز رہتے ہیں کہ جو حکم ملے اس کی تعمیل کریں، جو نئی کتاب یا شریعت آئے اس کا اتباع کریں، اور پہلی شریعت و کتاب ان کو کتنی محبوب ہو، اور آبائی مذہب ہو جانے کے سبب اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو، مگر وہ ہر وقت گوش برآواز اطاعت کے لئے تیار رہتے ہیں، اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنا بیٹھے اور اس کو ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے لئے ہوئے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے۔

اختلاف شرائع میں یہ ایک بڑی حکمت ہے، جس کے ذریعہ ہر زمانہ ہر طبقہ کے لوگوں کو صحیح عبادت و عبادت کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ درحقیقت عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت و پیروی کا جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یا ذکر و تلاوت میں منحصر نہیں اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقاصد ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک حکم الہی کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کارِ ثواب نہیں بلکہ اُلٹا گناہ کا موجب ہے، ایامِ عیدین وغیرہ جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی جہنم میں میدانِ عرفات میں جمع ہو کر دعا و عبادت کرنا کارِ ثواب نہیں جبکہ

نویں ذی الحجہ میں سب بڑی عبادت یہی ہے، اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال یہی ہے جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں اور جب اور جس حد پر ان کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، جاہل عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، جو عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں بلکہ جن قومی رسوم کو وہ عبادات سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، صریح احکام خدا و رسول کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز کر دیتے ہیں یہیں سے بدعات و محدثات دین کا جنس و بن جاتی ہیں، جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب ہوتی ہیں، اللہ جل شانہ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصد نہ بنالیں، بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جس عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔

اس کے علاوہ اختلاف شرائع کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر دور اور ہر طبقہ کے انسانوں کے مزاج و طبائع مختلف ہوتی ہیں، زمانہ کا اختلاف طبیعت انسانی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اگر سب کے لئے قریبی احکام ایک ہی کر دیئے جائیں تو انسان بڑی مشکل میں مبتلا ہو جائے، اس لئے حکمت الہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ ہر زمانہ اور ہر مزاج کے جذبات کی رعایت رکھ کر فروعی احکام میں مناسب تبدیلی کی جائے، یہاں ناسخ و منسوخ کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ حکم دینے والے کو پہلے حالات معلوم نہ تھے تو ایک حکم دیدیا، پھر نئے حالات سامنے آئے تو اس کو منسوخ کر دیا، یا پہلے غفلت و غلطی سے کوئی حکم صادر کر دیا تھا، پھر تنبیہ ہوا تو بدل دیا، بلکہ شرائع میں ناسخ و منسوخ کی مثال بالکل ایک حکیم یا ڈاکٹر کے نسخہ کی مثال ہے، کہ جس میں دوائیں تدریجاً بدل جاتی ہیں کہ حکیم ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کا استعمال کرنے کے بعد مریض پر یہ کیفیات طاری ہو جائیں گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی، جب وہ پچھلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پچھلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے ایام میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا، اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔

آیات مذکورہ میں آئے ہوئے | اول ابتدائی آیات سے معلوم ہوا کہ یہود کا مقدمہ جو آنحضرت صریح اور ضمنی احکام کا خلاصہ | صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا، اور آپ نے اس کا فیصلہ فرمایا تو یہ فیصلہ شریعتِ تورات کے مطابق تھا اس سے ثابت ہوا کہ پچھلی شریعتوں

میں جو احکام الہیہ نافذ تھے جب تک قرآن یا وحی الہی نے ان کو منسوخ نہ کیا ہو وہ بدستور باقی رہتے ہیں، جیسا کہ یہود کے مقدمات میں قصاص کی مساوات اور سزائے زنا میں سنگساری کا حکم تورات میں بھی تھا، پھر قرآن نے بھی اس کو بعینہ باقی رکھا۔

اسی طرح دوسری آیت میں زخموں کے قصاص کا حکم جو بحوالہ تورات بیان کیا گیا ہے اسلام میں بھی یہی حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا، اسی بنا پر جمہور علماء اسلام کے نزدیک ضابطہ یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے وہ احکام جن کو قرآن نے منسوخ نہ کیا ہو وہ ہماری شریعت میں بھی نافذ اور واجب الاتباع ہیں، یہی وجہ ہے کہ آیات مذکورہ میں اہل تورات کو تورات کے مطابق اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق حکم دینے اور عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں کتابیں اور ان کی شریعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں، مطلب یہ ہے کہ تورات و انجیل کے جو احکام قرآن نے منسوخ نہیں کئے وہ آج بھی واجب الاتباع ہیں۔

تیسرا حکم ان آیات میں یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف حکم دینا بعض صورتوں میں کفر ہے جبکہ اعتقاد میں بھی اس کو حق نہ جانتا ہو، اور بعض صورتوں میں ظلم و فسق ہے، جبکہ عقیدہ کی رُو سے تو ان احکام کو حق مانتا ہے، مگر عملاً اس کے خلاف کرتا ہے۔

چوتھا حکم ان آیات میں یہ آیا ہے کہ رشوت لینا مطلقاً حرام ہے، اور خصوصاً عدالتی فیصلہ پر رشوت لینا اور بھی زیادہ اشد ہے۔

پانچواں حکم ان آیات سے یہ واضح ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام اور انکی شریعتیں اصول میں تو بالکل متفق اور متحد ہیں، مگر جزوی اور فروعی احکام ان میں مختلف ہیں اور یہ اختلاف بڑی حکمتوں پر مبنی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ

وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے اور جو کوئی تم میں دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے،

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٨﴾ فَتَرَى الَّذِينَ فِي

اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو ، اب تو دیکھے گا ان کو

قُلْ بِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْجِرَ

جن کے دل میں بیماری ہو دوڑ کر ملتے ہیں اُن میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہو کہ نہ آجائے ہم پر

گردش زمانہ کی سو قریب ہو کہ اللہ جلد ظاہر فرمائے فتح یا کوئی حکم اپنا پاس سے تو لگیں اپنے جی

عَلَى مَا أَسْرَوْنَا فِي أَنْفُسِهِمْ نَذِيرٌ ۝۵۶ وَيَقُولُ الَّذِينَ

کی چھیں بات پر بچھتانے اور کہتے ہیں مسلمان

أَمَنُوا أَهْلُوا الَّذِينَ يَنْ أُقْسِمُ بِاللَّهِ بَهِدَ آيَمَانِهِمْ

کیا یہ وہی لوگ ہیں جو قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے

إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خِирٌ ۝۵۷

کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں برباد گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں ،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب

يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ

لا دیگا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہو اور وہ اس کو چاہتے ہیں نرم دل ہیں مسلمانوں پر

أَعَزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا

زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے

يَخَافُونَ لَوْمَةً لَآئِمَّةً ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

نہیں کسی کے الزام سے یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے ،

وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۵۸ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

اور اللہ کشاکش والا ہر خبردار ، تمھارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول م

وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ

اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں

الزَّكَاةَ وَهُمْ زَكَوُونَ ۝۵۹ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

زکوٰۃ اور عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی دوست رکھے اللہ اور اس کے رسول کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ

اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں

الزَّكَاةَ وَهُمْ زَكَوُونَ ۝۵۹ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

زکوٰۃ اور عاجزی کرنے والے ہیں اور جو کوئی دوست رکھے اللہ اور اس کے رسول کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ

اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں

۱۳

وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنْ حَزَبَ اللَّهُ هُمْ الْغَالِبُونَ ﴿۵۶﴾ يَا أَيُّهَا

اور ایمان والوں کو تو اللہ کی جماعت وہی سب پر غالب ہو، اے

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُنَّ وَآ

ایمان والوں مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں تمہارے دین کو ہنسی اور

وَلِعِبَائِهِمِ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ

کھیل وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے تھے پہلے اور نہ کافروں کو اپنا دوست،

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ

اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لئے

اتَّخَذُوا هُنَّ وَأَوْلِيَاءَ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۵۸﴾

تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل یہ اس واسطے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

خلاصہ تفسیر

آیات مذکورہ میں تین اہم اصولی مضامین کا بیان ہے، جو مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی وحدت و شیرازہ بندی کے بنیادی اصول ہیں:

اول یہ کہ مسلمان غیر مسلموں سے رواداری، ہمدردی، خیر خواہی، عدل و انصاف، اور احسان و سلوک سب کچھ کر سکتے ہیں، اور ایسا کرنا چاہئے کہ ان کو اس کی تعلیم دی گئی ہو، لیکن ان سے ایسی گہری دوستی اور خلط ملط جس سے اسلام کے امتیازی نشانات گڈمڈ ہو جائیں اس کی اجازت نہیں، یہی وہ مسئلہ ہے جو ”ترک موالات“ کے نام سے معروف ہو دوسرا مضمون یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی جگہ مسلمان اسی بنیادی اصول سے ہٹ کر غیر مسلموں سے ایسا خلط ملط کر لیں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے اسلام کو کوئی گزند اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ اسلام کی حفاظت اور بقا کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے، اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا، اگر کوئی قوم بڑھ جائے اور حدود و شرعیہ کو توڑ کر فرض کر لو کہ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دیں گے جو اسلام کے اصول و قانون کو قائم کرے گی،

تیسرا مضمون یہ ہے کہ جب ایک طرف منفی پہلو معلوم ہو گیا تو مسلمان کی گہری دوستی

تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور ان پر ایمان لانے والوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے، یہ اجمال ہے ان مضامین کا جو مذکورہ بالا پانچ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں، اب ان آیتوں کی مختصر تفسیر دیکھئے:

اے ایمان والو تم (منافقوں کی طرح) یہود و نصاریٰ کو (اپنا) دوست مت بنانا وہ (خود ہی) ایک دوسرے کے دوست ہیں (یعنی یہودی یہودی باہم اور نصرانی نصرانی باہم) مطلب یہ ہے کہ دوستی ہوتی ہے مناسبت سے، سو ان میں باہم تو مناسبت ہے، مگر تم میں اور ان میں کیا مناسبت (اور جب جملہ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ دوستی ہوتی ہے تناسب سے تو جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ کسی خاص مناسبت کے اعتبار سے) ان ہی میں سے ہوگا (اور گویا امر ظاہر ہے لیکن) یقیناً اللہ تعالیٰ (اس امر کی) سمجھ ہی نہیں دیتے ان لوگوں کو جو (کفار سے دوستی کر کے) اپنا نقصان کر رہے ہیں (یعنی دوستی میں ہنہمک ہونے کی وجہ سے یہ بات اُن کی سمجھ ہی میں نہیں آتی، اور چونکہ ایسے لوگ اس امر کو نہیں سمجھتے) اسی لئے (اے دیکھنے والے) تم ایسے لوگوں کو کہ جن کے دل میں (نفاق کا) مرض ہو دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان (کفار) میں گھستے ہیں (اور کوئی ملامت کرے تو حیلہ بازی اور سخن سازی کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ (ہمارا ملنا ان کے ساتھ دل سے نہیں، بلکہ دل سے تو تمھارے ساتھ ہیں صرف ایک مصلحت سے ان کے ساتھ ملتے ہیں وہ یہ کہ) ہم کو اندیشہ ہے کہ (شاید انقلاب زمانہ سے) ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے (جیسے قحط ہو تنگی ہے، اور یہ یہودی ہمارے ساتھ ہو کار ہیں ان سے قرص ادھار مل جاتا ہے، اگر ظاہری میل جول قطع کر دیں گے تو وقت پر ہم کو تکلیف ہوگی، ظاہراً نخشی آنْ تُصِيبَنَا ذَا آثَرَةٍ ط کا یہ مطلب لیتے تھے، لیکن دل میں اور مطلب لیتے کہ شاید آخر میں مسلمانوں پر کفار کے غالب آجانے سے ہم کو انکی حمایت پر پڑے اس لئے ان سے دوستی رکھنا چاہئے) سو قریب امید (یعنی وعدہ) ہے کہ اللہ تعالیٰ (مسلمانوں کی کامل) فتح (ان کفار کے مقابلہ میں جن سے یہ دوستی کر رہے ہیں) فرمادے (جن میں مسلمانوں کی کوشش کا بھی دخل ہوگا) یا کسی اور بات کا خاص اپنی طرف سے (ظہور فرمادے، یعنی ان کے نفاق کا علی التبعین بذریعہ وحی کے عام اظہار فرمادیں جس میں مسلمانوں کی تدبیر کا اصلاً دخل نہیں، مطلب یہ کہ مسلمانوں کی فتح اور ان کی پردہ دردی دونوں امر قریب ہونے والے ہیں) پھر (اس وقت) اپنے (سابق) پوشیدہ دلی خیالات پر نادام ہوں گے، کہ ہم کیا سمجھتے تھے کہ کفار غالب آویں گے اور یہ کیا برعکس ہو گیا، ایک ندامت تو اپنے خیال کی غلطی پر کہ امر طبعی ہے، دوسری ندامت اپنے

نفاق پر جس کی بدولت آج رسوا ہوئے، مآ آئیں وہاں یہ دونوں داخل ہیں، اور یہ تیسری نفاق کے کفار کے ساتھ دوستی کرنے پر انگاں ہی گئی، اور مسلمانوں سے بھی بُرے بنے، چونکہ دوستی مآ آئیں پر مبنی تھی، لہذا ان دو ندامتوں کے ذکر سے یہ تیسری بلا ذکر صریح خود مفہوم ہو گئی، اور جب اس زمانہ فتح میں ان لوگوں کا نفاق بھی کھل جائے گا تو آپس میں (مسلمان لوگ) تعجب سے کہیں گے ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ بڑے مبالغہ سے (ہمارے سامنے) قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم (دل سے) تمھارے ساتھ ہیں یہ تو کچھ اوجڑا ثابت ہوا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی ساری کارروائیاں (کہ دونوں فریق سے بھلا رہنا چاہتے تھے سب) غارت گئیں جس سے (دونوں طرف سے) ناکام رہے (کیونکہ کفار تو مغلوب ہو گئے، ان کا ساتھ دینا محض ہیکار ہے اور مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل گئی، ان سے اب بھلا بننا دشوار وہی مثل ہو گئی) ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ) اے ایمان والو! یعنی جو لوگ وقت نزول اس آیت کے ایمان والے ہیں، جو شخص تم میں سے اپنے (اس) دین سے پھر جائے تو (اسلام کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ اسلامی خدمات انجام دینے کے لئے) اللہ تعالیٰ بہت جلد (ان کی جگہ) ایسی قوم کو پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر تیز ہوں گے کافروں پر (کہ ان سے) جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور (دین اور جہاد کے مقدمہ میں) وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے (جیسا منافقین کا حال ہے کہ بے دباتے جہاد کے لئے جاتے تھے، مگر اندیشہ لگاتا تھا کہ کفار جن سے دل میں دوستی ہے ملامت کریں گے، یا اتفاق سے جن کے مقابلہ میں جہاد ہے وہی اپنے دوست اور عزیز ہوں تو سب دیکھتے سنتے طعن کریں گے کہ ایسوں کو مارنے گئے تھے) یہ (صفات مذکورہ) اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہیں عطا فرمادیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں کہ اگر چاہیں تو سب کو یہ صفات دے سکتے ہیں لیکن (بڑے علم والے (بھی) ہیں ان کے علم میں جس کو دینا مصلحت ہوتا ہو اس کو دیتے ہیں) تمھارے دوست تو (جن سے تم کو دوستی رکھنا چاہئے) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان (کے دلوں) میں خشوع ہوتا ہے، (یعنی عقائد، اخلاق و اعمال بدنی و مالی سب کے جامع ہیں) اور جو شخص (موافق مضمون مذکور) اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایمان دار لوگوں سے سو وہ اللہ کے گروہ میں داخل ہو گیا اور اللہ کا گروہ بیشک غالب ہو (اور کفار مغلوب ہیں، غالب سے

مغلوب کی سازگاری اور دوستی کی فکر کرنا محض نازیبا ہی (اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی توریت و انجیل) مل چکی ہے (مراد یہود و نصاریٰ) جو ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہو (جو علامت ہو تکذیب کی) ان کو اور (اسی طرح) دوسرے کفار کو (بھی جیسے مشرکین وغیرہ) دوست مت بناؤ (کیونکہ اصل علت کفر و تکذیب تو مشترک ہی) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (یعنی ایمان دار تو ہو ہی پس جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اس کو مت کرو) اور (جیسے اصول دین کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں) اسی طرح فروع کے ساتھ بھی چنانچہ) جب تم نماز کے لئے (اذان کے ذریعہ سے) اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ (تمہاری) اس (عبادت) کے ساتھ (جس میں اذان اور نماز دونوں آگئیں) ہنسی اور کھیل کرتے ہیں (اور) یہ (حرکت) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے (و نہ امر حق کو سمجھتے اور اس کے ساتھ ہنسی نہ کرتے) :

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے موالات (یعنی گہری دوستی) نہ کریں جیسا کہ عام غیر مسلموں کا اور یہود و نصاریٰ کا خود یہی دستور ہے کہ وہ گہری دوستی کو صرف اپنی قوم کے لئے مخصوص رکھتے ہیں مسلمانوں سے یہ معاملہ نہیں کرتے پھر اگر کسی مسلمان نے اس کی خلاف ورزی کر کے کسی یہودی یا نصرانی سے گہری دوستی کر لی تو وہ اسلام کی نظر میں بجائے مسلمان کے اسی قوم کا فرد شمار ہونے کے قابل ہو۔

شان نزول | امام تفسیر ابن جریر نے ہر روایت عکرمہؓ بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد ان اطراف کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ اس پر کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے، نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی امداد کریں گے، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی طرح مسلمان ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ ان کے خلاف کسی قوم کی امداد کریں گے بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے، کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ جانیبین سے قائم رہا، لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لئے خط لکھ دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ نے

ان کے مقابلہ کے لئے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیا، بنو قریظہ کے یہ یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے، اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے، اس لئے یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی گہری دوستی سے روک دیا، تاکہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کر سکیں، اُس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہ بن صامت وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور ترک موالات کا اعلان کر دیا، اور بعض لوگ جو منافق طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا ابھی ایمان اُن کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے قطع تعلق کر دینے میں یہ خطرات محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکین و یہودی سازش کا میاب ہو جائے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں تو ہمیں اُن لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہیے کہ اُس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہو جائے، عبداللہ بن ابی بن سلول نے اسی بنا پر کہا کہ ان لوگوں سے قطع تعلق میں تو مجھے خطرہ ہی اس لئے ایسا نہیں کر سکتا اس پر دوسری آیت نازل ہوئی:

فَتَوَسَّى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا آتٍ ۖ
نِفَاقٌ كَامِرٌ هُوَ أَظْنَرُ ۖ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْفٰكِرِ ۚ
یعنی ترک موالات کا حکم شرعی سنکر وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہوا اپنے کافر دوستوں کی طرف دوڑنے لگے اور کہنے لگے کہ ان سے قطع تعلق کرنے میں تو ہمارے لئے خطرات ہیں۔

اللہ جل شانہ نے ان کے جواب میں فرمایا: فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنَّ بِالْفَتْحِ أَوْ
أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ ۖ فَيُصِيبُكُمْ أَهْلًا مِّمَّا أَتَيْتُمْ ۖ وَإِنِّي لَأَنفُسِهِمْ مِّنْ ذٰلِكُمْ مِّنِي ۚ
اس خیال میں ہیں کہ مشرکین اور یہود مسلمانوں پر غالب آجائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما چکے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ قریب ہی کہ مکہ فتح ہو جائے، یا فتح مکہ سے پہلے اللہ تعالیٰ ان منافقین کے نفاق کا پردہ چاک کر کے ان کو رسوا کر دے، تو اس وقت یہ لوگ اپنے مخفی خیالات پر نادام ہوں گے۔

تیسری آیت میں اس کی مزید تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ جب منافقین کے نفاق کا پردہ چاک ہوگا اور ان کی دوستی کے دعووں اور قسموں کی حقیقت کھلے گی تو مسلمان حیرت میں رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو ہم سے اللہ تعالیٰ کی مغلط قسمیں کھا کر دوستی کا دعویٰ کرتے تھے اور آج ان کا یہ حشر ہوا کہ ان کے سب اسلامی

اعمال جو محض دکھلاوے کے لئے کیا کرتے تھے ضائع ہو گئے، اور اللہ جل شانہ نے ان آیات میں جو فتح مکہ اور منافقین کی رسوائی کا ذکر فرمایا ہے وہ چند روز کے بعد سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

چوتھی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ گہری دوستی اور خلط ملط کی جو ممانعت کی گئی ہے یہ خود مسلمانوں ہی کے مفاد کی خاطر ہے، ورنہ اسلام وہ دین حق ہے جس کی حفاظت کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے، کسی فرد یا جماعت کی کج روی یا نافرمانی تو بجائے خود ہے، اگر مسلمانوں کا کوئی فرد یا جماعت سچ مچ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے اور بالکل ہی مرتد ہو کر غیر مسلموں میں مل جائے اس سے بھی اسلام کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قادر مطلق جو اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے فوراً کوئی دوسری قوم میدان عمل میں لے آئے گا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اشاعت کے فرائض انجام دے گی، اس کے کام نہ کسی ذات پر موقوف ہیں نہ کسی بڑی سے بڑی جماعت یا ادارہ پر وہ جب چاہتے ہیں تو تنہا سے شہتیر کا کام لے لیتے ہیں، ورنہ شہتیر پڑے کھا دھوئے رہتے ہیں، کسی نے خوب کہا ہے

إِنَّ الْمَقَادِيرَ إِذَا سَاعَدَتْ

الْحَقِّقَتِ الْعَاجِزَ بِإِثْقَادٍ

”یعنی تفتیر آتی جب کسی کی مددگار ہو جاتی ہے تو ایک عاجز و بیکار

سے قادر و توانا کا کام لے لیتی ہے“

اس آیت میں جہاں یہ ذکر فرمایا کہ مسلمان اگر مرتد ہو جائیں تو پروا نہیں، اللہ تعالیٰ ایک دوسری جماعت کھڑی کر دے گا، وہاں اس پاکباز جماعت کے کچھ اوصاف بھی بیان فرماتے ہیں کہ یہ جماعت ایسے اوصاف کی حامل ہوگی، دین کی خدمت کرنے والوں کو ان اوصاف کا خیال رکھنا چاہئے، کیونکہ آیت سے معلوم ہوا کہ ان اوصاف و عادات کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و محبوب ہیں۔

ان کی پہلی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے محبت رکھوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھیں گے، اس صفت کے دو جز ہیں، ایک ان لوگوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ، یہ تو کسی نہ کسی درجہ میں انسان کے خستیار میں سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک انسان کو کسی کے ساتھ اگر طبعی محبت نہ ہو تو کم از کم عقلی محبت اپنے عزم و ارادہ کے تابع رکھ سکتا ہے، اور طبعی محبت بھی اگر چہ خستیار میں نہیں، مگر اس کے بھی سبب اختیاری ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور قدرت کاملہ اور انسان پر اس کے اختیارات

انعامات کا مراقبہ اور تصور لازمی طور پر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت طبعی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن دوسرا جز یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت ان لوگوں کے ساتھ ہوگی، اس میں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خستیار و عمل کا کوئی دخل ہمیں نہیں، اور جو چیز ہماری قدرت و اختیار سے باہر ہے اسے سنانے اور بتلانے کا بھی بظاہر کوئی حاصل نہیں نکلتا۔

لیکن قرآن کریم کی دوسری آیات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ محبت کے اس جز کے اسباب بھی انسان کے خستیار میں ہیں، اگر وہ ان اسباب کا استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اُن کے ساتھ لازمی ہوگی، اور وہ اسباب آیت قرآن قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ میں مذکور ہیں، یعنی اے رسول! آپ لوگوں کو بتلا دیجئے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو تو میرا اتباع کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمانے لگیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرمائیں اس کو چاہئے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی کا محور بنالے، اور زندگی کے ہر شعبے اور ہر کام میں سنت کے اتباع کا التزام کرے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس سے محبت فرمائیں گے، اور اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کفر و ارتداد کا مقابلہ وہی جماعت کر سکے گی جو متبع سنت ہو، نہ احکام شرعیہ کی تعمیل میں کوتاہی کرے، اور نہ اپنی طرف سے خلاف سنت اعمال کو اور بدعات کو جاری کرے۔

دوسری صفت اس جماعت کی یہ بتلائی گئی ہے کہ أَذَلَّتْ عَلَى الْمَوْتِ يُنِيبُ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ، اس میں لفظ أَذَلَّتْ حسب تصریح قاموس ذلیل یا ذلول دونوں کی جمع ہو سکتی ہے، ذلیل کے معنی عربی زبان میں وہی ہیں جو اردو وغیرہ میں معروف ہیں، اور ذلول کے معنی ہیں نرم اور سہل الانقیاد، یعنی جو آسانی سے قابو میں آجائے، جمہور مفسرین کے نزدیک اس جگہ یہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے، اگر کسی معاملہ میں اختلاف بھی ہو تو آسانی سے قابو میں آجائیں گے، جھگڑا چھوڑ دیں گے، اگرچہ وہ اپنا جھگڑے میں حق بجانب بھی ہوں، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: أَنَا ذَعِيمٌ بَيْنَ رِبْضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌ، یعنی میں اس شخص کو وسط جنت میں گھر دلوانے کی ذمہ داری لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔

تو حاصل اس لفظ کا یہ ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اپنے حقوق اور معاملات میں کوئی

جھگڑا نہ رکھیں گے، دوسرا لفظ آعِزَّةٌ عَلٰی الْكُفْرِ یُنِّ، آیا، اس میں بھی آعِزَّةٌ، عزیز کی جمع ہے، جس کے معنی غالب، قوی اور سخت کے آتے ہیں، مراد یہ ہو کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں سخت اور قوی ہیں اور وہ ان پر قابو نہ پاسکیں گے۔

اور دونوں جملوں کو ملانے کا حاصل یہ نکل آیا کہ یہ ایک ایسی قوم ہوگی جس کی محبت و عداوت اور دوستی، دشمنی اپنی ذات اور ذاتی حقوق و معاملات کے بجائے صرف اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر ہوگی، اسی لئے ان کی لڑائی کا رُخ اللہ و رسول کے فسرماں برداروں کی طرف نہیں بلکہ اس کے دشمنوں اور منافقوں کی طرف ہوگا، یہی مضمون ہو سورۃ فتح کی اس آیت کا، اَشِدَّ اَعْمَلٰی الْكُفَّارِ رَحَمَاءٌ بِبَيْنِهِمْ۔

پہلی صفت کا حاصل حقوق کی تکمیل تھا، اور دوسری صفت کا حاصل حقوق العباد اور معاملات کا اعتدال ہے، تیسری صفت اس جماعت کی یہ بیان فرمائی، يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، یعنی یہ لوگ دین حق کی اشاعت اور برتری کے لئے جہاد کرتے رہیں گے اس کا حاصل یہ ہو کہ کفر و ارتداد کے مقابلہ کے لئے صرف معروف قسم کی عبادت گزاری اور نرم و سخت ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اقامت دین کا جذبہ بھی ہو، اسی جذبہ کی تکمیل کے لئے چوتھی صفت یہ بتلائی گئی وَلَا يَخَافُؤْنَ كَوْمَةً لَا تِمْ، یعنی اقا دین اور کلمہ حق کے سر بلند کرنے کی کوشش میں یہ لوگ کسی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی تحریک کو چلانے والے کی راہ میں دو قسم کی چیزیں حائل ہوا کرتی ہیں، ایک مخالف قوت کا زور دوسرے اپنوں کے لعن طعن اور ملامت اور سب سے شائد ہو کہ جو لوگ تحریک چلانے کے لئے عزم لے کر کھڑے ہوتے ہیں، اور اکثر حالات میں مخالف قوت تو مغلوب نہیں ہوتے، قید و بند اور زخم و خون سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں، لیکن اپنوں کے طعنوں اور تشنیع و تفتیح سے بڑے بڑے عزم والوں کے قدم میں لعن و تشنیع آجاتی ہے، شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ اس کی اہمیت بتلانے کے لئے اس پر اکتفا فرمایا، کہ یہ لوگ کسی کی ملامت کی پروا نہ کریں بغیر اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں۔ آخر آیت میں یہ بھی بتلادیا کہ یہ صفات اور خصائل حَسَنَہ اللہ تعالیٰ ہی کے انعام ہیں، وہی جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، انسان محض اپنے سعی و عمل سے بغیر فضل خداوندی کے ان کو حاصل نہیں کر سکتا۔

آیت کے الفاظ کی تشریح سے یہ واضح ہو چکا کہ اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ مرتد بھی ہو جائیں تو دین اسلام کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، بلکہ اس کی حفاظت و حمایت کیلئے

اللہ جل شانہ ایک اعلیٰ اخلاق و اعمال کی جماعت کو کھڑا کر دیں گے۔
 جمہور مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت درحقیقت آنے والے فتنہ کی پیشینگوئی
 اور اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے کامیاب ہونے والی جماعت کے لئے بشارت ہے
 آنے والا وہ فتنہ ارتداد ہے جس کے کچھ جراثیم تو عہد نبوت کے بالکل آخری ایام میں پھیلنے
 لگے تھے، اور پھر بعد وفات آنحضرتؐ کے عام ہو کر پورے جزیرۃ العرب میں اس کا طوفان
 کھڑا ہو گیا اور بشارت پانے والی وہ جماعت صحابہ کرامؓ کی ہی جس نے خلیفہ اول صدیق اکبرؓ
 کے ساتھ مل کر اس فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا۔

واقعات یہ تھے کہ سب سے پہلے تو میلہ کذاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
 ساتھ شریک نبوت ہونے کا دعویٰ کیا، اور یہاں تک جرأت کی کہ آپ کے قاصدوں کو یہ کہہ کر
 واپس کر دیا کہ اگر بصلحت تبلیغ و اصلاح یہ دستور عام نہ ہوتا کہ قاصدوں اور سفیروں کو قتل
 نہیں کیا جاتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا، میلہ اپنے دعوے میں کذاب تھا، پھر آپ کو اس کے خلاف
 جہاد کا موقع نہیں ملا، یہاں تک کہ وفات ہو گئی۔

اسی طرح یمن میں قبیلہ مذحج کے سردار اسود غسی نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے مقرر کئے ہوئے حاکم یمن کو اس کا مقابلہ
 کرنے کا حکم دیدیا، مگر جس رات میں اس کو قتل کیا گیا اس کے اگلے دن ہی آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، صحابہ کرامؓ تک اس کی خبر ربیع الاول کے آخر میں
 پہنچی، اسی طرح کا واقعہ قبیلہ بنو آسد میں پیش آیا کہ ان کا سردار طلحہ بن خویلد خود اپنی
 نبوت کا مدعی بن گیا۔

یہ تین قبیلوں کی جماعتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات ہی میں
 مرتد ہو چکی تھیں، آپ کی وفات کی خبر نے اس فتنہ ارتداد کو ایک طوفانی شکل میں منتقل
 کر دیا، عرب کے سات قبیلے مختلف مقامات پر اسلام اور اس کی حکومت سے منحرف ہو گئے،
 اور خلیفہ وقت ابو بکر صدیقؓ کو اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا
 وفات سردار کائنات کے بعد ملک و ملت کی ذمہ داری خلیفہ اول حضرت صدیق
 اکبرؓ پر عائد ہوئی، ایک طرف ان حضرات پر اس حادثہ عظیم کا صدمہ جا نگداز اور دوسری
 طرف یہ فتنوں اور بغاوتوں کے سیلاب، صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو صدمہ میرے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ پر پڑا اگر وہ
 مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑ جاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر ستقامت

کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا کہ تمام آفات و مصائب کا پرے عزم و ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔

بغاوتوں کا مقابلہ ظاہر ہے کہ طاقت استعمال کر کے ہی کیا جاسکتا ہے، مگر حالات کی نزاکت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ صدیق اکبرؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو کسی کی رائے نہ ہوئی کہ اس وقت بغاوتوں کے مقابلہ میں کوئی سخت قدم اٹھایا جائے، خطرہ یہ تھا کہ حضرات صحابہؓ اگر اندرونی جنگ میں مشغول ہو جائیں تو بیرونی طاقتیں اس جدید اسلامی ملک پر دوڑ پڑیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے قلب کو اس جہاد کے لئے مضبوط فرمادیا، اور آپؐ نے ایک ایسا بلیغ خطبہ صحابہ کرام کے سامنے دیا کہ اس جہاد کے لئے ان کا بھی شرح صدر ہو گیا، اس خطبہ میں اپنے پورے عزم و استقلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکام اور قانون اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرے مقابلہ پر تمام جن و انفس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں، اور کوئی میرا سا تھی نہ ہو، تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا۔

اور یہ نسر ماکر گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلنے لگے، اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبرؓ کو اپنی جگہ بٹھلا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا، اسی لئے حضرت علی مرتضیٰؓ، حسن بصریؓ، ضحاکؓ، قتادہ وغیرہ جمہور ائمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آئی ہے وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے، جن کے من جانب اللہ میدانِ عمل میں لائے جانے کا آیت مذکورہ میں ارشاد ہے۔

مگر یہ اس کے منافی نہیں کہ کوئی دوسری جماعت بھی اس آیت کی مصداق ہو، اس لئے جن حضرات نے اس آیت کا مصداق حضرت ابوموسیٰؓ، شعیبؓ یا دوسرے صحابہ کرام کو قرار دیا ہے، وہ بھی اس کا مخالف نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ یہ سب حضرات بلکہ قیامت تک آنے والا وہ مسلمان جو قرآنی ہدایات کے مطابق کفر و ارتداد کا مقابلہ کریں گے، اسی آیت کے مصداق میں داخل ہوں گے، بہر حال صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت حضرت صدیق اکبرؓ کے زیر ہدایت اس فتنہ ارتداد کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی، حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک بڑا لشکر دے کر مسلمانہ کذاب کے مقابلہ پر یمامہ کی طرف روانہ کیا،

وہاں میلہ کذاب کی جماعت نے اچھی خاصی طاقت پکڑ لی تھی، سخت معرکے ہوئے، بالآخر مسلمان کذاب حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا، اور اس کی جماعت تائب ہو کر پھر مسلمان میں مل گئی، اسی طرح طلحہ بن خویلد کے مقابلہ پر بھی حضرت خالدؓ ہی تشریف لے گئے، وہ فرار ہو کر کہیں باہر چلا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خود بخود ہی اسلام کی دوبارہ توفیق بخشی، اور مسلمان ہو کر نوٹ آئے۔

خلافت صدیقی کے پہلے مہینہ ربیع الاول کے آخر میں اسود عسی کے قتل اور اس کی قوم کے مطیع و فرمانبردار ہو جانے کی خبر پہنچ گئی، اور یہی خبر سب سے پہلی فتح کی خبر تھی، جو حضرت صدیق اکبرؓ کو ان حالات میں پہنچی تھی، اسی طرح دوسرے قبائل مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں بھی ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو فتح مبین نصیب فرمائی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو تیسری آیت کے آخر میں مذکور ہے، فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ، یعنی اللہ والوں کی جماعت ہی غالب آکر رہے گی، اس کی عملی تفسیر دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لی، اور جبکہ تاریخی اور واقعاتی رنگ میں یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قبائل عرب میں فتنہ ارتداد پھیلنا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قوم کھڑی فرمائی وہ صدیق اکبرؓ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام ہی تھے، تو اس آیت ہی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو اوصاف اس جماعت کے قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں وہ سب صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقاء صحابہ کرام میں موجود تھے، یعنی:

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب حضرات مسلمانوں کے معاملات میں نہایت نرم ہیں اور کفار کے معاملہ میں تیز۔

چوتھے یہ کہ ان کا جہاد ٹھیک اللہ کی راہ میں تھا، جس میں انھوں نے کسی کی ملامت وغیرہ کی پرواہ نہیں کی۔

آخر آیت میں اس حقیقۃ الحقائق کو واضح فرما دیا کہ یہ سب صفات کمال پھر ان کا ہر وقت استعمال، پھر ان کے ذریعہ اسلامی مہم میں کامیابی یہ سب چیزیں نرمی تدبیر یا طاقت یا جماعت کے بل بوتہ پر حاصل نہیں ہوا کرتیں، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہر وہی جس کو چاہتے ہیں یہ نعمت عطاء فرماتے ہیں۔

سابقہ چار آیات میں مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ گہری دوستی رکھنے سے منع فرمایا گیا پانچویں آیت میں مثبت طور پر یہ بتلایا گیا کہ مسلمانوں کو گہری دوستی اور رفاقت خاص کا تعلق جن سے ہو سکتا ہے وہ کون ہیں، ان میں سب پہلے اللہ تعالیٰ اور پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے، کہ درحقیقت مومن کا ولی و رفیق ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور وہی ہو سکتا ہے، اور اس کے تعلق کے سوا ہر تعلق اور ہر دوستی فانی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے، اس سے الگ نہیں، تیسرے نمبر میں مسلمانوں کے رفیق اور مخلص دوست ان مسلمانوں کو قرار دیا ہے جو صرف نام کے مسلمان نہیں، بلکہ سچے مسلمان ہیں، جن کی تین صفات اور علامات یہ بتلائی ہیں،

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ سَاكِعُونَ

اول یہ کہ وہ نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ پابندی سے ادا کرتے ہیں، دوسری یہ کہ اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، تیسرے یہ کہ وہ لوگ متواضع اور فروتنی کرنے والے ہیں اپنے اعمال خیر پر ناز اور تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت کا تیسرا جملہ وَهُمْ سَاكِعُونَ میں لفظ رکوع کے کسی مفہوم ہو سکتے ہیں، اسی لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا کہ رکوع سے مراد اس جگہ اصطلاحی رکوع ہی، جو نماز کا ایک رکن ہے، اور یَقِيمُونَ الصَّلَاةَ کے بعد وَهُمْ سَاكِعُونَ کا جملہ اس مقصد سے دیا گیا کہ مسلمانوں کی نماز کو دوسرے فرقوں کی نماز سے ممتاز کر دینا مقصود ہے، کیونکہ نماز تو یہود و نصاریٰ بھی پڑھتے ہیں، مگر اس میں رکوع نہیں ہوتا، رکوع صرف اسلامی نماز کا امتیازی وصف ہے۔ (منظری)

مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ لفظ رکوع سے اس جگہ اصطلاحی رکوع مراد نہیں، بلکہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی جھکنا تواضع اور عاجزی و انکساری کرنا، تفسیر بحر محیط میں ابو حیان نے اور تفسیر کشاف میں زہد مختصر میں نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور تفسیر مظہری و بیان لہذا قرآن وغیرہ میں بھی اسی کو لیا گیا ہے، تو معنی اس جملہ کے یہ ہو گئے کہ ان لوگوں کو اپنے اعمال صالحہ پر ناز نہیں، بلکہ تواضع اور انکساری اُن کی خصلت ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک روز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نماز میں مشغول تھے، جب آپ رکوع میں گئے تو کسی سائل نے آکر سوال کیا، آپ نے اسی حالت رکوع میں اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی، غریب فقیر کی حاجت روائی

میں اتنی دیر کرنا بھی پسند نہیں فرمایا کہ نماز سے فارغ ہو کر اس کی ضرورت پوری کریں، یہ مسابقت فی الخیرات اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند آئی، اور اس جملہ کے ذریعہ اس کی قدر افزائی فرمائی گئی۔

اس روایت کی سند میں علماء و محدثین کو کلام ہے، لیکن روایت کو صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز و زکوٰۃ کے پابند عام مسلمان ہیں اور ان میں خصوصیت کیسا تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكَ فَخَلِيْ مَوْلَاكَ، (رواہ احمد از مظہری) یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی بھی اس کے دوست ہیں۔

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَللّٰهُمَّ وَاٰلِ مَنْ وَاٰلَاہُ وَاَعَادِ مَنْ عَادَاہُ، یعنی یا اللہ آپ محبوب بنالیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہو علی مرتضیٰ سے، اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضیٰ سے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لئے نوازا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہو گیا تھا، کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت و دشمنی رکھیں گے، اور ان کے مقابلہ پر علم بغاوت اٹھائیں گے، جیسا کہ خواجه کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔

بہر حال آیت مذکورہ کا نزول خواہ اسی واقعہ کے متعلق ہوا ہو مگر لفاظ آیت کے عام ہیں، جو تمام صحابہ کرام اور سب مسلمانوں کو شامل ہیں، از روئے حکم کسی ضرورت کی خصوصیت نہیں، اسی لئے جب کسی نے حضرت امام باقر سے پوچھا کہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی مومنین میں داخل ہونے کی حیثیت سے اس آیت کا مصداق ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کو فتح و نصرت اور: نیا پر غالب آنے کی بشارت دی گئی ہے، جو مذکورہ آیات قرآنی کے احکام کی تعمیل کر کے غیروں کی گہری دوستی سے باز آجائیں اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کو اپنا دوست بنائیں، ارشاد فرمایا:

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمْ
الْغٰلِبُوْنَ، اس میں ارشاد فرمایا کہ ان احکامِ الہیہ کی تعمیل کرنے والے مسلمان اللہ کا گروہ
ہیں، اور پھر یہ خوش خبری سنا دی کہ اللہ کا گروہ ہی انجام کار سب پر غالب آکر رہے گا۔
آنے والے واقعات نے اس کی ایسی تصدیق کر دی کہ ہر آنکھوں والے نے دیکھ لیا کہ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب پر غالب آکر ہے جو طاقت ان سے ٹکرانی پاش پاش ہو گئی خلیفہ اول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر اندرونی فتنے اور بغاوتیں کھڑی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سب پر غالب فرمایا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں قیصر و کسریٰ کی آگئیں تو اللہ تعالیٰ ان کا نام و نشان مٹا دیا، اور پھر ان کے بعد کے خلفاء اور مسلمانوں میں جب تک ان احکام کی پابندی رہی کہ مسلمانوں نے غیروں کے ساتھ خلط ملط اور گہری دوستی کے تعلقات قائم نہیں کئے وہ ہمیشہ مظفر و منصور نظر آئے۔

چھٹی آیت میں پھر بطور تاکید کے اس حکم کا اعادہ فرمایا گیا ہے جو شروع رکوع میں بیان ہوا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کو اپنا رفیق یا گہرا دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل قرار دیتے ہیں، اور یہ دُگر وہ ہیں، ایک اہل کتاب دوسری عام کفار و مشرکین۔

امام ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ لفظ کفار میں تو اہل کتاب بھی داخل تھے پھر خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب کا مستقل ذکر اس جگہ غالباً اس لئے فرمایا گیا کہ اہل کتاب اگرچہ ظاہر میں بہ نسبت دوسرے کفار کے اسلام کے ساتھ قریب تھے، مگر تجربہ نے یہ بتلایا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں نے اسلام کو قبول کیا، یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت اور مابعد کے ایمان لانے والے لوگوں کے اعداد و شمار دیکھے جائیں، تو ان میں کثرت عام کفار کی نکلے گی، اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل کتاب کو اس پر ناز ہے کہ ہم دین الہی اور کتاب آسمانی کے پابند ہیں، اس فخر و ناز نے ان کو حق قبول کرنے سے باز رکھا، اور مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزاء کا معاملہ بھی زیادہ تر انہوں نے کیا، اسی شرارت پسندی کا ایک واقعہ وہ ہے جو ساتویں آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: وَإِذَا نَادَىٰ نَذِيرًا إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هُزْنًا وَآوَعِبَاءَ یعنی جب مسلمان نماز کے لئے اذان دیتے ہیں تو یہ لوگ اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کا واقعہ بحوالہ ابن ابی حاتم تفسیر مظہری میں نقل کیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک نصرانی تھا، وہ جب اذان میں أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ کا لفظ سنتا تو یہ کہا کرتا تھا أَحْرَقِ اللَّهَ الْكَاذِبَ یعنی جھوٹے کو اللہ تعالیٰ جلا لے۔

آخر کار اس کا یہ کلمہ ہی اس کے پورے خاندان کے جل کر خاک ہو جانے کا سبب بن گیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ رات کو جب یہ سو رہا تھا اس کا نوکر کسی ضرورت سے آگ لے کر گھر میں آیا اس کی چنگاری اُڑ کر کسی کپڑے پر گر پڑی اور سب کے سو جانے کے بعد وہ

بھڑکی اٹھی، اور سب کے سب جل کر خاک ہو گئے۔
اس آیت کے آخر میں فرمایا: ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ، یعنی دین حق کے ساتھ
اس تمخر و استہزاء کی وجہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے
ان کو بے عقل فرمایا ہی، حالانکہ امور دنیا میں ان کی عقل و دانش مشہور و معروف ہے، اس سے
معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان ایک قسم کے کاموں میں ہوشیار عقلمند ہو مگر
دوسری قسم میں یا وہ عقل سے کام نہیں لیتا یا اس کی عقل اس طرف چلتی نہیں، اس لئے
اس میں بیوقوف لا یعقل ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم نے اسی مضمون کو دوسری آیت میں
اس طرح بیان فرمایا ہے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ
یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کے سطحی امور کو تو خوب جانتے ہیں، مگر انجام اور آخرت سے
غافل ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا اِلَّا اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا

تو کہہ اے کتاب والو کیا ضد ہو تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو

اَنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اَنْزِلَ مِن قَبْلُ ۚ وَاَنْ اَكْتَرِمُكُمْ فِتْنٰتٍ ۚ قُلْ هَلْ اُنْبِئُكُمْ

نازل ہوا ہم پر اور جو نازل ہو چکا پہلے اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں، تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں

بَشَرٍ مِّنْ ذٰلِكَ مَتُوْبَةٌ عِنْدَ اللّٰهِ مَن لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ

کس کی بری جزا ہے اللہ کے ہاں وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب

عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرٰدَةَ وَالْخٰنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ

نازل کیا اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعضوں کو سورا درجنوں نے بندگی کی شیطان کی

اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۶۱ وَاِذَا

وہی لوگ بدتر ہیں درجہ میں اور بہت پھکے ہوئے ہیں سیدھی راہ سے اور جب

جَاؤُكُمْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوْا بِالْكَفْرِ وَهُمْ قَدْ

تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور حالت یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور

خَرَجُوْا بِهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝۶۲

کافر ہی چلے گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ چھپائے ہوئے تھے،

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر (بھی) جو (ہم سے) پہلے بھیجی جا چکی ہے، (یعنی تمہاری کتاب تورات و انجیل) باوجود اس کے کہ تم میں اکثر لوگ ایمان سے خارج ہیں (کہ نہ قرآن پر ان کا ایمان ہی، جس کا خود ان کو بھی اقرار ہو اور نہ تورات و انجیل پر ایمان ہے، کیونکہ ان پر ایمان ہوتا تو ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت موجود ہے اس پر بھی ضرور ایمان ہوتا، قرآن کا انکار اس پر شاہد ہے کہ تورات و انجیل پر بھی ان کا ایمان نہیں ہے، یہ حال تو تم لوگوں کا ہوا اور ہم اس کے برعکس سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، تو عیب ہم میں نہیں خود تم میں ہر غور کرو) اور آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم ہمارے طریقہ کو برا سمجھتے ہو تو آؤ) کیا میں (اچھے بُرے میں موازنہ کرنے کے لئے) تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو (ہمارے) اس (طریقہ) سے بھی (جس کو تم بُرا سمجھ رہے ہو) خدا کے یہاں سزا ملنے میں زیادہ بُرا ہو، وہ ان اشخاص کا طریقہ ہے جن کو (اس طریقہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو اور ان کو بندر اور سور بنا دیا ہو اور انھوں نے شیطان کی پرستش کی ہو (اب دیکھ لو کہ ان میں کونسا طریقہ بُرا ہے، آیا وہ طریقہ جس میں غیر اللہ کی عبادت اور اس پر یہ وبال ہوں، یا وہ طریقہ جو سراسر توحید اور نبوتِ انبیاء کی تصدیق ہو) یقیناً موازنہ کا نتیجہ یہی ہے کہ، ایسے اشخاص (جن کا طریقہ ابھی ذکر کیا گیا ہے آخرت میں) مکان کے اعتبار سے بھی (جو ان کو سزا کے طور پر ملے گا) بہت بُرے ہیں (کیونکہ یہ مکان دوزخ ہے) اور (دنیا میں) راہِ راست سے بھی بہت دور ہیں، (اشارہ یہ ہو کہ تم لوگ ہم پر ہنستے ہو، حالانکہ سہزاد کے قابل تمہارا طریقہ ہی، کیونکہ یہ سب خصلتیں تم میں پائی جاتی ہیں، کہ یہود نے گوسالہ پرستی کی اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کو خدا بنا لیا، پھر اپنے علماء و مشائخ کو خدائی کے خستیاں سپرد کر دیے، اسی لئے یہودیوں نے جب یومِ السبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تو اللہ کا عذاب آیا، وہ بندر بنا دیئے گئے اور نصاریٰ کی درخواست پر آسمانی ماندہ نازل ہونے لگا، انھوں نے پھر بھی ناشکری کی تو ان کو بندر اور سور بنا دیا گیا، آگے ان کی ایک خاص جماعت کا ذکر ہے، جو منافق تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر یہودی ہی تھے)

اور جب یہ (منافق) لوگ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ کفر ہی کو لے کر (مسلمانوں کی مجلس میں) آئے تھے اور کفر ہی کو لے کر چلے گئے اور اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں جس کو یہ (اپنے دل میں) چھپائے ہوئے ہیں (اس لئے ان کا نفاق اللہ تعالیٰ کے سامنے کام نہیں دے گا اور کفر کی بدترین سزا سے سابقہ پڑے گا)

معارف و مسائل

اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ میں حق تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے خطاب میں سب کے بجائے اکثر کو خطاب فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہر حال میں مؤمن ہی رہے، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہیں ہوتی تھی وہ احکام تورات و انجیل کے تابع اور ان پر ایمان رکھتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآن نازل ہوا تو آپ پر بھی ایمان لائے اور عمل قرآن کے تابع کرنے لگے۔

تبلیغ و دعوت میں | یہاں قُلْ مٰھَلْ اُفٰیْتُکُمْ میں جو حال ایک مثال کے انداز میں ایسے لوگوں مخاطب کی رعایت کا بیان کیا ہے جن پر اللہ کی لعنت و غضب ہو اس کے مصداق درحقیقت خود یہی مخاطب تھے، مقام اس کا تھا کہ اُن پر یہی یہ الزام عائد کیا جاتا کہ تم ایسے ہو، مگر قرآن کریم نے طرز بیان بدل کر اس کو ایک مثال کی صورت دیدی، جس میں پیغمبرانہ دعوت کا ایک خاص اسلوب بتلایا گیا، کہ عنوان بیان ایسا خستہ یا کرنا چاہئے جس سے مخاطب کج شہ حال پیدا نہ ہو۔

وَتَرٰی کَثِیْرًا مِّنْھُمْ یَسٰرِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ

اور تو دیکھے گا بہتوں کو اُن میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم اور

اٰکُلِھِمُ السَّحٰتَ لِیْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ کَوْلَا یَنْھِمُ

حرام کھانے پر بہت بُرے کام ہیں جو کر رہے ہیں، کیوں نہیں منع کرتے

الرَّٰسِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ مَعَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَ اٰکُلِھِمُ

ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے

السَّحٰتَ لِیْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

سے، بہت ہی بُرے عمل ہیں جو کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان (یہودیوں) میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دڑ دڑ کر گناہ (یعنی جھوٹ) اور ظلم اور حرام (مال) کھانے پر گرتے ہیں واقعی ان کے یہ کام بُرے ہیں (یہ تو عوام کا حال تھا آگے خواص کا حال ہے کہ) ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے (باوجود علم مسئلہ و اطلاع واقعہ کے) کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بُری ہے

معارف و مسائل

یہود کی اخلاقی تباہ حالی | آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اکثر یہود کی اخلاقی گراوٹ اور عملی بربادی کا ذکر ہوا تاکہ سننے والوں کو نصیحت ہو کہ ان افعال اور ان کے اسباب سے بچتے رہیں۔

اگرچہ عام طور پر یہودیوں کا یہی حال تھا، لیکن ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے، قرآن کریم نے ان کو مستثنیٰ کرنے کے لئے لفظ کَثِيرًا استعمال فرمایا، اور ظلم و تعدی اور حرام خوری و دُول اگرچہ لفظ اَشَدُّ یعنی گناہ کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ان دونوں قسم کے گناہوں کی تباہ کاری اور اُن کی وجہ سے پورے امن و اطمینان کی بربادی واضح کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر علیحدہ کر دیا (بحر محیط)

اور تفسیر روح المعانی وغیرہ میں ہے کہ ان لوگوں کے متعلق دُور دُور کر گناہوں پر گرنے کا عنوان خمشیار کر کے قرآن کریم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا، کہ یہ لوگ ان بُری خصلتوں کے عادی مجرم ہیں، اور یہ بُرے اعمال ان کے ملکاتِ راسخہ بن کر ان کی رگ پے میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ بلا ارادہ بھی یہ لوگ اسی طرف چلتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک عمل ہو یا بد جب کوئی انسان اس کو بہترت کرتا ہے، تو رفتہ رفتہ وہ ایک ملکہِ راسخہ اور عادت بن جاتی ہے، پھر اس کے کرنے میں اس کو کوئی مشقت اور تکلف باقی نہیں رہتا، بُری خصلتوں میں یہود اسی حد پر پہنچے ہوئے تھے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: يَسَارِعُونَ فِي الْآثِمِ، اور اسی طرح اچھی خصلتوں میں انبیاء و اولیاء کا حال ہے، اُن کے بارے میں بھی قرآن کریم نے يَسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ کے الفاظ استعمال فرمائے۔

اصلاحِ اعمال کا طریقہ | اصلاحِ اعمال کا سب سے زیادہ اہتمام کرنے والے حضرات صوفیاء کرام

اور اولیاء اللہ ہیں، ان حضرات نے اپنی ارشادات قرآنیہ سے یہ اہم اصول اخذ کیا ہے کہ جتنے بُرے یا بھلے اعمال انسان کرتا ہے اصل میں ان کا اصل سرچشمہ وہ مخفی ملکات اور اخلاق ہوتے ہیں جو انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، اسی لئے بُرے اعمال اور جرائم کی روک تھام کے لئے ان کی نظر اپنی مخفی ملکات پر ہوتی ہے اور ان کی اصلاح کر دیتے ہیں، تو تمام اعمال خود بخود درست ہونے لگتے ہیں، مثلاً کسی کے دل میں مال دنیا کی حرص کا غلبہ ہے، وہ اس کے نتیجہ میں رشوت بھی لیتا ہے، سود بھی کھاتا ہے، اور موقع ملے تو چوری اور ڈاکہ تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے، حضرات صوفیائے کرام ان جرائم کا الگ الگ علاج کرنے کے بجائے وہ نسخہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان سب جرائم کی بنیاد منہدم ہو جائے، اور وہ ہے دنیا کی ناپائیداری اور اس کی عیش و عشرت کے زہر آلود ہونے کا استخراج۔

اسی طرح کسی کے دل میں تکبر، غرور یا وہ غصہ میں مغلوب ہے، اور دوسروں کی تحقیر توہین کرتا ہے، دوستوں اور پڑوسیوں سے لڑتا ہے، یہ حضرات فکر آخرت اور خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کو مستحضر کرنے والا نسخہ استعمال کرتے ہیں، جن سے یہ اعمال بد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قرآنی اشارہ سے معلوم ہوا کہ انسان میں کچھ ملکات ہوتے ہیں جو طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، یہ ملکات خیر اور بھلائی کے ہیں تو نیک عمل خود بخود ہونے لگتے ہیں، اسی طرح ملکات بُرے ہیں تو بُرے اعمال کی طرف انسان خود بخود دوڑنے لگتا ہے، مکمل اصلاح کے لئے ان ملکات کی اصلاح ضروری ہے۔

علماء پر عوام کے اعمال کی ذمہ داری | دوسری آیت میں یہود کے مشائخ اور علماء کو اس پر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ ان لوگوں کو بُرے اعمال سے کیوں نہیں روکتے، قرآن میں اس جگہ دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں، ایک رَبَّنَا یُؤْتِنَا، جس کا ترجمہ ہے اللہ والے، یعنی عابد، زاہد، جن کو ہمارے عرف میں درویش یا پیر یا مشائخ کہا جاتا ہے، اور دوسرا لفظ أَحْبَابُ استعمال فرمایا، یہود کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے، جن سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ، دوسرے علماء، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ربانیتوں سے مراد وہ علماء ہیں جو حکومت کی طرف سے مامور اور با اقتدار ہوں، اور احبار سے مراد عام علماء ہیں، اس صورت میں جرائم سے روکنے کی ذمہ داری حکام اور علماء دونوں پر عائد ہو جاتی ہے، اور بعض دوسری آیات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

علماء و مشائخ کیلئے تنبیہ | آخر آیت میں فرمایا لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ، یعنی ان مشائخ و

علماء کی یہ سخت بُری عادت ہے کہ اپنا فرض منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ ان کو نہیں روکتے۔

علماء مفسرین نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو لَبَسَ مَا كَانُوا يَحْمِلُونَ ارشاد فرمایا گیا، اور دوسری آیت جس میں مشائخ و علماء کی غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے آخر میں لَبَسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ کا لفظ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ فعل تو ہر کام کو شامل ہے، خواہ با قصد ہو یا بلا قصد اور لفظ عمل صرف اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو قصد و ارادہ سے کیا جائے، اور لفظ صنع اور صنعت کا ایسے کام کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے، جس میں قصد و اختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور مقصد کے درست کر کے کیا جائے، اس لئے عوام کی بد عملی کے نتیجے میں تو صرف لفظ عمل اختیار فرمایا، لَبَسَ مَا كَانُوا يَحْمِلُونَ، اور خواص مشائخ و علماء کی غلط کاری کے نتیجے میں لفظ صنع اختیار فرمایا، لَبَسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ، اس میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان کے علماء و مشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بد اعتقاد ہو جانے کے خوف سے ان کے دلوں میں حمایت حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ اُن بدکاروں کے اعمال بد سے بھی زیادہ اشد ہے۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ و علماء کو یہ بھی انداز ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ مشائخ و علماء کے لئے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں، اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ علماء کے لئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے (ابن جریر و ابن کثیر)

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ان کا جرم تمام چوروں، ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے (الحیاء باللہ) مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہیں جبکہ مشائخ و علماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائیگی اور جس جگہ قرآن یا تجربہ سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سُنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذا میں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے،

لیکن فضل و اعلیٰ پھر بھی یہی رہتا ہو کہ کوئی مانے یا نہ مانے یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں، اور اس میں کسی کی ملامت یا ایذا کی فکر نہ کریں، جیسا کہ چند آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ کے مقبول مجاہدین کی صفات میں گزر چکا ہے، وَلَا يَخَافُونَ تَوَمَّةً لَا يَفْجَرُ، یعنی یہ لوگ اللہ کے راستہ میں اور حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہو کہ جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ و علماء پر بلکہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم و گناہ ہونا معلوم ہو فرض ہے کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں معتد و رہبر کو شش کرے، خواہ ہاتھ سے یا زبان سے، یا کم از کم اپنے دل کی نفرت اور اعراض سے، اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ سنی جائے گی، یا یہ کہ اس کے خلاف دشمنی بھڑک اٹھے گی، تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر فضل و اعلیٰ ہر حال ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں، خود نیک عمل خستیار کرنے اور بُرے اعمال سے بچنے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور بُرائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دنیا میں امن و طہینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زریں اصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام برائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔

اصلاح امت کا طریقہ | اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اور قرونِ مابعد میں بھی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا مسلمانوں کی پوری قوم علم و عمل، اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سر بلند اور ممتاز رہی، اور جب سے مسلمانوں نے اس فریضہ کو نظر انداز کر دیا، اور جرائم کی روک تھام کو صرف حکومت اور اس کی پولیس کا فرض سمجھ کر خود اس سے علیحدہ ہو بیٹھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا جو آج ہر جگہ سامنے ہے، کہ ماں باپ اور پورا خاندان دیندار اور پابندِ شریعت ہوا مگر اولاد اور متعلقین اس کے برعکس ہیں، ان کا نظری اور فکری رخ بھی اور عملی طریقے بھی جدا گانہ ہیں، اسی لئے ملت کی اجتماعی اصلاح کے لئے قرآن و حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے، قرآن نے اس کام کو امتِ محمدیہ کی خصوصیات میں شمار فرمایا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کرنے کو سخت گناہ اور موجبِ عذاب قرار دیا ہے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم میں گناہ کے کام کئے جائیں اور کوئی آدمی اس قوم میں رہتا ہے اور ان کو منع نہیں کرتا تو قریب ہو کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں پر عذاب بھیج دے۔ (بحر محیط)

گناہوں پر اظہارِ نفرت نہ کرنے پر وعید

مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو تباہ کر دو، فرشتوں نے عرض کیا اس بستی میں تو آپ کا فلاں عبادت گزار بندہ بھی ہے، حکم ہوا کہ اس کو بھی عذاب چکھاؤ، کیونکہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اس کو بھی غصہ نہیں آیا، اور اس کا چہرہ غصہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا۔

حضرت یوشع ابن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کئے جائیں گے، جن میں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بد عمل، حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا کہ رب العالمین بدکرداروں کی ہلاکت کی وجہ تو ظاہر ہے، لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے؟ تو ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی ان بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، ان کے ساتھ کھانے پینے، اور ہنسی دل لگی کے شریک رہتے تھے، میری نافرمانیاں اور گناہ دیکھ کر کبھی ان کے چہروں پر کوئی ناگواری کا اثر تک نہ آیا (یہ سب روایات بحر محیط سے منقول ہیں)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلَعِنُوا

اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا اپنی کے ہاتھ بند ہو جاویں اور لعنت ہو ان کو

يَمَاقِلُ أُولَٰئِكَ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ وَلَٰكِنَّ

اس کہنے پر بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں خرچ کرتا ہو جس طرح چاہو اور ان میں بہتوں کو

كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا وَ

بڑھ گئی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور انکار اور

أَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ط

ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی اور تیرے قیامت کے دن تک جب کبھی

أَوْ قَدْ وَانَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَاكَ اللَّهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ

آگیں سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے اللہ اس کو بجھا دیتا ہو اور دوڑتے ہیں ملک میں

فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يَحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٨﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ

فساد کرتے ہوئے اور اللہ پسند نہیں کرتا فساد کرنے والوں کو اور اگر اہل کتاب ایمان

أَمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلُكُمْ

لاتے اور ڈرتے تو ہم دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ان کو داخل کرتے

وقف لازم

جَنَّتِ النَّعِيمِ ۶۵) وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا

نعت کے باغوں میں اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل کو اور اس کو

أَنْزَلَ إِلَيْهِمْ مِّنْ رَبِّهِمْ لَأَكْلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

جو کہ نازل ہوا اُن پر اُن کے رب کی طرف سے تو کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں

أَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا

کے نیچے سے کچھ لوگ ہیں اُن میں سیدھی راہ پر اور بہت سے اُن میں بُرے کام

يَعْمَلُونَ ۶۶) يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ

کر رہے ہیں اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اُنزا تیرے رب کی

رَبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ

طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تجھ کو بچالے گا

مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۶۷)

لوگوں سے بے شک اللہ راستہ نہیں دکھاتا قوم کفار کو

رَبِّطِ آيَاتِ | گزشتہ آیات میں یہود کے بعض احوال کا ذکر تھا، آگے ان آیات سے بھی مزید

بعض خاص حالات بیان کئے گئے ہیں، جن کا قصہ یہ ہوا کہ نباش بن قیس

اور فخاص ریس یہود قیس نقاع نے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخانہ الفاظ بخل وغیرہ کہے،

جس کا بیان آگے آتا ہے، اس پر اگلی آیت نازل ہوئی، کذا فی اللباب بروایۃ الطبرانی عن ابن عباس

و بروایۃ ابی الشیخ عنہ

خلاصہ تفسیر

اور یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے (یعنی نعوذ باللہ بخل کرنے لگا ہے،

درحقیقت) انہی کے ہاتھ بند ہیں (یعنی واقع میں خود عیب بخل میں مبتلا ہیں، اور خدا پر

عیب دھرتے ہیں) اور اپنے اس کہنے سے یہ رحمت (الہی) سے دُور کر دیئے گئے، (جس کا اثر

دنیا میں ذلت اور قید اور قتل وغیرہ ہوا اور آخرت میں عذاب جہنم، اور حاشا وکلا کہ خدا تعالیٰ میں

اس کا حسد بھی ہو) بلکہ ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں (یعنی بڑے جواد و کریم ہیں، لیکن

چونکہ حکیم بھی ہیں اس لئے) جس طرح چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں (پس یہود پر جو تنگی ہوئی

اس کی علت حکمت ہے کہ ان کے کفر کا وبال ان کو چکھانا مقصود ہے نہ یہ کہ بخل اس کی علت ہو اور یہود کے کفر اور سرکشی کی یہ حالت ہو کہ ان کو یہ توفیق نہ ہوگی کہ مثلاً اپنے قول کا بطلان دلیل سن لیا تو اس سے توبہ کر لیں، نہیں بلکہ جو مضمون آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے اس طرح سے کہ وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں، تو کچھ تو پہلا طغیان اور کفر تھا پھر اور بڑھ گیا (اور ان کے کفر سے جو ان پر لعنت یعنی رحمت سے دوری واقع کی گئی ہے اس کے آثار دنیاویہ میں سے ایک یہ ہے کہ) ہم نے ان میں باہم (دین کے باب میں) قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا (چنانچہ ان میں مختلف فرقے ہیں، اور ہر فرقہ دوسرے کا دشمن، چنانچہ باہمی عداوت و بغض کی وجہ سے) جب کبھی (مسلمانوں کے ساتھ) لڑائی کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں (یعنی لڑنے کا ارادہ کرتے ہیں) حق تعالیٰ اس کو فرو کر دیتے ہیں، (اور بھجوا دیتے ہیں، یعنی مرعوب ہو جاتے ہیں) یا لڑ کر مغلوب ہو جاتے ہیں، یا آپس کے اختلاف کی وجہ سے اتفاق کی نوبت نہیں آتی (اور جب لڑائی سے رہ جاتے ہیں تو اپنی عداوت دوسری طرح نکالتے ہیں کہ) ملک میں (خفیہ) فساد کرتے پھرتے ہیں (جیسے نو مسلموں کو بہکانا، لگانا، بھجانی کرنا، عوام کو تورات کے محرف مضامین سننا کہ اسلام سے روکنا) اور اللہ تعالیٰ (چونکہ) فساد کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے (یعنی مبغوض رکھتے ہیں) اس لئے اس فساد کی ان کو خوب سزا ہوگی خواہ دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو ضرور) اور اگر یہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ جن امور حقہ کے منکر ہیں، جیسے رسالت محمدیہ و حقیقت قرآن ان سب پر) ایمان لے آتے اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے جن امور کا کفر و معصیت ہونا بتلایا گیا ہے ان سب سے) تقویٰ (یعنی پرہیز) اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی تمام (گزشتہ) برائیاں (کفر اور شرک اور معاصی جن میں سب اقوال و احوال آگئے) معاف کر دیتے اور (معاف کر کے) ضرور ان کو چین (اور آرام) کے باغوں میں (یعنی بہشت میں) داخل کرتے (توبہ برکاتِ اخرویہ ہوئیں) اور اگر یہ لوگ ایمان اور تقویٰ مذکور اختیار کرتے جس کو لعنواں و نیکر یوں کہا جاتا ہے کہ) تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) ان کے پاس (ہو واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے (یعنی ان میں جس جس بات پر عمل کرنے کو لکھا ہے سب پر پورا عمل کرتے، اس میں تصدیق رسالت بھی آگئی، اور اس سے احکام محرفہ و منسوخہ نکل گئے، کیونکہ ان کتب کا مجموعہ ان پر عمل کرنے کو نہیں بتلاتا بلکہ منع کرتا ہے) تو یہ لوگ (بوجہ اس کے کہ) اوپر سے (یعنی آسمان سے پانی برتا)

اور نیچے سے (یعنی زمین سے پیداوار ہوتی) خوب فراغت سے کھاتے (برتتے، یہ ایمان کی برکات دنیویہ کا ذکر ہوا، لیکن کفر پر مصر رہے، اس لئے تنگی میں پکڑے گئے، جس پر بعض نے حق تعالیٰ کی شان میں بخل کی نسبت کر کے گستاخی کی، مگر پھر بھی سب یہود و نصاریٰ برابر نہیں، چنانچہ ان (ہی) میں ایک جماعت راہ راست پر چلنے والی (بھی) ہے (جیسے یہود میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی، اور نصاریٰ میں حضرت نجاشی اور ان کے ساتھی، لیکن ایسے قلیل ہی ہیں) اور (باقی) زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت بُرے ہیں (کیونکہ کفر و عناد سے بدتر کیا کردار ہوگا) اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہو آپ (لوگوں کو) سب پہنچا دیجئے اور اگر (بفرض محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (ایسا سمجھا جاوے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ یہ مجموعہ فرض ہے، تو جیسا کھل کے اخفاء سے یہ فرض فوت ہوتا ہو اسی طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے) اور (تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ کے مقابل ہو کر قتل و ہلاک کر ڈالیں) محفوظ رکھے گا (اور) یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (اس طرح قتل و ہلاک کر ڈالنے کے واسطے آپ تک) راہ نہ دیں گے۔

معارف و مسائل

یہود کی ایک گستاخی کا جواب | قولہ تعالیٰ وَقَالَتِ الْيَهُودُ، اس آیت میں یہود کا ایک سنگین جرم اور ایک بدترین کلمہ یہ ذکر کیا گیا کہ وہ کم نجت یہ کہنے لگے کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ تنگ دست ہو گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودیوں کو مال دار صاحب وسعت بنایا تھا، مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، اور آپ کی دعوت اُن کو پہنچی، تو ان ظالموں نے اپنی قومی چودھراہٹ اور اپنی جاہل رسوم سے حاصل ہونے والے نذرانوں کی خاطر اس دعوت حق سے روگردانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر دنیا بھی تنگ کر دی یہ تنگ دست ہو گئے، اُس پر ان نالائقوں کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے لگے کہ (معاذ اللہ) خدائی خزانہ میں کمی آگئی، یا اللہ نے بخل خستیار کر لیا، اس کے جواب میں اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہاتھ تو انہی کہنے والوں کے بندھیں گے، اور اُن پر لعنت ہوگی، جس کا اثر آخرت میں عذاب اور دنیا میں

ذلت و رسوائی کی صورت میں نمودار ہو گا، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ تو ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں، اس کی جو دوستی ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی، مگر جس طرح وہ غنی اور صاحبِ وسعت ہیں اسی طرح حکیم بھی ہیں، حکمت کے ساتھ اس کے تقاضے کے مطابق خرچ فرماتے ہیں، جس پر مناسب سمجھتے ہیں وسعت فرماتے ہیں اور جس پر مناسب سمجھتے ہیں تنگی اور تنگدستی مسلط فرما دیتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ یہ سرکش لوگ ہیں آپ پر جو فتہ آئی بینات اُترتی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کا کفر و انکار اور سخت ہوتا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے شر سے بچانے کے لئے خود ان کے فرقوں میں اختلاف شدید ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف نہ ان کو کھلی جنگ کرنے کا حوصلہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی سازش چل سکتی ہے: **كَلِمَاتٍ اَوْ قَدْ وَاَنَّا لُلْحَرْبِ اَخْلَقْنَاهَا ۗ اِنَّ فِيْ اٰلَاءِ رَبِّكَ لَفَسَادًا** میں ظاہر جنگ کی ناکامی اور یسعون فی المائے فساد میں خفیہ سازشوں کی ناکامی کا ذکر ہے۔

احکامِ الہیہ پر پورا عمل دنیا | آیت نمبر ۶۴ میں یہود کو ہدایت دی گئی کہ تورات اور انجیل کی ہدایت میں بھی برکات کا سبب ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ارشادات سے ان لوگوں نے کوئی فائدہ

نہ اٹھایا، حرصِ دنیا میں مبتلا ہو کر سب کو بھلا بیٹھے جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی تنگدستی کا شکار ہوئے، لیکن اگر اب بھی یہ لوگ ایمان اور خدا ترسی کے طریقہ کو اختیار کر لیں تو ہم انکی سب پچھلی خطائیں معاف کر دیں، اور ان کو نعمتوں سے بھرے ہوئے باغات عطا کر دیں۔

احکامِ الہیہ پر پورا عمل | (قرآن تعالیٰ) وَلَوْ اَنَّكُمْ اَقَامُوا التَّوْرَةَ، اس آیت میں اسی ایمان اور کس طرح ہوتا ہے تقویٰ کی کچھ تفصیل مذکور ہے، جس پر دنیوی برکات آرام و راحت کا وعدہ

پچھلی آیت میں کیا گیا ہے، اور تفصیل یہ ہے کہ تورات و انجیل اور ان کے بعد جو آخری کتاب قرآن بھیجی گئی اس کو قائم کریں، یہاں عمل کرنے کے بجائے لفظ "اقامت" یعنی قائم کرنے کا لایا گیا، مراد یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر پورا پورا صحیح عمل جب ہو گا کہ نہ اس میں کوتاہی اور کمی ہو اور نہ زیادتی، جس طرح کسی عمو کو قائم اُسی وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ کسی طر مائل نہ ہو، سیدھا کھڑا ہو۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہود اگر آج بھی تورات و انجیل اور قرآن کریم کی ہدایات پر ایمان لے آئیں اور ان پر پورا پورا عمل مطابق ہدایات کے کریں، نہ عملی کوتاہی میں مبتلا ہوں نہ غلو اور تعدی میں، کہ خود ساختہ چیزوں کو دین قرار دیدیں، تو آخرت کی موعودہ نعمتوں کے مستحق ہوں گے، اور دنیا میں بھی ان پر رزق کے دروازے اس طرح کھول دیئے جائیں گے، کہ اوپر سے رزق برے گا اور نیچے سے اُبلے گا، نیچے اوپر سے مراد بظاہر یہ ہے کہ آسانی کے ساتھ

مسلسل رزق عطا ہوگا (تفسیر کبیر)

اوپر کی آیت میں تو صرف آخرت کی نعمتوں کا وعدہ تھا، اس آیت میں دنیاوی آرام و راحت کا وعدہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہودی کی بدعملی اور احکامِ توریت و انجیل میں تحریف و تاویل اور توڑ مروڑ کی بڑی وجہ ان کی دنیا پرستی اور حرصِ مال تھی، اور یہ وہ آفت تھی جس نے ان کو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آیات و بینات دیکھنے کے باوجود ان کی اطاعت سے روکا ہوا تھا، ان کو خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم مسلمان ہو جائیں گے تو ہماری یہ چودہراہٹ ختم ہو جائے گی، اور دینی پیشوا ہونے کی حیثیت سے جو تذرا نے اور ہدایا ملتے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وسوسہ کو دور کرنے کے لئے یہ بھی وعدہ فرمایا کہ اگر وہ سچے طور پر ایمان اور عملِ صالح اختیار کر لیں تو ان کی دنیاوی دولت و راحت میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی بلکہ زیادتی ہو جائے گی۔

ایک شبہ کا جواب | اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ خاص وعدہ ان یہودیوں کے تھا کیا گیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود اور آپ کے مخاطب تھے، وہ اگر ان احکام کو مان لیتے تو دنیا میں بھی ان کو ہر طرح کی نعمت و راحت دیدہ بجاتی چنانچہ اس وقت جن حضرات نے ایمان اور عملِ صالح اختیار کر لیا ان کو یہ نعمتیں پوری ملیں جیسے نجاشی سلطان حبشہ اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب کوئی ایمان و عملِ صالح کا پابند ہو جائے تو دنیا میں اس کے لئے رزق کی وسعت ضروری ہوگی، اور جو نہ ہو تو اس کے لئے رزق کی تنگی ضرور ہوگی، کیونکہ یہاں کوئی عام قاعدہ ضابطہ بیان فرمانا مقصود نہیں، ایک خاص جماعت سے خاص حالات میں وعدہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایمان اور عملِ صالح پر عام قاعدہ اور ضابطہ کی صورت سے حیاتِ طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی عطا ہونے کا وعدہ عام ہے، مگر وہ وسعتِ رزق کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے اور ظاہری تنگدستی کی صورت میں بھی جیسا کہ انبیاء و اولیاء علیہم السلام کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ سب کو ہمیشہ وسعتِ رزق تو نہیں ملی، لیکن پاکیزہ زندگی سب کو عطا ہوئی۔

آخر آیت میں بقا ضائعے عدل و انصاف یہ بھی فرمادیا کہ جو کج روی اور بدعملی یہودی کی بیان کی گئی ہے یہ سب یہود کا حال نہیں، بلکہ **مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ**، ان میں ایک تھوڑی سی جماعت راہِ راست پر بھی ہے، لیکن ان کی اکثریت بدکار، بدعمل ہے، راہِ راست پر ہونے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے یہودی یا نصرانی تھے، پھر قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، ان دونوں آیتوں میں اور ان سے پہلے مسلسل

دور کو ع میں یہود و نصاریٰ کی بکجروی و بے راہی اور ضد و ہٹ دھرمی اور مخالف اسلام سازشوں کا ذکر چلا کر ہاتھ۔

تبلیغ کی تاکید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی | اس کا ایک اثر طبعی طور پر تقاضائے بشریت یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، مایوس ہو کر یا مجبور ہو کر تبلیغ و رسالت میں

کچھ کمی ہو جائے، اور دوسرا اثر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ مخالفت اور دشمنی اور ایذا رسائی کی پرواہ کئے بغیر تبلیغ رسالت میں لگے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں آپ کو دشمنوں کے ہاتھ سے تکالیف و مصائب کا سامنا ہو، اس لئے تیسری آیت میں ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید می حکم دیدیا گیا کہ جو کچھ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچا دیں، کوئی بُرا مانے یا بھلا، اور مخالفت کرے یا قبول کرے، اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کر دیا گیا کہ تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں یہ کفار آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ خود آپ کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس آیت میں ایک جملہ تو یہ قابل غور ہے کہ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ، مراد اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی ایک حکم خداوندی بھی آپ کے امت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنے فرض پیغمبری سے سبکدوش نہیں ہوں گے، یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر اس فرض کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت و قوت صرف فرمائی، اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جو ایک حیثیت سے اسلام کا آئین اور دستور تھا اور دوسری حیثیت سے ایک رفق و رحیم اور مال باپ سے زیادہ شفیق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نصیحت | اس خطبہ میں آپ نے صحابہ کرام کے ایک عظیم مجمع کے سامنے اہم ہدایات فرمانے کے بعد مجمع سے سوال فرمایا:

أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ، دیکھو! کیا میں نے آپ کو دین پہنچا دیا؟ صحابہ کرام نے اقرار فرمایا کہ ضرور پہنچایا، اس پر ارشاد فرمایا کہ آپ اس پر گواہ رہو، اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ قَدْ بَلَّغْتُ الشَّاهِدُ الْغَائِبُ، یعنی جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہیں وہ غائبوں تک میری بات پہنچا دیں، غائبین میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود تھے، مگر مجمع میں حاضر نہ تھے، اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہنچانے کا طریقہ علم دین کی نشر و اشاعت تھی جس کو حضرات صحابہ و تابعین نے پوری کوشش سے انجام دیا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ عام حالات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و کلمات کو اللہ کی ایک بھاری امانت کی طرح محسوس فرمایا، اور مقرب و بکر اس کی کوشش کی کہ آپ کی زبان مبارک سے سُنا ہوا کوئی جملہ ایسا نہ رہ جائے جو امانت کو نہ پہنچے، اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی نے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کیا تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنا دیا، تاکہ وہ اس امانت سے سبکدوش ہو جائیں، صحیح بخاری میں حضرت معاذؓ کی ایک حدیث کے متعلق ایسا ہی واقعہ مذکور ہے کہ ان خبر بہ معاذ عند موتہ تاشما، یعنی حضرت معاذؓ نے یہ حدیث اپنی موت کے وقت بیان فرمائی، تاکہ اس امانت کے نہ پہنچانے کی وجہ سے گنہگار نہ ہو جائیں۔

آیت کے دوسرے جملہ وَاللّٰهُ يَعْصِيْكَ مِنَ النَّاسِ، میں بشارت دی گئی ہو کہ ہزاروں مخالفین کے باوجود دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے چند صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے عام طور پر ساتھ لگے رہتے تھے، اور سفر و حضر میں آپ کی حفاظت کرتے تھے، اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے ان سب کو رخصت کر دیا، کہ اب کسی پہرہ اور حفاظت کی ضرورت نہیں رہی، اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھے تبلیغ و رسالت کے احکام ملے تو میرے دل میں اس کی بڑی ہی ہیبت تھی، کہ ہر طرف سے لوگ میری تکذیب اور مخالفت کریں گے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سکون و الطمینان حاصل ہو گیا۔ (تفسیر کبیر)

چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ تبلیغ و رسالت کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند پہنچائے، جنگ و جہاد میں عارضی طور سے کوئی تکلیف پہنچ جانا اس کے منافی نہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُ عَلٰی شَيْءٍ حَتّٰی تُقِيْمُوْا اَلْشُّرْعَةَ وَ

کہہ دے اے کتاب والو تم کسی راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو تو ریت اور

اِلَّا نُّجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَلَيْسَ اَنَّ

انجیل کو اور جو تم پر اترا تمھارے رب کی طرف سے اور ان میں بہتوں کو

كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ

بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ

سو تو افسوس نہ کر اس قوم کفار پر بے شک جو مسلمان ہیں اور جو

هَادُوا وَالصَّابِغُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

یہودی ہیں اور فرقہ صابی اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور روز

الْآخِرَةِ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

قیامت پر اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

رابط آیات | اوپر اہل کتاب کو اسلام کی ترغیب تھی، آگے ان کے موجودہ طریقہ کا جس کے حق ہونے کے وہ مدعی تھے عند اللہ ناکارہ اور نجات میں ناکافی ہونا اور نجات کا اسلام پر موقوف ہونا مذکور ہے، اور اس کے بعد بھی ان کے اصرار علی الکفر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرمایا ہے، اور درمیان میں ایک خاص مناسبت اور ضرورت سے تبلیغ کا مضمون آگیا تھا۔

خلاصہ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) کہتے کہ اے اہل کتاب تم کسی راہ پر بھی نہیں (کیونکہ غیر مقبول راہ پر ہونا مثل بے راہی کے ہے) جب تک کہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) تمھارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) تمھارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہو (یعنی قرآن) اس کی بھی پوری پابندی نہ کرو گے (جس کے معنی اور ترغیب اور برکات اور پر مذکور ہوئے ہیں) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان میں اکثر لوگ تعصب مذہب میں مبتلا ہیں اس لئے یہ) ضرور رہو کہ جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے، (اور اس میں ممکن ہو کہ آپ کو رنج و غم ہو، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ متعصب ہیں) تو آپ ان کافر لوگوں (کی اس حالت) پر غم نہ کیا کیجئے، یہ تحقیقی بات ہے کہ اور یہودی اور فرقہ صابین اور نصاریٰ (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ (کی ذات و صفات) پر

اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (یعنی موافق قانون شریعت کے) ایسوں پر (آخرت میں) نہ کسی طرح کا اندیشہ ہو اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اہل کتاب کو شریعتِ الہیہ | پہلی آیت میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو شریعتِ الہیہ کے اتباع کے اتباع کی ہدایت کی ہدایت کی ہدایت اس عزان سے فرمائی گئی تھی کہ اگر تم نے احکام شرعیہ کی پابندی نہ کی تو تم کچھ نہیں، مطلب یہ ہو کہ شریعتِ اسلام کی پابندی کے بغیر تمہارے سارے کمالات اور اعمال سب اکارت ہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ایک کمال فطری یہ عطا فرمایا ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہو، دوسرے تورات و انجیل کے علمی کمالات بھی تمہیں حاصل ہیں، تم میں سے بہت سے آدمی درویش منش بھی ہیں، مجاہدات و ریاضیات کرتے ہیں، مگر ان سب چیزوں کی قیمت اور وزن اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس پر موقوف ہو کہ تم شریعتِ الہیہ کا اتباع کرو، اس کے بغیر نہ کوئی نسبی فضیلت کام آوے گی نہ علمی تحقیقات تمہاری نجات کا سامان بنیں گی نہ تمہارے مجاہدات و ریاضیات۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت مل گئی کہ کوئی درویشی اور سلوک و طریقت، مجاہدات و ریاضات اور کشف و الہام اُس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ ہو۔

اس آیت میں شریعتِ الہیہ کی پیروی کے لئے تین چیزوں کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے، اول تورات، دوسرے انجیل، جو یہود و نصاریٰ کے لئے پہلے نازل ہو چکی تھیں، تیسرے وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا۔

جمہور مفسرین، صحابہ و تابعین کا اس پر اتفاق ہو کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے، جو تمام امتِ دعوت کے لئے بشمول یہود و نصاریٰ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے بھیجا گیا اس لئے معنی آیت کے یہ ہونگے کہ جب تک تم تورات، انجیل و قرآن کے لائے ہوئے احکام پر صحیح صحیح اور پورا پورا عمل نہ کرو گے تمہارا کوئی نسبی یا علمی کمال اللہ کے نزدیک مقبول و معتبر نہیں ہوگا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہو کہ اس آیت میں توریت و انجیل کی طرح قرآن کا مختصر نام ذکر کر دینے کے بجائے ایک طویل جملہ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ استعمال فرمایا گیا ہو، اس میں کیا حکمت ہو؟ ہو سکتا ہے کہ اس میں اُن احادیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہو جن میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا، اسی طرح دوسرے علوم و معارف بھی عطا کئے گئے ہیں، جن کو ایک حیثیت قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جاسکتا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

الَا تَنبَیْ اَوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ
مَعَهُ الْاِیْرَ شَکَّ رَجُلٌ شَبَعَانِ
عَلٰی اَرِیْکَتَهُ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ
بِهَذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ
فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاحْلُوْهُ وَمَا
وَجَدْتُمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ
وَ اَنْ مَّا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
رَصَلٰی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَمَا
حَرَّمَ اللّٰهُ

یاد رکھو! کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے
ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے،
آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی
شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو قرآن
قرآن کافی ہے، جو اس میں حلال ہو صرف
اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہو صرف
اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ
جس چیز کو اللہ کے رسولؐ نے حرام ٹھہرایا
ہو وہ بھی ایسی ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ
کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیا حرام ہیں

(ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی وغیرہ)

احکام کی بین اقسام | اور خود قرآن بھی اسی مضمون کا شاہد ہے: وَمَا یَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ
اِلَّا وَحٰی یُّوْحٰی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتے، جو کچھ
آپؐ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اور جن حالات میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنے اجتہاد اور قیاس کے ذریعہ فرماتے ہیں اور بذریعہ وحی پھر اس
کے خلاف آپؐ کوئی ہدایت نہیں ملتی تو انجام کار وہ قیاس اور اجتہاد بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔
جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک
تو وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحتاً مذکور ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صراحتاً قرآن میں مذکور نہیں، بلکہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جداگانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے، تیسرے وہ جو آپؐ نے اپنے
اجتہاد و قیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا،
وہ بھی بحکم وحی ہو گیا، یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں اور وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ
رَّبِّکُمْ مِّنْ دَاخِلٍ ہیں۔

شاید آیت مذکورہ میں قرآن کا مختصر نام چھوڑ کر یہ طویل جملہ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ
رَّبِّکُمْ اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے لایا گیا ہو کہ ان تمام احکام کا اتباع لازم و واجب
ہو جو صراحتاً قرآن میں مذکور ہوں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ احکام دیئے ہوں۔

دوسری بات اس آیت میں یہ قابل غور ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ کو، تورات، انجیل، و تہران تینوں کے احکام پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، حالانکہ ان میں سے بعض بعض کے لئے ناسخ ہیں، انجیل نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ ٹھہرایا اور قرآن نے تورات اور انجیل کے بہت سے احکام کو منسوخ قرار دیا، تو پھر تینوں کے مجموعہ پر عمل کیسے ہو؟ جواب واضح ہے کہ ہر آنے والی کتاب نے پچھلی کتاب کے جن احکام کو بدل دیا، تو بدلے ہوئے طریقہ پر عمل کرنا ہی ان دونوں کتابوں پر عمل کرنا ہے، منسوخ شدہ احکام پر عمل کرنا دونوں کتابوں کے مقتضاء کے خلاف ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تسلی | آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کے ساتھ ہماری اس رعایت و عنایت کے باوجود ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے کہ اس عنایت ربانی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں گے، بلکہ اُن کا کفر و عناد اور بڑھ جائے گا، آپ اس سے غمگین نہ ہوں، اور ایسے لوگوں پر ترس نہ کھائیں۔

چار قوموں کو ایمان اور عمل صالح | دوسری آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے چار قوموں کو مخاطب کر کے ایمان کی ترغیب آخرت میں نجات کا وعدہ اور عمل صالح کی ترغیب اور اس پر فلاح آخرت کا وعدہ فرمایا،

ان میں سے پہلے الَّذِينَ آمَنُوا، یعنی مسلمان ہیں، دوسرے الَّذِينَ هَادُوا، یعنی یہود، تیسرے الَّذِينَ صَبَّأُوا، اور چوتھے نصاریٰ، ان میں تین قومیں مسلمان، یہود، نصاریٰ معروف و مشہور اور دنیا کے اکثر خطوں میں موجود ہیں، صابئون یا صابئہ کے نام سے آجکل کوئی قوم معروف نہیں، اسی لئے اس کی تعیین میں علماء و ائمہ کے اقوال مختلف ہیں، امام تفسیر ابن کثیر نے بحوالہ قتادہ ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ صابئون وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں، اور آسمانی کتاب زبور کی تلاوت کرتے ہیں (جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی)۔

قرآن کریم کے اس سیاق سے بظاہر اسی کی تائید ہوتی ہے کہ چار آسمانی کتابیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تورات، زبور، انجیل، اور قرآن، اس میں ان چار کتابوں کے ماننے والوں کا ذکر آگیا۔

اسی مضمون کی ایک آیت تقریباً اپنی الفاظ کے ساتھ سورۃ بقرہ کے ساتویں رکوع میں گزر چکی ہے، إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِئِينَ، مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، اس میں بتقاضائے مقام بعض الفاظ کی تقدیم

تاخیر کے سوا کوئی فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک امتیاز کا مدار عمل صالح پر ہے | خلاصہ مضمون ان دونوں آیتوں کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی

نسبی، وطنی اور قومی خصوصیت کچھ نہیں، جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور عمل صالح اختیار کرے گا، خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے یہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے، کیونکہ کتب سابقہ تورات و انجیل میں بھی اس کی ہدایات موجود ہیں، اور قرآن کریم تو سراسر اسی کے لئے نازل ہوا، اسی لئے نزول قرآن اور بعثت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر نہ تورات و انجیل کا اتباع صحیح ہو سکتا ہے نہ زبور کا، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ان تمام اقوام میں سے جو مسلمان ہو جائے گا آخرت میں نجات و ثواب کا مستحق ہوگا، اس میں اس خیال کا جو آہو گیا، کہ یہ کفر و معصیت اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرارتیں جو آب تک کرتے رہے ہیں مسلمان ہو جانے کے بعد ان کا کیا انجام ہوگا، معلوم ہوا کہ پچھلے سب گناہ اور خطائیں معاف کر دی جائیں گی، اور آخرت میں نہ ان لوگوں کو اندیشہ رہے گا نہ کوئی غم و بے چینی پیش آئے گا۔

مضمون پر نظر کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ذکر نہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ تو ایمان و اطاعت کے اُس مقام پر ہیں جو اس آیت میں مطلوب ہے، یہاں ذکر صرف اُن لوگوں کا کرنا چاہئے جن کو اس مقام کی طرف بلانا ہے، مگر اس طرز خاص میں کہ مسلمانوں کا ذکر بھی ان کے ساتھ ملا دیا گیا ایک خاص بلاغت پیدا ہو گئی، اس کی ایسی مثال ہو کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ مورد عنایت و انعام ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سننا تو اصل میں اس کو ہے جو مخالفت کر رہا ہے، لیکن اس جگہ موافق کو بھی ذکر کرنے میں حکمت یہ ہو کہ ہم کو جو موافقین کے ساتھ عنایت ہے وہ کسی نسبی یا قومی خصوصیت کی بنا پر نہیں بلکہ ان کی صفت اطاعت پر تمام عنایت و انعام کا مدار ہے، اگر مخالفت بھی اطاعت خستیا کرے گا وہ بھی اسی لطف و عنایت کا مستحق ہوگا۔

متذکرہ چار قوموں کو خطاب کر کے جس امر کی ہدایت دی گئی اس کے تین جز ہیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، اور عمل صالح۔

ایمان بالرسالت کے بغیر نجات نہیں | ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے، اسلام کے چند بنیادی عقائد

ذکر کر کے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا مقصود ہے، اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول یا ایمان بالسنہۃ کا ذکر صراحتاً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم و عقل اور انصاف و دانش رکھنے والے کو کسی مشبہ کی گنجائش نہ تھی، خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات لبریز ہیں، جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول اور ارشادات رسول پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان و عمل بغیر اس کے مقبول و معتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکر وہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے، اور انھوں نے اس آیت میں صراحتاً ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کر لیا، جو قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہو، وہ یہ کہ ہر شخص اپنی اپنے مذہب یہودی، نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے، نجات اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں (نعوذ باللہ منہ)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے، ان کے لئے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کر دینا کسی بڑے علم و نظر کا محتاج نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو با آسانی سمجھ سکتے ہیں، چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں:

قرآن کریم نے جس جگہ ایمان مفصل کا بیان فرمایا اس کے الفاظ سورۃ بقرہ کے آخر میں یہ ہیں:

كُلُّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ
وَرُسُلِهِ لَا نَفِيَ قُبَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ
رَّسُوْلِهِ

”سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے
فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس
کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں
درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے“

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں، بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہو، اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر اور مقبول نہیں۔
دوسری جگہ ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَ
رُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا
بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنُكْفِرُ بِبَعْضٍ يُرِيدُونَ
أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار
کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس
کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں
(کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر رسولوں پر ایمان
نہ ہو) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں
کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور وہ چاہیں

کفر و اسلام کے بیچ بیچ کا ایک رستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

كَانَ مُؤْمِنِي حَيًّا لَمَّا دُيْعُوا
إِلَّا أَتْبَاعِي

”یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ
علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے

توابع کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاح آخرت پاسکتے ہیں
قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے

اس کے علاوہ ہر مذہب و ملت ایسی چیز ہو کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات
اور فلاح کے لئے کافی ہے، تو پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن
ہی بے معنی ہو جاتا ہے، اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجا قبول ہو جاتا ہو
سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی، دوسرے رسولوں کتابوں
شرعیاتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس
شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر
ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے، اور اس صورت میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ لِكُلِّ
جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاہٌ یعنی ہم نے تم میں ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت
اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے

اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اور
اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود و نصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف
تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل و قتال اور سیف و سنان کی جنگیں بھی لڑی، اور اگر انسان کے مؤمن
اور مقبول عند اللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو
بیچارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روزِ آخرت اور قیامت

اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا

کامن کر تھا اس نے تو عین حالت غضب میں بھی اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا جو حقیقت یہ ہو کہ یہ مغالطہ صرف اس نظریہ کی پیداوار ہے کہ مذہب کو برادری کے نوتہ کی طرح کسی کو..... تحفہ میں دیا جاسکتا ہے، اور اس کے ذریعہ دوسری قوموں سے رشتے جوڑے جاسکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے کھول کھول کر واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ برادری ہمدردی، احسان و سلوک اور مروت سب کچھ کرنا چاہئے، لیکن مذہب کی حدود کی پوری حفاظت اور اس کی سرحدوں کی پوری نگرانی کے ساتھ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اگر بالفرض ایمان بالرسول کا ذکر بالکل نہ ہوتا تو دوسری آیات قرآن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، جن میں اس کی اشد تاکید موجود ہے وہ کافی تھیں لیکن اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت میں بھی ایمان بالرسول کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو، قرآن کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا، **قَالَ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا**، یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا سہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول تھا، اس لئے **مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ** کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ وَارْسَلْنَا إِلَيْهِمْ

ہم نے لیا تھا پختہ قول بنی اسرائیل سے اور بھیجے ان کی طرف

رُسُلًا كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ

رسول جب لایا ان کے پاس کوئی رسول وہ حکم جو خوش نہ آیا ان کے جی کو

فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝۱۰ وَحَسِبُوا أَنَّا لَآ تَكُونُ

تو بہتوں کو جھٹلایا اور بہتوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور خیال کیا کہ کچھ خیرابی نہ

فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا

ہو گئے سو اندھے ہو گئے اور بہرے پھر توبہ قبول کی اللہ نے ان کی پھر اندھے اور

وَصَمُوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝۱۱

بہرے ہوئے ان میں سے بہت اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں،

خلاصہ تفسیر

ہم نے بنی اسرائیل سے (اول تو ریت میں تمام پیغمبروں کی تصدیق و اطاعت کا) عہد لیا اور (اس عہد کے یاد دلانے کو) ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے (لیکن اُن کی یہ حالت تھی کہ) جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا (تب ہی ان کے ساتھ مخالفت سے پیش آئے) سو بعضوں کو (تو) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (سب پر ہڑت) قتل ہی کر ڈالتے تھے اور (ہمیشہ ہر شرارت پر جب چند روز سزا سے مہلت دی گئی) یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی اس (گمان) سے اور بھی اندھے اور بہرے (کی طرح) بن گئے (کہ نہ دلائل صدق انبیاء کو دیکھنا اُن کے کلام کو سنا) پھر (ایک مدت کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ان پر (رحمت کے ساتھ) توبہ فرمائی (کہ اور کسی پیغمبر کو بھیجا کہ اب بھی راہ پر آویں مگر) پھر بھی (اسی طرح) اندھے اور مہرے بنے (سب تو نہیں مگر) اُن میں کے بہترے، اور اللہ تعالیٰ ان کے (ان) اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں (یعنی ان کا گمان غلط تھا، چنانچہ ان کو وقتاً فوقتاً سزا بھی ہوتی رہی، مگر ان کا یہی شیوہ رہا، حتیٰ کہ اب آپ کے ساتھ اسی طرح تکذیب و خلاف کا برتاؤ کیا،

معارف و مسائل

بنی اسرائیل کی عہد شکنی | کَلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ، یعنی جب بنی اسرائیل کے پاس ان کا رسول کوئی حکم لاتا جو اُن کے مذاق کے مطابق نہ ہوتا تو عہد و پیمان توڑ کر خدا سے غداری کرتے پھرتے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں سے کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کیا، یہ تو ان کے ”ایمان باللہ اور عمل صالح“ کا حال تھا، ”ایمان بالیوم الآخر“ کا اندازہ اس سے کر لو کہ اس وقت درشدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا، اور ظلم و بغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے، یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل ہی اندھے اور بہرے ہو گئے، اور جو ناکردنی کام تھے وہ کئے، حتیٰ کہ بعض انبیاء کو قتل اور بعض کو قید کیا، آخر خدا تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا، پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوک فارس نے بخت نصر کی قید و ملت در سواری سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا، اس وقت لوگوں نے توبہ کی، اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے

توبہ قبول کی، لیکن کچھ زمانہ کے بعد پھر وہی شرارتیں سوجھیں، اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرات کی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گئے۔ (فوائد عثمانی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا،

وَقَالَ الْمَسِيحُ يَبْنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ط

اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو اللہ کی رب ہو میرا اور تمہارا

اِنَّهُ مَن يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ

بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو حرام کی اللہ نے اس پر جنت اور

مَا وُجِدَ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۷۶ لَقَدْ كَفَرَ

اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی نہیں گنہگاروں کی مدد کرنے والا بے شک کافر ہوئے

الَّذِيْنَ قَالُوا اِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اِلٰهُ

جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں سے ایک، حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک

وَاحِدٌ ۝۷۷ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ

معبود کے اور اگر نہ باز آویں گے اس بات سے کہ کہتے ہیں تو بیشک پہنچے گا ان میں سے کفر پر

كَفَرُوا وَمِنْهُمْ عَذَابُ الْاَلِيْمِ ۝۷۸ اَفَلَا يَتُوبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ

قائم رہنے والوں کو عذاب دردناک، کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ کے آگے اور

يَسْتَغْفِرُوْنَ لَهُ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷۹ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ

گناہ بخشواتے اس سے اور اللہ بے بخشے والا مہربان نہیں ہے مسیح مریم کا

مَرْيَمَ الْاَسْرَسُوْلُ ۝۸۰ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۝۸۱ وَاُمُّهُ

بیٹا مگر رسول گزر چکے اس سے پہلے بہت رسول اور اس کی ماں

صِدِّيقَةٌ ط كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ اَنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ

دلی ہے دونوں کھاتے تھے کھانا، دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں۔ ان کو

الْاٰيَاتِ ثُمَّ اَنْظُرْ اِلَى يَوْمٍ فَاَكُوْنَ ۝۸۲ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِن دُونِ

دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں اُلٹے جا رہے ہیں، تو کہہ دے کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو

دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ

اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمھارے بُرے کی اور نہ بھلے کی اور اللہ وہی ہے

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۷۶﴾

سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر

بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح بن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد ہی) حالانکہ (حضرت) مسیح نے خود فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی رب ہو اور اس قول میں اپنے مروب اور بندہ ہونے کی تصریح ہے، پھر ان کو الہ کہنا وہی بات ہے کہ مدعی سست گواہ چست) بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا کہ دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا سکے، اور جلیبہ عقیدہ اتحاد کفر ہے اسی طرح عقیدہ تثلیث بھی کفر ہے پس) بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین (معبودوں) میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک معبود (حق) کے اور کوئی معبود (حق) نہیں (نہ دو اور نہ تین) جب یہ عقیدہ بھی کفر و شرک ہے تو اِنَّكَ مِنْ يٰسْرِ كَ الْخ میں جو سزا مذکور ہے وہ اس پر بھی مرتب ہوگی) اور اگر یہ (دونوں عقیدہ کے) لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (سمجھ رکھیں کہ) جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر (آخرت میں) دردناک عذاب واقع ہوگا کیا (ان مضامین توحید و عید کو مستکر) پھر بھی (اپنے ان عقائد و اقوال سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ (جب کوئی توبہ کرتا ہے تو) بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرماتا ہے ہیں (حضرت) مسیح ابن مریم (عین خدا یا جزو خدا) کچھ بھی نہیں ضرر ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر (اہل معجزات) گذر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبر می یا خرقِ عادت دلیل الوہیت ہے تو سب کو الہ (خدا) ماننا چاہئے، اور اگر دلیل الوہیت نہیں ہو تو حضرت مسیح کو کیوں الہ کہا جاوے، غرض جب اوروں کو الہ نہیں کہتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی) الہ یا جزو الہ نہیں بلکہ وہ) ایک دلی بی بی

ہیں (جیسی اور بیبیاں بھی ولی ہو چکی ہیں) اور دونوں حضرات کے آلہ نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک سہل دلیل یہ ہے کہ (دونوں حضرات) کھانا کھایا کرتے تھے (اور جو شخص کھانا کھاتا ہو وہ اس کا محتاج ہوتا ہو اور کھانا کھانا خواص مادیات سے ہے، اور احتیاج اور مادیات خاصہ ممکن الوجود کا ہے، جس کا وجود ضروری ہو، اور ممکن یعنی جس کا وجود ہی ضروری نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا) دیکھتے تو (ہی) ہم کیونکر صاف صاف دلائل ان سے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھتے وہ آلے کدھر جا رہے ہیں، آپ (ان سے) فرمائیے کیا خدا کے سوا ایسی (مخلوق) کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو کوئی ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتا ہو اور نہ نفع پہنچانے کا (اختیار رکھتا ہو اور عاجز ہونا خود خدائی کے منافی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سنتے ہیں جانتے ہیں (پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتے اور اپنے کفر و شرک سے باز نہیں آتے)

معارف مسائل

(قوله تعالى) إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ، یعنی حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ یا مسیح، مریم، اور اللہ تینوں خدا ہیں (العیاذ باللہ) ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہوا، پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں، عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہے، اور اس خلاف عقل و ہدایت عقیدہ کو گول مول اور چپراہ عبارتوں سے ادا کرتے ہیں، اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ماوراء عقل حقیقت قرار دیتے ہیں (قواند عثمانی) مسیح علیہ السلام کی (قوله تعالى) قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، یعنی جس طرح اور انبیاء دنیا الٰہیت کی تردید میں آئے اور کچھ دن رہ کر چل بے، ان کو دوام اور بقاء حاصل نہ تھا جو الٰہیت کی شان ہے، اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام (جو انہی کی طرح ایک انسان ہیں) کو دوام اور بقاء حاصل نہیں، لہذا وہ آلہ نہیں ہو سکتے۔

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج اور حیوانات سے اسے استغناء نہیں ہو سکتا، غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور مہضم ہونے تک خیال کرو بالواسطہ یا بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہو، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الٰہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے، جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی

چیز سے مستغنی نہیں ہو سکتا، پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقا میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتی ہے، یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں، یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے، اگرچہ نہ کھانا بھی کوئی الوہیت کی دلیل نہیں ورنہ سائے فرشتے خدا بن جائیں (معاذ اللہ) (فوائد عثمانی)

حضرت مریم بتوں میں مقام مدح میں لفظ "صَدِيقَہ" سے بظاہر اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ آپ "ولی" تھیں، نبی نہیں، کیونکہ مقام مدح میں اعلیٰ درجہ کو ذکر کیا جاتا ہے، اگر آپ کو نبوت حاصل ہوتی تو یہاں "نبیہ" کہا جاتا، حالانکہ یہاں "صَدِيقَہ" کہا گیا ہے، جو ولایت کا مقام ہے (روح ملخصاً)

جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی، یہ منصب رجال ہی کے لئے مخصوص رہا ہے، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ اِلَيْهِمْ مِنْ اَهْلِ الْفُرْسٰی (یوسف، رکوع ۱۲) (فوائد عثمانی)

قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُواْ فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا

تو کہہ اے اہل کتاب مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں ناحق کا اور مت چلو

اَهْوَاۗءَ قَوْمٍۭ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ

خیالات پران لوگوں کے جو گمراہ ہو چکے پہلے اور گمراہ کر گئے بہتوں کو اور بہک گئے

سَوَاۤءِ السَّبِیْلِ ۝۷ لَعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ

سیدھی راہ سے ، ملعون ہوتے کانسر بنی اسرائیل میں کے

عَلٰی لِسَانِ دَاوُدَ وَعِیْسٰی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا

داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بیٹے مریم کی یہ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے اور حد

یَعْتَدُوْنَ ۝۸ کَانُوْا لَا یَتَنٰہَوْنَ عَنْ مَّا کُفِرُوْا بِہٖ فَعَلُوْا کِبٰۤیۡسًا

سے گذر گئے تھے آپس میں منع نہ کرتے بُرے کام سے جو وہ کر رہے تھے کیا ہی

مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝۹ تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْہُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ

برا کام ہو جو کرتے تھے، تو دیکھتا ہوں ان میں کہ بہت سے لوگ دوستی کرتے ہیں کافروں

کَفَرُوْا وَاَطٰۤیۡبُۡسٍ مَّا قَدْ مَتَّ لَہُمْۢ اَنْفُسُہُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ

سے کیا ہی بُرا سامان بھیجا انھوں نے اپنے واسطے وہ یہ کہ اللہ کا غضب ہوا

عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ لَهُمْ خِلَدٌ ۖ وَنَ ۝۸۰ وَكَوْكَانُوا يُؤْمِنُونَ

اُن پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں اور اگر وہ یقین رکھتے

بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوا لَهُمْ أَوْلِيَاءَ

اللہ پر اور نبی پر اور جو نبی پر اترا تو کافروں کو دوست نہ بناتے

وَلَكِنْ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ۝۸۱

لیکن ان میں بہت سے لوگ نافرمان ہیں

خلاصہ تفسیر

آپ (ان نصاریٰ سے) فرمائیے کہ اے اہل کتاب تم اپنے دین (کے معاملہ) میں ناحق کا غلو (اور افراط) مت کرو اور اس (افراط کے باب) میں ان لوگوں کے خیالات (یعنی بے سند باتوں) پر مت چلو جو (اس وقت سے) پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور (اپنے ساتھ) اور بہتوں کو (لے کر ڈوبے ہیں) غلطی میں ڈال چکے ہیں اور (وہ ان کی غلطی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ حق مفقود ہو گیا ہو اس کا پتہ نہ لگتا ہو بلکہ) وہ لوگ راہِ راست (کے) ہوتے ہوئے قصداً (اس) سے دور (اور علحدہ) ہو گئے تھے (یعنی جب اُن کی غلطی دلائل سے ثابت ہو گئی پھر ان کا اتباع کیوں نہیں چھوڑتے) بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت لعنت کی گئی تھی (زبور اور انجیل میں جس کا ظہور حضرت داؤد علیہ السلام) اور (حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) کی زبان سے (ہوا یعنی زبور اور انجیل میں کافروں پر لعنت لکھی تھی جیسے قرآن مجید میں بھی ہے فَلَعْنَتُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِينَ، چونکہ یہ کتابیں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئیں، اس لئے یہ مضمون اُن کی زبان سے ظاہر ہوا اور) یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انھوں نے حکم کی (اعتقاد ہی) مخالفت کی (جو کہ کفر ہے) اور (اس مخالفت میں) حد سے (بہت دور) نکل گئے (یعنی کفر بھی شدید تھا، پھر شدید کے ساتھ) مدید بھی تھا، یعنی اس پر استمرار رکھا، چنانچہ (جو بُرا کام (یعنی کفر) انھوں نے (خستیار) کر رکھا تھا اس سے) (آئندہ کو) باز نہ آتے تھے (بلکہ اس پر مصر تھے، پس ان کے کفر) شدید اور مدید کے سبب ان پر شدید لعنت ہوئی) (واقعی ان کا یہ) فعل (مذکور یعنی کفر) پھر وہ بھی شدید اور مدید) بیشک بُرا تھا (کہ اس پر یہ سزا مرتب ہوئی) آپ ان (بیہوش) میں بہت سے آدمی دیکھیں گے کہ (مشرک) کافروں سے دوستی کرتے ہیں (چنانچہ یہوذا

مدینہ اور مشرکین کہ میں مسلمانوں کی عداوت کے علاقہ سے جس کا منشاء اتحاد فی الکفر تھا باہم خوب سازگاری تھی) جو کام انھوں نے آگے (بھگتے) کے لئے کیا ہو (یعنی کفر جو سبب تھا دوستی کفار اور عداوتِ مومنین کا) وہ بے شک بُرا ہے کہ (اس کے سبب) اللہ تعالیٰ ان پر (ہمیشہ کے لئے) ناخوش ہوا اور (اس ناخوشی دانی کا ثمرہ یہ ہوگا کہ) یہ لوگ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، اور اگر یہ (یہودی) لوگ اللہ پر ایمان رکھتے اور پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) پر ایمان رکھتے جس کا اُن کو دعویٰ ہے) اور اس کتاب پر ایمان رکھتے (جو ان پیغمبر کے پاس بھیجی گئی تھی) (یعنی توریت) تو ان (مشرکین) کو دوست نہ بتاتے، لیکن ان میں زیادہ لوگ (دائرۃ) ایمان سے خارج ہی ہیں اس لئے کافروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور دوستی ہو گئی۔

معارف و مسائل

بنی اسرائیل کی کج روی | (قرآن تعالیٰ) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ، پھلی آیات کا ایک دوسرا پہلو | میں بنی اسرائیل کی سرکشی اور ان کے ظلم و ستم کو بیان کیا گیا تھا، کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول جو اُن کے لئے حیاتِ جاودانی کا پیغام اور ان کی دنیا و آخرت ستوارنے کا دستورِ عمل لے کر آئے تھے ان کی قدر و منزلت پہچاننے اور تعظیم و تکریم کرنے کے بجائے انھوں نے ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا، کہ خَرِيفًا كَذَّابًا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ، یعنی بعض انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کر ڈالا۔

مذکورہ آیات سے انھیں بنی اسرائیل کی کج روی کا دوسرا رخ بتلایا گیا ہے، کہ یہ جاہل یا تو سرکشی اور نافرمانی کے اس کنارے پر تھے، کہ اللہ کے رسولوں کو جھوٹا کہا، اور بعض کو قتل کر ڈالا، اور یا گمراہی اور کج روی کے اس کنارے پر پہنچ گئے کہ رسولوں کی تعظیم میں غلو کر کے ان کو خدا ہی بنا دیا، فَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ، یعنی وہ بنی اسرائیل کافر ہو گئے، جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو عیسیٰ ابن مریم ہی کا نام ہے۔ یہاں تو یہ قول صرف نصاریٰ کا مذکور ہے، دوسری جگہ نہیں غلو اور گمراہی یہودی بھی بیان فرمائی گئی ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ، یعنی یہود نے تو یہ کہہ دیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ نے یہ کہہ دیا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔

غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں دین نے جو حدود و مقرر کی ہیں اُن سے آگے بڑھ جائیں مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلقِ خدا میں

سب سے افضل جانے، اس حد سے آگے بڑھ کر اپنی کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دینا اعتقادی غلط ہے۔
 بنی اسرائیل کی افراط و تفریط | انبیاء اور رسل کے معاملہ میں بنی اسرائیل کے یہ دو متضاد عمل کہ یا تو ان کو جھوٹا کہیں اور قتل تک سے دریغ نہ کریں، اور یا یہ زیادتی کہ ان کو خود ہی خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیدیں، یہ وہی افراط و تفریط ہے جو جہالت کے لوازم سے ہے، عرب کا مشہور مقولہ الجاہل امارعظ و اومفیط یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال اور میانہ روی پر نہیں رہتا، بلکہ یا افراط میں مبتلا ہوتا ہے یا تفریط میں، افراط کے معنی حد سے آگے بڑھنے کے ہیں اور تفریط کے معنی ہیں فرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور کمی کرنے کے، اور یہ افراط و تفریط یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی دو مختلف جماعتوں کی طرف سے عمل میں آئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ ایک ہی جماعت کے یہ دو مختلف عمل مختلف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوئے ہوں، کہ بعض کی تکذیب و قتل تک نوبت پہنچ جاتے، اور بعض کو خدا کے برابر بنا دیا جائے۔

ان آیات میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے جو ہدایات ان کو اور قیامت تک گنہ والی نسلوں کو دی گئی ہیں وہ دین و مذہب اور اس کی پیروی میں ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں، کہ اس سے ذرا ادھر ادھر ہونا انسان کو گمراہیوں کے غار میں دھکیل دیتا ہے، اس کو اس کی تشریح سمجھ لیجئے۔

اللہ جل شانہ تک | حقیقت یہ ہے کہ سارے جہان اور اس کی موجودات کا خالق و مالک صرف ایک رسائی کا طریقہ | اللہ جل شانہ ہے، اسی کا ملک ہو اور اسی کا حکم ہے، اسی کی اطاعت ہر انسان پر لازم ہے، لیکن بیچارہ خاکی نژاد انسان اپنی مادی ظلمتوں اور پستیوں میں گھرا ہوا ہے، اس کی ساری رسائی اس ذات قدوس تک یا اس کے احکام و ہدایات معلوم کرنے تک کس طرح ہو، اللہ جل شانہ نے اپنے فضل سے اس کے لئے دو واسطے مقرر کر دیئے، جن کے ذریعے انسان کو حق تعالیٰ کی پسند و ناپسند اور مامورات و منہیات کا علم ہو سکے، ایک اپنی کتابیں جو انسان کے لئے قانون اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہیں، دوسرے اپنے ایسے مخصوص مقبول بندے جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے چن لیا ہے، اور ان کو اپنی پسند و ناپسند کا عملی نمونہ اور اپنی کتاب کی عملی تشریح بنا کر بھیجا ہے، جن کو دینی اصطلاح میں رسول یا نبی کہا جاتا ہے، کیونکہ تجربہ شاید ہو کہ کوئی کتاب خواہ کتنی ہی جامع اور مفصل کیوں ہو کسی انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے کافی نہیں ہوتی، بلکہ فطری طور پر انسان کا مرقی و مصلح صرف انسان ہی ہو سکتا ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے دو سلسلے رکھے، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ جن میں انبیاء علیہم السلام اور پھر ان کے نائبین علماء و مشائخ سب

داخل ہیں، رجال اللہ کے اس سلسلہ کے متعلق زمانہ قدیم سے دنیا افراط و تفریط کی غلطیوں میں مبتلا رہی ہی، اور مذاہب میں جتنے مختلف فرقے پیدا ہوئے، وہ سب اسی ایک غلطی کی پیداوار ہیں کہ کہیں ان کو حد سے بڑھا کر رجال پرستی تک نوبت پہنچادی گئی، اور کہیں ان سے بالکل قطع نظر کر کے حَبِطُ الْکِتَابِ اللہ کو غلط معنے پہنکا کر اپنا شعار بنا لیا گیا، ایک طرف رسول کو بلکہ پیروں کو بھی عالم الغیب اور خاص خدائی صفات کا مالک سمجھ لیا گیا، اور پھر پرستی بلکہ قبر پرستی تک پہنچ گئی دوسری طرف اللہ کے رسول کو بھی محض ایک قاصد اور چٹھی رساں کی حیثیت دیدی گئی، آیات متذکرہ میں رسولوں کی توہین کرنے والوں کو بھی کافر قرار دیا گیا، اور ان کو حد سے بڑھا کر خدا تعالیٰ کے برابر کہنے والوں کو بھی کافر قرار دیا گیا، آیت لَا تَخْلُوا بَیْ دِیْنِکُمْ اِیْ دِیْنِکُمْ کی تہمید ہے جس نے واضح کر دیا کہ دین اصل میں چند حدود و قیود ہی کا نام ہے، اُن حدود کے اندر کوتاہی کرنا اور کمی کرنا جس طرح جرم ہے اسی طرح اُن سے آگے بڑھنا اور زیادتی کرنا بھی جرم ہے جس طرح رسولوں اور ان کے نائبوں کی بات نہ ماننا ان کی توہین کرنا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ کا مالک یا مساوی سمجھنا اس سے زیادہ گناہ عظیم ہے۔

علمی تحقیق و تدقیق غلو نہیں | آیت مذکورہ میں لَا تَخْلُوا بَیْ دِیْنِکُمْ کے ساتھ لفظ غَيْرَ الْحَقِّ لایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ناحق کا غلو مت کرو، یہ لفظ محققین اہل تفسیر کے نزدیک تاکید کیلئے استعمال ہوا ہے، کیونکہ غلو فی الدین ہمیشہ ناحق ہوتا ہے، اس میں حق ہونے کا احتمال ہی نہیں اور علامہ زحشر می غیر نے اس جگہ غلو کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک ناحق اور باطل جس کی ممانعت اس جگہ کی گئی ہے، دوسرے حق اور جائز جس کی مثال میں انھوں نے علمی تحقیق و تدقیق کو پیش کیا ہے، جیسا کہ عقائد کے مسائل میں حضرات متکلمین کا اور فقہی مسائل میں فقہاء رحمہم اللہ کا طریق رہا ہے، ان کے نزدیک یہ بھی اگرچہ غلو ہے، مگر غلو حق اور جائز ہے، اور جہوں کی تحقیق یہ ہے کہ یہ غلو کی تعریف میں داخل ہی نہیں، قرآن و سنت کے مسائل میں گہری نظر اور موثکافی جس حد تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے ثابت ہے وہ غلو نہیں، اور جو غلو کی حد تک پہنچے وہ اس میں بھی مذموم ہے۔

بنی اسرائیل کو معتدل راہ کی ہدایت | مذکورہ آیت کے آخر میں موجودہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا آهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَصْلُوا کَثِیْرًا، یعنی اس قوم کے خیالات کا اتباع نہ کرو جو تم سے پہلے خود بھی گمراہ ہو چکے تھے، اور دوسروں کو بھی انھوں نے گمراہ کر رکھا تھا، اس کے بعد ان کی گمراہی کی حقیقت اور وجہ کو ان الفاظ سے بیان فرمایا وَ ضَلُّوا عَنْ سَبِیْلِ سَوَاءٍ السَّبِیْلِ، یعنی یہ لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے تھے، جو افراط

تفریط کے درمیان معتدل راہ تھی، اسی طرح اس آیت میں غلو اور افراط و تفریط کی مہلک غلطی کا بیان بھی آگیا، اور درمیانی راہ صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کا بھی۔

بنی اسرائیل کا انجام بد | دوسری آیت میں ان بنی اسرائیل کا انجام بد ذکر کیا گیا ہے، جو اس افراط و تفریط کی گمراہی میں مبتلا تھے، کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی، اول و اول علیہ السلام کی زبان سے جس کے نتیجے میں ان کی صورتیں مسخ ہو کر خنزیر بن گئے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ لعنت اُن پر مسلط ہوئی، جس کا اثر دنیا میں یہ ہوا کہ مسخ ہو کر بندر بن گئے، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ بقا ضاعے مقام صرف دو پیغمبروں کی زبانی ان پر لعنت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پر لعنت کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی، اور انتہا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی، اس طرح مسلسل چار پیغمبروں کی زبانی ان لوگوں پر لعنت مسلط ہوئی جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی، یا جنہوں نے ان کو حد سے آگے بڑھا کر خدا تعالیٰ کی صفات کا شریک بنا دیا۔

آخری دونوں آیتوں میں کفار کے ساتھ گہری دوستی اور موالات کی ممانعت اور اس کے تباہ کن نتائج کا بیان فرمایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ ساری کجروی اور گمراہی نتیجہ تھی ان کے غلط قسم کے ماحول اور کفار کے ساتھ دلی دوستی کرنے کا، جس نے ان کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ

تو پادے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو

وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِلَّذِينَ

اور مشرکوں کو اور تو پادے گا سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں

آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

کے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس واسطے کہ نصاریٰ میں

قَرِيبِينَ وَرَهَبَانًا وَآخَرَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۸۶﴾

عالم ہیں اور درویش ہیں اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے

وَإِذْ أَسْمِعُوا مَا أَنزَلَ إِلَى الرَّسُولِ نَرَىٰ

اور جب سننے میں اس کو جو اُترا رسول پر تو دیکھ تو

أَعْيَنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّامِعِ مَسَاعِرُ فَوَامِنَ الْاِحْسَنِ ۝

انکی آنکھوں کو کہ اُبلتی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انھوں نے پہچان لیا حق بات کو

يَقُولُونَ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاَكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ ۝۸۳ وَمَا لَنَا لَا

کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کے ساتھ اور ہم کو کیا ہوا

نُعْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُدْخِلَنَا

کہ یقین نہ لادیں اللہ پر اور اس چیز پر جو پہنچی ہم کو حق سے اور توقع رکھیں اس کی کہ داخل کرے ہم کو

رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۴ فَاَنَّا يَكْفُمُ اللّٰهُ بِمَا فَاَلَوْا

رب ہمارا ساتھ نیک بختوں کے پھر ان کو بدلے میں دیتے اللہ نے اس کہنے پر ایسے

جَنَّتْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ

باغ کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی اور یہ ہے

جَزَاؤُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۵ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا

بدلہ نیک کرنے والوں کا اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلانے لگے ہماری آیتوں

اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَحِيْمِ ۝۸۶

کو وہ ہیں دوزخ کے رہنے والے

رَبِّطِ اٰيَاتِ | اوپر یہود و کافر کے دوستی رکھنا مذکور تھا، آگے اُن کا مع مشرکین کے مسلمانوں سے عداوت رکھنا مذکور ہے، جو اس دوستی کا اصلی سبب تھا، اور چونکہ ہر معاملہ

میں قرآن مجید عدل و انصاف کا سب سے بڑا داعی ہے، اس لئے یہود و نصاریٰ میں بھی سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا، جس میں کوئی خوبی تھی اس کا بھی اظہار کیا گیا، مثلاً نصاریٰ کی ایک

خاص جماعت میں بہ نسبت ان یہود کے تعصب کا کم ہونا، اور ان نصاریٰ میں جنھوں نے حق قبول کر لیا تھا ان کا مستحق حسن ثناء و حسن جزا ہونا مذکور ہے، اور یہ خاص جماعت حبشہ

کے نصاریٰ کی ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو جبکہ ہجرت مدینہ کے قبل وہ اپنا وطن مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے تھے، کچھ تکلیف نہیں دی، اور جو اور نصرائی ایسا ہی ہو وہ بھی حکماً انہی میں داخل

ہو، اور ان میں سے جنھوں نے حق قبول کر لیا تھا وہ بجا بشی بادشاہ اور ان کے مصاحب ہیں کہ حبشہ میں بھی قرآن سن کر روئے اور مسلمان ہو گئے، پھر تیس آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن شکر و سے اور اسلام قبول کیا، یہی اس آیت کا شان نزول ہے۔

حُلاصۂ تفسیر

(غیر مؤمنین میں) تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پاویں گے اور ان (غیر مؤمن آدمیوں) میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر (بہ نسبت اوروں کے) ان لوگوں کو پاویں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (قریب تر کا یہ مطلب ہے کہ دوست تو وہ بھی نہیں، مگر دوسرے کفار مذکورین سے غنیمت ہیں) یہ دوستی سے قریب تر ہونا اور عداوت میں کم ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان (نصاری) میں بہت سے علم دوست عالم ہیں، اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں، (اور جب کسی قوم میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں تو عوام میں بھی حق کے ساتھ زیادہ عناد نہیں رہتا، اگرچہ خواص و عوام حق کو قبول بھی کریں) اور اس سبب سے ہے کہ یہ (نصاری) لوگ متکبر نہیں ہیں (قتیسین و رہبان سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں، اور نیز تواضع کا خاصہ ہوا حق کے سامنے نرم ہو جانا اس لئے ان کو عداوت زیادہ نہیں، پس قتیسین و رہبان یعنی علماء و مشائخ کا وجود اشارہ ہے علت فاعلہ کی طرف اور عدم استکبار قابلیت کی طرف، بخلاف یہود و مشرکین کے کہ محب دنیا اور متکبر ہیں، اور گویہو میں بھی بعض علماء و حقانی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے، لیکن بدجہ ان کی قلت کے عوام میں اثر نہیں پہنچتا تھا، اس لئے ان میں عناد ہے، جو سبب ہو جاتا ہے شدت عداوت کا، اسی لئے یہود تو مؤمن ہی کم ہوئے اور مشرکین میں سے جب عناد نکال گیا تب مؤمن ہونا شروع ہوئے) اور (بعض ان میں جو کہ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے ایسے ہیں کہ) جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، اس سبب سے کہ انھوں نے (دین) حق (یعنی اسلام) کو پہچان لیا (مطلب یہ کہ حق کو سن کر متاثر ہوتے ہیں اور) یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم مسلمان ہو گئے تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لیجئے (یعنی ان میں شمار کر لیجئے) جو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے حق ہونے کی) تصدیق کرتے ہیں ... اور ہمارے پاس کو نسا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب تعلیم شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو (دین) حق ہم کو (اب) پہنچا ہو اس پر ایمان نہ لاویں اور (پھر) اس بات کی امید (بھی) رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک (مقبول) لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا، (بلکہ یہ امید موقوف اسلام پر ہے، اس لئے مسلمان ہونا ضروری ہے) سو ان (لوگوں) کو اللہ تعالیٰ ان کے (اس) قول (مع الاعتقاد) کی پاداش میں ایسے باغ (بہشت کے) دیں گے جن کے (مخلات)

نیچے ہنسی جاری ہوں گی (اور) یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، اور نیکو کاروں کی یہی جزا ہے، اور (برخلاف ان کے) جو لوگ کافر رہے اور ہماری آیات (واحکام) کو جھوٹا کہتے رہے وہ لوگ دو تہ (میں رہنے والے ہیں)۔

معارف و مسائل

بعض اہل کتاب کی ان آیات میں مسلمانوں کے ساتھ عداوت یا مودت کے معیار سے اُن اہل کتاب حق پرستی، کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اپنی حق پرستی اور خدا ترسی کی وجہ سے مسلمانوں سے بغض و عداوت نہیں رکھتے تھے، مگر ان اوصاف کے لوگ یہودیوں میں بہت کم کا عدم تھے، جیسے حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ، نصاریٰ میں نسبتاً ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ملک حبشہ کا بادشاہ نجاشی اور وہاں کے حکام و عوام میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی، اور اسی سبب جب مکہ مکرمہ کے مسلمان قریش کے مظالم سے تنگ آ گئے، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا، اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ حبشہ کا بادشاہ نہ خود ظلم کرتا ہے، نہ کسی کو کسی پر ظلم کرنے دیتا ہے، اس لئے مسلمان کچھ عرصہ کے لئے وہاں چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے پہلی مرتبہ گیارہ حضرات حبشہ کی طرف نکلے، جن میں حضرت عثمان غنیؓ اور ان کی زوجہ محترمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں، اس کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی سرکردگی میں مسلمانوں کا ایک بڑا قافلہ جو عورتوں کے علاوہ بیاسی مردوں پر مشتمل تھا، حبشہ پہنچ گیا، شاہ حبشہ اور وہاں کے باشندوں نے ان کا مہربانہ استقبال کیا، اور یہ لوگ امن و عافیت سے وہاں رہنے لگے۔

قریش مکہ کے غیظ و غضب نے ان کو اس پر بھی نہ رہنے دیا، کہ یہ لوگ کسی دوسرے ملک میں اپنی زندگی عافیت سے گزار لیں، انھوں نے اپنا ایک وفد بہت سے تحفے دے کر شاہ حبشہ کے پاس روانہ کیا، اور یہ درخواست کی کہ ان مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دیں، مگر شاہ حبشہ نے حالات کی تحقیق کی، اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور ان کے رفقاء سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے حالات معلوم کئے، ان حالات اور اسلام کی تعلیمات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی پیشینگوئی کے عین مطابق پایا، جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر اور ان کی تعلیمات کا مختصر خاکہ، اور ان کا اور ان کے صحابہ کا حلیہ وغیرہ مذکور تھا، اس سے متاثر ہو کر شاہ حبشہ نے قریشی وفد کے ہدیے، تحفے واپس

کر دیئے اور ان کو صاف جواب دیدیا کہ میں ایسے لوگوں کو اپنے ملک سے نکلنے کا کبھی حکم نہیں دے سکتا
 حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر | حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے نجاشی کے دربار میں اسلام اور
 کاشاہ حبشہ پر اثر کیا | اس کی تعلیمات کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ کھینچ دیا تھا، اور پھر ان
 حضرات کے قیام نے نہ صرف اس کے دل میں بلکہ وہاں کے حکام و عوام سب کے دل میں اسلام
 اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت و عظمت پیدا کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رسول
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور وہاں آپؐ کا اور صحابہ کرامؓ کا
 مطمئن ہو جانا معلوم ہوا اور ہاجرین حبشہ نے مدینہ طیبہ جانے کا عزم کیا تو نجاشی شاہ حبشہ نے
 ان کے ساتھ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء، مشائخ کا ایک وفد آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھا، جن میں باسٹھ حضرات حبشہ
 کے اور آٹھ شام کے تھے۔

شاہ حبشہ کے وفد کی | یہ وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک درویشانہ اور راہبنا
 درگاہ رسائی حاضری | لباس میں ملبوس حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورہ
 یسین پڑھ کر سنائی، یہ لوگ سنتے جاتے تھے، اور ان کی آنکھوں آنسو جاری تھے، سب نے کہا کہ
 یہ کلام اس کلام کے کتنا مشابہ ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا، اور یہ سب کے
 سب مسلمان ہو گئے۔

ان کی واپسی کے بعد شاہ حبشہ نجاشی نے بھی اسلام کا اعلان کر دیا، اور اپنا ایک خط
 دے کر اپنے صاحبزادہ کو ایک دوسرے وفد کا قائد بنا کر بھیجا، مگر سو برا اتفاق سے یہ کشتی دریائے
 غرق ہو گئی، الغرض حبشہ کا بادشاہ اور حکام و عوام نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ
 صرف شریفانہ اور عادلانہ سلوک کیا بلکہ بالآخر خود بھی مسلمان ہو گئے۔

جمہور مفسرین نے فرمایا کہ آیات متذکرہ انہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں اَلَّذِينَ
 اٰقَرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الَّذِيْنَ قَالُوْا اَلَا نَا نَصْرُیْ، اور بعد کی آیات میں ان کا خوف
 حق تعالیٰ سے رہنا اور حق کو قبول کرنا بیان فرمایا گیا ہے، اس پر بھی جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ اگرچہ
 یہ آیات نجاشی اور اس کے بھیجے ہوئے وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن الفاظ میں عموم
 ہی، اس لئے اس کا حکم ان تمام نصاریٰ کے لئے عام اور شامل ہے، جو اہل حبشہ کی طرح حق پرست
 اور انصاف پسند ہوں، یعنی اسلام سے پہلے انجیل کے متبع تھے، اور اسلام آنے کے
 بعد اسلام کے پیرو ہو گئے۔

یہودی میں بھی اگرچہ چند حضرات اسی شان کے موجود تھے جو عہد موسوی میں تورات پر

عامل ہے، پھر اسلام آنے کے بعد اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، لیکن یہ اتنی کم تعداد تھی کہ امتوں اور قوموں کے ذکر کے وقت اس کو ذکر نہیں کیا جاسکتا، باقی یہود کا حال کھلا ہوا تھا، کہ وہ مسلمانوں کی عداوت اور بیخ کنی میں سب آگے تھے، اسی لئے صدر آیت میں یہود کا یہ حال ذکر فرمایا:

كَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ، یعنی مسلمانوں کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہودی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس آیت میں نصاریٰ کی ایک خاص جماعت کی مدح فرمائی گئی ہے جو خدا ترسی اور حق پرستی کی حامل تھی، اس میں نجاشی اور اس کے اعدا و انصار بھی داخل ہیں، اور دوسرے نصاریٰ بھی جو ان صفات کے حامل تھے، یا آئندہ زمانہ میں داخل ہوں، لیکن اس کے یہ معنی نہ آیات سے نکلتے ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں کہ نصاریٰ خواہ کیسے بھی گمراہ ہو جائیں اور اسلام دشمنی میں کتنے ہی سخت اقدام کریں ان کو بہر حال مسلمانوں کا درست سمجھا جائے، اور مسلمان ان کی دوستی کی طرف ہاتھ بڑھائیں، کیونکہ یہ بدابہ غلط اور واقعات کے قطعاً خلاف ہے، اسی لئے امام ابو بکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ بعض جاہل جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان آیات میں مطلقاً نصاریٰ کی مدح ہے اور وہ علی الاطلاق یہود سے بہتر ہیں، یہ سراسر جہالت ہے، کیونکہ اگر عام طور پر دونوں جماعتوں کے مذہبی عقائد کا موازنہ کیا جائے تو نصاریٰ کا مشرک ہونا زیادہ واضح ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ معاملات کو دیکھا جائے تو آجکل کے عام نصاریٰ نے بھی اسلام دشمنی میں یہودیوں سے کم حصہ نہیں لیا، ہاں یہ صحیح ہے کہ نصاریٰ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوئی ہے، جو خدا ترس اور حق پرست تھے، اسی کے نتیجے میں انکو قبول اسلام کی توفیق ہوئی، اور یہ آیات ان دونوں جماعتوں کے مابین اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں، خود اسی آیت کے آخر میں قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِيّٰيْنَ وَرُهْبَانًا وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ، یعنی جن نصاریٰ کی مدح ان آیات میں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور خدا ترس تارک الدنیا حضرات ہیں، اور ان میں تکبر نہیں کہ دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، مقابلہ سے معلوم ہوا کہ یہود کے یہ حالات نہ تھے، ان میں خدا ترسی اور حق پرستی نہ تھی، ان کے علماء نے بھی بجائے ترک دنیا کے اپنے علم کو صرف ذریعہ معاش بنالیا تھا، اور طلب دنیا میں ایسے مست ہو گئے تھے کہ حق و ناحق اور حلال و حرام کی بھی پرواہ نہ رہی تھی۔

قوم و ملت کی اصلی روح | آیت مذکورہ کے بیان سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ قوم و ملت کی حق پرست علماء و مشائخ ہیں | اصلی روح حق پرست، خدا ترس علماء و مشائخ ہیں، ان کا وجود پوری قوم

کی حیات ہے، جب تک کسی قوم میں ایسے علماء و مشائخ موجود ہوں جو دنیوی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں،
خدا ترسی ان کا مقام ہو تو وہ قوم خیر و برکت سے محروم نہیں ہوتی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ

اے ایمان والو! مت حرام ٹھہراؤ وہ لذیذ چیزیں جو اللہ نے تمھارے لئے حلال کر دیں

وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۸۸﴾ وَكُلُوا مِمَّا

اور حد سے نہ بڑھو بیشک اللہ پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو اور کھاؤ اللہ کے

رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿۸۹﴾

دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو،

رابط آیات | یہاں تک اہل کتاب کے متعلق گفتگو تھی، آگے پھر خود ہے احکام ذریعہ کی طرف،

جن کا ذکر کچھ شروع سورت میں اور کچھ درمیان میں بھی ہوا ہے، اور باعتبار خصوصیت مقام کے ایک
رابط خاص بھی منقول ہے، وہ یہ کہ اوپر مقام مدح میں رہبانیت کا ذکر آیا ہے، گو وہ باعتبار اس کے
ایک جزو خاص یعنی ترکِ حُبِ دنیا کے ہے، لیکن احتمال تھا کہ کوئی رہبانیت کی مساوی خصوصیت
کو قابلِ مدح سمجھ جائے، اس لئے اس مقام پر اس تحریمِ حلال کی ممانعت زیادہ مناسب معلوم ہوئی۔

(بیانِ لہٰذاً لِمَا لَمْ يَخْصَا)

حُصْلَةُ تَفْسِيرِ

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمھارے واسطے حلال کی ہیں (خواہ وہ کھانے پینے اور
پہننے کی قسم سے ہوں یا منکوحات کی قسم سے ہوں)، ان میں لذیذ (اور مرغوب) چیزوں کو (قسم و
عہد کر کے اپنے نفسوں پر) حرام مت کر دو اور حدود (شرعیہ) سے (جو کہ تحلیل و تحریم کے باب
میں معتبر ہیں) آگے مت نکلو بیشک اللہ تعالیٰ حد (شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے
اور خدا تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ (پرو) اور اللہ
تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو (یعنی تحریمِ حلال خلافِ رضائے حق ہے، ڈرو، اور
اس کا ارتکاب مت کرو) ۛ

معارف و مسائل

ترک دنیا اگر حدودِ الہیہ کے اندر ہو تو جائز ورنہ حرام ہے | مذکورہ آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ ترک دنیا اور ترک شہوات لذائذ ایک درجہ میں محبوب و پسندیدہ ہے، مگر اس میں بھی حدودِ الہیہ سے

تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

کسی حلال چیز کو حرام | کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں، ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرے،

مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا، تیسرے یہ کہ اعتقاد و قول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانونِ الہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظِ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے تو قسم ہو جائے گی، قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارِ قسم اور کفر جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبائیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن و سنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیتِ ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس کے لئے اُن چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لئے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تَعْتَدُوا مَا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ، یعنی اللہ کی حدود سے آگے نہ بڑھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

حد سے بڑھنے کا مطلب یہی ہو کہ کسی حلال چیز کو بلا کسی عذر کے ثواب سمجھ کر چھوڑ دے، جس کو ناواقف آدمی تقویٰ سمجھتا ہو، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تعدی اور ناجائز ہے، اس لئے دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ، یعنی جو رزق حلال پاک اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے اس کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے جس پر تمہارا ایمان ہے ڈرتے رہو۔

اس آیت میں واضح فرمادیا کہ حلال پاک چیزوں کا ثواب سمجھ کر چھوڑ دینا تقویٰ نہیں، بلکہ تقویٰ اس میں ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر استعمال کرے، اور شکر ادا کرے، ہاں کسی جسمانی یا روحانی مرض کی وجہ سے بطور علاج کسی چیز کو چھوڑے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر لیکن پکڑتا ہے

بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ ۖ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ

اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہر دس محتاجوں کو

مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ

اوسط درجہ کا کھانا جو دیتے ہو اپنے گھر والوں کو یا کپڑا پہنا دینا دس محتاجوں کو یا ایک گروں آزاد

رَقَبَةٍ ۖ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ أَذَلِكَ كَفَارَةٌ

کرتی پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھنے میں تین دن کے یہ کفارہ ہو تمہاری

أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ۚ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ

قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو، اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی اسی طرح بیان کرتا ہے

اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۸۹﴾

اللہ تمہارے لئے اپنے حکم تاکہ تم احسان مانو

رَبِّطِ آيَاتِ | اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا، چونکہ وہ بعض اوقات بذریعہ قسم کے ہوتی ہے، اس لئے آگے قسم کھانے کا حکم مذکور ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ تم سے (دنیوی) مواخذہ نہیں فرماتے (یعنی کفارہ واجب نہیں کرتے) تمہاری قسموں میں لغو قسم (توڑنے) پر لیکن (ایسا) مواخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو (آئندہ بات پر) مستحکم کر دو (اور پھر اس کو توڑ دو) سو اس (قسم کے توڑنے) کا کفارہ (یہ ہے کہ) دس محتاجوں کو کھانا دینا (وسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو (معمولی طور پر) کھانے کو دیا کرتے ہو یا ان (دس محتاجوں کو) کپڑا دینا (اوسط درجہ کا) یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا یعنی تینوں میں جس کو چاہے نخواستیا کرے) اور جو (ان تینوں میں سے ایک کا بھی) معتد ورنہ ہو تو (اس کا کفارہ) تین دن کے (متواتر) روزے ہیں یہ (جو مذکور ہوا) کفارہ ہے تمہاری (ایسی) قسموں کا جبکہ تم قسم کھاؤ (اور پھر اس کو توڑ دو) اور (چونکہ یہ کفارہ واجب ہوا اس لئے) اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو (کبھی ایسا نہ ہو کہ قسم کو توڑ دو اور کفارہ نہ دو اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح یہ حکم بر عایت تمہارے دنیوی و دینی مصالح کے بیان فرمایا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے (دوسرے) احکام (بھی) بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (اس نعمت یعنی مصالح خلق کی رعایت کا) شکر کرو۔

معارف و مسائل

قسم کھانے کی چند صورتیں | اس آیت میں قسم کھانے کی چند صورتوں کا بیان ہے، بعض کا بیان سورۃ اور ان سے متعلق احکام ہفتہ میں بھی گزر چکا ہے، اور خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر کسی گزشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کر لیا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے، اور پھر جان بوجھ کر قسم کھالے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم سخت گناہ کبیرہ اور موجب وبال دنیا و آخرت ہے، مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، تو بہرہ و استغفار لازم ہے، اسی لئے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہا جاتا ہے، کیونکہ غموس کے معنی ڈوبادینے والے کے ہیں، یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کر دینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گزشتہ واقعہ پر اپنے نزدیک سچا سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں وہ غلط ہو، مثلاً کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص آگیا ہے، اس پر اعتماد کر کے اس نے قسم کھالی کہ وہ آگیا ہے، پھر معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس کو یمین لغو کہتے ہیں، اسی طرح بلا قصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی یمین لغو کہا جاتا ہے

اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اُس پر کفارہ ہے نہ گناہ۔

تیسری صورت قسم کی یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اس کو یحیٰ بن منقذہ کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ بھی ہوتا ہے، بعض میں نہیں ہوتا۔

اس جگہ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں بظاہر لغو سے وہی قسم مراد ہے، جس پر کفارہ نہیں خواہ گناہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ بالمقابل عَقْدُ ثَمٍّ اِلَّا يَمَانٌ مذکور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مواخذہ سے مراد صرف دنیا کا مواخذہ ہے، جو کفارہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

اور سورۃ بقرہ کی آیت میں ارشاد ہے لَا يُوْاْخِذُكُمْ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْ اَیْمَانِكُمْ وَلَٰكِنْ يُّوْاْخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ فَلَکُوْاْ بِکُمْ، اس میں لغو سے مراد وہ قسم ہے جو بلا قصد ارادہ زبان سے نکل جائے، یا اپنے نزدیک سچی بات سمجھ کر قسم کھالے، مگر وہ واقع میں غلط نکلی، اس کے بالمقابل وہ قسم مذکور ہے جس میں قصد اچھوٹ بولا گیا ہو، جس کو یحیٰ بن غموس کہتے ہیں، اس کو اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ یحیٰ بن لغو پر تو کوئی گناہ نہیں، بلکہ گناہ یحیٰ بن غموس پر ہے، جس میں قصد کر کے جھوٹ بولا گیا ہو تو سورۃ بقرہ میں حکم آخرت کے گناہ کا بیان ہے، اور سورۃ مائدہ کی آیت متذکرہ میں دنیوی حکم یعنی کفارہ کا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ یحیٰ بن لغو پر اللہ تعالیٰ تم سے مواخذہ نہیں کرتا، یعنی کفارہ واجب نہیں کرتا، بلکہ کفارہ صرف اس قسم پر لازم کرتا ہے جو آئندہ زمانہ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں منعقد کی ہو، اور پھر اس کو توڑ دیا ہو، اس کے بعد کفارہ کی تفصیل اس طرح ارشاد فرمائی ہے:

فَلْكَفَّارَتُهُ اِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِيْنٍ مِنْ اَوْ سَطِ مَا تَطْعَمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ ذِيْ كِسْفٍ مِنْهُمْ اَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ط یعنی تین کاموں میں سے کوئی ایک اپنے اختیار سے کر لیا جائے اول یہ کہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا صبح و شام دو وقت کھلا دیا جائے یا یہ کہ دس مسکینوں کو بقدر ستر پوشی کپڑا دیدیا جائے، مثلاً ایک پاجامہ یا تہبند یا لمبا کرتہ، یا سحوی مملوک غلام آزاد کر دیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ، یعنی اگر کسی قسم توڑنے والے کو اس مالی کفارہ کے ادا کرنے پر قدرت نہ ہو کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا سکے نہ کپڑے سکے اور نہ غلام آزاد کر سکے تو پھر اس کا کفارہ یہ ہے کہ تین دن روزے رکھے، بعض روایات میں اس جگہ تین روزے پے درپے مسلسل..... رکھنے کا حکم آیا ہے، اسی لئے امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک کفارۃ قسم کے تین روزے مسلسل ہونا ضروری ہیں۔

آیت مذکورہ میں کفارۃ قسم کے متعلق اول لفظ اطعام آیا ہے، اور اطعام کے معنی عربی لغت

کے اعتبار سے کھانا کھلانے کے بھی آتے ہیں، اور کسی کو کھانا دیدینے کے بھی، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے آیت مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہو، کہ دس مسکینوں کی دعوت کر کے کھانا کھلا دے یا کھانا ان کی ملکیت میں دیدے، مگر پہلی صورت میں یہ ضروری ہو کہ متوسط درجہ کا کھانا جو وہ عادتاً اپنے گھر کھاتا ہے دس مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھلا دے، اور دوسری صورت میں ایک مسکین کو بقدر ایک فطرہ کے دیدے مثلاً پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت تینوں میں جو چاہے خستیار کرے، لیکن روزہ رکھنا صرف اُس صورت میں کافی ہو سکتا ہے جبکہ ان تینوں میں سے کسی پر قدرت نہ ہو۔

قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ | آخر آیت میں تنبیہ کے لئے دو امر ارشاد فرمائے گئے ہیں، اول ذلک کی ادائیگی معتبر نہیں | كَفَّارَةٌ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ، یعنی یہ ہے کفارہ تمہاری قسم کا جب تم نے قسم کھائی، امام عظیم ابو حنیفہ اور دوسرے اکثر ائمہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہو کہ جب تم کسی آئندہ کام کرنے یا نہ کرنے پر حلف کرو اور پھر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفارہ کی ادائیگی قسم ٹوٹنے کے بعد ہونی چاہئے قسم ٹوٹنے سے پہلے اگر کفارہ دیدیا جائے تو وہ معتبر نہ ہوگا، وجہ یہ ہے کہ کفارہ لازم ہونے کا سبب قسم ٹوٹنا ہے جب تک قسم نہیں ٹوٹی تو کفارہ واجب ہی نہیں ہوا، تو جیسے وقت سے پہلے نماز نہیں ہوتی، رمضان سے پہلے رمضان کا روزہ نہیں ہوتا، اسی طرح قسم ٹوٹنے سے پہلے قسم کا کفارہ بھی ادا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَأَحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ، یعنی اپنی قسموں کی حفاظت کرو، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی قسم کھالی ہے تو بلا ضرورت شرعی یا طبعی قسم کو نہ توڑو، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قسم کھانے میں جلد بازی سے کام نہ لو، اپنی قسم کو محفوظ رکھو، جب تک شدید مجبوری نہ ہو قسم نہ کھاؤ (منظری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ

اے ایمان والو یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت

وَالْأَنْزِلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ

اور پالنے سے گندے کام ہیں شیطان کے سوان سے بچنے رہو تاکہ

تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ

تم نجات پاؤ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ

دشمنی اور بے سر ہذریعہ شراب اور جوئے کے اور روکے تم کو

ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿۹۱﴾ وَ

اللہ کی یاد سے اور نماز سے سوا بھی تم باز آؤ گے اور

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو پھر اگر تم پھر جاؤ گے

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا رَسُولُنَا بَلَّغُ الْمُبِينِ ﴿۹۲﴾

تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے کھول کر
رابطہ آیات: اوپر حلال چیزوں کے ترک خاص کی ممانعت تھی آگے بعض حرام چیزوں کے استعمال کی ممانعت ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور بے دہی وغیرہ اور قمار کے تیرے سب
گندمی باتیں شیطانی کام ہیں، سوان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو (بوجہ ان کی مضرتوں سے
بچنے کے جو آگے مذکور ہیں) فلاح ہو (اور وہ مضرتیں دنیوی بھی ہیں اور دینی بھی جن کا بیان یہ
ہو کہ) شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں (برتاؤ میں)
عداوت اور (دلوں میں) بغض واقع کر دے (چنانچہ ظاہر ہے کہ شراب میں تو عقل نہیں رہتی،
گالی گلوچ و نگہ فساد ہو جاتا ہے، جس سے بعد میں بھی طبعاً کدورت باقی رہتی ہے، اور جوئے میں
جو شخص مغلوب ہوتا ہے اس کو غالب پر غیظ ہوتا ہے، اور جب اس کو رنج ہو گا دوسرے پر
بھی اس کا اثر پہنچے گا، یہ تو دنیوی مضرت ہوئی) اور (شیطان یوں چاہتا ہے کہ اسی شراب اور
جوئے کے ذریعہ سے) اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے (جو کہ اللہ کی یاد کا سب سے افضل طریقہ ہے) تم کو
باز رکھے (چنانچہ یہ بھی ظاہر ہے، کیونکہ شراب میں تو اس کے ہوش ہی بجا نہیں ہوتے اور قمار میں غالب
کو تو سرور و نشاط اس درجہ ہوتا ہے کہ وہ اس میں غرق ہوتا ہے، اور مغلوب کو مغلوب ہونے کا رنج و
اضطلال اور پھر غالب آنے کی کوشش اس درجہ ہوتی ہے کہ اس سے قراغ نہیں ہوتا، یہ دینی مضرت
ہوتی، جب ایسی بُری چیزیں ہیں (ہو بتلاؤ) اب بھی باز آؤ گے؟ اور تم (جميع احکام میں) اللہ تعالیٰ
کی اطاعت کرتے رہو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتے رہو اور مخالفت (حکم سے) احتیاط رکھو
اگر (اطاعت سے) اعراض کر دے تو یہ جان لے کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف (حکم کا) پہنچا
دینا تھا (اور وہ اس بخوبی انجام دے چکے اور تم کو احکام پہنچا چکے اب تمہارے پاس کسی غدر کی گنجائش نہیں رہی)۔

معارف و مسائل

کائنات کی تخلیق انسان | ان آیات میں بتلانا یہ منظور ہے کہ مالک کائنات نے ساری کائنات کو انسان کے نفع کے لئے ہے | کی خدمت کے لئے پیدا فرمایا، اور ہر ایک چیز کو انسان کی خاص خاص خدمت پر لگا دیا ہے، اور انسان کو محض وہ کائنات بنایا ہے، انسان پر صرف ایک پابندی لگا دی کہ ہماری مخلوقات سے نفع اٹھانے کی جو حدود ہم نے معطر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، جن چیزوں کو تمھارے لئے حلال طیب بنادیا ہے ان سے احتراز کرنا ہے ادنیٰ اور ناشکر ہی، اور جن چیزوں کے کسی خاص استعمال کو حرام قرار دیدیا ہے، اس میں خلاف ورزی کرنا نافرمانی اور بغاوت ہے، بندہ کا کام یہ ہے کہ مالک کی ہدایات کے مطابق اس کی مخلوق کا استعمال کرے، اسی کا نام عبدیت ہے۔

پہلی آیت میں شراب، جوا، ہبت اور جوتے کے تیر چار چیزوں کی حرمت کا بیان ہے۔ اس مضمون کی ایک آیت تقریباً ایسے ہی الفاظ کے ساتھ سورہ بقرہ میں بھی آچکی ہے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَسْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ، اس میں ان چار چیزوں کو رِجْسُ فرمایا، رِجْسُ عربی زبان میں ایسی گندی چیز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی طبیعت کو گھن اور نفرت پیدا ہو، یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ذرا بھی عقل سلیم اور طبع سلیم رکھتا ہو تو خود بخود ہی ان چیزوں سے اس کو گھن اور نفرت ہوگی۔

ازلام کی تشریح | ان چار چیزوں میں سے ایک ازلام ہے، جو زلم کی جمع ہے، اَزْلَامُ اُن تیروں کو کہا جاتا ہے جن پر ترسہ اندازی کر کے عرب میں جوا کھیلنے کی رسم جاری تھی، جس کی صورت یہ تھی کہ دس آدمی شرکت میں ایک اونٹ ذبح کرتے تھے، پھر اس کا گوشت تقسیم کرنے کے لئے، بجائے اس کے کہ دس حصے برابر کر کے تقسیم کرتے اس میں اس طرح جوا کھیلنے کہ دس عدد تیروں میں سات تیروں پر کچھ مقررہ حصوں کے نشانات بنا رکھتے تھے، کسی پر ایک کسی پر دو یا تین اور تین تیروں کو سادہ رکھا ہوا تھا، ان تیروں کو ترکش میں ڈال کر ہلاتے تھے، پھر ایک ایک شریک کے لئے ایک ایک ترکش میں سے نکالتے، اور جتنے حصوں کا تیر کسی کے نام پر بچل آئے وہ اُن حصوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اور جس کے نام پر سادہ تیر بچل آئے وہ حصہ سے محروم رہتا تھا، جیسے آجکل بہت سی قسمیں لاٹری کے طریقہ پر بازاروں میں جاری ہیں، اس طرح کی قرعہ اندازی، قمار یعنی جوا ہی، جو ازروئے قرآن کریم حرام ہے۔

قرعہ اندازی کی جائز صورت | ہاں ایک طرح کی فترعہ اندازی جائز اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ یہ کہ جب حقوق سب کے مساوی ہوں اور حصے بھی مساوی تقسیم کر دیے گئے ہوں پھر ان میں سے حصوں کی تعیین بذریعہ قرعہ اندازی کر لی جائے، مثلاً ایک مکان چار شریکوں میں تقسیم کرنا ہے تو قیمت کے لحاظ سے چار حصے برابر لگائے گئے، اب یہ متعین کرنا کہ کونسا حصہ کس شریک کے پاس رہے، اس کی تعیین اگر آپس میں مصالحت و رضامندی سے نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے کہ فترعہ اندازی کر کے جس کے نام پر جس طرف کا حصہ نکل آئے اس کو دیدیا جائے، یا کسی چیز کے خواہش مند ایک ہزار ہیں، اور سب کے حقوق مساوی ہیں، مگر جو چیز تقسیم کرنا ہو وہ کل تنوہیں، تو اس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اَزْلَامُ کی قرعہ اندازی کے ذریعہ گوشت تقسیم کرنے کی جاہلانہ رسم کی حرمت سورۃ مائدہ ہی کی ایک آیت میں پہلے آچکی ہے، **وَاَنْ تَسْتَفِيسُوا بِالْاَزْلَامِ**۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں جن چار چیزوں کا حرام ہونا مذکور ہوا ان میں سے دو یعنی میسر اور اَزْلَامُ نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، باقی دو میں ایک اَنْصَابُ ہر جو نَصَب کی جمع ہے، ایسی چیز کو نَصَب کہا جاتا ہے جو عبارت کے لئے کھڑی کی گئی ہو خواہ بت ہو یا کوئی درخت، پتھر وغیرہ۔

شراب اور جُوئے کے | آیت کے شان نزول اور اس کے بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی اور روحانی مفسد اس آیت میں اصل مقصود دو چیزوں کی حرمت اور مفسد کا بیان کرنا ہے، یعنی شراب اور جُو، اَنْصَابُ یعنی بتوں کا ذکر اس کے ساتھ اس لئے ملا دیا گیا ہے کہ سننے والے سمجھ لیں کہ شراب اور جُوئے کا معاملہ ایسا سخت مجرم ہے جیسے بت پرستی۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَايِدِ الْوَلَدِ**۔ یعنی شراب پینے والا ایسا مجرم ہے جیسے بت کو پوجنے والا اور بعض روایات میں ہے: **شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَايِدِ الْاَلَاتِ وَالْعُتْرَى**۔ یعنی شراب پینے والا ایسا ہے جیسا لات و عترت کی پرستش کرنے والا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہاں شراب اور جُوئے کی شدید حرمت اور ان کی روحانی اور جسمانی خرابیوں کا بیان ہے، ازل روحانی اور معنوی خرابیاں رَجِسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کے الفاظ میں بیان کیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ یہ چیزیں فطرتِ سلیمہ کے نزدیک گندری قابل نفرت چیزیں اور شیطانی جال ہیں، جن میں پھنس جانے کے بعد انسان بیشمار مفسد اور مہلک خرابیوں کے گڑھے میں جا گرتا ہے، یہ روحانی مفسد بیان فرمانے کے بعد حکم دیا گیا

فَاجْتَنِبُوْهُ ۖ كَمَا جَبَّيْنَا فِيْ سَبْعٍ مِّنْ نَّوْحٍ ۚ اٰیٰتٍ لِّمَنۡ يَّرْتَدُّ عَلٰی اَعْقَابِهٖ ۚ
 آخر میں فرمایا اَلْعَلَّكُمْ تَقْلِدُوْنَ جس میں بتلایا گیا کہ تمھاری فلاح و نیا و آخرت اسی پر
 موقوف ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کرتے رہو۔

اس کے بعد دوسری آیت میں شراب اور جُوس کے دنیوی اور ظاہری مفاسد کا بیان
 اس طرح فرمایا گیا، اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوَفِّعَ بَيْنَكُمْ الْعَدٰى وَ اَوْتٰهُ الْبَخْصَآءَ
 فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ، یعنی شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جُوس میں مبتلا
 کر کے تمھارے درمیان بغض و عداوت کی بنیادیں بٹال دے۔

ان آیات کا نزول بھی کچھ ایسے ہی واقعات کے بارہ میں ہوا ہے کہ شراب کے نشہ میں ایسی
 حرکات صادر ہوئیں جو باہمی غیظ و غضب اور پھر جنگ و جدل کا سبب بن گئیں، اور یہ کوئی
 اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ شراب کے نشہ میں جب آدمی عقل کھو بیٹھتا ہے تو اس سے ایسی
 حرکات کا صدور لازمی جیسا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جُوس کا معاملہ ہے کہ ہارنے والا اگرچہ اپنی ہار مان کر اس وقت نقصان
 اٹھالیتا ہے، مگر اپنے حریف پر غیظ و غضب اور بغض و عداوت اس کے لازمی اثرات میں سے
 ہے، حضرت قتادہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بعض عرب کی عادت تھی کہ جُوس
 میں اپنے اہل و عیال اور مال و سامان سب کو ہر اکرا نہتائی نخ و عنم کی زندگی گزارتے تھے۔
 آخر آیت میں پھر ان چیزوں کی ایک اور خرابی ان الفاظ میں ارشاد فرمائی، وَيَصْدُرُ
 عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ۔ یعنی یہ چیزیں تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے غافل
 کر دیتی ہیں۔

یہ خرابی بظاہر روحانی اور اخروی خرابی ہے، جس کو دنیوی خرابی کے بعد مکرر ذکر
 فرماتے ہیں، اس میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ اصل قابلِ نظر اور قابلِ فکر وہ زندگی ہے جو ہمیشہ
 رہنے والی ہے، عقلمند کے نزدیک اسی کی خوبی مطلوب و مرغوب ہونی چاہئے، اور اسی کی
 خرابی سے ڈرنا چاہئے، دنیا کی چند روزہ زندگی کی خوبی نہ کوئی قابلِ فخر چیز ہے، نہ خرابی
 زیادہ قابلِ نخ و عنم ہے، کہ اس کی دونوں حالتیں چند روز میں ختم ہو جانے والی ہیں۔

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت

تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت یہ دنیا و آخرت اور جسم و
 رُوح دونوں کے لئے مضر ہے، آخرت اور رُوح کے لئے مضر ہونا تو ظاہر ہے کہ اللہ

سے غافل بے نماز کی آخرت تباہ اور روح مُردہ ہے، اور ذرا غور سے دیکھا جائے تو اللہ سے غافل کی دنیا بھی وبالِ جان ہوتی ہے کہ جب اللہ سے غافل ہو کر اس کا انتہائی مقصود مال و دولت اور عزت و جاہ ہو جائے تو وہ اتنے بکھڑے اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ وہ خود ایک مستقل غم ہوتے ہیں جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنے مقصود المقاصد یعنی راحت و آرام اور اطمینان و سکون سے محروم ہو جاتا ہے، اور ان اسبابِ راحت میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ خود راحت کو بھی بھول جاتا ہے، اور اگر کسی وقت یہ مال و دولت یا عزت و جاہ جاتے رہیں یا ان میں کمی آجائے تو ان کے غم اور بے چاری کی انتہاء نہیں رہتی، غرض یہ خالص دنیا دار انسان دونوں حالتوں میں بے چارہ و غم و اندوہ میں گھرا رہتا ہے، ۵

اگر دنیا نباشد درد مندیم

وگر باشد بہرِش پائے بندیم

بخلاف اس شخص کے جس کا دل اللہ کی یاد سے روشن اور نورِ نماز سے منور ہے، دنیا کے مال و منال اور جاہ و منصب اس کے قدموں پر گرتے ہیں، اور ان کو صحیح راحت و آرام پہنچاتے ہیں، اور اگر یہ چیزیں جاتی رہیں تو ان کے قلوب اس سے متاثر نہیں ہوتے، اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ ۵

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے

بہ پیش ہمتِ ما ہر چہ آمد بود مہمانے

خلاصہ یہ ہے کہ ذکر اللہ اور نماز سے غفلت اگر غور دیکھا جائے تو اخروی اور دنیوی دونوں طرح کی خرابی ہے، اس لئے ممکن ہو کہ رَحْبُ مِّنَ الشَّيْطَانِ سے خالص اخروی اور روحانی مضرت بیان کرنا مقصود ہو، اور يُوقِعْ بَيْنَكُمْ اَلْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ سے خالص دنیوی اور جسمانی خرابی بتلانا ہو اور یَصَدِّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ سے دین و دنیا کی مشترک تباہی و بربادی کا ذکر کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ذکر اللہ میں تو نماز بھی داخل ہے، پھر نماز کو علیحدہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں نماز کی اہمیت اور ذکر اللہ کی تمام اقسام میں فضل و شرف ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لئے نماز کو مستقل طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

اور تمام دینی اور دنیوی، جسمانی اور روحانی خرابیوں کی تفصیل بتلانے کے بعد ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ایک عجیب و دل نواز انداز سے فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے:-

فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ، یعنی جب یہ ساری خرابیاں تمھارے علم میں آگئیں تو اب بھی ان سے باز آؤ گے۔

ان دونوں آیتوں میں شراب اور جوئے وغیرہ کی حرمت اور شدید ممانعت کا بیان تھا، جو قانون الہی کی ایک دفعہ ہے، تیسری آیت میں اس حکم کو آسان کرنے اور اس پر عمل کچھ سہل بنانے کے لئے قرآن کریم نے اپنے خاص سلوب بیان کے تحت ارشاد فرمایا:

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا، فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ عَلَى رَسُولِنَا الْكِبَالُ الْمُبِينُ۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا حکم تمھارے فائدہ کے لئے ہے، اگر تم نہ مانو تو نہ اللہ جل شانہ کا کوئی نقصان ہے نہ اس کے رسولؐ کا، اللہ تعالیٰ کا اس نفع و نقصان سے بالاتر ہونا تو ظاہر تھا، رسولؐ کے متعلق کسی کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب انکی بات نہ مانی گئی تو ان کے اجر و ثواب یا قدر و منزلت میں شاید کچھ فرق آجائے، اس شبہ کے ازالہ کے لئے ارشاد فرمایا: فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ عَلَى رَسُولِنَا الْكِبَالُ الْمُبِينُ، یعنی اگر تم میں سے کوئی بھی ہمارے رسولؐ کی بات نہ مانے جب بھی اس کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیونکہ جتنا کام ان کے سپرد تھا وہ کر چکے، یعنی صاف صاف طور پر واضح کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا، اس کے بعد جو شخص نہیں مانتا وہ اپنا نقصان کرتا ہے ہمارے رسولؐ کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو کچھ پہلے

طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا

کھا چکے جب کہ آئندہ کو ڈرتے اور ایمان لائے اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے

وَأَمِنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَاحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيُكَلِّمَكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

اے ایمان والو! البتہ تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات سے اس شکار میں کہ جس پر

تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ

پہنچے ہیں ہاتھ تمھارے اور نیزے تمھارے تاکہ معلوم کرے اللہ کون اس سے ڈرتا ہے

بِالْغَيْبِ فَمَنْ اَعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ اَلِيمٌ ﴿۹۲﴾

بن دیجئے پھر جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے ،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ طَوْفًا

اے ایمان والو نہ مارو شکار جس وقت تم ہو احرام میں اور جو کوئی

قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ

تم میں اس کو مارے جان کر تو اس پر بدلہ ہو اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے

يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ

جو تجویز کریں دو آدمی معتبر تم میں سے اس طرح سے کہ وہ جانور بدلے کا بطور نیاز پہنچا یا جادے

طَعَامٌ مِّسْكِينَ أَوْ عَدْلٌ ذَلِكُمْ صِيَامًا لَّيْذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ

کعبۃ تک یا اس پر کفارہ ہو چند محتاجوں کو کھلانا یا اس کے برابر روزے تاکہ چھٹے سزا اپنے کام کی

عَفَا اللَّهُ عَنْمَا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ وَاللَّهُ

اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہو چکا اور جو کوئی پھر کرے گا اللہ اور اللہ

عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ أَحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُ

زبردست ہے بدلہ لینے والا حلال ہوا تمھارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا ،

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَاسَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا

تمھارے فائدہ کے واسطے اور سب مسافروں کے اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار جب تک

دُمْتُمْ حُرُمًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۹۶﴾

تم احرام میں رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم جمع ہو گے

رَبِّطِ آيَاتِ | بَاب میں سند احمد سے بروایت ابی ہریرہ منقول ہے کہ جب اوپر کی آیت

میں تحریم خمر و میسر نازل ہو چکی تو بعض لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ بہت سے آدمی جو کہ

شراب پیتے تھے اور شمار کا مال کھاتے تھے تحریم سے پہلے مر گئے ، اور اب معلوم ہوا کہ

وہ حرام ہے ان کا کیا حال ہوگا ، اس پر آیت لَئِنْ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا الْإِذْنُ نازل ہوئی ۔

اور پچھے آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرَّمُوا طَيِّبَاتِ میں تحریم طہیات کی ممانعت

کا ذکر تھا ، اب آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَبْلُوَ اللَّهُ عَمَلَكُمْ الخ سے بیان فرماتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ خاص حالات میں خاص خاص چیزوں کو حرام قرار دیدیں (بیان ہستی قرآن)

خلاصہ تفسیر

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جسکو وہ کھاتے پیتے ہوں اور اس وقت وہ حلال ہوگو بعد میں حرام ہو جائے اور ان کو گناہ کیسے ہوتا، جبکہ (گناہ کا کوئی امر مقتضی نہ ہو بلکہ ایک امر مانع موجود ہو وہ یہ کہ) وہ لوگ (خدا کے خوف سے اس وقت کی ناجائز چیزوں سے) پرہیز رکھتے ہوں اور (دلیل اس خوف کی یہ ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں (جو کہ خدا سے ڈرنے کا سبب ہے) اور نیک کام کرتے ہوں (جو کہ خوف خدا کی علامت ہے، اور اسی حالت پر وہ عمر بھر رہیں، چنانچہ اگر وہ حلال چیز جس کو پہلے کھاتے پیتے تھے آگے کبھی چل کر حرام ہو جائے تو پھر (اس سے بھی اسی خوف خدا کے سبب) پرہیز کرنے لگتے ہوں اور (اس خوف کی بھی دلیل مثل سابق یہی ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں (جو کہ موقوف ہیں ایمان پر، پس یہاں بھی سبب اور علامت خوف خدا کے مجتمع ہیں، مطلب یہ کہ ہر بار کی مکرر سہ کرر تحریم میں ان کا یہی عمل درآمد ہو کچھ دو تین بار کی خصوصیت نہیں، پس باوجود مانع اور استمرار مانع کے ہمارے فضل سے بعید ہے کہ وہ گناہگار ہوں) اور ان کی یہ خاص طریقہ مذکور کی نیکوکاری صرف لزوم گناہ سے مانع ہی نہیں بلکہ وجود ثواب و محبوبیت کو مقتضی بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں پس ان میں مبغوض ہونے کا احتمال تو کم ہو سکتا ہے، یہ تو غیر مبغوض ہونے سے گذر کر محبوب ہونے کا درجہ رکھتے ہیں)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک (بوجہ تم سے دور دور نہ بھاگنے کے) تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے (مطلب امتحان کا یہ کہ حالت احرام میں وحوش کے شکار کرنے کو تم پر حرام کر کے جیسا آگے تصریح آتا ہے، ان وحوش کو تمہارے آس پاس پھرتے رہیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہر طور پر بھی) معلوم کرے کہ کون شخص اس سے (یعنی اس کے عذاب سے) بن دیکھے ڈرتا ہے (اور از تکاپ حرام سے جو کہ موجب عذاب ہے بچتا ہے، اسی سے التزامنا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شکار حرام ہے) سو جو شخص اس (حرمت) کے بعد (جس پر ابتلاء بھی دلالت کر رہا ہے) حد (شرعی) سے نکلے گا (یعنی شکار ممنوع کام تکب ہوگا) اس کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے، (چنانچہ شکاری

جانور اسی طرح اس پاس لگے پھرتے تھے، چونکہ صحابہ میں بہت سے شکار کے عادی تھے اس میں ان کی اطاعت کا امتحان ہو رہا تھا، جس میں وہ پورے اترے، آگے ممانعت کی زیادہ تصریح ہے کہ، اے ایمان والو وحشی شکار کو (باستثناء ان کے کہ جن کو شرع نے مستثنیٰ کر دیا) قتل مت کرو، جبکہ تم حالت احرام میں ہو اسی طرح جبکہ وہ شکار حرم میں ہو گوشتکاری احرام میں نہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اور جو شخص تم میں اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر (اس کے فعل کی پاداش واجب ہوگی جو کہ باعتبار قیمت کے) مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہو جس کے تخمینہ کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں کہ دینداری میں بھی قابل اعتبار ہوں، اور تجربہ و بصیرت میں بھی، پھر اس قاتل کو تخمینہ قیمت کے بعد اختیار ہے (خواہ اس قیمت کا کوئی ایسا جانور خرید لے کہ وہ پاداش کا جانور) خاص چوپائوں میں سے ہو (یعنی اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، نر ہو یا مادہ) بشرطیکہ نیاز کے طور پر کعبہ کے پاس) تک (یعنی حرم کے اندر) پہنچائی جائے اور خواہ اس قیمت کے برابر غلہ بطور کفارہ کے) مساکین کو دیدیا جائے (یعنی ایک مسکین کو بقدر ایک صدقۃ الفطر کے دیا جائے) اور خواہ اس (غلہ) کے برابر روزے رکھ لئے جائیں (برابری کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کے حصہ یعنی خطہ کے بدلے ایک روزہ اور یہ پاداش اس لئے مقرر کی ہے) تاکہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے (بخلاف اس شخص کے جس نے قصداً شکار نہ کیا ہو کہ گو اس پر بھی جزا تو یہی واجب ہو مگر وہ فعل کی سزا نہیں، بلکہ محل محترم یعنی شکار حرم جو کہ حرم کی وجہ سے محترم یا احرام کی وجہ سے کا محترم ہو گیا ہے اس کا ضمان اور جزا ہو اور اس جزا کے ادا کر دینے سے) اللہ تعالیٰ نے گزشتہ کو معاف فرمایا اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا (چونکہ اکثر عود میں ایک گونہ پہلی بار سے زیادہ جرأت ہوتی ہے) تو اس وجہ سے علاوہ جزا مذکور کے جو کہ اصل فعل یا محل کا عوض ہے آخرت میں) اللہ تعالیٰ اس سے (اس جرأت کا) انتقام لیں گے (البتہ اگر توبہ کرے تو انتقام کا سبب بننا ہی نہیں ہوگا) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں انتقام لے سکتے ہیں تمہارے لئے (حالت احرام میں) دریا (یعنی پانی) کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا (سب) حلال کیا گیا ہے تمہارے انتفاع کے واسطے (اور تمہارے مسافروں کے) (انتفاع کے) واسطے (کہ سفر میں اسی کو توشہ بنادیں) اور خشکی کا شکار (گو بعض صورتوں میں کھانا حلال ہو مگر) پکڑنا (یا اس میں معین ہونا) تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے، جب تک تم حالت احرام میں رہو اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو، جس کے پاس جمع (کر کے) جانور کئے جاؤ گے۔

معارف ومسائل

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں۔ اور ایمان یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر و فکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان و یقین مضبوط و مستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیرالی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام ”احسان“ اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرمادی۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: صید جو کہ حرم اور احرام میں حرام ہی عام ہی، خواہ ماکول یعنی حلال جانور ہو یا غیر ماکول (یعنی حرام) بلا طلاق الآیہ،

مسئلہ: صید یعنی شکار، اُن جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادتاً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقِ اہلی ہوں جیسے بھیر، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔
مسئلہ: البہ جو دس مستثنیٰ ہو گئے ہیں اور ان کو پکڑنا، قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، لقولہ تعالیٰ اُحِلَّ لَکُم صِیْدُ الْبَحْرِ، اور بھتے وحشی کے جانور، جیسے کوا اور چیل اور بھیر یا اور سانپ اور بھجور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے، حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلصَّیْدُ میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ: جو حلال شکار غیر احرام اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں معین یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے، اور آیت کے الفاظ لَا تَقْتُلُوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لَا تَقْتُلُوا فرمایا ہو لَا تَقْتُلُوا نہیں فرمایا۔
مسئلہ: شکار حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزار واجب ہے، اسی طرح خطا و نسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخر جہ الروح)

مسئلہ: جیسا پہلی بار میں جزار واجب ہو اسی طرح دوسری تیسری بار قتل کرنے میں بھی واجب ہے۔
مسئلہ: حاصل جزاء کا یہ ہے کہ جس زمان اور جس مکان میں یہ جانور قتل ہوا ہے بہتر تو یہ ہو کہ دو عادل شخص سے اور جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی عادل شخص سے اس جانور کی قیمت کا تخمینہ کرائے، پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہو تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہوگی، اور اگر وہ جانور ماکول تھا تو جس قدر تخمینہ ہو گا وہ سب واجب ہوگا، اور دونوں حال میں آگے اس کو تین صورتوں میں اختیار ہے، خواہ تو اس قیمت کا کوئی جانور حسب شرائط مستربانی کے خرید لے، اور حد و حرم کے اندر ذبح کر کے فقرار کو بانٹ دے، اور یا اس قیمت کے برابر غلہ حسب شرائط صدقہ فطر

کے فی مسکین نصف صاع فقراء کو دیدے، اور یا بحساب فی مسکین نصف صاع جتنے مسکین کو وہ غلہ پہنچ سکتا ہوا اتنے شمار سے روزے رکھ لے اور تقسیم غلہ اور روزوں میں حرم کی قید نہیں، اور اگر قیمت نصف صاع سے بھی کم واجب ہوئی ہے تو اختیار ہے خواہ ایک مسکین کو دیدے، یا ایک روزہ رکھ لے اسی طرح اگر فی مسکین نصف صاع دے کر نصف صاع سے کم بچ گیا، تو بھی یہی اختیار ہے کہ خواہ وہ بقیہ ایک مسکین کو دیدے یا ایک روزہ رکھ لے، نصف صاع کا وزن ہمالے وزن کے اعتبار سے پونے دو سیر ہوتا ہے۔

مسئلہ: تخمینہ مذکور میں جتنے مسکین کا حصہ قرار پائے اگر ان کو دو وقت کھانا شکم سیر کر کے کھلا دے تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ: اگر اس قیمت کے برابر ذبح کے لئے جانور تجویز کیا، مگر کچھ قیمت بچ گئی تو اس بقیہ میں اختیار ہے خواہ دوسرا جانور خرید لے، یا اس کا غلہ دیدے، یا غلہ کے حساب سے روزے رکھ لے، جس طرح قتل میں جزاء واجب ہے اسی طرح ایسے جانور کو زخمی کرنے میں بھی تخمینہ کرایا جائے گا کہ اس سے جانور کی کس قدر قیمت کم ہوگئی اس مقدار قیمت میں پھر وہی تین مذکورہ صورتیں جائز ہوں گی۔

مسئلہ: محرم کو جس جانور کا شکار کرنا حرام ہے اس کا ذبح کرنا بھی حرام ہے، اگر اس کو ذبح کرے گا تو اس کا حکم مردار کا سا ہوگا ردی لاقتلوا اشارۃ الی ان ذبحہ کا قتل۔

مسئلہ: اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ: اشارہ ودالت واعانت شکار میں مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔

جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا لِلنَّاسِ وَالشَّهْرَ

اللہ نے کر دیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث لوگوں کیلئے اور بزرگی والے

الْحَرَامَ وَالْهُدًى وَالْقَلَادِیْذُ ذَلِكَ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ

مہینوں کو اور قربانی کو جو کہ نیاز کعبہ کی ہو اور جن کے گھلے میں پٹہ ڈال کر لیا جائے کعبہ کو یہ اس لئے کہ تم جان لو بیشک اللہ کو

مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۙ ۹۴

معلوم ہو جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے،

اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۙ ۹۵

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہو اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا

رسول کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا اور اللہ کو معلوم ہو جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو

تَكْتُمُونَ ﴿٩٩﴾ قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ

چھپا کر کرتے ہو تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے

كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠٠﴾

ناپاک کی کثرت سو ڈرتے رہو اللہ سے اے عقلمندو تاکہ تمہاری نجات ہو

۱۳
ع
۳

خلاصہ تفسیر

خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے، لوگوں (کی مصلحتوں) کے قائم رہنے کا سبب قرار دیدیا ہے اور (اسی طرح) عزت والے مہینہ کو بھی اور (اسی طرح) حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور (اسی طرح) ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز میں حرم میں ذبح ہوں گے) یہ (قرارداد علاوہ اور دنیوی مصلحتوں کے) اس (دینی مصلحت کے) لئے (بھی) ہے تاکہ (تمہارا اعتقاد درست اور سچہ ہو اس طرح کہ تم ان مصالح سے استدلال کر کے) اس بات کا یقین (ابتداءً یا کمالاً) کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتا ہے (کیونکہ ایسا حکم مقرر کرنا جس میں آئندہ کے ایسے مصالح مرعی ہو کہ عقول بشریہ انکو نہ سوچ سکیں دلیل ہے کمال صفت علمیہ کی) اور ان معلومات مذکورہ کے ساتھ تعلق علم کامل سے استدلال کر کے یقین کر لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں، (کیونکہ ان معلومات کے علم پر کسی چیز نے مطلع نہیں کیا، معلوم ہوا کہ علم ذاتی کی نسبت جمیع معلوم کے ساتھ یکساں ہوتی ہے) تم یقین سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ سنا بھی سخت دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے بھی ہیں (تو ان کے احکام کی خلاف مت کیا کرو اور جو احیاناً ہو گیا ہو، موافق قواعد شرعیہ کے توبہ کرو) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے، (سودہ خوب پہنچا چکے اب تمہارے پاس کوئی عذر و حیلہ نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں جو کچھ تم (زبان یا جوارح سے) ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو (سو تم کو چاہئے کہ اطاعت ظاہر و باطن دونوں سے کرو) آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے یہ بھی، فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک (یعنی گناہ اور اطاعت یا گناہ کرنے والا اور اطاعت کرنے والا)، برابر نہیں، (بلکہ خبیث مبغوض ہے اور طیب مقبول ہے، پس اطاعت کر کے مقبول بننا چاہئے

معصیت کر کے مبعوض نہ ہونا چاہئے، اگرچہ لے دیکھنے والے، تجھ کو ناپاک کی کثرت (جیسا اکثر دنیا میں یہی واقع ہوتا ہے) تعجب میں ڈالتی ہو کہ باوجود ناپسندیدہ ہونے کے یہ کثیر کیوں ہے، مگر یہ سمجھ لو کہ کثرت جو کسی حکمت سے ہے دلیل محمود ہونے کی نہیں، جب کثرت پر مدار نہیں یا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم و عقاب پر بھی مطلع ہو گئے، تو اس کو مت دیکھو بلکہ خدا تعالیٰ کے خلاف حکم کرنے سے ڈرتے رہو تاکہ تم (پورے طور سے) کامیاب ہو (کہ وہ جنت اور رضائے حق ہے)

معارف و مسائل

امن والمینان کے چار ذرائع | پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کو لوگوں کے قیام و بقا اور امن و اطمینان کا سبب بتلایا ہے۔

اول کعبہ، لفظ کعبہ عربی زبان میں ایسے مکان کو کہتے ہیں جو مربع یعنی چوکور ہو، عرب میں قبیلہ خثعم کا بنایا ہوا ایک اور مکان بھی اسی نام سے موسوم تھا، جس کو کعبہ سیانہ کہا جاتا تھا، اسی لئے بیت اللہ کو اس کعبہ سے ممتاز کرنے کے لئے لفظ کعبہ کے ساتھ البیت الحرام کا لفظ بڑھا یا گیا۔

لفظ قیام اور قوام اسم مصدر ہے، اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر کسی چیز کا قیام و بقا موقوف ہو، اس لئے قیاماً للناس کے معنی یہ ہوئے کہ کعبہ اور اس کے متعلقات لوگوں کے قیام و بقا کا سبب اور ذریعہ ہیں۔

اور لفظ ناس لغت میں عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس جگہ قرینہ مقام کی وجہ سے خاص مکہ والے یا اہل عرب بھی مراد ہو سکے ہیں اور عام دنیا کے انسان بھی، اور ظاہر یہی ہے کہ پورے عالم کے انسان اس میں داخل ہیں، البتہ مکہ اور عرب والے ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں، اس لئے مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ بیت اللہ اور جن چیزوں کا ذکر آگے آتا ہے، اُن کو پورے عالم انسانیت کے لئے قیام و بقا اور امن و سکون کا ذریعہ بنا دیا ہے، جب تک دنیا کا ہر ملک ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا ہے یعنی جن پر حج فرض ہو وہ حج ادا کرتے رہیں اس وقت تک یہ پوری دنیا قائم اور محفوظ رہے گی۔ اور اگر ایک سال بھی ایسا ہو جائے کہ کوئی حج نہ کرے یا کوئی شخص بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا نہ کرے تو پوری دنیا پر عذاب عام آجائے گا۔

بیت اللہ پورے عالم کا عمود ہے | اسی مضمون کو امام تفسیر حضرت عطاء نے ان الفاظ میں

بیان فرمایا ہے: لو تروکہ عامًّا وَاَحَدًا لَمْ يَنْظُرُوا وَلَمْ يَخْرُوا (بحر محیط)، اس سے معلوم ہوا کہ معنوی طور پر بیت اللہ اس پورے عالم کا عمود ہے، جب تک اس کا استقبال اور حج ہوتا رہے گا دنیا قائم رہے گی، اور اگر کسی وقت بیت اللہ کا یہ احترام ختم ہوا تو دنیا بھی ختم کر دی جائے گی، رہا یہ معاملہ کہ نظام عالم اور بیت اللہ میں جوڑ اور ربط کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، جس طرح مقناطیس اور لوہے اور کھربا اور تئکے کے ربط باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، بیت اللہ اور نظام عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے قبضہ میں نہیں، وہ خالق کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، بیت اللہ کا پورے عالم کی بقا کے لئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، ظاہری نظریں اس کو نہیں پاسکتیں، لیکن عرب اور اہل مکہ کے لئے اس کا موجب امن و سلامتی ہونا طویل تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے۔

بیت اللہ کا وجود عام دنیا میں قیام امن کی صورت حکومتوں کے قوانین اور ان کی گرفت امن عالم کا سبب ہوتی ہے، اس کی وجہ سے ڈاکو، چور، قتل و غارت گری کرنے والے کی جرأت نہیں ہوتی، لیکن جاہلیت عرب میں نہ کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی، اور نہ امن عامہ کے لئے کوئی قانون عام تھا، سیاسی نظام محض قبائلی بنیادوں پر قائم تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی جان و مال عزت و آبرو سب ہی چیزوں پر جب چاہے حملہ کر سکتا تھا، اس لئے کسی قبیلہ کے لئے کسی وقت امن و اطمینان کا موقع نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کو حکومت کے قائم مقام ذریعہ امن بنا دیا جس طرح حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کوئی سمجھدار انسان نہیں کر سکتا، اسی طرح بیت اللہ شریف کی حرمت و تعظیم حق تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت میں بھی عام لوگوں کے دلوں میں اس طرح پیوست کر دی تھی کہ اس کے احترام کے لئے اپنے سارے جذبات و خواہشات کو چھپے ڈال دیتے تھے۔

عرب جاہلیت جو اپنی جنگ جوی اور قبائلی تعصب میں پوری دنیا میں ضرب المثل تھی، اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ اور اس کے متعلقات کی اتنی حرمت و تعظیم اُن کے دلوں میں پیوست کر دی تھی کہ ان کا کیسا بھی جانی دشمن یا سخت سے سخت مجرم ہو اگر وہ حرم شریف میں داخل ہو جائے تو انتہائی غم و غصہ کے باوجود اس کو کچھ نہ کہتے، باپ کا قاتل حرم میں بیٹے کو ملتا تو بیٹا نیچی نظریں کر کے گزر جاتا تھا۔

اسی طرح جو شخص حج و عمرہ کے لئے نکلا ہو یا جو جانور حرم شریف میں قربانی کے لئے لایا گیا ہو اس کا بھی اتنا ہی احترام عرب میں عام تھا کہ کوئی بُرے سے بُرا شخص بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچاتا تھا، اور اگر وہ جانی دشمن بھی ہے تو ایسی حالت میں جبکہ اس نے حج و عمرہ کی کوئی علامت احرام یا قلادہ باندھا ہو اس کو قطعاً کچھ نہ کہتے تھے۔

سنہ ہجری یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک خاص عجمت کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر بقصد بیت اللہ روانہ ہوئے اور حدودِ حرم کے قریب مقامِ حدیبیہ پر قیام فرما کر حضرت عثمان غنیؓ کو چند رفیقوں کے ساتھ مکہ بھیجا کہ مکہ کے سرداروں سے کہہ دیں کہ مسلمان اس وقت کسی جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ عمرہ ادا کرنے کے لئے آئے ہیں اس لئے ان کی راہ میں کوئی مزاحمت نہ ہونی چاہئے۔

قریشی سرداروں نے بہت سے بحث و مباحثہ کے بعد اپنا ایک نمائندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ شخص حرمتِ بیت اللہ کا خاص لحاظ رکھنے والا ہے، اس لئے اپنے قربانی کے جانور جن پر قربانی کا نشان کیا ہوا ہے اس کے سامنے کر دو، اس نے جب ہدایا (قربانی کے جانور) دیکھے تو اقرار کیا کہ بیشک ان لوگوں کو بیت اللہ سے ہرگز نہیں روکنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حرم محترم کا احترام زمانہ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایسا رکھ دیا تھا کہ اس کی وجہ سے امن و امان قائم رہتا تھا، اس احترام کے نتیجہ میں صرف حرم شریف کے اندر آنے جانے والے اور وہ لوگ مامون ہو جاتے تھے جو حج و عمرہ کے لئے نکلے ہیں، اور حج کی کوئی علامت ان پر موجود ہے، اطرافِ عالم کے لوگوں کو اس سے کوئی نفع امن و اطمینان کا حاصل نہ ہوتا تھا، لیکن عرب میں جس طرح بیت اللہ کے مکان اور اس کے گرد و پیش کے حرم محترم کا احترام عام تھا اسی طرح حج کے مہینوں کا بھی خاص احترام تھا کہ ان مہینوں کو اشہر حرم کہتے تھے، ان کے ساتھ رجب کو بھی بعض نے شامل کر لیا تھا، ان مہینوں میں حرم سے باہر بھی قتل و قتال کو تمام عرب حرام سمجھتا اور پرہیز کرتا تھا۔

اسی لئے قرآن کریم نے قِيَمَاتٍ لِّنَّاسٍ ہونے میں کعبہ کے ساتھ تین اور چیزوں کو شامل فرمایا ہے، اَوَّلُ الشَّهْرِ الْحَرَامِ یعنی عزت و عظمت کا مہینہ، یہاں چونکہ لفظ شَہْرٌ مفرد لایا گیا ہے، اس لئے عام مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس جگہ ”شہر حرام“ سے مراد ماہ ذی الحجہ ہے جس میں حج کے ارکان و اعمال ادا کئے جاتے ہیں، اور بعض نے فرمایا

کہ لفظ اگرچہ مفرد ہے مگر مراد اس سے جنس ہے، اس لئے سب ہی اشہر حرم (عزت کے مہینے) اس میں داخل ہیں۔

دوسری چیز ہدیٰ ہے، ہدیٰ اس جانور کو کہا جاتا ہے جس کی قربانی حرم شریف میں کی جائے، ایسے جانور جس شخص کے ساتھ ہوں عام عرب کا معمول تھا کہ اس کو کچھ نہ کہتے تھے، وہ امن و اطمینان کے ساتھ سفر کرتا اور اپنا مقصد پورا کر سکتا تھا، اس لئے ہدیٰ بھی قیام امن کا ایک سبب ہوتی۔

تیسری چیز قلائد ہیں، قلائد قلابہ کی جمع ہے، گھلے کے ہار کو کہا جاتا ہے۔ جاہلیت عرب کی رسم یہ تھی کہ جو شخص حج کے لئے نکلتا تو اپنے گھلے میں ایک ہار بطور علامت کے ڈال لیتا تھا، تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ سمجھ لیں کہ یہ حج کے لئے جا رہا ہے کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، اسی طرح قربانی کے جانوروں کے گھلے میں بھی اس طرح کے ہار ڈالے جاتے تھے ان کو بھی قلائی کہتے ہیں، اس لئے قلائی بھی قیام امن و سکون کا ایک ذریعہ بن گئے۔

اور اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں چیزیں شہر حرام، ہدیٰ اور قلائی سب کے سب بیت اللہ کے متعلقات میں سے ہیں، ان کا احترام بھی بیت اللہ ہی کے احترام کا ایک شعبہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بیت اللہ اور اس کے متعلقات کو اللہ تعالیٰ نے پورے عالم انسانیت کے لئے عموماً اور عرب اور اہل مکہ کے لئے خصوصاً ان کے تمام امور دین و دنیا دونوں کے لئے قیام و قوام بنا دیا ہے۔

قیاماً للناہ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بیت اللہ اور حرم محترم سب کے لئے جائے امن بنایا گیا ہے، بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد اہل مکہ کے لئے وسعت رزق ہے، کہ باوجود اس کے کہ اس زمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ دنیا بھر کی چیزیں وہاں پہنچاتے رہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ اہل مکہ جو کہ بیت اللہ کے خادم اور محافظ کہلاتے تھے ان کو لوگ اللہ والے سمجھ کر ہمیشہ ان کی تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، قیاماً للناہ سے ان کا یہ خاص اعزاز مراد ہے۔

امام عبد اللہ رازیؒ نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی اختلاف نہیں لفظ قیاماً للناہ کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو سب لوگوں کے بہتار و قیام اور معاش و معاد کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بنایا ہے، اور اہل عرب اور اہل مکہ کو خصوصیت کے ساتھ اس کی برکات ظاہرہ اور باطنہ سے نوازا ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذَلِك لِّتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ صِرَاحٌ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ، یعنی ہم نے بیت اللہ کو اور اس کے متعلقات کو لوگوں کے لئے ذریعہ امن و امان اور قیام و بقا بنا دیا ہے، جس کا مشاہدہ اہل عرب خصوصیت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، یہ اس لئے کہا گیا کہ سب لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی ہر چیز کو پورا پورا جانتے ہیں، اور وہی اس کا انتظام کر سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والے رحم فرمانے والے ہیں، اس میں بتلادیا کہ جو احکام حلال و حرام کے دیئے گئے ہیں وہ عین حکمت و مصلحت ہیں، ان کی تعمیل ہی میں تمھارے لئے خیر ہے، اُن کی خلاف ورزی سخت وبال و عذاب ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ انسانی بھول اور غفلت سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً عذاب نہیں دیتے، بلکہ توبہ کرنیوالوں اور شرمندہ ہونے والوں کے لئے مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُنْبِئُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ، یعنی ہمارے رسول کے ذمہ تو اتنا ہی کام ہے کہ ہمارے احکام مخلوق کو پہنچا دیں، پھر وہ مانیں نہ مانیں اس کا نفع و ضرر انہی کو پہنچتا ہے، ان کی نافرمانی سے ہمارے رسول کا کچھ نقصان نہیں، اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دیا جاسکتا، وہ تمھارے ظاہر و باطن اور کھیلے اور چھپے ہر کام سے واقف ہیں۔ چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ، عربی زبان میں طیب اور خبیث دو متقابل لفظ ہیں، طیب ہر چیز کے عمدہ اور حبیبہ کو اور خبیث ہر چیز کے ردی اور خراب کو کہا جاتا ہے، اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک خبیث سے مراد حرام یا ناپاک ہے، اور طیب سے مراد حلال اور پاک، معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر عقل سلیم کے نزدیک پاک و ناپاک یا حلال و حرام برابر نہیں ہو سکتے۔

اس جگہ لفظ خبیث اور طیب اپنے عموم کے اعتبار سے حرام و حلال مال و دولت کو بھی شامل ہے، اور اچھے بُرے انسانوں کو بھی، اور بھلے بُرے اعمال و اخلاق کو بھی مطلب آیت کا واضح ہے کہ کسی عقل سلیم کے نزدیک نیک و بد اور بھلا بُرا برابر نہیں ہوتا اسی فطری قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال و حرام یا پاک و ناپاک چیزیں

برابر نہیں اسی طرح اچھے اور بُرے اعمال و اخلاق برابر نہیں، اسی طرح نیک و بد انسان برابر نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثَاتِ، یعنی اگرچہ دیکھنے والوں کو بعض اوقات خراب اور خبیث چیزوں کی کثرت مرعوب کر دیتی ہے، اور گرد و پیش میں خبیث و خراب چیزوں کے پھیل جانے اور غالب آ جانے کے سبب انہی کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہ انسانی علم و شعور کی بیماری اور احساس کا قصور ہوتا ہے۔

آیت کا شان نزول | آیت کے شان نزول کے متعلق بعض روایات میں ہے کہ جب اسلام میں شراب کو حرام اور اس کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا تو ایک شخص جس کا کاروبار شراب فروشی کا تھا، اور اس ذریعہ سے اس نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ مال جو شراب کی تجارت سے میرے پاس جمع ہوا ہے اگر میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کروں تو کیا وہ میرے لئے مفید ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو حج یا جہاد وغیرہ میں خرچ کر دے گے تو وہ اللہ کے نزدیک تمہارے لئے ایک پرکے برابر بھی قیمت نہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ پاک اور حلال چیز کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

حرام مال کی یہ بے توقیری تو آخرت کے اعتبار سے ہوئی، اور اگر گہری نظر سے معائنہ کیا جائے اور سب کاموں کے آخری انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال و حرام مال برابر نہیں ہوتے، حلال سے جتنے فوائد اور اچھے نتائج اور حقیقی آرام و راحت نصیب ہوتی ہے وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہو گیا اور آمدنی بہت محدود ہو گئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی، لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثَاتِ، اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم و جور کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل و انصاف قائم کر کے اپنے خزانہ کو کم کر لو اور کوئی پروا نہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم

مقدار سے پورے ہوں گے۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے کہ اعداد و شمار کی کمی زیادتی کوئی چیز نہیں اکثریت و قلت سے کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی کو نہیں جانچا جاسکتا، انسانوں کے سر پر ہاتھ شمار کر کے کیا دن ہاتھوں کو انچا سٹس کے مقابلہ میں حق و صداقت کا معیار نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ اگر دنیا کے ہر طبقہ کے حالات پر ذرا بھی نظر ڈالی جائے تو سارے عالم میں بھلائی کی مقدار اور تعداد کم اور بُرائی کی تعداد میں کثرت نظر آئے گی، ایمان کے مقابلہ میں کفر، تقویٰ طہارت اور دیانت و امانت کے مقابلہ میں فسق و فجور، عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم و جور، علم کے مقابلہ میں جہل، عقل کے مقابلہ میں بے عقلی کی کثرت کا مشاہدہ ہوگا، جس سے اس کا یقین لازمی ہو جاتا ہے کہ کسی چیز یا کسی جماعت کی تعدادی کثرت اس کے اچھے یا حق پر ہونے کی قطعاً دلیل نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی چیز کی اچھائی اور بہتری اس چیز اور اس جماعت کے ذاتی حالات و کیفیات پر دائر ہوتی ہے، حالات و کیفیات اچھی ہیں تو وہ اچھی اور بُری ہیں تو بُری ہیں، قرآن کریم نے اسی حقیقت کو وَلَوْ اَعْجَبَتْكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِطِ کے الفاظ پر واضح فرما دیا ہے۔

ہاں عدد کی کثرت کو اسلام نے بھی بعض مواقع میں فیصلہ کن قرار دیا ہے وہ اس جگہ جہاں قوتِ دلیل اور ذاتی خوبیوں کے موازنہ کا فیصلہ کرنے والا کوئی صاحبِ اقتدار حاکم نہ ہو، ایسے موقع پر عوام کا جھگڑا چکانے کے لئے عددی کثرت کو ترجیح دیدی جاتی ہے جیسے نصبِ امام کا مسئلہ ہے، وہاں کوئی امام و امیر فیصلہ کرنے والا موجود نہیں، اس لئے کثرتِ رائے کو بعض دفعہ قطعِ نزاع کے لئے ترجیح دیدی گئی یہ ہرگز نہیں کہ جس چیز کو زیادہ تعداد کے لوگوں نے اختیار کر لیا وہی چیز حلال اور جائز اور حق ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا اُولِیْ الْاَلْبَابِ، یعنی اے عقل والو اللہ سے ڈرو، جس میں اشارہ فرمادیا کہ کسی چیز کی تعدادی کثرت کا مرغوب ہونا یا کثرت کو بمقابلہ قلت کے حق و صحیح کا معیار قرار دینا عقلاً کا کام نہیں، اسی لئے عقلاً کو خطاب کر کے ان کو اس غلط رویہ سے روکنے کے لئے فَاتَّقُوا اللَّهَ کا حکم دیا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءٍ إِنْ تُبَدَّلَ لَكُمْ

اے ایمان والو! مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھولی جاویں تو تم کو بُری لگیں وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنْزَلُ الْقُرْآنُ

تم کو بُری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے

تُبَدِّلْ لَكُمْ عَقَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَأَلَهَا

تو تمیز ظاہر کر دی جاوے گی اللہ نے ان سے درگزر کی ہر اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے، ایسی باتیں پوچھ چکی ہر

قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ

ایک جماعت تم سے پہلے پھر ہو گئے ان باتوں سے منکر، نہیں مقرر کیا اللہ نے

مِّنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ ﴿۱۰۳﴾ وَلَكِنَّ

بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی و لیکن

الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُغْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَأَكْثَرُهُمْ

کافر باندھتے ہیں اللہ پر بہتان، اور ان میں اکثروں کو

لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۰۴﴾

عقل نہیں،

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو ایسی (فضول) باتیں مت پوچھو (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم سے ظاہر کر دی جاوے گی تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو یعنی یہ احتمال ہو کہ جواب تمہاری منشا کے خلاف آیا تو تمہیں ناگوار ہو گا) اور (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم زمانہ نزول قرآن (اور وحی) میں ان باتوں کو پوچھو تو تم سے ظاہر کر دی جاوے گی (یعنی سوال کرنے میں تو یہ دوسرا احتمال ہو کہ جواب مل جائے اور جواب ملنے میں وہ پہلا احتمال ہو کہ ناگوار گذرے، اور یہ دونوں احتمال جو مجموعی طور پر علت نہی سوال کی ہیں واقعی ہیں پس ایسا سوال ممنوع ہے (خیر) سوالات گزشتہ (جو اس وقت تک کر چکے ہو وہ تو) اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے، (مگر آئندہ مت کرنا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے گزشتہ سوالات معاف کر دیئے اور) بڑے حلم والے ہیں (اس لئے اگر آئندہ کے خلاف ورزی پر دنیا میں سزا نہ دے تو دھوکہ میں مت پڑ جانا کہ آگے بھی کوئی عذاب و سزا نہ ہوگی) ایسی باتیں تم سے پہلے (زمانہ میں) اور (امتوں کے) لوگوں نے بھی (اپنے پیغمبروں سے) پوچھی تھیں پھر (ان کو جواب ملا تو) ان باتوں کا حق نہ بجالاتے (یعنی ان جوابوں میں جو متعلق احکام کے تھے ان کے موافق عمل نہ کیا، اور جو متعلق واقعات کے تھے اُن سے متاثر نہ ہوئے، پس کہیں تم کو بھی ایسی ہی نوبت نہ پیش آئے، اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ ایسے

سوالات چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے نہ بیکرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ (ان رسوم کے باب میں) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان اعمال سے خوش ہیں، اور اکثر کافر (دین کی) عقل نہیں رکھتے اور اس سے کام نہیں لیتے بلکہ محض اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی ایسی جہالتیں کرتے ہیں،

معارف و مسائل

بے ضرورت سوال | ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکامِ الہیہ میں کرنے کی ممانعت بلا ضرورت تدقیق اور بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے، اور جو احکام نہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیہ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑے یا ان کو خفیہ رازوں کے اظہار سے رسوائی ہو۔

شان نزول | ان آیات کا شان نزول مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو اقرع بن حابس نے سوال کیا کہ کیا ہر سال ہمارے ذمہ حج فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا، تو مکرر سوال کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی سکوت فرمایا، انھوں نے تیسری مرتبہ پھر سوال کیا، تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کے ساتھ تنبیہ فرمائی کہ اگر میں تمھارے جواب میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج فرض ہے تو ایسا ہی ہو جاتا اور پھر تم اس کو پورا نہ کر سکتے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کے متعلق میں تمھیں کوئی حکم نہ دوں ان کو اسی طرح رہنے دو، ان میں کھود کرید کر کے سوالات نہ کرو، تم سے پہلے بعض امتیں اسی کثرت سوال کے ذریعہ ہلاک ہو چکی ہیں کہ جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول نے فرض نہیں کی تھیں سوال کر کر کے ان کو فرض کر لیا، اور پھر اس کی خلاف ورزی میں مبتلا ہو گئے، تمھارا وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ جن کام میں حکم دوں اس کو معتدور بھر پورا کرو اور جن چیز سے منع کروں اس کو چھوڑ دو (مراد یہ ہے کہ جن چیزوں سے سکوت کیا جائے ان کے متعلق کھود کرید نہ کرو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد | اس آیت میں ایک ضمنی جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ وَاِنْ نَسَلُوا اَئِمَّاهِجَيْنِ يَنْزِلُ الْقُرْآنُ تَبْدِ لَكُمْ، یعنی نزولِ نبوت اور سلسلہ وحی ختم ہے۔

مستراک کے زمانہ میں اگر تم ایسے سوالات کرو گے تو بذریعہ وحی ان کا جواب آجائے گا، اس میں نزولِ قرآن کے زمانہ کے ساتھ مقید کر کے اس کی طرف اشارہ فرمادیا کہ نزولِ مستراک

کی تکمیل کے بعد نبوت و وحی کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔

ختم نبوت اور سلسلہ وحی کے انقطاع کے بعد ایسے سوالات کا اگرچہ یہ اثر نہ ہوگا کہ نثر احکام آجائیں جو چیزیں فرض نہیں ہیں وہ فرض ہو جائیں، یا بذریعہ وحی کسی کا خفیہ راز آشکارا ہو جائے، لیکن بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بے ضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا بعد انقطاع نبوت کے بھی مذموم اور ممنوع ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ**، یعنی مسلمان ہونے کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان جو بالکل فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کیا نام تھا، اور نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول و عرض کیا تھا، جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں، ایسے سوالات کرنا مذموم ہے، خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ ایسے سوالات کرنے والے حضرات اکثر ضروری اور اہم مسائل دین سے بے خبر ہوتے ہیں، فضول کاموں میں پڑنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی ضروری کاموں سے محروم ہو جاتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرات فقہاء نے خود ہی بہت سی مفروضہ صورتیں مسائل کی نکال کر اور سوالات قائم کر کے ان کے احکام بیان کر دیئے ہیں سو یہ بے ضرورت چیز نہ تھی، آنے والے واقعات نے بتلادیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی ضرورت تھی، اس لئے وہ فضول اور لایعنی سوالات نہ تھے، اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ایک تعلیم ہے کہ علم ہو یا عمل کوئی کام ہو یا کلام جب تک اس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو اس میں لگ کر وقت ضائع نہ کریں۔

بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تعریف | بحیرہ، سائبہ و صلیک، حامی، یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں، مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے، ممکن ہو ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو، ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔

بحیرہ: جس جانور کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔

سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر ہمالے زمانہ کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔
حامی: نراونٹ جو ایک خاص عدد سے جھنی کر چکا ہو، اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے درمیان میں بچہ پیدا نہ ہوا سے بھی بتوں کے

نام پر چھوڑ دیتے تھے۔
 علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائرِ شرک میں سے تھیں جس جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری
 سے منفعہ ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا گویا اپنی
 لئے منصبِ شریع تجویز کرنا تھا، اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکاتہ رسوم کو حق تعالیٰ کی...
 خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز یہ رسوم
 مقرر نہیں کیں، ان کے بڑوں نے خدا پر یہ بہتان باندھا، اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول
 کر لیا، الغرض یہاں یہ تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول و بیکار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں
 تنگی اور سختی کرنا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جُرم ہے کہ بدون حکم شایع کے محض اپنی آراء و
 ہوا سے حلال و حرام تجویز کر لئے جائیں (فوائد عثمانی)۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ

اور جب کہا جاتا ہو اُن کو آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف

قَالُوا أَحَبُّنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَكُنَّا آبَاءُوهُمْ

تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو بھلا اگر ان کے باپ دادے

لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۰۴﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتی ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے، اے ایمان والو

عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم سچے راہ پر

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو، پھر وہ بتلا دے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے،

رابطِ آیات | اوپر رسم پرست کفار کی ایک جہالت کا ذکر تھا، اور ایسی ایسی جہالتیں انکی
 بہ کثرت تھیں جن کو سنکر مؤمنین کو بیخ اور افسوس ہوتا تھا، اس لئے آگے

مؤمنین کو اس کے متعلق ارشاد ہے کہ تم کیوں اس غم میں پڑے ہو، تم کو اپنی اصلاح کا اور
 دوسرے کی اصلاح میں بقدر وسعت و قدرت کوشش کرنے کا حکم ہے، باقی کوشش پر عمرہ
 مرتب ہونا تھا اے اختیار سے خارج ہے، اس لئے ”کار خود کن کار بیگانہ مکن“ پر عمل کرو۔

حُصْلَۃُ تَفْسِیْرِ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی طرف اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (جن پر وہ احکام نازل ہوئے ہیں) رجوع کرو (جو امر اس سے حق ثابت ہو حق سمجھو اور جو باطل ہو باطل سمجھو) تو کہتے ہیں کہ ہم کو ان احکام اور رسول کی ضرورت نہیں ہم کو وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا ہے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) کیا (وہ طریقہ ان کے لئے ہر حال میں کافی ہے) اگرچہ ان کے بڑے (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں، اے ایمان والو اپنی (اصلاح کی) فکر کرو (اصل کام تمہارے ذمہ یہ ہے، باقی دوسروں کی اصلاح کے متعلق یہ ہے کہ جب تم اپنی طرف سے اپنی قدرت کے مطابق اصلاح کی سعی کر رہے ہو مگر دوسرے پر اثر نہیں ہوتا تو تم اثر مرتب نہ ہونے کی فکر میں نہ پڑو کیونکہ) جب تم (دین کی) راہ پر چل رہے ہو (اور واجبات دین کو ادا کر رہے ہو) اس طرح کہ اپنی بھی اصلاح کر رہے ہو اور دوسروں کی اصلاح میں بھی کوشش کر رہے ہو) تو جو شخص (باوجود تمہاری سعی اصلاح کے بھی) گمراہ رہے تو اس کے گمراہ رہنے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں (اور جیسا اصلاح وغیرہ میں حد سے زیادہ فکر و غم سے منع کیا جاتا ہے ایسے ہی ہدایت سے ناامید ہونے کی صورت میں غصہ میں آکر دنیا ہی میں ان پر سزا نازل ہونے کی تمنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ حق و باطل کا مکمل فیصلہ تو آخرت میں ہوگا، چنانچہ) اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلا دیں گے جو کچھ تم سب کیا کرتے تھے (اور جتنا کر حق پر ثواب اور باطل پر عذاب کا حکم نافذ فرما دیں گے)۔

مَعَارِفُ وَمَسَائِلُ

آیات کا شان نزول | جاہلیت کی رسموں میں ایک تقلیدِ آباء بھی تھی، جس نے ان کو ہر برائی میں مبتلا اور ہر بھلائی سے محروم رکھا تھا، تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ ان میں سے کوئی خوش نصیب اگر حق بات کو مان کر مسلمان ہو جاتا تو اس کو یوں عار دلائی جاتی تھی کہ تو نے اپنے باپ دادوں کو بیوقوف ٹھہرایا، کہ ان کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کر لیا، ان کی اس گمراہی و گمراہی پر یہ آیت نازل ہوئی، وَذَٰلَآءِیۡنَآ لَہُمۡمُ تَعَاوُنًاۤیۡلَیۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِۡمُ مِنَ الرُّسُوۡلِ قَالُوۡۤا حَسْبُنَا مَا وَجَدَۡنَا عَلَیۡہِۡۤیۡۡۤاِبَآءَۡنَا، یعنی جب اُن کو کہا جاتا کہ تم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حقائق اور احکام اور رسول کی طرف رجوع کرو جو ہر حیثیت سے حکمت

مصلحت اور تمھارے لئے صلاح و فلاح کے ضامن ہیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا کہ ہم کو تو وہی طریقہ کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔

یہ وہ شیطانی استدلال ہے جس نے لاکھوں انسانوں کو معمولی سمجھ بوجھ اور علم و ہنر رکھنے کے باوجود گمراہ کیا، قرآن کریم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: **أَذَلُّوْكَانَ أَبَاؤُكُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا**، غور کرنے والوں کے لئے قرآن کے اس ایک جملہ نے کسی شخص یا جماعت کی اقتدار کرنے کا ایک صحیح اصول بیان کر کے اندھوں کے لئے بنیاتی کھوپڑیاں اور جاہل و غافل کے لئے انکشافِ حقیقت کا مکمل سامان فراہم کر دیا ہے، وہ یہ کہ یہ بات تو معقول ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں کی، ناواقف لوگ واقف کاروں کی پیروی کریں، جاہل آدمی عالم کی اقتدار کرے لیکن یہ کوئی معقول بات نہیں کہ علم و عقل اور ہدایت کے معیار سے ہٹ کر اپنے باپ دادا یا کسی بھائی بند کی اقتدار کو اپنا طریقہ کار بنا لیا جائے، اور بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ مقتدار خود کہاں جا رہا ہے، اور یہیں کہاں پہنچائے گا اس کے پیچھے لگ لیا جائے۔

اسی طرح بعض لوگ کسی کے اتباع و اقتدار کا معیار لوگوں کی بھیڑ کو بنا لیتے ہیں جس طرف یہ بھیڑ دیکھی اسی طرف چل پڑے، یہ بھی ایک نامعقول حرکت ہے، کیونکہ اکثریت تو ہمیشہ دنیا میں بیوقوفوں یا کم عقلوں کی اور عمل کے لحاظ سے بد عملوں کی رہتی ہے، اس لئے لوگوں کی بھیڑ حق و ناحق یا بھلے برے کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔

نااہل کو مقتدار بنانا | قرآن کریم کے اس جملہ نے سب کو ایک واضح حکمت کا سبق دیا کہ ان میں سے کوئی چیز مقتدار و پیشوا بنانے کے لئے ہرگز کافی نہیں، بلکہ ہر انسان پر سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد اور اپنے سفر کا رخ متعین کرے، پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ دیکھے کہ کون ایسا انسان ہے جو اس مقصد کا راستہ جاننے والا بھی ہو، اور اس راستہ پر چل بھی رہا ہو، جب کوئی ایسا انسان مل جائے تو بے شک اس کے پیچھے لگ لینا اس کو منزلِ مقصود پر پہنچا سکتا ہے، یہی حقیقت ہے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی کہ وہ دین کو جاننے والے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی، اس لئے نہ جاننے والے ان کا اتباع کر کے دین کے مقصد یعنی اتباعِ خدا اور رسول کو حاصل کر سکتے ہیں، اور جو گم کردہ راہ ہو، منزلِ مقصود کو خود ہی نہ جانتا ہو یا جان بوجھ کر منزل کے خلاف سمت چل رہا ہو اس کے پیچھے چلنا ہر عقلمند کے نزدیک اپنی سعی و عمل کو ضائع کرنا، بلکہ اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے، اس علم و حکمت اور روشن خیالی کے زمانہ میں بھی افسوس ہے کہ لکھے پڑھے ہوش و عقل والے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں، اور آج کی برادری

اور تباہی کا سبب بنا اہل اور غلط مقتداؤں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔
اقتدار کا معیار | قرآن کریم کے اس جملہ نے اقتدار کا نہایت معقول اور واضح معیار دو چیزوں کو بنایا ہے، علم اور اہتدار، علم سے مراد منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کے طریقوں کا جاننا اور اہتدار سے مراد اس مقصد کی راہ پر چلنا، یعنی صحیح علم پر عمل مستقیم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس شخص کو مقتدار بناؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ جس مقصد کے لئے اس کو مقتدار بنایا ہے وہ اس مقصد اور اس کے طریق سے پوری طرح واقف بھی ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھو کہ وہ اس کی راہ پر چل بھی رہا ہے؟ اور اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے یا نہیں؟
 غرض کسی کو مقتدار بنانے کے لئے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری ہے، محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا، یا صاحب مال و دولت ہونا یا صاحب حکومت و سلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیار اقتدار سمجھا جائے۔

کسی پر تنقید کرنے کا | قرآن کریم نے اس جگہ تقلیدِ آبائی کے خوگر لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا،
مؤثر طریقہ | اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلادیا، جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو شیعہ نہ ہونے کیونکہ دینِ آبائی کی تقلید کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں، بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا، نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔

اصلاحِ خلق کی فکر | دوسری آیت میں، اصلاحِ خلق کی فکر میں سب کچھ قربان کر نیوالے مسلمانوں کو تسلیٰ کو ایک تسلیٰ | کو تسلیٰ دی گئی ہے کہ جب تم نے حق کی تبلیغ و تعلیم میں معتدور و بھرکوشش کر لی، اور نصیحت و خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، تو پھر بھی اگر کوئی گمراہی پر جا رہا ہے تو تم اس کی فکر میں نہ پڑو، اس حالت میں دوسروں کی گمراہی یا غلط کاری سے تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا، ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَعْلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَصُرُّكُمْ مَن حَتَّىٰ إِذَا أَهْتَدَيْتُمْ
 یعنی اے مسلمانوں تم اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے تو اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے چونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر انسان کو صرف اپنے عمل اور اپنی اصلاح کی فکر کافی ہے، دوسرے کچھ بھی کرتے رہیں اُس پر دھیان دینے کی ضرورت

نہیں اور یہ بات قرآن کریم کی بے شمار تصریحات کے خلاف ہے، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کا اہم فریضہ اور اس امت کی امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے، اسی لئے اس آیت کے نازل ہونے پر کچھ لوگوں کو شبہات پیش آئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے گئے، آپ نے توضیح فرمائی، کہ یہ آیت احکام امر بالمعروف کے منافی نہیں، امر بالمعروف کو چھوڑ دو گے تو مجرموں کے ساتھ تم بھی ماخوذ ہو گے، اسی لئے تفسیر بحر محیط میں حضرت سعید ابن جبیرؓ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ تم اپنے واجبات شرعیہ کو ادا کرتے رہو جن میں جہاد اور امر بالمعروف بھی داخل ہے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو لوگ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی نقصان نہیں، قرآن کریم کے الفاظ **اِذَا اهْتَدَيْتُمْ** میں غور کریں، تو یہ تفسیر خود واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم راہ پر چل رہے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمھارے لئے مضر نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص امر بالمعروف کے فریضہ کو ترک کر دے وہ راہ پر نہیں چل رہا ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ سوال کیا کہ فلاں فلاں حضرات میں باہمی سخت جھگڑا ہے، ایک دوسرے کو مشرک کہتے ہیں، تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ تمہیں کہہ دوں گا کہ جاؤ ان لوگوں سے قتال کرو، ہرگز نہیں، جاؤ ان کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ، قبول کریں تو بہتر اور نہ کریں تو ان کی فکر چھوڑ کر اپنی فکر میں لگ جاؤ، پھر یہی آیت آپ نے جواب کی شہادت میں تلاوت فرمائی گناہوں کی روک تھام کے بارے میں آیت کے ظاہری الفاظ سے سرسری نظر میں جو شبہ ہو سکتا تھا حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک خطبہ اس کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے موقع استعمال کرتے ہو، کہ امر بالمعروف کی ضرورت نہیں، خوب سمجھ لو کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو لوگ کوئی گناہ ہوتا ہو ادیکھیں اور (مقدور بھر) اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے ساتھ ان دوسرے لوگوں کو بھی عذاب میں پکڑ لے۔

یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ میں موجود ہے اور ابوداؤد کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جو لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس ظلم سے (اپنی قدرت کے موافق) نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں پکڑ لیں گے۔

معروف اور منکر کے معنی گزشتہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہو چکی کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ منکر یعنی ناجائز امور کی روک تھام کرے یا کم از کم ان سے اظہار نفرت کرے، اب یہ

معلوم کیجئے کہ معروف اور منکر کس کو کہتے ہیں۔

لفظ معروف، معرفہ سے اور منکر انکار سے ماخوذ ہے، معرفہ کہتے ہیں کسی چیز کو غور و فکر کر کے سمجھنے یا پہچاننے کو، اس کے بالمقابل انکار کہتے ہیں نہ سمجھنے یا نہ پہچاننے کو، یہ دونوں لفظ متقابل سمجھے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے: يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُوهَا، یعنی اللہ کی قدرت کا ملکہ کے مظاہر دیکھ کر اس کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں مگر پھر از روئے عناد انکار کرتے ہیں، گویا ان نعمتوں کو جانتے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لغوی معنی کے اعتبار سے معروف کے معنی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، اور منکر کے معنی نا پہچانی ہوئی چیز کے، امام راغب اصفہانی نے مفردات لہ قرآن میں اسی کی مناسبت سے اصطلاح شرع میں معروف و منکر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ معروف اس فعل کو کہا جاتا ہے جس کا مستحق یعنی اچھا ہونا عقل یا شرع سے پہچانا ہوا ہو، اور منکر ہر اس فعل کا نام ہے جو از روئے عقل و شرع اوپر اور نہ پہچانا ہوا ہو، یعنی برا سمجھا جاتا ہو، اس لئے امر بالمعروف کے معنی اچھے کام کی طرف بلانے کے اور نہی عن المنکر کے معنی برے کام سے روکنے کے ہو گئے۔

ائمہ مجتہدین کے مختلف اقوال میں | لیکن اس جگہ گناہ و ثواب یا طاعت و معصیت کے بجائے کوئی منکر شرعی نہیں ہوتا | معروف و منکر کا لفظ استعمال کرنے میں شاید اس طرف

اشارہ ہو کہ وہ دقیق اور اجتہادی مسائل جن میں قرآن و سنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دو رائیں ہو سکتی ہیں، اور اسی بنا پر ان میں فقہاء امت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ سے خارج ہیں، ائمہ مجتہدین جن کی شان اجتہاد علماء امت میں مسلم ہے، اگر کسی مسئلہ میں ان کے دو مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبیں معروف میں داخل ہیں، ایسے مسائل میں ایک رائے کو رائج سمجھنے والے کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے پر ایسا انکار کرے جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین میں بہت سے اجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث و تمحیص اور مناظرے و مکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجہ بیان کرتا اور دوسرے پر اعتراض کرتا تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا۔ خلاصہ یہ ہو کہ اجتہادی اختلاف کے موقع پر یہ تو ہر ذی علم کو اختیار ہے کہ جس جانب کو رائج سمجھے اسے اختیار کرے، لیکن دوسرے کے فعل کو منکر سمجھ کر اس پر انکار کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس سے واضح ہوا کہ اجتہادی مسائل میں جنگ و جدل

یا منافرت پھیلانے والے مقالات و مضامین امر بالمعروف یا نہی عن المنکر میں داخل نہیں
ان مسائل کو محاذ جنگ بنانا صرف ناواقفیت یا جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةٌ بَيْنَكُمْ إِذَا أَحْضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ

اے ایمان والو! گواہ درمیان تمہارے جب کہ پہنچے کسی کو تم میں موت،

حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ آخَرِينَ مِّنْ غَيْرِكُمْ

وصیت کے وقت دو شخص معتبر ہونے چاہئیں تم میں سے یا دو شاہد اور ہوں تمہارے سوا،

إِنْ أَنْتُمْ خَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ

اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر پہنچے تم کو مصیبت موت کی،

تَحْبِسُوكُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمُ بِاللَّهِ إِنْ أَرْتَبْتُمْ

تو کھڑا کرو ان دونوں کو بعد نماز کے وہ دونوں قسم کھا دیں اللہ کی اگر تم کو شبہ پڑے کہیں

لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَلَا نَكُمُ شُهَدَاةَ اللَّهِ

کہ ہم نہیں لیتے قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی

إِنَّا إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٦﴾ فَإِنْ عُرِّرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّ ثَمَنًا

نہیں تو ہم بے شک گناہگار ہیں، پھر اگر خبر ہو جائے کہ وہ دونوں حق بات دہا گئے

فَآخَرِينَ يَقُولُ مَنْ مَّقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ

تو دو گواہ اور کھڑے ہوں ان کی جگہ ان میں سے کہ جن کا حق دہا ہے جو سب سے زیادہ

الْأَوْلَىٰ لِيْنِ فَيُقْسِمُ بِاللَّهِ لَشَهَادَتُنَا أَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا

قریب ہوں میت کے پھر قسم کھا دیں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہر پہلوں کی گواہی سے

وَمَا اعْتَدَيْنَا إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ

اور ہم نے زیادتی نہیں کی نہیں تو ہم بیشک ظالم ہیں، اس میں امید ہے کہ

يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا أَوْ يَخَافُونَ أَنْ تُرَدَّ أَيْمَانُهُمْ

اور اگر اس شہادت کو ٹھیک طرح پر اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی

بَعْدَ أَيْمَانِهِمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

قسم کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو اور اللہ نہیں چلاتا سیدھی

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

راہ پر نافرمانوں کو

رَبِّطِ آيَاتِ | اوپر مصالح دینیہ کے متعلق احکام تھے، آگے مصالح دنیویہ کے متعلق بعض احکام کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ کر دیا کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے مثل اصلاح معاد کے اپنے بندوں کی معاش کی اصلاح بھی فرماتے ہیں (بیان لغت قرآن)

آیات مذکورہ کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص "بَدِیل" نامی جو مسلمان تھا
شانِ نزول | دو شخصوں تیمم وعدی کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے، بغرض تجارت

ملک شام کی طرف گیا، شام پہنچ کر مدین بیمار ہو گیا، اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی، اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی، مرض جب زیادہ بڑھا، تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انھوں نے سب سامان لاکر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش ڈنگا تھا، اس میں سے نکال لیا، وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی، انھوں نے اوصیا سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں خرچ ہوا ہو، ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی، نہ کوئی چیز اس کی چھپائی، آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا، کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی ر کے ہاتھ فروخت کیا ہے، جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا، چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے۔

میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا، اب پہلی صورت کے برعکس اوصیا خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے، شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کی ملک تھا، اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں، چنانچہ جس قیمت پر انھوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم پر) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

خلاصہ تفسیر

لے ایمان والو تمھارے آپس (کے معاملات) میں (مثلاً ورثہ کو مال سپرد کرنے کے لئے) دو شخص وصی ہونا مناسب ہے (گو بالکل وصی نہ بنانا بھی جائز ہے) جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے (یعنی) جب وصیت کرنے کا وقت ہو (اور) وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں اور تم میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) ہوں یا غیر قوم کے دو شخص ہوں اگر (مسلمان بن گئیں مثلاً) تم کہیں سفر میں گئے ہو پھر تم پر واقعہ موت کا پڑ جائے (اور یہ سب امور واجب نہیں، مگر مناسب اور بہتر ہیں، ورنہ جس طرح بالکل وصی نہ بنانا جائز ہے اسی طرح اگر ایک وصی ہو یا عادل نہ ہو یا حضر میں غیر مسلم کو بنا دے سب جائز ہے، پھر ان اوصیاء کا یہ حکم ہو کہ اگر (کسی وجہ سے اُن پر) تم کو (اے ورثہ) شبہ ہو تو (اے حکام مقدمہ اس طرح فیصلہ کرو کہ اول ورثہ سے چونکہ وہ مدعی ہیں اس امر پر گواہ طلب کر لے کہ انھوں نے فلاں چیز مثلاً جام لے لیا ہے، اور اگر وہ گواہ نہ لاسکیں تو ان اوصیاء سے چونکہ وہ مدعا علیہ ہیں، اس طرح قسم لو کہ) ان دونوں (وصیوں) کو بعد نماز (عصر مثلاً) روک لو (کیونکہ اکثر اس وقت مجمع زیادہ ہوتا ہے، تو جھوٹی قسم کھانے والا کچھ نہ کچھ شرماتا ہے، نیز وقت بھی معظم ہے کچھ اس کا بھی خیال ہوتا ہے، اور مقصد اس سے تغلیظ یہی ہے، زمان متبرک و مکان اجتماع خلق کے ساتھ) پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھاویں کہ (صبغہ حلف کے ساتھ کہیں کہ) ہم اس قسم کے عوض کوئی (دنیا) کا نفع نہیں لینا چاہتے (کہ دنیا کا نفع حاصل کرنے کے لئے قسم میں سچ بولنے کو چھوڑ دیں) اگرچہ (اس واقعہ میں ہمارا) کوئی بستر ابتداء بھی (کیوں نہ ہوتا) جس کی مصلحت کو اپنی مصلحت سمجھ کر ہم جھوٹی قسم کھاتے اور اب تو کوئی ایسا بھی نہیں، جب دوسری مصلحتوں کی وجہ سے بھی ہم جھوٹ نہ بولتے تو ایک مصلحت کے لئے تو ہم کیوں ہی جھوٹ بولیں گے) اور اللہ کی (طرف سے جس) بات (کہتے) کا حکم ہے (اس) کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت گنہگار ہونگے (یہ تغلیظ قولی ہے جس سے مقصد احتضار ہے وجوب صدق و حرمت کذب و عظمت الہیہ کا جو مانع ہو دروغ حلفی سے، اب ان دونوں تغلیظ کے بعد اگر حاکم کی رائے ہو تو بتاغلیظ اصل مضمون کی قسم کھاویں، مثلاً ہم کو میت نے پیالہ نہیں دیا، اور اس پر مقدمہ فیصلہ کر دینا چاہئے، چنانچہ اس آیت کے واقعہ میں ایسا ہی ہوا) پھر (اس کے بعد) اگر (کسی طریق سے ظاہراً) اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں وصی کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں

مثلاً واقعہ آیت میں جس کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، جب پیالہ مکہ میں ملا اور دونوں وصیوں نے دریافت کرنے پر میت سے خریدنے کا دعویٰ کیا جس سے میت سے لے لینے کا اقرار لازم آتا ہے، اور وہ ان کے پہلے قول کا مخالف ہے، جس میں مطلقاً لینے ہی سے انکار کیا تھا، چونکہ اقرار بالمضر حجت ہی، اس لئے ظاہراً ان کا خائن اور کاذب ہونا معلوم ہوا، تو ایسی صورت میں مقدمہ کا رخ بدل جائے گا، وصی جو کہ پہلے مدعا علیہ تھے اب خریدنے کے مدعی ہو گئے، اور وراثہ جو کہ پہلے مدعی خیانت کے تھے اب مدعا علیہ ہو گئے، اس لئے اب فیصلہ کی یہ صورت ہو گئی کہ اول وصیوں سے گواہ خریدنے کے طلب کئے جائیں، اور جب وہ گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان (وارث) لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں (ان اوصیاء کی جانب سے) گناہ (مذکور) کا ارتکاب ہوا تھا اور جو کہ شرعاً مستحق میراث ہوں مثلاً صورت واقعہ آیت میں (دو شخص (تھے) جو سب (ورثہ) میں باعتبار (استحقاق میراث) قریب تر ہیں جہاں (حلف کے لئے) وہ دونوں (وصی) کھڑے ہوئے تھے (اب) یہ دونوں (حلف کے لئے) کھڑے ہوں پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھا دیں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ کہیں کہ) بالیقین ہماری یہ قسم (بوجہ اس کے کہ بالکل اشتباہ سے ظاہراً حقیقتہً پاک ہے) ان دونوں (اوصیاء) کی اس قسم سے زیادہ راست ہے (کیونکہ اس کی حقیقت کا گویم کو علم نہیں، لیکن ظاہراً تو وہ مشتبہ ہو گئی) اور ہم نے (حق سے) ذرا تجاوز نہیں کیا (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے، (کیونکہ پرایا مال جان بوجھ کر بلا اجازت لے لینا ظلم ہے، یہ بھی تغلیظ ہے، جو حاکم کی رائے پر ہے، پھر اصل مضمون پر قسم لی جائے، جس کا صیغہ بوجہ اس کے کہ فعل غیر پر ہے یہ ہوگا کہ خدا کی قسم ہمارے علم میں میت نے ان (وصیوں) کے ہاتھ جام فروخت نہیں کیا، اور چونکہ علم کی واقعیت و عدم واقعیت کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی واقعیت پر زیادہ موکد قسم لی گئی، جیسا لفظ آحق دال ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس کا مدعا چونکہ میرے ہی اوپر ہے اس لئے قسم کھاتا ہوں کہ جیسا اس میں کذب ظاہری کا ثبوت نہیں ہو سکتا اسی طرح حقیقت میں کذب بھی نہیں ہے، اور یہ قرینہ مفید ہے، کہ یہاں حلف علم پر ہے، اور چونکہ اس کا کذب بلا اقرار کبھی ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے اس میں جو حق تلفی ہوگی وہ اس شد درجہ کا ظلم ہوگا، عجب نہیں کہ یہاں ظالمین اسی لئے کہا گیا ہو) یہ (قانون جو مجموعہ آیتیں میں مذکور ہوا) بہت قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (اوصیاء) لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں (اگر سپردگی مال زائد کی نہیں ہوئی قسم کھالیں، اور اگر ہوتی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کر دیں) یہ حکمت تو تحلیف اوصیاء

میں ہے) یا اس بات سے ڈر کر قسم کھانے سے رُک جائیں کہ ان سے قسم لینے کے بعد (ورثہ پر) قسمیں متوجہ کی جائیں گی (پھر ہم کو خفیف ہونا پڑے گا، یہ حکمتِ تخلیفِ ورثہ میں ہے، اور ان سب شقوق میں حق دار کو اس کا حق پہنچایا ہے کہ جو مشروع و مطلوب ہے، کیونکہ اگر تخلیفِ اوصیاء مشروع نہ ہوتا اور اوصیاء مال کے پر کرنے میں سچے ہوتے تو ان کی ہمت برفع کرنے کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اگر وہ جھوٹے ہوتے تو ورثہ کے اثبات حق کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اب سچے ہونے کے وقت برائے ہو جاتی، اور جھوٹے ہونے کے وقت شاید جھوٹی قسم سے ڈر کر انکار کر جاویں تو ورثہ کا حق ثابت ہو جاتا ہے، اور اگر تخلیفِ ورثہ مشروع نہ ہوتا اور شرعاً ان کا حق ہوتا تو اثباتِ حق کی کوئی صورت نہ تھی، اور اگر شرعاً ان کا حق نہ ہوتا تو اوصیاء کے اثباتِ حق کا کوئی طریقہ نہ تھا، اور اب ورثہ کا حق ہونے کے وقت ان کا اثباتِ حق ہو سکتا ہے، اور حق نہ ہونے کے وقت قسم کے انکار سے اوصیاء کا حق ثابت ہو جائیگا پس دو شقیں تخلیفِ اوصیاء کی حکمت میں ہیں، اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا دُنِيَ مِنَ الشَّيْءِ مَا لِلَّهِ اور وَاللَّهُ عَالِمُ الْغُيُوبِ کی مدلول ہے، پس مجموعہ ہر دو تخلیف میں سب شق میں متداخل ہے اور پہلی شق أَوْ يَخَافُوا کی مدلول ہے، پس مجموعہ ہر دو تخلیف میں سب شقوق کی رعایت ہوگئی) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اور معاملات و حقوق میں جھوٹ مت بولو) اور (ان کے احکام کو) سنو (یعنی مانو) اور اگر خلاف کرو گے تو فاسق ہو جاؤ گے) اللہ تم فاسق لوگوں کو (قیامت کے روز فرمانبرداروں کے درجات کی طرف) رہنمائی نہ کریں گے (بلکہ نجات پانے کے وقت بھی ان سے کم رہیں گے تو ایسا خسارہ کیوں گوارا کرتے ہو)

معارف و مسائل

- مسئلہ: میت جس شخص کو مال سپرد کر کے اس کے متعلق کسی کو دینے دلانے کیلئے کہہ جاوے وہ وصی ہے، اور وصی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، اور زیادہ بھی۔
- مسئلہ: وصی کا مسلمان اور عادل ہونا خواہ حالتِ سفر ہو یا حضر افضل ہو لازم نہیں۔
- مسئلہ: نزاع میں جو امر زائد کا مثبت ہو وہ مدعی اور دوسرا مدعا علیہ کہلاتا ہے۔
- مسئلہ: اول مدعی سے گواہ لئے جاتے ہیں، اگر موافق ضابطہ شرعی کے پیش کر دے، مقدمہ وہ پاتا ہے، اور اگر پیش نہ کرے تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے اور مقدمہ وہ پاتا ہے، البتہ اگر قسم سے انکار کر جائے تو پھر مدعی مقدمہ پالیتا ہے۔
- مسئلہ: قسم کی تغلیظ زمان یا مکان کے ساتھ جیسا کہ آیت مذکورہ میں کی گئی ہے، حاکم کی رائے پر ہے، لازم نہیں، اس آیت سے بھی لزوم ثابت نہیں ہوتا اور دوسری

آیات و روایات سے اطلاق ثابت ہے۔

مسئلہ: اگر مدعا علیہ کسی غیر کے فعل کے متعلق قسم کھائے تو الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ مجھ کو اس فعل کی اطلاع نہیں۔

مسئلہ: اگر میراث کے مقدمہ میں وارث مدعا علیہ ہوں تو جن کو شرعاً میراث پہنچتی ہے ان پر قسم آوے گی خواہ وہ واحد ہو یا متعدد اور جو وارث نہیں اُن پر قسم نہ ہوگی (بیان بقرآن)

ایک کافر کی شہادت دوسرے (قرآن تعالیٰ) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَشْهَادُكُمْ بَيْنَكُمْ (الی قولہ) کافر کے معاملہ میں قابل قبول ہو أَوِ الْآخَرِينَ مِنْ غَيْرِكُمْ اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا

ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے تو دو ایسے آدمیوں کو وصی بناؤ جو تم میں سے ہوں اور نیک ہوں، اور اگر اپنی قوم کے آدمی نہیں ہیں تو غیر قوم (یعنی کافر) سے بناؤ۔

اس سے امام ابو حنیفہؒ نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ کفار کی شہادت بعض کی بعض پر جائز ہے، کیونکہ اس آیت میں کفار کی شہادت مسلمانوں پر جائز قرار دی ہے، جیسا کہ أَوِ الْآخَرِينَ مِنْ غَيْرِكُمْ سے ظاہر ہے تو کفار کی شہادت بعض کی بعض پر بطریق اولیٰ جائز ہے

لیکن بعد میں آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُتِلْتُمْ بَدِيتُمْ إِلَىٰ آجَلٍ مُّتَمِّتٍ فَاصْبِرُوا (الی قولہ) وَأَشْهِدُوا وَأَشْهِدُوا بَيْنَكُمْ سے کفار کی شہادت مسلمانوں پر منسوخ ہو گئی، لیکن کفار کی بعض کی بعض پر اسی طرح باقی ہے (قرطبی، احکام القرآن للخصاص)

امام صاحب کے مسلک کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ایک یہودی نے زنا کر لیا تو اس کے لوگوں نے اس کا چہرہ سیاہ کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کیا، آپ نے اس کی حالت دیکھ کر وجہ دریافت فرمائی تو انھوں نے کہا کہ اس نے زنا کیا ہے تو آپ نے گواہوں کی شہادت کے بعد اس کو رجم کرنے کا حکم دیا (جصاص)

جس شخص پر کسی کا حق ہو (قرآن تعالیٰ) تَحْبِسُوهُمْ، اس آیت سے ایک اصول معلوم ہوا کہ جب وہ اس کو قید کر سکتا ہو آدمی پر کسی کا کوئی حق واجب ہو اس کو اس حق کی خاطر ضرورت کے

وقت قید کیا جاسکتا ہے (قرطبی)

(قرآن تعالیٰ) مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ (صلوٰۃ سے عصر کی نماز مراد ہے، اس وقت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی تعظیم اہل کتاب بہت کرتے تھے، جھوٹ بولنا ایسے وقت میں خصوصاً ان کے ہاں ممنوع تھا، اس سے معلوم ہوا کہ قسم میں کسی خاص وقت یا خاص مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے (قرطبی)

خستیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی تعظیم اہل کتاب بہت کرتے تھے، جھوٹ بولنا ایسے وقت میں خصوصاً ان کے ہاں ممنوع تھا، اس سے معلوم ہوا کہ قسم میں کسی خاص وقت یا خاص مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے (قرطبی)

یا خاص مقام وغیرہ کی قید لگا کر تغلیظ کرنا جائز ہے (قرطبی)

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ

جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا تم کو کیا جواب ملا تھا وہ کہیں گے ہم کو

لَنَا بِكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝۱۰۹ إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعْقِبَ ابْنُ

نہر نہیں تو ہی ہر چھپی باتوں کو جاننے والا ، جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم

مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ

کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر جب مدد کی میں نے

بِرُوحِ الْقُدُّسِ تَكَلَّمَ النَّاسُ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ

تیری روح پاک سے تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود میں اور بڑی عمر میں اور جب

عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ

سکھائی میں نے تجھ کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور توریت اور انجیل اور جب

تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفَخُ فِيهَا

تو بناتا تھا گارے سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر پھونک مارتا تھا اس میں

فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَةَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۚ

تو ہو جاتا اڑنے والا میرے حکم سے اور اچھا کرتا تھا مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے

وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

اور جب نکال کھڑا کرتا تھا مردوں کو میرے حکم سے اور جب روکائیں نے بنی اسرائیل کو

عَنْكَ إِذْ جَعَلْتَهُمُ الْبَيْتَ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ

تجھ سے جب تو نے کر آیا ان کے پاس نشانیاں تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں

إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝۱۱۰

اور کچھ نہیں یہ تو جادو ہے صریح

رابط آیات | اوپر احکام مختلفہ کا ذکر ہوا اور درمیان میں ان پر عمل کی ترغیب اور ان کی مخالفت

پر ترہیب فرمائی گئی، اسی کی تاکید کے لئے اگلی آیت میں قیامت کے ہولناک واقعات یاد

دلاتے ہیں، تاکہ اطاعت کا زیادہ باعث اور مخالفت سے زیادہ مانع ہو اور اکثر طرز قرآن مجید

کا یہی ہے، پھر ختم سورت میں اہل کتاب کا مکالمہ ذکر فرمایا ہے، جو ماقبل متعدد آیات میں

مذکور ہو چکا جس سے مقصد اہل کتاب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعض مضامین سنانا ہو جن سے ان کی عبدیت کا اثبات اور اُلوہیت کی نفی ہے (اگرچہ اس مخاطبت کا وقوع قیامت میں ہوگا)

خلاصہ تفسیر

(وہ دن بھی کیسا ہولناک ہوگا) جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو (مع ان کی امتوں کے) جمع کرے گا پھر ان امتوں میں جو عاصی ہوں گے بغرض تو بیخ ان کے سنانے کو ان پیغمبروں سے (ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو ان امتوں کی طرف سے) کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ (ظاہری جواب تو ہم کو معلوم ہے اور اس کو بیان بھی کر دیں گے، لیکن ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کی) ہم کو کچھ خبر نہیں (اس کو آپ ہی جانتے ہیں کیونکہ) آپ بیشک پوشیدہ باتوں کے پورے جاننے والے ہیں (مطلب یہ کہ ایک دن ایسا ہوگا اور اعمال و احوال کی تفتیش ہوگی، اس لئے تم کو مخالفت و معصیت سے ڈرتے رہنا چاہئے، اور اسی روز عیسیٰ علیہ السلام سے ایک خاص گفتگو ہوگی) جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم میرا نعام یاد کرو (تاکہ لذت تازہ ہو) جو تم پر اور تمھاری والدہ پر (مختلف اوقات میں مختلف صورتوں سے ہوا ہے مثلاً) جبکہ میں نے تم کو روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے امداد اور تائید دی (اور) تم آدمیوں سے (دونوں حالتوں میں یکساں) کلام کرتے تھے (ماں کی) گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی (دونوں کلاموں میں کچھ تفاوت نہ تھا) اور جبکہ میں نے تم کو (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت و انجیل تعلیم کیں، اور جبکہ تم گالے سے ایک شکل بناتے تھے، جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے میرے حکم سے پھر تم اس (مصنوعی ہیئت) کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ (پچ مچ کا جانداز) پرندہ بن جاتا تھا، میرے حکم سے اور تم اچھا کر دیتے تھے مادرزاد اندھے کو اور برص (جذام) کے بیمار کو میرے حکم سے اور جبکہ تم مُردوں کو (قبروں سے) نکال (اور چلا کر) کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل (میں سے جو آپ کے مخالف تھے ان) کو تم سے (یعنی تمھارے قتل و ہلاک سے) باز رکھا جب (انھوں نے تم کو ضرر پہنچانا چاہا جبکہ) تم ان کے پاس (اپنی نبوت کی) دلیلیں (معجزات) لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انھوں نے کہا تھا کہ یہ (معجزات) بجز کھلے جادو کے اور کچھ بھی نہیں

معارف و مسائل

قیامت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے پہلے سوال ہوگا | (قولہ تعالیٰ) یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ، قیامت میں اگرچہ اوّل سے آخر تک پیدا ہونے والے تمام انسان ایک کھلے میدان میں کھڑے ہوں گے، اور کسی خطہ، کسی ملک اور کسی زمانہ کا انسان ہو وہ اس میدان میں حاضر ہوگا، اور سب سے ان کے عمر بھر کے اعمال کا حساب لیا جائے گا، لیکن بیان میں خصوصیت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا گیا، یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ، یعنی اس دن کو یاد کرو، جس دن اللہ تعالیٰ سب رسولوں کو حساب کے لئے جمع فرمائیں گے، مراد یہ ہے کہ جمع تو سارے عالم کو کیا جائے گا، مگر سب سے پہلے سوال انبیاء علیہم السلام سے ہوگا، تاکہ پوری مخلوق دیکھ لے، کہ آج کے دن کوئی حساب اور سوال و جواب سے مستثنیٰ نہیں، پھر رسولوں سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہے کہ مَاذَا أَجَبْتُمْ، یعنی جب آپ لوگوں نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین حق کی طرف بلایا تو ان لوگوں نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟ اور کیا انھوں نے آپ کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کیا؟ یا انکار و مخالفت؟ اس سوال کے مخاطب اگرچہ انبیاء علیہم السلام ہوں گے، لیکن درحقیقت مسلمانانہ ان کی امتوں کو مقصود ہوگا، کہ امتوں نے جو اعمال نیک یا بد کئے ہیں ان کی شہادت سب سے پہلے ان کے رسولوں سے لی جائے گی، امتوں کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوگا، کہ وہ تو اس ہوش ربا ہنگامہ میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کے متوقع ہوں گے، ادھر انبیاء علیہم السلام ہی سے اُن کے متعلق یہ سوال ہو جائے گا تو ظاہر ہو کہ انبیاء علیہم السلام کوئی غلط یا خلاف واقع بات تو کہہ نہیں سکتے، اس لئے مجرموں اور گنہگاروں کو اندیشہ یہ ہوگا کہ جب خود انبیاء علیہم السلام ہی ہمارے جرائم کے شاہد بنیں گے تو اب کون ہو جو کوئی شفاعت یا مدد کر سکے۔

انبیاء علیہم السلام اس سوال کا جواب یہ دیں گے: قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا بِاِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوبِ، یعنی ہمیں اُن کے ایمان و عمل کا کوئی علم نہیں، آپ خود ہی تمام غیب کی چیزوں سے پورے باخبر ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ | یہاں سوال یہ ہے کہ ہر رسول کی امت کے وہ لوگ جو اُن کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ان کے بارے میں تو انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب صحیح اور صاف ہے، کہ ان کے ایمان و عمل سے وہ باخبر نہیں، کیونکہ غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، لیکن ایک بہت بڑی تعداد امت میں ان لوگوں کی بھی تو ہے جو خود انبیاء علیہم السلام کی انتھک

کوششوں سے انہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور پھر ان کے احکام کی پیروی ان کے سامنے کرتے رہے، اسی طرح وہ کافر جنہوں نے انبیاء کی بات نہ مانی اور مخالفت و دشمنی سے پیش آئے، ان کے بارے میں یہ کہنا یکے صحیح ہوگا کہ ہمیں ان کے ایمان و عمل کا علم نہیں، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ امام ابو عبد اللہ رازیؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک عِستلم جس کے معنی یقین کامل کے ہیں، اور دوسرے ظن یعنی غلبہ گمان، اور ظاہر ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے ہونے کے باوجود اس کے ایمان و عمل کی گواہی اگر دے سکتا ہے، تو محض ظن، یعنی غلبہ گمان کے اعتبار سے دے سکتا ہے، ورنہ دلوں کا راز اور حقیقی ایمان جس کا تعلق دل سے ہے وہ تو کسی کو یقینی طور پر بغیر وحی الہی کے معلوم نہیں ہو سکتا، ہر امت میں منافقین کے گروہ رہے ہیں، جو ظاہر میں ایمان بھی لاتے تھے اور احکام کی پیروی بھی کرتے تھے، مگر ان کے دلوں میں ایمان نہ تھا، اور نہ پیروی کا کوئی جذبہ، وہاں جو کچھ تھا سب ریاکاری تھی، ہاں دنیا کے تمام احکام ظاہر افعال پر دائر ہوتے تھے، جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور احکام خداوندی کا اتباع کرے، اور خلاف اسلام و ایمان اس سے کوئی قول و فعل ثابت نہ ہو، انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں اس کو مومن صالح کہنے پر مجبور تھے، خواہ وہ دل میں مومن نکلے ہو یا منافق، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَعْنِي هُمْ تَوَظَّاهُ بِأَعْمَالٍ بِرَحْمَةٍ جَارِيَةٍ
ہیں دلوں کے مخفی رازوں کا متولی خود
اللہ جل شانہ ہے!

نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظُّوَاهِرِ
وَاللَّهُ مُتَوَلَّى السَّرَائِرِ

اسی ضابطہ کے تحت دنیا میں تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب خلفاء و علماء ظاہری اعمال پر ظن ظن کے مطابق کسی کے مومن صالح ہونے کی شہادت دے سکتے تھے لیکن آج وہ عالم دنیا جس کا سارا مدار ظن و گمان پر تھا ختم ہو چکا، یہ محشر کا میدان ہو جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی، حقائق کو آشکارا کیا جائے گا، مجرموں کے مقابلہ میں پہلے دوسرے لوگوں سے شہادتیں لی جائیں گی، ان سے اگر مجرم مطمئن نہ ہو اور اپنے جرم کا اعتراف نہ کیا تو خاص قسم کے سرکاری گواہ بروئے کار لائے جائیں گے، ان کے منہ اور زبان پر تو مہر سکوت لگادی جائے گی، اور مجرم کے ہاتھوں پاؤں اور کھال سے گواہی لی جائے گی، وہ ہر فعل کی پوری حقیقت بیان کر دیں گے، اَنِّيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيَهُمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ، اس وقت انسانوں کو معلوم ہوگا کہ میرے تمام

اعضاء رب العالمین کی خفیہ پولیس تھے، ان کے بیان کے بعد انکار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ خلاصہ یہ کہ اس عالم کا کوئی حکم محض ظن و تخمین پر نہیں چلے گا، بلکہ علم و یقین پر ہر چیز کا مدار ہوگا، اور یہ ابھی معلوم ہو چکا کہ کسی شخص کے ایمان و عمل کا حقیقی اور یقینی علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس لئے انبیاء علیہم السلام سے جب محشر میں یہ سوال ہو گا کہ مَاذَا أُجِبْتُمْ؟ تو وہ اس سوال کی حقیقت کو پہچان لیں گے کہ یہ سوال عالم دنیا میں نہیں ہو رہا جس کا جواب ظن کی بنیاد پر دیا جاسکے، بلکہ یہ سوال محشر میں ہو رہا ہے، جہاں یقین کے سوا کوئی بات چلنے والی نہیں، اس لئے ان کا یہ جواب کہ ہمیں ان کے متعلق کوئی علم نہیں، یعنی علم یقینی نہیں بالکل بجا اور درست ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب | یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتوں کے قبول و عدم قبول، اطاعت یا انبیاء کی انتہائی شفقت کا ظہور | نافرمانی کے جو واقعات ان کے سامنے پیش آئے ان سے جس طرح کا علم لظن غالب ان کو حاصل ہوا، اس سوال کے جواب میں وہ تو بیان کر دینا چاہتے تھے، صرف اس علم کے درجہ یقین کا حوالہ اللہ تعالیٰ پر کیا جاسکتا ہے، مگر یہاں انبیاء علیہم السلام نے اپنی معلومات اور پیش آمدہ واقعات کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، علم الہی کے حوالے کر کے خاموش ہو گئے۔

حکمت اس میں یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں اور عام خلق اللہ پر بے انتہا شفیق ہوتے ہیں، ان کے متعلق ایسی کوئی بات اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہیں گے جس سے یہ لوگ گرفت میں آجائیں، ہاں کوئی مجبوری ہی ہوتی تو کہنا پڑتا، یہاں علم یقین نہ ہونے کا عذر موجود تھا، اس عذر سے کام لے کر اپنی زبانوں سے اپنی امتوں کے خلاف کچھ کہنے سے بچ سکتے تھے اس طرح اس سے بچ گئے۔

محشر میں پانچ چیزوں کا سوال | خلاصہ یہ کہ اس آیت میں قیامت کے ہولناک منظر کی ایک جھلک سامنے کر دی گئی، کہ وہ موقع حساب میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ و مقبول رسول کھڑے ہیں، اور لرز رہے ہیں تو دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس لئے اس روز کی فکر آج سے چاہئے، اور فرصت عمر کو اس حساب کی تیاری کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ
عَنْ عُمُرِهِ فِيمَا أَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَا أَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهِ مِنْ آيِنٍ
اِكْتَسَبَهُ وَآيِنٍ أَنْفَقَهُ وَمَاذَا عَمِلَ بِمَا عَلِمَ

”یعنی کسی آدمی کے قدمِ محشر میں اس وقت تک آگے نہ سرک سکیں گے جب تک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لے لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کے طویل و کثیر لیل و نہار کس کام میں خرچ کئے، دوسرے یہ کہ خصوصیت سے جوانی کا زمانہ جو قوتِ عمل کا زمانہ تھا، اس کو کن کاموں میں خرچ کیا، تیسرے یہ کہ ساری عمر میں جو مال اس کو حاصل ہوا وہ کہاں اور کن حلال یا حرام طریقوں سے کمایا، چوتھے یہ کہ مال کو کن جائز یا ناجائز کاموں میں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟“

اللہ تعالیٰ نے غایتِ رحمت و شفقت سے اس امتحان کا پرچہ سوالات بھی پہلے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت کو بتلادیا، اب ان کا کام صرف اتنا رہ گیا کہ ان سوالات کا حل سکھے، اور محفوظ رکھے، امتحان سے پہلے ہی سوالات بتلا دینے کے بعد بھی کوئی ان میں فیل ہو جائے تو اس سے زیادہ کون محروم ہو سکتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام | پہلی آیت میں تو عام انبیاء علیہم السلام کا حال اور ان سے سوال و سے خصوصی سوال و جواب | جواب کا تذکرہ تھا، دوسری آیت میں اور اس کے بعد ختمِ سورت تک کی نو آیات میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور ان پر اللہ تعالیٰ کے مخصوص انعامات کی کچھ تفصیل کا بیان ہے، اور محشر میں اُن سے ایک خصوصی سوال اور اس کے جواب کا ذکر ہے، جو اگلی آیتوں میں آ رہا ہے۔

حاصل اس سوال و جواب کا بھی بنی اسرائیل اور تمام مخلوق کو یہ ہولناک منظر دکھلانا ہے کہ اس میدان میں جب روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے سوال ہوتا ہے کہ آپ کی امت نے جو آپ کو خدا کا شریک بنایا، تو وہ ساری عزت و عظمت اور عصمت و نبوت کے باوجود کس قدر گھبرا کر اپنی براءت بارگاہِ عز و جلال میں پیش فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نہیں بار بار مختلف عنوانات سے اس کی نفی کرتے ہیں کہ میں نے ان کو یہ تعلیم نہ دی تھی، اول عرض کیا: سُبْحَنَكَ مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اَقُولَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ، ”یعنی پاک ہیں آپ میری کیا مجال تھی کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے حق نہ تھا،“

اپنی براءت کا دوسرا پہلو اس طرح اختیار فرماتے ہیں کہ خود حق تعالیٰ کو اپنا گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اگر میں ایسا کہتا تو آپ کو ضرور اس کا علم ہوتا، کیونکہ آپ تو میرے دل کے بھید سے بھی واقف ہیں، قول و فعل کا تو کیا کہنا، آپ تو علام الغیوب ہیں۔ اس ساری تمہید کے بعد اصل سوال کا جواب دیتے ہیں:-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب بارگاہ ایزدی میں
یعنی یہ کہ میں نے اُن کو وہی تعلیم دی تھی جن کا آپ نے مجھے حکم فرمایا تھا، اِنْ اَعْبُدُ وَاللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، پھر اس تعلیم کے بعد جب تک میں ان لوگوں کے اندر رہا تو میں ان کے اقوال و افعال کا گواہ تھا (اُس وقت تک اُن میں کوئی ایسے نہ کہتا تھا) پھر جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو پھر یہ لوگ آپ ہی کی نگرانی میں تھے، آپ ہی ان کے اقوال و افعال سے پورے واقف ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چند ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جس سوال و جواب کا مخصوص انعامات کا ذکر ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے اُن مخصوص انعامات کا بھی ذکر کریں جو خصوصی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مبذول ہوئے، اور بشکل معجزات ان کو عطا فرمایا۔ اس مجموعہ میں ایک طرف انعامات خاصہ کا اور دوسری طرف جواب طلبی کا منظر دکھلا کر بنی اسرائیل کی ان دونوں قوموں کو تنبیہ کی گئی ہے، جن میں سے ایک نے تو ان کی توہین کی اور طرح طرح کی ہمتیں لگائیں اور ستایا، اور دوسری قوم نے ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا دیا، انعامات کا ذکر کر کے پہلی قوم کو اور سوال و جواب کا ذکر کر کے دوسری قوم کو تنبیہ کی گئی، یہاں جن انعامات کا تفصیلی ذکر کئی آیتوں میں کیا گیا ان میں سے ایک جملہ زیادہ قابل غور ہے جس میں ارشاد ہوا ہے: يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهَجِ وَكَهْلًا یعنی ایک خصوصی معجزہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بچے ہونے کی حالت میں بھی کلام کرتے ہیں، اور ادھیڑ عمر ہونے کی حالت میں بھی۔

اس میں پہلی بات کا معجزہ اور خصوصی انعام ہونا تو ظاہر ہے، ابتداء ولادت میں بچے کلام کرنے کے قابل نہیں ہوا کرتے، کوئی بچہ ماں کی گود یا گہوارہ میں بولنے لگے تو یہ اس کا خصوصی مستیاز ہو گا، ادھیڑ عمر میں بولنا یا کلام کرنا جو مذکور ہے وہ تو کوئی قابل ذکر چیز نہیں، ہر انسان اس عمر میں بولا ہی کرتا ہے، اور کلام کرتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصوصی حال پر غور کریں تو اس کا بھی معجزہ ہونا واضح ہو جائے گا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھائے گئے، اب یہاں کے انسانوں سے ان کا کلام کرنا ادھیڑ عمر کو پہنچنے کے بعد جب ہی ہو سکتا ہے جب وہ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں، جیسا کہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے، اور قرآن و سنت کی تصریحات سے ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر میں کلام کرنا بھی بوجہ اس دنیا میں دوبارہ آنے کے معجزہ ہی ہے۔

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْخَوَارِجِ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے

آمِنُوا وَاشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝۱۱۱ إِذْ قَالَ الْخَوَارِجُ لِعِيسَى

ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں ، جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً

مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا

مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُم مِّنْ

آسمان سے بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے ،

قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنَّا وَنَطْمِئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ

بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھا دیں اس میں سے اور مطمئن ہو جا دیں ہمارے دل اور ہم جانیں

قَدْ صَدَّقْتَ وَأَنْتَ وَنَكُونُ عَلَيْهِم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝۱۱۲ قَالَ عِيسَى

کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اس پر گواہ کہا عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ

مریم کے بیٹے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے

تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ ۚ وَارْزُقْنَا

کہ وہ دن عید ہے ہمارے لئے پہلوں اور پچھلوں کے واسطے اور نشانی ہوتیری طرف اور روزی دے ہم کو

وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝۱۱۳ قَالَ اللَّهُ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

اور تو ہی سب بہتر روزی دینے والا ، کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان

عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدَ مَنكُم فَأَيُّ آيَةٍ لَهُ عَدَاةً

تم پر پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا

لَا أَعْدِيَّةَ لَهُ أَحَدٌ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝۱۱۴

جو کسی کو نہ دوں گا جہان میں

بجائے

۱۱۵

خلاصہ تفسیر

اور جبکہ میں نے حواریین کو (انجیل میں تمہاری زبانی) حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لاؤ انھوں نے (جواب میں تم سے) کہا کہ ہم (خدا اور رسول یعنی آپ پر) ایمان لائے اور آپ شاہد رہے کہ ہم (خدا کے اور آپ کے) پورے فرمانبردار ہیں، وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ حواریین نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیک السلام) کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں (یعنی کوئی امر مثل خلافت حکمت ہونے وغیرہ کے اس سے مانع تو نہیں) کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا (پکچا پکایا) نازل فرما دیں آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (مطلب یہ کہ تم تو ایمان دار ہو اس لئے خدا سے ڈرو اور معجزات کی فرمائش سے کہ بے ضرورت ہونے کی وجہ سے خلافت ادب ہے بچو) وہ بولے کہ (ہمارا مقصود بے ضرورت فرمائش کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک مصلحت سے اس کی درخواست کرتے ہیں وہ یہ کہ) ہم (ایک تو) یہ چاہتے ہیں کہ (برکت حاصل کرنے کو) اس میں سے کھائیں اور (دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہمارے دلوں کو (ایمان پر) پورا اطمینان ہو جاوے اور (مطلب اطمینان کا یہ ہے کہ) ہمارا یہ یقین اور بڑھ جاوے کہ آپ نے (دعویٰ رسالت میں) ہم سے سچ بولا ہے (کیونکہ جس قدر دلائل بڑھتے جاتے ہیں دعویٰ کا یقین بڑھتا جاتا ہے) اور (تیسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہم (ان لوگوں کے سامنے جنھوں نے یہ معجزہ نہیں دیکھا) گواہی دینے والوں میں سے ہو جاویں (کہ ہم نے ایسا معجزہ دیکھا ہے تاکہ ان کے سامنے اثبات رسالت کر سکیں، اور ان کی ہدایت کا یہ ذریعہ بن جاوے) عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے (جب دیکھا کہ اس درخواست میں ان کی غرض صحیح ہے تو حقیقتاً سے) دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ (مائدہ) ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اَوَّل (یعنی موجودہ زمانہ میں) ہیں اور جو بعد (کے زمانہ میں آئوالے) ہیں، سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جاوے (حاضرین کی خوشی تو کھانے سے اور درخواست قبول ہونے سے اور بعد والوں کی خوشی اپنے سلف پر انعام ہونے سے، اور یہ غایت تو وہی ہے مؤمنین کے ساتھ) اور (میری پیغمبری پر) آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے، (کہ مؤمنین کا یقین بڑھ جاوے اور منکرین حاضرین یا غائبین پر حجت ہو جاوے اور یہ مقصد مؤمنین وغیرہ سب کے لئے عام ہے) اور آپ ہم کو (وہ مائدہ) عطا فرمائیے، اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ سب کا دینا اپنے نفع کے لئے اور آپ کا

دینا مخلوق کے نفع کے لئے ہے، اس لئے ہم اپنے منافع کو پیش کر کے آپ سے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں (حق تعالیٰ نے جواب میں) ارشاد فرمایا کہ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) میں وہ کھانا (آسمان سے) تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد (اسکی) مباحی مشناسی کرے گا (یعنی اس کے حقوق واجبہ عقلاً و نقلاً ادا نہ کرے گا) تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا اس وقت کے (جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا

معارف مسائل

مؤمن کو معجزات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے (قولہ تعالیٰ) قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ تُوْمِنُونَ، جب حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمان سے مائدہ کے اترنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس سے معلوم ہوا کہ (ایمان دار بندہ کو لائق نہیں کہ وہ اس قسم کی فرمائشیں کرے خدا کو آزمائے، اور اس سے خرق عادت کی چیزوں کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ روزی وغیرہ کو اپنی ذرائع سے طلب کرے جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔

جب نعمت غیر معمولی بڑی ہو (قولہ تعالیٰ) فَإِنِّي آعِنُ بَعْءَ عَذَابِ اللَّهِ أَهْلَ آقَمِنَ تَوَاشِكْرِي كَادِيَالٌ بِي بَرَاهُونَ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمولی سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔

مائدہ آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین حضرات کا اختلاف ہے، چہرہ نرول کے قائل ہیں، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی، اور اگلے دن کے لئے اٹھا کر رکھا، پس بندہ اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے (نحوذ باللہ من غضب اللہ)

اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں سے کھاتے بھی تھے، چہاں قاضی میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لئے رکھ لینا ممنوع تھا۔
(بیان لہترآن)

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي

اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو کہ تمہارا مجھ کو

وَأُخِي إِلَهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ

اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے کہا تو پاس ہے مجھ کو لائق نہیں کہ

أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ

کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا تو جانتا ہی

مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝۱۱۶

جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بیشک تو ہی ہر جان و بالا چھپی باتوں کا

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُ وَاللَّهُ رَبِّي

میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کر اللہ کی جو رب ہے میرا

وَرَبِّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مِمَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۚ فَلَمَّا

اور تمہارا اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان میں رہا ، پھر جب

تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّاقِبُ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

تو نے مجھ کو اٹھالیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا اُن کی اور تو ہر چیز سے

شَهِيدٌ ۝۱۱۷ إِنَّ تَعَذُّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ

خبردار ہے اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو ان کو معاف

فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۱۱۸

کر دے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہو جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفار نصاریٰ کے سنانے کے لئے) فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ ابن مریم (ان لوگوں میں جن کا عقیدہ تثلیث کا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو شریک الوہیت مانتے تھے تو) کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام

(کو) اور میری ماں (حضرت مریم) کو بھی سلام خدا کے معبود قرار دید و تو عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو خود اپنے عقیدہ میں آپ کو (شریک سے) منزہ سمجھتا ہوں (جیسا کہ آپ واقع میں بھی منزہ (پاک) ہیں تو ایسی حالت میں) مجھ کو کسی طرح زیانہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں (نہ باعتبار اپنے عقیدے کے کہ میں موجد یعنی ایک خدا کا قائل ہوں اور نہ باعتبار پیغام الہی پہنچانے کے کہ مجھ کو ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا تھا، اور دلیل میری اس نہ کہنے کی یہ ہے کہ) اگر میں نے (واقع میں) کہا ہو گا تو آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہو گا (مگر جب آپ کے علم میں بھی میں نے نہیں کہا تو واقع میں بھی نہیں کہا اور کہنے کی صورت میں آپ کو اس کا علم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ) آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں (تو جو زبان سے کہتا اس کا علم تو کیوں نہ ہوتا) اور میں (تو مثل دیگر مخلوقات کے اتنا عاجز ہوں کہ) آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو (بدون آپ کے بتلائے ہوئے) نہیں جانتا (جیسے دیگر مخلوقات کا بھی یہی حال ہے پس) تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہی ہیں (سو جب اپنا اس قدر عجز اور آپ کا کمال مجھ کو معلوم ہو تو ان لوگوں میں شرکت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، یہاں تک تو اس بات کے کہنے کی نفی ہوئی، آگے اس کی نفیض کے کہنے کا اثبات ہو کہ) میں نے تو ان سے اور کچھ نہیں کہا، صرف (ہی) (بات) جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، اور یہاں تک تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت کے متعلق عرض کیا، آگے ان لوگوں کی حالت کے متعلق عرض کرتے ہیں کیونکہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوا مِنِّي سُبُحًا تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے یا نہیں، لیکن اشارۃً اس کا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا پس عیسیٰ علیہ السلام اس باب میں یوں عرض کریں گے کہ) میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی اول بار) میں تو زندہ آسمان کی طرف اور دوسری بار میں وفات کے طور پر) تو (اس وقت صرف) آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اس وقت مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں (یہاں تک تو اپنا اور ان کا معاملہ عرض کیا آگے ان کے اور حق تعالیٰ کے معاملات کے متعلق عرض کرتے ہیں کہ) اگر آپ ان کو (اس عقیدہ پر) سزا دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) یہ آپ کے بند ہیں

اور آپ ان کے مالک، اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے) اور اگر آپ ان کو معاف فرمادیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ) آپ زبردست (قدرت والے) ہیں (تو معافی پر بھی قادر ہیں اور) حکمت والے (بھی) ہیں (تو آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی، اس لئے اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہو سکتی، مطلب یہ ہے کہ دونوں حال میں آپ مختار ہیں میں کچھ دخل نہیں دیتا)

(غرض عیسیٰ علیہ السلام نے معروض اول سُبْحَانَكَ الْحَمْدُ میں اپنی تبریٰ ان اہل تہلیل کے عقیدے سے اور اس کی تعلیم سے، دوسری عرض وَكُنْتُ عَلَيْهِمُ الْخَمِيں اپنی تبریٰ ان کے اس عقیدہ کے مفصل بیان تک سے، اور عرض سوم اِنْ تَعَذَّبْهُمْ الْخَمِيں اپنی تبریٰ ان کے باب میں کوئی تحریک کرنے تک سے ظاہر کر دی، اور یہی مقصود تھا حق تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان مخاطبات سے، پس ان میں ان کفار کو پوری زجر اپنی نادانی پر اور حسرت اپنی ناکامی پر ہوگی)۔

معارف و مسائل

فوائد مہمہ | قولہ تعالیٰ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ لِعِيسٰى الْخَمِ، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں، لہذا عیسیٰ علیہ السلام سے سوال اس لئے نہیں فرما رہے کہ ان کو معلوم نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود ان کی قوم نصاریٰ کی ملامت اور سرزنش ہے کہ جس کو تم آئمہ مان رہے ہو وہ خود تمہارے عقیدے کے خلاف اپنی عبدیت کا اقرار کر رہا ہے، اور تمہارے بہتان سے وہ بری ہے (ابن کثیر)

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبُ عَلَيْهِمْ ط حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء وغیرہ کی بحث سورۃ آل عمران میں آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ اَرْفَعُکَ کے تحت گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور رفع الی السماء کے انکار پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ یہ گفتگو قیامت کے روز ہوگی، اور اس وقت آسمان سے نزول کے بعد آپ کو موت حقیقی حاصل ہو چکی ہوگی چنانچہ ابن کثیر نے بروایت ابو موسیٰ اشعری ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں بلائی جائیں گی، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اور ان کو نزدیک کر کے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بیٹے مریم کے اذکر نعمتی

عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ، یہاں تک کہ فرمائے گا یَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ءَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ
أَتَّخِذُ وِلْدًا وَآيَاتِي الْهَيْلَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ، عیسیٰ علیہ السلام انکار کریں گے کہ پروردگار میں
نہیں کہا ہے، پھر نصاریٰ سے سوال ہوگا تو یہ لوگ کہیں گے کہ ہاں اس نے ہم کو یہی حکم دیا تھا،
اس کے بعد ان کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا،

قوله تعالى إِنَّ تَعْنِي بِهِمْ فَأَهْلُهُمْ عِبَادُكَ، یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بیجا سختی نہیں
کر سکتے، اس لئے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہوگی، اور فرض کیجئے معاف
کر دیں تو یہ معافی بھی ازراہ عجز نہ ہوگی، کیونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں، اس لئے
کوئی مجرم آپ کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا، کہ اس پر آپ قابو نہ پاسکیں،
اور چونکہ حکیم (حکمت والے) ہیں، اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع
چھوڑ دیں، بہر حال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا
حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور
استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی، اس لئے حضرت مسیح نے ”عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ کی جگہ ”غَفُورٌ رَحِيمٌ“
وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا، برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں
اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا، رَبِّ اَنْجِنِي مِنْ هَٰذَا ۚ اَصْلَحْتُ مِنْ النَّاسِ فَمَنْ يَنْصَحْنِي
فَاِنَّكَ مَنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَاِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے
آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان میں سے میرے تابع ہو وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی
کی تو پھر تو غفور رحیم ہے) یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ اُن کو توبہ اور رجوع
الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے (فوائد عثمانی)

ابن کثیرؒ نے بروایت ابو ذرؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ
پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے، اور وہ آیت اِنَّ تَعْنِي بِهِمْ فَأَهْلُهُمْ عِبَادُكَ،
ہے، پھر جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ یہی آیت پڑھتے رہے، رکوع
اسی سے اور سجدے اسی سے کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تو فرمایا کہ میں نے اپنے
پروردگار سے اپنے واسطے شفاعت کی درخواست کی تو مجھے عطا فرمائی، اور وہ انشاء اللہ تعالیٰ
ملنے والی ہے، ایسے شخص کے واسطے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو۔
دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے مذکورہ آیت پڑھ کر آسمان کی طرف ہاتھ
اٹھائے اور کہا اَللّٰهُمَّ اُمِّتِي یعنی میرے پاک پروردگار میری امت کی طرف نظر رحمت
فرما، اور آپ رونے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبریل امین رونے کی وجہ دریافت

فرمائی، تو آپ نے جبریل امین کو اپنے مذکورہ قول سے آگاہ کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو پھر جاؤ اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہہ دو کہ ہم عنقریب تیری امت کے بارے میں تم کو رضامند کر دیں گے، اور تم کو ناخوش نہ کریں گے۔

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ

فرمایا اللہ نے یہ دن ہے کہ کام آوے گا سچوں کے ان کا سچ ان کے لئے ہیں

جَنَّاتُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ

باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں گے انہی میں ہمیشہ اللہ

اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۱۱۹

راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے یہی ہے بڑی کامیابی اللہ ہی کے لئے

مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۲۰

سلطنت ہو آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے نیچے ہیں ہو اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

رَبِّطِ آيَاتِ | اور دونوں رکوع میں قیامت کے دن اعمال و احوال کا حساب و کتاب اور سوال و جواب کا ذکر ہے، اب آگے اس تقشیش و محاسبہ کا نتیجہ ذکر کیا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

ان تمام مکالمات مذکورہ کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ یہ (قیامت کا دن) وہ دن ہے کہ جو لوگ (دنیا میں باعتبار عقائد و اعمال اور اقوال کے) سچے تھے رکہ وہ سچا ہونا اب ظاہر ہو رہا ہے، جن میں انبیاء جن سے خطاب ہو رہا ہے اور مؤمنین جن کے ایمان کی انبیاء و ملائکہ سب شہادت دیں گے، سب داخل ہیں اور اس میں اشارہ تصدیقِ رسل و تصدیقِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی ان مخاطبات میں ہو گیا، غرض یہ سب حضرات جو دنیا میں سچے تھے ان کا سچا ہونا (آج) ان کے کام آوے گا (اور وہ کام آنا یہ ہو کہ) ان کو (جنت کے) باغ (رہنے کو) ملیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (اور یہ نعمتیں ان کو کیوں نہ ملیں کیونکہ) اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں (اور جو شخص راضی و مرضی ہو اس کو ایسی ہی نعمتیں ملتی ہیں) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) بڑی بھاری کامیابی ہے (کہ دنیا کی کوئی کامیابی اسکے برابر نہیں ہو سکتی)۔

ربط آیات اب سورت ختم ہونے کو ہے۔ پوری سورت میں کچھ اصولی اور فردعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے آخر میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مالک ہے، اس لئے اسے یہ احکام دینے کا حق ہے۔ اور بندوں کو یہ احکام پوری طرح ماننے چاہئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں، وہ نافرمانی کی صورت میں سزا اور فرماں برداری کی صورت میں انعام دینے پر قادر ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں موجود ہیں، اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

معارف مسائل

فائدہ قَالَ اللَّهُ هَلْ أَيْكُومُ يَنْفَعُ الصَّدَقَاتِينَ صِدْقُهُمْ، عام طور پر واقع کے مطابق قول کو صدق اور خلاف واقع کو کذب سمجھا جاتا ہے، لیکن قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق و کذب عام ہے یعنی قول اور عمل دونوں کو شامل ہے، چنانچہ اس حدیث میں خلاف واقع عمل کو کذب کہا گیا ہے، مَنْ تَعَلَّى بِمَا لَمْ يُؤْطَ كَانَ كَلَامًا بِسِ تَوْبَىٰ زُورًا (مشکوٰۃ) یعنی اگر کوئی اپنے آپ کو ایسے زیور سے آراستہ کرے جو اس کو نہیں دیا گیا، یعنی کسی ایسی صفت یا عمل کا دعویٰ کرے جو اس میں نہیں ہے تو گویا اس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہنے، ایک دوسری حدیث میں علانیہ اور تہناتی میں اچھی طرح نماز پڑھنے والے کو سچا بندہ کہا گیا ہے، ارشاد ہے:

یعنی جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہو اور وہ تہناتی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہو تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچ بچ بندہ ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا صَلَّى فِي الْعَلَانِيَةِ
فَأَحْسَنَ وَصَلَّى فِي السِّرِّ أَحْسَنَ
قَالَ اللَّهُ تَعَالَى هَذَا عَبْدِي
حَقَّارًا (مشکوٰۃ)

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ، یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بڑی نعمت یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہوا اب کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔

ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، یعنی یہی بڑی کامیابی ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہوگی کہ مالک خالق جل جلالہ راضی ہیں؟
قَبْلَهُ الْحَمْدُ أَوَّلًا وَآخِرًا

سورہ مائدہ تمام شد

سُورَةُ الْاِنْعَامِ

سُورَةُ النَّعَامِ

سُورَةُ النَّعَامِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَتَانِ وَخَمْسُونَ آيَةً وَعِشْرُونَ رُكُوعًا

سورۃ النعام مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو پینسٹھ آیتیں ہیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور بنایا

الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ①

اندھیرا اور اجالا پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ ادوروں کو برابر کئے دیتے ہیں

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلَكُمْ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کر دیا ایک وقت اور ایک مدت مقرر ہے

عِنْدَهُ ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ ② وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي

اللہ کے نزدیک پھر بھی تم شک کرتے ہو اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور

الْأَرْضِ يَخْلُكُم مِّنْ بَيْنِ يَدَيْكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ③

زمین میں جانتا ہے تمہارا چھپا اور کھلا اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا

اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے مگر کرتے ہیں اس

مُعْرِضِينَ ④ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ

سے تغافل سو بیشک جھٹلایا انھوں نے حق کو جب ان تک پہنچا سو اب

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ ۝

آئی جاتی ہے ان کے آگے حقیقت اس بات کی جس پر ہنستے تھے

خلاصہ تفسیر

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا پھر بھی کافر لوگ (عبادت میں دوسروں کو) اپنے رب کی برابر قرار دیتے ہیں وہ (اللہ) ایسا ہی جس نے تم (سب) کو (بواسطہ آدم علیہ السلام کے) مٹی سے بنایا پھر (تمہاری مرنے کا) ایک وقت معین کیا، اور دوسرا وقت معین (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا) خاص اللہ ہی کے نزدیک (معلوم) ہے، پھر بھی تم (میں سے بعض) شک رکھتے ہو کہ قیامت کو محال سمجھتے ہو حالانکہ جس نے اول حیات بخشی دوبارہ دینا اس کو کیا مشکل ہے) اور وہی ہی معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی (یعنی اور سب معبود باطل ہیں) وہ تمہارے پوشیدہ حالات کو بھی اور تمہارے ظاہر حالات کو بھی (یکساں) جانتے ہیں اور (بالخصوص) تم جو کچھ ظاہر یا باطناً عمل کرتے ہو (جس پر جزاء و سزا کا مدار ہے) اس کو جانتے ہیں اور ان (کفار) کے پاس کوئی نشانی بھی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آئی، مگر وہ اس سے اعراض ہی کیا کرتے ہیں، سو (چونکہ یہ ان کی عادت بنی ہوئی ہے) انہوں نے اس سچی کتاب (قرآن) کو بھی جھوٹا بتلایا جبکہ وہ ان کے پاس پہونچی سو (ان کی یہ تکذیب خالی نہ جائے گی بلکہ) جلد ہی ان کو خبر مل جاوے گی اس چیز کی جس کے ساتھ یہ لوگ استہزاء کیا کرتے تھے (مراد اس سے عذاب ہو جس کی خبر قرآن میں سنکر ہنستے تھے، اور اس کی خبر ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جب عذاب نازل ہوگا تو اس خبر کی تصدیق آنکھوں سے دیکھ لیں گے)

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورۃ النعام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری سورت بجز چند آیات کے بیک وقت مکہ میں اس طرح نازل ہوئی ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے تھے، ائمہ تفسیر میں سے مجاہد، کلبی، قتادہ وغیرہ کا بھی تقریباً یہی قول ہے۔
ابو اسحاق اسفرائینی نے فرمایا کہ یہ سورت توحید کے تمام اصول و قواعد پر مشتمل ہے

اس سورۃ کو کلمۃ الْحَمْدُ یُثَبِّتُہ سے شروع کیا گیا، جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور مراد اس خبر سے لوگوں کو حمد کی تعلیم دینا ہے، اور تعلیم کے اس طرز خاص میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی کی حمد و تعریف کا محتاج نہیں، کوئی حمد کرے یا نہ کرے وہ اپنے ذاتی کمال کے اعتبار سے خود بخود محمود ہے، اس جملہ کے بعد آسمان و زمین اور اندھیرے، اجالے کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا کہ اس کے محمود ہونے کی دلیل بھی بتلا دی کہ جو ذات اس عظیم قدرت و حکمت کی حامل ہے وہی حمد و تعریف کی مستحق ہو سکتی ہے۔

اس آیت میں سَمَوَاتٍ کو جمع اور اَرْضٍ کو مفرد ذکر فرمایا ہے، اگرچہ دوسری آیت میں آسمان کی طرح زمین کے بھی سات ہونے کا ذکر موجود ہے، شاید اس میں اس طرح اشارہ ہو کہ سات آسمان اپنی ہیئت و صورت اور دوسری صفات کے اعتبار سے باہم بہت مستیاز رکھتے ہیں، اور ساتوں زمینیں ایک دوسرے کی ہمشکل اور مثل ہیں، اس لئے ان کو مثل ایک عدد کے قرار دیا گیا (منظری)۔

اسی طرح ظُلُمَاتٍ کو جمع اور نُورٌ کو مفرد ذکر فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نور تعبیر ہے صحیح راہ اور صراطِ مستقیم سے اور وہ ایک ہی ہے، اور ظُلُمَاتٍ تعبیر ہے غلط راستہ کی، اور وہ ہزاروں ہیں (منظری و بحر محیط)۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسمانوں اور زمین کے بنانے کو لفظ خَلَقَ سے تعبیر کیا گیا ہو اور اندھیرے اُجالے بنانے کو لفظ خَلَقَ سے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اندھیرا اور اجالا، آسمان و زمین کی طرح مستقل قائم بالذات چیزیں نہیں، بلکہ عوارض اور صفات میں سے ہیں، اور ظُلُمَاتٍ کو نور پر مقدم شاید اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ اس جہان میں اصل ظلمت ہے، اور نور خاص خاص چیزوں سے وابستہ ہے، جب وہ سامنے ہوتی ہیں روشنی پیدا ہوتی ہے، جب نہیں ہوتیں تو اندھیرا رہتا ہے۔

مقصود اس آیت کا توحید کی حقیقت اور اس کی واضح دلیل کو بیان فرما کر دنیا کی ان تمام قوموں کو تنبیہ کرنا ہے جو یا تو سرے سے توحید کی قائل نہیں، یا قائل ہونے کے باوجود توحید کی حقیقت کو چھوڑ بیٹھی ہیں۔

مجوس دنیا کے دو خالق مانتے ہیں یزدان اور اہرمین، یزدان کو خالق خیر اور اہرمین کو خالق شر قرار دیتے ہیں، اور انہی دونوں کو نور و ظلمت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدا کا شریک بتاتے ہیں، آریہ سماج توحید کے قائل ہونے کے باوجود روح و مادہ کو قدیم اور خدا تعالیٰ کو قدرت و خلقت کے

آزاد قرار دے کر توحید کی حقیقت سے ہٹ گئے، اسی طرح نصاریٰ توحید کے قائل ہونے کے تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو خدا تعالیٰ کا شریک و ہم بنانے لگے، اور پھر عقیدہ توحید کو تھامنے کے لئے ان کو ایک تین اور تین ایک کا غیر معقول نظریہ تہستیار کرنا پڑا، اور عرب کے مشرکین نے تو خدائی کی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ ہر پہاڑ کا ہر پتھر ان کے نزدیک نوع انسانی کا معبود بن سکتا تھا، غرض انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا مراتب اور اشرف المخلوقات بنایا تھا یہ جب راہ سے بھٹکا تو اس نے نہ صرف چاند، سورج، اور ستاروں کو بلکہ آگ، پانی اور درخت، پتھر یہاں تک کہ کیڑوں مکوڑوں کو اپنا معبود اور حجتِ رواہ مشکل کشا بنالیا۔

قرآن کریم نے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کا خالق اور اندھیرے اُجالے کا بنانے والا بتلا کر ان سب غلط خیالات کی تردید کر دی، کہ نور و ظلمت اور آسمان و زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہیں، تو پھر ان کو کیسے خدا تعالیٰ کا شریک و ہم بن کیا جاسکتا ہے۔

پہلی آیت میں عالم کبیر یعنی پوری دنیا کی عظیم ترین چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق و محتاج بتلا کر انسان کو صحیح عقیدہ توحید کا سبق دیا گیا ہے، اس کے بعد دوسری آیات میں انسان کو بتلایا ہے کہ تیرا وجود خود ایک عالم صغیر ہے، اگر اسی کی ابتداء و انتہاء اور بود و باش پر نظر کرے تو عقیدہ توحید ایک واضح حقیقت بن کر سامنے آجائے، اس میں ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا، یعنی اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی کے خمیر سے پیدا فرما کر ان میں جان ڈال دی، اور عام انسانوں کی غذا مٹی سے نکلتی ہے، غذا سے نطفہ، اور نطفہ سے انسان کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ شعری فرماتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک خاص مقدار سے پیدا فرمایا جس میں پوری زمین کے اجزاء شامل کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم، رنگ و روپ اور اخلاق و عادات میں مختلف ہیں، کوئی کالا کوئی گورا، کوئی سرخ، کوئی سخت کوئی نرم، کوئی پاکیزہ خلقت کوئی خبیث طبع ہوتا ہے، (منظری بروایت ابن عدی بسند حسن)

یہ تو انسان کی ابتداء و آفرینش کا ذکر تھا اس کے بعد انتہاء کی دو منزلوں کا ذکر ہے، ایک انسان کی شخصی انتہاء جس کو موت کہا جاتا ہے، دوسری پوری نوع انسانی اور اس کے کائناتی خادموں سب کے مجموعہ کی انتہاء، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، انسان کی شخصی انتہاء

کے لئے فرمایا، ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا، یعنی انسان کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی بقا و حیات کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی، اس میعاد پر پہنچنے کا نام موت ہی، جس کو اگرچہ انسان نہیں جانتا مگر اللہ کے فرشتے جانتے ہیں، بلکہ خود انسان بھی اس حیثیت سے اپنی موت کو جانتا ہے کہ ہر وقت ہر جگہ اپنے گرد و پیش میں اولادِ آدم کو مرتے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد پورے عالم کی انتہاء یعنی قیامت کا ذکر اس طرح فرمایا وَ أَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَکَ، یعنی ایک اور میعاد مقرر ہے، جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی میعاد کا پورا علم نہ کسی فرشتہ کو ہے نہ کسی انسان کو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پہلی آیت میں عالم اکبر یعنی پوری دنیا کا حال یہ بتلایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی ہے، اور دوسری آیت میں اسی طرح عالم اصغر یعنی انسان کا مخلوق خداوندی ہونا بیان فرمایا، پھر انسان کو غفلت سے چونکانے کے لئے یہ بتلایا کہ ہر انسان کی ایک خاص عمر ہے جس کے بعد اس کی موت یقینی ہے، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مشاہدہ ہر انسان کو اپنے گرد و پیش میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے، وَ أَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَکَ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ انسان کی شخصی موت سے پورے عالم کی عمومی موت یعنی قیامت پر استدلال ایک فکری اور طبعی امر ہے، اس لئے قیامت کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس لئے آخر آیت میں بطور استبعاد کے فرمایا، ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ، یعنی ایسے واضح دلائل کے باوجود تم قیامت کے بارے میں شبہات و شکوک نکالتے ہو۔

تیسری آیت میں پہلی دو آیتوں کے مضمون کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جو آسمانوں اور زمین میں لائق عبادت و اطاعت ہے، اور وہی تمھارے ظاہر و باطن کے ہر حال اور ہر قول و فعل سے پورا واقف ہے۔

چوتھی آیت میں غفلت شعار انسان کی ہٹ دھرمی اور خلافِ حق ضد کی شکایت اس طرح فرمائی گئی ہے کہ: وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کے باوجود منکر انسانوں نے بے پروائی اختیار کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی نشانی ان کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں، اس میں ذرا غور نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں اسی غفلت شعاری کی مزید تفصیل بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے بیان فرمائی ہے کہ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ، یعنی جب حق اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے حق کو جھٹلادیا، حق سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذات اقدس بھی۔

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً عمر سے آخر تک اپنی قبائل عرب کے درمیان رہے، بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا اپنی کی آنکھوں کے سامنے آیا، ان کو یہ بھی پوری طرح واضح تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان سے مطلقاً کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، یہاں تک کہ اپنا نام بھی خود نہ لکھتے تھے، پورے عرب میں آپ کا لقب اُمّی مشہور تھا، چالیس سال کی عمر اسی حال میں ان کے درمیان گزری، کہ نہ کبھی شعر شاعری سے دلچسپی ہوئی نہ کبھی کوئی علم و تعلیم سے مناسبت ہوئی، پھر چالیس سال پورے ہوتے ہی دفعۃً آپ کی زبان مبارک سے وہ حقائق و معارف اور علوم و فنون جاری ہو گئے کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہر فلاسفہ بھی ان کے سامنے عاجز نظر آتے، عرب کے تمام فصحاء و بلغاء کو اپنے لئے ہوتے کلام کا مقابلہ کرنے کے لئے چیلنج دیا، یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست دینے کے لئے اپنی جان و مال عزت و آبرو، اولاد و خاندان سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہر وقت تگہ رہتے تھے، ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس چیلنج کو قبول کر کے قرآن کی ایک آیت کی مثال ہی پیش کر دیتے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا اپنا وجود خود حقانیت کی بہت بڑی نشانی تھی، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہزاروں معجزات اور کھلی کھلی نشانیاں ایسی ظاہر ہوئیں جس کا انکار کوئی صحیح الحواس انسان نہیں کر سکتا، مگر ان لوگوں نے ان ساری نشانیوں کو یکسر جھٹلادیا، اسی لئے اس آیت میں ارشاد فرمایا: فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ۔

آخر آیت میں ان کے کفر و انکار اور تکذیب کے انجام بد کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا يَسْتَهْزِئُونَ، یعنی آج تو یہ انجام سے غافل لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کی لائی ہوئی ہدایات اور قیامت و آخرت سب کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب یہ سارے حقائق ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، قیامت قائم ہوگی، ایمان و عمل کا حساب دینا ہوگا، اور ہر شخص اپنے کئے کی جزاء و سزا پائے گا، مگر اس وقت کا یقین و اقرار ان کے کام نہ آئے گا، کیونکہ وہ روزِ عمل نہیں بلکہ روزِ جزاء ہوگا، ابھی غور و فکر کی فرصت خدا تعالیٰ نے دے رکھی ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر آیاتِ الہیہ پر ایمان لانے ہی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي

کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے اُنہیں جس کو جمادیا تھا ہم نے

الْاَرْضِ مِمَّا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا

ملک میں اتنا کہ جتنا تم کو نہیں جمایا اور چھوڑ دیا ہم نے اُن پر آسمان کو لگاتار برستا ہوا،

وَجَعَلْنَا الْاَرْضَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَاهْلَكْنَاهُمْ يَوْمَ يُغْمَرُ

اور بنادیں ہم نے نہریں بہتی ہوئی ان کے نیچے پھر ہلاک کیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر

وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ

اور پیدا کیا ہم نے ان کے بعد اور امتوں کو اور اگر اتاریں ہم تجھ پر

كِتَابًا فَاِذَا قَرَأْتَ فَلَسَوْهُ بِاَيِّدِيهِمْ لَقَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

لکھا ہوا کاغذ میں پھر چھو لیوں وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر

اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ وَقَالُوا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ

یہ نہیں ہے مگر صریح جادو ، اور کہتے ہیں کیوں نہیں اُترا اُس پر کوئی

مَلَكٌ ۝۸ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّفُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يَنْظُرُوْنَ ۝۹

فرشتہ اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جائے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے ،

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِ مِمَّا

اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں

يَلْبَسُوْنَ ۝۹ وَلَقَدْ اَسْتَهْزِئُ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ

اب پڑ رہے ہیں ، اور بلاشبہ ہنسی کرتے رہے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر گھبر لیا

بِالَّذِيْنَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِئُوْنَ ۝۱۰ وَنُفِثَ

ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز نے کہ جس پر ہنسا کرتے تھے ، تو کہہ دے

سَيُّرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ اَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

کہ سیر کرو ملک میں پھر دیکھو کیا انجام ہوا

الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱

جھٹلانے والوں کا

خلاصہ تفسیر

کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو (عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت (جسمانی اور مالی) دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں اور ہم نے ان کے (کھیت اور باغوں کے) نیچے سے نہریں جاری کیں (جس سے زراعت اور پھلوں کی خوب ترقی ہوئی اور وہ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے) پھر اس قوت و قدرت اور سامان اسباب کے ہوتے ہوئے ہم ان کو ان کے گناہوں کے سبب (انواع عذاب سے) ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کر دیا (تو اگر تم پر بھی عذاب نازل کر دیں تو تعجب کیا ہے اور ان لوگوں کے عناد کی یہ حالت ہے کہ) اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ پر نازل فرمائے، پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے (جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا کہ لکھی ہوئی کتاب آسمان سے آجائے اور ہاتھوں سے چھو لینے کا ذکر کر کے نظر بند کی کے شبہ کو بھی دُور کر دیا) تب بھی یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے (کیونکہ جب بات ماننے کا ارادہ ہی نہیں تو ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نئی بات نکال لینا کیا مشکل ہے) اور یہ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے پاس کوئی فرشتہ (جس کو ہم دیکھیں اور باتیں سنیں) کیوں نہیں بھیجا گیا (حق تعالیٰ فرماتے ہیں) اور اگر ہم کوئی فرشتہ (اسی طرح) بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا پھر (نزول فرشتہ کے بعد) ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی (کیونکہ عادت الہیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا منہ مانگا معجزہ دکھلا دیا گیا اگر پھر بھی انھوں نے ایمان سے انکار کیا تو فوراً بلا مہلت کے عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا ہے اور جب تک ایسا مطلوبہ معجزہ نہ دیکھیں دنیا میں مہلت ملتی رہتی ہے) اور اگر ہم اس (پیغام پہنچانے والے) کو فرشتہ ہی قرار دیتے تو اس کو بہ شکل فرشتہ بھیجیں تو اسکی ہیبت انسانوں سے برداشت نہ ہو، اس لئے ہم اس (فرشتہ) کو آدمی ہی (کی شکل) بناتے تو اس پر بھی وہی شبہ کرتے جواب کر رہے ہیں (یعنی اس فرشتہ کو بشر سمجھ کر پھر بھی اعتراض کرتے، غرض نزول فرشتہ جس کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اگر اس کو پورا کر دیا جائے تو ان کو اس سے کوئی فائدہ تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ فرشتہ بشکل فرشتہ دیکھنے پر ان کو قدرت نہیں، اور بشکل انسان بھیجنے سے ان کا شبہ رفع نہیں ہوگا، اور دوسری طرف ان کو نقصان یہ پہنچے گا کہ نہ ماننے پر خود ہی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے) اور آپ ان کے بیہودہ مطالبات سے غم نہ کریں کیونکہ (واقعی آپ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں

ان کے ساتھ بھی (مخالفین کی طرف سے) ہتھڑا کیا گیا ہے، پھر جن لوگوں نے ان سے تمسخر کیا تھا انکو اس عذاب نے آگھیرا جس کا تمسخر اڑاتے تھے (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس طرزِ عمل سے انبیاء کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ یہ خود انہی کے لئے عذاب اور مصیبت ہو رہی ہے) اگر یہ لوگ ایم سابقہ کے عذاب کا انکار کرنے لگیں، تو آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں احکامِ الہیہ اور تعلیماتِ رسل سے اعراض کرنے یا مخالفت کرنیوالوں پر وعید شدید کا ذکر تھا، ان آیات میں انہی منکرین کا رخ اپنے گرد و پیش کے حالات اور اگلے زمانہ کے تاریخی واقعات کی طرف پھیر کر ان کو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ بلاشبہ تاریخِ عالمِ عبرتوں کی ایک کتاب ہے، جس کو اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے، تو وہ ہزاروں وعظوں سے زیادہ مؤثر و عظیم ہے، ایک حکیم کا یہ جملہ بہت ہی پسندیدہ ہے کہ: ”دنیا ایک بہترین کتاب ہے، اور زمانہ بہترین معلم“ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا عنصر قصص اور تاریخ ہے، لیکن عام طور پر غفلت شعار انسان نے دنیا کی تاریخ کو بھی ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ اس وعظ و حکمت کی بہترین کتاب کو بھی اپنی غفلت و معصیت کا ایک ذریعہ بنا لیا، پچھلے قصوں اور کہانیوں کا یا تو صرف یہ کام رہ گیا کہ نیند سے پہلے ان کو خواب آور دوا کے قائم مقام استعمال کیا جائے، اور یا پھر خالی اوقات میں دل بہلانے اور وقت گزارنے کا مشغلہ بنایا جائے۔

شاید اسی لئے قرآن کریم نے تاریخِ عالم کی روح کو عبرت و نصیحت کے لئے لیا ہے، مگر عام دنیا کی تاریخی اور افسانوی کتابوں کی طرح نہیں، جن میں قصہ گوئی یا تاریخ نگاری خود ہی ایک مقصد ہوتا ہے، اسی لئے تاریخی واقعات کو مسلسل قصہ کی صورت سے بیان نہیں فرمایا، بلکہ قصہ کا جتنا ٹکڑا جس معاملہ اور جس حال سے متعلق تھا وہاں اتنا ہی ٹکڑا ذکر کر دیا، پھر کسی دوسری جگہ اس قصہ کا دوسرا ٹکڑا وہاں کی مناسبت کے بیان فرما دیا، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خبر یا قصہ کبھی خود مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ہر خبر سے کوئی انشاء اور ہر واقعہ کے اظہار سے کوئی عملی نتیجہ نکالنا مقصد ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا جتنا حصہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے اس کو پڑھو، اور آگے بڑھو اور اپنے حالات کا جائزہ لو، اور واقعاتِ ماضیہ سے سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کرو

آیت متذکرہ میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ مخاطب یعنی اہل مکہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ کیا ان لوگوں نے اپنے سے پہلے گزرنے والی قوموں کا حال نہیں دیکھا جس سے ان کو عبرت و نصیحت ہوتی، اور دیکھنے سے مراد ان کے حال پر غور و فکر کرنا ہے، کیونکہ وہ قومیں اُس وقت تو ان کے سامنے نہیں تھیں جن کو وہ دیکھ سکتے، اس کے بعد اگلی قوموں کی ہلاکت و بربادی کا ذکر فرمایا، كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ، یعنی ہم نے ان سے پہلے کتنے قرون کو ہلاک کر دیا۔

لفظ قرن اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانہ میں مجتمع موجود ہو، اور زمانہ کے ایک طویل حصہ کو بھی جس کے بارے میں مثل سال سے لے کر سو سال تک کے مختلف اقوال ہیں، مگر بعض واقعات و روایات حدیث سے تائید اس کی ہوتی ہے کہ لفظ قرن سو سال کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن بشر مازنی کو فرمایا تھا کہ تم ایک قرن زندہ رہو گے، اور وہ پورے ایک سو سال زندہ رہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو دعا دی کہ قرن بھر زندہ رہو تو وہ پورے سو سال زندہ رہا، اکثر حضرات علماء نے حدیث خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَكُونُ نَفْسُهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَكُونُ نَفْسُهُمْ، کا یہی مطلب قرار دیا ہے، کہ ہر قرن کو سو سال مانا گیا۔ اس آیت میں گزشتہ اقوام عالم کے بارے میں پہلے یہ بتلایا گیا کہ ان کو حق تعالیٰ زمین میں وہ وسعت و قوت اور سامان معیشت عطا فرمایا تھا، جو بعد کے لوگوں کو نصیب بھی نہیں ہوا، لیکن جب انہی نے رسولوں کی تکذیب اور احکام خداوندی کی مخالفت اختیار کی تو یہ سارا جاہ و جلال اور مال و منال اللہ کے عذاب کے سامنے بیکار ثابت ہوا، اور سب کچھ سب نیست و نابود ہو کر رہ گئے، تو آج کے مخاطب اہل مکہ جن کو نہ عار و نہود جیسی قوت و طاقت حاصل ہے، نہ اہل شام و یمن جیسی خوش حالی ان کو اقوام ماضیہ کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا اور اپنے افعال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ مخالفت کر کے ان کا کیا انجام ہوگا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَأَنشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ، یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہیں تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور ڈیل ڈول و قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک و برباد کر دیا، بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی اُن کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر کے ایسی طرح بسا دیا کہ دیکھنے والوں کو یہ بھی محسوس نہ ہو سکا کہ یہاں سے کوئی انسان کم بھی ہوا ہے۔

اور حق جل و علا شانہ کی اس قدرت و حکمت کا مشاہدہ تو ویسے بھی ہر زمانہ ہر وقت میں

ہوتا رہتا ہے کہ روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر کہیں خلا نظر نہیں آتا کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں کے آدمی ہلاک ہو گئے تو اس میں بسنے والے نہ رہے۔

خدا جانے یہ دنیا جہلہ گاہِ ناز ہے کس کی؟

ہزاروں اٹھ گئے رونق دہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدانِ عرفات میں جہاں تقریباً دس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا اس طرف نظر گئی کہ آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے اس سالے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے جن کا آج نام و نشان نہیں ہے، اس طرح انسانوں کے ہر اجتماع اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو جب اس کے ماضی و مستقبل کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک بہت ہی مؤثر و اعظا نظر آتا ہے، فقبارک اللہ حسن الخالقین۔

دوسری آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی، کہ عبداللہ بن ابی اُمیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ میں تو آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ آسمانیں چڑھ جائیں، اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک کتاب لے کر آئیں، جس میں میرا نام لے کر یہ ہو کہ میں آپ کی تصدیق کروں، اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں میں تو جب بھی مسلمان ہوتا نظر نہیں آتا۔

اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ پھر یہی صاحبِ مسلمان ہوئے اور ایسے ہوئے کہ اسلام کے غازی بن کر غزوہ طائف میں شہید ہوئے۔

قوم کے ایسے بیجا معاندانہ مطالبات اور استہزاء کے رنگ میں مکالمات نے ماں باپ زیادہ شفیق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر کیا اثر کیا ہوگا، اس کا صحیح اندازہ ہم نہیں کر سکتے، صرف وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس کو قوم کی صلاح و فلاح کی فکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لگی ہو۔

اسی لئے اس آیت میں آپ کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا گیا کہ ان کے یہ مطالبات کسی غرض اور مقصد کے لئے نہیں، نہ اُن کو عمل کرنا مقصود ہے، اُن کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ یہ طلب کر رہے ہیں اگر اس سے بھی زیادہ واضح صورتیں آپ کی سچائی کی ان کے سامنے آجائیں، جب بھی قبول نہ کریں، مثلاً ہم اُن کی فرمائش کے مطابق آسمان سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتار دیں اور صرف یہی نہیں کہ وہ آنکھوں سے دیکھ لیں جس میں نظر بندی یا جادو وغیرہ کا احتمال ہے، بلکہ وہ اس کتاب کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیں کہ محض خیال نہیں

حقیقت ہے، مگر چونکہ ان کی ساری باتیں محض عناد کی وجہ سے ہیں تو پھر بھی یہی کہیں گے کہ
 اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ، ”یعنی یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“

تیسری آیت کے نزول کا بھی ایک واقعہ ہے کہ یہی عبداللہ بن ابی امیہ اور نصر بن حارث
 اور نوفل بن خالد ایک مرتبہ جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے
 اور یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہم تو آپ پر جب ایمان لائیں گے جب کہ آپ آسمان سے ایک
 کتاب لے کر آئیں، اور اس کے ساتھ چار فرشتے آئیں جو اس کی گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ ہی
 کی طرف سے آئی ہے اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کا جواب حق تعالیٰ نے ایک تو یہ دیا کہ یہ غفلت شعار ایسے مطالبات کر کے اپنی
 موت و ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ قانون الہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی پیغمبر
 سے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیا
 جائے، تو اگر وہ پھر بھی ماننے اور اسلام لانے میں ذرا تاخیر کریں تو پھر ان کو عذاب عام
 کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا ہے، یہ قوم اہل مکہ بھی یہ مطالبہ کسی نیک نیتی سے تو کرتے رہی
 تھی، جس سے مان لینے کی توقع کی جاتی، اس لئے فرمایا: کُوْا اَنْتُمْ لَنَا مَلٰٓئِكًا تَقْصُوْنَ الْاَمُوْرَ
 ثُمَّ لَا يَنْظُرُوْنَ، یعنی اگر ہم ان کا مانگا ہوا معجزہ دکھلا دیں کہ فرشتہ بھیج دیں اور یہ قوم
 ماننے والی تو ہے نہیں، تو اس معجزہ کے دیکھنے کے بعد بھی جب خلاف ورزی کرے گی تو
 اللہ کا حکم ان کے ہلاک کرنے کے لئے جاری ہو جائے گا، اور اس کے بعد ان کو ذرا بھی
 ہمت نہ دی جائے گی، اس لئے ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی مانگی ہوئی کوئی نشانی اگر ظاہر
 نہیں کی گئی تو اس میں ان کی خیر ہے۔

اسی بات کا ایک دوسرا جواب چوتھی آیت میں دوسرے انداز سے یہ دیا گیا کہ یہ
 سوال کرنے والے عجیب بیوقوف ہیں کہ فرشتوں کے نازل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ
 فرشتوں کے نازل ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی ہیئت و صورت
 میں سامنے آجائے تو اس کی ہیئت کو تو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ ہول کھا کر
 فوراً مر جانے کا خطرہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ بشکل انسانی آئے، جیسے جبریل امین نبی کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم کے پاس بہت مرتبہ بشکل انسانی آئے ہیں، تو اس صورت میں اس سوال کرنے والے
 کو جو اعتراض آپ پر ہے وہی اس فرشتہ پر بھی ہوگا، کہ یہ اس کو ایک انسان ہی
 سمجھے گا۔

ان تمام معاندانہ سوالات کے جواب دینے کے بعد پانچویں آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہتھڑاؤ تمسخر اور ایذا رسانی کا معاملہ جو آپ کی قوم آپ کے ساتھ کر رہی ہے کچھ آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ سے پہلے بھی سب سولہ کو ایسے دلدوز اور ہمت شکن واقعات سے سابقہ پڑا ہے، مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری، اور انجام یہ ہوا کہ ہتھڑاؤ تمسخر کرنے والی قوم کو اس عذاب نے آپکڑا جس کا تمسخر کیا کرتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ احکام ہے، وہ کر کے آپ اپنے قلب کو فارغ فرمایا اس کا اثر کسی نے کچھ لیا یا نہیں، اس کی نگہداشت آپ کے ذمہ نہیں، اس لئے اس میں مشغول ہو کر آپ قلب کو مغموم نہ کریں۔

قُلْ لِّمَن مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلُودٌ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِہٖ

پوچھ کہ کس کا ہے جو کچھ کہ ہر آسمانوں اور زمین میں کہہ دے اللہ کا کہ اس نے لکھی ہو اپنے

الرَّحْمَۃَ لِيَجْمَعَ بَکُمُ الْیَوْمَ الْقَیۡمَۃَ لَا رَیۡبَ فِیہِۚ الَّذِیۡنَ

ذمہ ہر بانی البتہ تم کو اکٹھا کر دے گا قیامت کے دن تک کہ اس میں کچھ شک نہیں جو لوگ

خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی

نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو وہی ایمان نہیں لاتے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آرام پکڑتا ہے

الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَہُوَ السَّمِیۡعُ الْعَلِیۡمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ

رات میں اور دن میں اور وہی ہر سب کچھ سننے والا جاننے والا تو کہہ دے کیا اور کسی کو بناؤں اپنا

وَلِیًّا فَاَطِیۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَہُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ

بدو گار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا

قُلْ اِنِّیۡ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوۡنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَکُوۡنَنَّ

کہہ دے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں اور تو ہرگز نہ ہو

مِنَ الْمُشْرِکِیۡنَ ﴿۱۴﴾

شُرک والا

خلاصہ تفسیر

آپ (ان مخالفین سے بطور الزام حجت کے) کہتے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود

یہ سب کس کی ملک ہو؟ تو وہ بھی یہی جواب دیں گے جس سے توحید ثابت ہوگی، اور اگر کسی وجہ سے مثل خوف مغلوبیت کے جواب نہ دیں تو آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ ہی کی ملک ہو اور ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے توبہ کرنے والوں کے ساتھ (جہربانی فرمانا اپنے ذمہ لازم فرمایا ہے) اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر تم نے توحید کو قبول نہ کیا تو پھر سزا بھی بھگتنا پڑے گی، کیونکہ تم کو خدا تعالیٰ قیامت کے روز (قبروں سے زندہ اٹھا کر میدانِ حشر میں) جمع کریں گے (اور قیامت کی حالت یہ ہے کہ) اس کے آنے میں کوئی شک نہیں (مگر) جن لوگوں نے اپنے کو (یعنی اپنی عقل و نظر کو) ضائع (یعنی معطل) کر لیا ہے، سو وہ ایمان نہ لادیں گے (اور ان سے بطور اتمامِ حجت یہ بھی کہتے کہ) اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ رات میں اور دن میں رہتے ہیں (اس کے اور اس سے پہلی آیت قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ کے مجموعہ کا حاصل یہ نکلا کہ جتنی چیزیں کسی مکان میں ہیں یا کسی زمان میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں) اور وہی سب سے بڑا ستنے والا جاننے والا ہے (پھر اثباتِ توحید کے بعد ان سے کہتے کہ کیا اللہ کے سوا جو کہ آسمان اور زمین کے پیدا کر نیوالے ہیں اور جو سب کو کھانا کھلاتے ہیں اور ان کو کوئی انہیں کھلاتا؟ کیونکہ وہ کھانے پینے کی احتیاج سے بالاتر ہیں، تو کیا ایسے اللہ کے سوا) کسی کو اپنا معبود قرار دوں (آپ اس استفہامِ انکاری کی تشریح میں خود) فرمادیجئے (کہ میں غیر اللہ کو معبود کیسے قرار دے سکتا ہوں جو عقل و نقل کے خلاف ہے) مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں اسلام قبول کر لوں (جس میں عقیدہ توحید بھی آگیا) اور (مجھ کو یہ کہا گیا کہ) تم مشرکین میں سے ہرگز نہ ہونا۔

معارف و مسائل

آیت قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ میں کفار سے سوال کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور ان کی تمام کائنات کا مالک کون ہے؟ پھر خود ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ سب کا مالک اللہ ہے، کفار کے جواب کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی جواب دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جواب کفار کے نزدیک بھی مسلم ہے وہ اگرچہ شرک بت پرستی میں مبتلا تھے مگر زمین و آسمان اور کل کائنات کا مالک اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ میں لفظ الیٰی یا تو فی کے معنی میں ہے، اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب اولین و آخرین کو قیامت کے دن میں جمع فرمادیں گے، اور یا جمع فی القبور مراد ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت تک سب انسانوں کو قبروں میں

جمع کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ روز قیامت میں سب کو زندہ کریں گے (قرطبی)
 کُتِبَ عَلَی نَفْسِ الرَّحْمَۃِ، صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہو کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا فرمایا تو ایک نوشتہ اپنے
 وعدہ کا تحریر فرمایا جو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، جس کا مضمون یہ ہے: اِنَّ رَحْمَتِيْ تَغْلِبُ
 عَلٰی غَضَبِيْ، یعنی میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے گی (قرطبی)

اَلَّذِيْنَ يَخْسِئُ ذُنُوبُهُ لِنَفْسِهِمْ، اس میں اشارہ ہے کہ شروع آیت میں جو اللہ تعالیٰ
 کی عموم رحمت کا ذکر ہے کفار و مشرکین اگر اس سے محروم ہوئے تو وہ خود اپنے عمل سے
 محروم ہوئے، انھوں نے حصول رحمت کا طریقہ یعنی ایمان اختیار نہیں کیا (قرطبی)
 وَ لَوْ مَا سَكَنَ فِي الْاَيْلِ وَالنَّهَارِ، یہاں یا تو سکون سے مراد استقرار ہے، یعنی جو چیز
 جہان کے لیل و نہار میں موجود ہے وہ سب اللہ ہی کی ملک ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد
 سکون و حرکت کا مجموعہ ہو، یعنی مَا سَكَنَ وَمَا تَحَرَّكَ اور ذکر صرف سکون کا کیا گیا حرکت
 جو اس کے بالمقابل ہے وہ خود بخود سمجھ میں آ سکتی ہے۔

قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۵

تو کہہ میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی ایک بڑے دن کے عذاب جس پر سے

يَصْرِفُ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْنَاهُ ۚ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۱۶

ٹل گیا وہ عذاب اُس دن تو اس پر رحم کر دیا اللہ نے اور یہی ہے بڑی کامیابی،

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ

اور اگر پہنچائے تجھ کو اللہ کچھ سختی تو کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں سوا اس کے اور اگر تجھ کو

يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷ وَ هُوَ الْقَاهِرُ

پہنچائے بھلائی تو وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور اسی کا زور ہے اپنے

فَوْقَ عِبَادِهٖ ۚ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۱۸ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ

بندوں پر اور وہی بڑی حکمت والا سب کی خبر رکھنے والا تو پوچھ سب سے بڑا گواہ

شَہَادَةٌ ۚ قُلِ اللّٰهُ شَهِيدٌ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۚ وَ اَوْحٰی اِلٰی

کون ہی، کہہ دے اللہ گواہ ہے میرے اور تمھارے درمیان اور اترا ہے مجھ پر

هٰذَا الْقُرْاٰنُ اِنْ لَا نُنْذِرْكُمْ بِهِ ۚ وَ مَنْ يَبْلُغْ اَيْتَكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ

یہ قرآن تاکہ تم کو اس سے خبردار کر دوں اور جس کو یہ پہنچے کیا تم گواہی دیتے ہو

أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَىٰ قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ

کہ اللہ کے ساتھ معبود اور بھی ہیں تو کہہ دے میں تو گواہی دوں گا کہہ دے وہی ہے معبود

وَاحِدٌ وَإِنِّي بِرَبِّي مُشْرِكُونَ ۱۹ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ

ایک اور میں میسز اہل تمھارے شرک سے جن کو ہم نے دی ہے کتاب

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

وہ پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو جو لوگ نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۲۰ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا

وہی ایمان نہیں لاتے اور اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر یا

أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۲۱

جھٹلا دے اس کی آیتوں کو بلا شک بھلائی نصیب نہیں ہوتی ظالموں کو

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں کہ اسلام و ایمان کے حکم کی تعمیل نہ کروں یا شرک میں مبتلا ہو جاؤں تو میں ایک بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں (یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اسلام و ایمان کے خلاف شرک و معصیت کا صادر ہونا آپ سے ممکن نہیں، مگر یہاں سنانا عام اُمت کو ہے، کہ نبی معصوم بھی اللہ کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں، پھر فرمایا کہ وہ عذاب ایسا ہے کہ جس شخص سے اس روز کا عذاب ہٹا دیا گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم کیا اور یہ (عذاب کا ہٹ جانا اور اللہ کی رحمت کا متوجہ ہو جانا) صریح کامیابی ہے (اس میں اس رحمت کا بیان بھی ہو گیا جس کا ذکر اس سے پہلے کتب علیٰ نَفْسِہِ الرَّحْمَۃِ میں آیا ہے) اور (آپ ان کو یہ بھی سنا دیجئے کہ اے انسان) اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف (دنیا یا آخرت میں) پہونچا دیں تو اس کا دور کر نہوالا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں (وہی چاہیں تو دور کریں یا نہ کریں اور جلد کریں یا دیر میں کریں) اور اگر تجھ کو (اسی طرح) کوئی نفع پہونچا دیں (تو اس کا بھی کوئی ہٹانے والا نہیں، جیسا دوسری جگہ ہے: لَا رَآءَ لِفَضْلِہِ کَیۡوَنَکَ) وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (اور مضمون مذکور کی تاکید کے لئے یہ بھی فرما دیجئے کہ) وہی اللہ تعالیٰ (قدرت کے اعتبار سے) اپنے

وقف الازھر
وقف الازھر
د

بندوں پر غالب اور برتر ہیں اور (علم کے اعتبار سے) وہی بڑی حکمت والے اور پوری خبر رکھنے والے ہیں (پس وہ علم سے سب کا حال جانتے ہیں اور قدرت سے سب کو جمع کر لیں گے اور حکمت سے مناسب جزاء و سزا دیں گے) آپ (ان منکرین توحید و رسالت سے) کہتے کہ (اچھا یہ تو بتلاؤ کہ) سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے (جس کی گواہی دینے پر سب کا اختلاف رفع ہو جاوے، اس کا جواب ظاہر ہے یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر ہیں) آپ کہتے کہ میرے اور تمہارے درمیان (جس مسئلہ میں اختلاف ہے اس میں وہی) اللہ تعالیٰ گواہ ہے (جس کی گواہی سب بڑھ کر ہے) اور (ان کی گواہی یہ ہے کہ) میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے (منجانب اللہ) بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو (ان وعیدوں سے) ڈراؤں (جو توحید و رسالت کے انکار پر اس میں مذکور ہیں کیونکہ قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی مثل بنانے سے ساری دنیا کا عاجز ہونا اللہ تعالیٰ کی تکوینی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ہو گئی، اور مضافاً قرآن سے اس کی تشریحی شہادت ہو گئی) کیا تم (اس شہادت کبریٰ کے بعد بھی جو کہ توحید کو شامل ہے) توحید کے بارے میں سچ بچ یہی گواہی دو گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (تحقیقاً عبادت میں) کچھ اور معبود بھی (شریک) ہیں (اور اگر وہ ہٹ دھرمی سے اس پر بھی کہہ دیں کہ ہاں ہم تو یہی گواہی دیں گے تو اس وقت ان سے بحث کرنا فضول ہے، بلکہ صرف) آپ (اپنے عقیدہ کو ظاہر کرنے کے لئے) کہہ دیجئے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا اور بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں (اور آپ کی رسالت کے بارے میں جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے پوچھ کر دیکھ لیا تو اس معاملہ کی تحقیق یہ ہے کہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات و انجیل) دی ہے وہ سب لوگ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (ایسا) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (لیکن جب شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے اہل کتاب کی شہادت پر مدار ہی نہیں تو اس کے نہ ہونے سے بھی کوئی ہستدلال نہیں کیا جاسکتا، اور ایسی شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے بھی) جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کر لیا ہے وہ ایمان نہ لاویں گے (عقل کو ضائع کرنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کو معطل کر دیا عقل سے کام نہیں لیا) اس سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو اللہ پر جھوٹ بہتان پاندھے، یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتا دے، ایسے بے انصافوں کا حال یہ ہو گا کہ ان کو (قیامت کے دن) خلاصی نہ ہوگی (بلکہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے)

معارف مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کا ذکر کر کے اس پر ایمان لانے اور شرک سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا عذاب ایک خاص انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر بالفرض میں بھی اپنے رب کے حکم کی مخالفت کروں تو مجھ کو بھی قیامت کے عذاب کا خوف ہے، یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر گناہ سے معصوم ہیں، آپ سے نافرمانی کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، لیکن آپ کی طرف منسوب کر کے امت کو یہ بتلانا ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی پر جب نبی الانبیاء کو معاف نہیں کیا جاسکتا تو اور کسی کی کیا مجال ہے۔

اس کے بعد فرمایا مَنْ يُضَرْفُ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ، یعنی روز محشر کا عذاب انتہائی ہولناک اور سخت ہے، جس شخص سے یہ عذاب ٹل گیا تو سمجھئے کہ اس پر اللہ کی بڑی رحمت ہو گئی، وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ، یعنی یہی بڑی اور کھلی کامیابی ہے، یہاں کامیابی سے مراد دخول جنت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عذاب سے نجات اور جنت کا داخلہ لازم و ملزوم ہیں۔

دوسری آیت میں اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نفع اور نقصان کا مالک درحقیقت صرف اللہ جل شانہ ہے، کوئی شخص کسی کو حقیقت کے اعتبار سے نہ ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ادنیٰ نقصان، اور ظاہر میں جو کسی کو کسی کے ہاتھ سے نفع یا نقصان پہنچتا نظر آتا ہے وہ صرف ایک ظاہری صورت اور حقیقت کے سامنے ایک نقاب سے زائد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقان

مصلحت راتہتے برآہوئے چیں بستہ اند؛

یہ عقیدہ بھی اسلام کے ان انقلابی عقائد میں سے ہے جن نے مسلمانوں کو ساری مخلوق سے بے نیاز اور صرف خالق کا نیاز مند بنا کر ان کی ایک ایسی بے مثال البیلی عجات تیار کر دی جو فقر و فاقہ اور تنگدستی میں بھی سارے جہان پر بھاری ہے، کسی کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتی۔

فقر میں بھی سر بسر فخر و غرور و نماز ہوں ؛ کس کا نیاز مند ہوں سب جو بے نیاز ہوں

قرآن مجید میں جا بجا یہ مضمون مختلف عنوانات کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، ایک آیت میں ارشاد ہے:

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُمْسِكَ لَهُ مِنْ بَعْدِهَا	یعنی اللہ تعالیٰ نے جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دی اس کو کوئی روک نہ سکے اور جب روک دے اس کو کوئی کھول نہ
---	---

صحیح احادیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں اکثر یہ کہا کرتے تھے:

اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَحْدِ مِنْكَ الْجَدُّ	یعنی اے اللہ! جو آپ نے دیا اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جو آپ نے روک دیا اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی کوشش
--	---

والے کی کوشش آپ کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔

امام بخاریؒ نے اس آیت کے تحت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار ہوئے، اور مجھے اپنے پیچھے روک بنا لیا، کچھ دور چلنے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے لڑکے! میں نے عرض کیا حاضر ہوں، کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو! اللہ تم کو یاد رکھے گا، تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے، تم امن و عافیت اور خوش عیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو پہچانو تو تمہاری مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ تم کو پہچانے گا، جب تم کو سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے سوال کرو، اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو، جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے قلمِ تقدیر اس کو لکھ چکا ہے، اگر ساری مخلوقات مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نفع پہنچاویں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں نہیں رکھا تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکیں گے، اور اگر وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نقصان پہنچاویں جو تمہاری قسمت میں نہیں ہے تو ہرگز اس پر قدرت نہ پائیں گے، اگر تم کر سکتے ہو کہ یقین کے ساتھ صبر پر عمل کرو تو ایسا ضرور کر لو، اگر اس پر قدرت نہیں تو صبر کرو، کیونکہ اپنی خلافِ طبع چیز دل پر صبر کرنے میں بڑی خیر و برکت ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کے ساتھ ہے، اور مصیبت کے ساتھ راحت اور تنگی کے ساتھ فراخی ہے، یہ حدیث ترمذی اور مسند احمد میں بھی بسند صحیح مذکور ہے۔

افسوس ہے کہ قرآن کے اس واضح اعلان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بھر کی تعلیمات کے باوجود یہ اُمت پھر اس معاملہ میں بھٹکنے لگی، سالے خدائی اختیارات مخلوقات کو

بانٹ دیئے، آج ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو مصیبت کے وقت بجائے خدا تعالیٰ کے پکارنے کے اور اس سے دعا مانگنے کے مختلف ناموں کی دہائی دیتے اور اپنی سے مدد مانگتے ہیں، خدا تعالیٰ کی طرف دھیان تک نہیں ہوتا، انبیاء و اولیاء کے توسل سے دعا مانگنا دوسری بات ہے وہ جائز ہے، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن براہ راست کسی مخلوق کو حاجت روائی کے لئے پکارنا، اس سے اپنی حاجتیں مانگنا، اس شرآئی حکم کے خلاف کھلی بغاوت ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی اپنے سب بندوں پر غالب قادر ہے، اور سب اس کے تحت قدرت اور محتاج ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان خواہ اللہ کا رسول مقرب ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ ہو اپنے ہر ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اس کی ہر مراد پوری نہیں ہوتی۔

وہ حکیم بھی ہے کہ اس کے تمام افعال عین حکمت ہیں، اور ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے اس میں لفظ "قاہر" سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کا اور لفظ "حکیم" سے اس کے علم محیط کا بیان کر کے بتلادیا کہ تمام صفات کمال علم و قدرت میں منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ ان دونوں میں یکتا ہیں پانچویں آیت کا ایک خاص واقعہ نزول عامہ مفسرین نے نقل کیا ہے، کہ ایک مرتبہ اہل مکہ کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ جو رسول اللہؐ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا گواہ کون ہے؟ کیونکہ ہمیں کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو آپ کی تصدیق کرتا ہو، حالانکہ ہم نے یہود سے، نصاریٰ سے اس کی تحقیق میں پوری کوشش کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ قُلْ أُمِّي شَوَّاعٌ كَبُرَ شِمَادُكُم، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ سے بڑھ کر کس کی شہادت ہوگی، جس کے قبضہ میں کل جہان اور سب کا نفع و ضرر ہے، پھر آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی گواہی سے مراد وہ معجزات اور آیات بینات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کے متعلق ظاہر فرمائی، اسی لئے اس کے بعد اہل مکہ کو خطاب کر کے یہ ارشاد فرمایا، أَتَشْكُرُونَنِي وَأَنْتُمْ إِلَٰهَةُ الْآخِرِينَ، یعنی کیا اللہ تعالیٰ کی اس گواہی کے بعد بھی تم اس کے خلاف اس کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں، اگر ایسا ہے تو اپنے انجام کو تم سمجھو، میں تو ایسی گواہی نہیں دے سکتا، قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهُ وَاحِدٌ، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ یکتا معبود ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

اور ارشاد فرمایا وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ هَٰذَا أَنِ انْصَبْ إِلَيْنَا كُفْرَهُ وَمَنْ يَبْلُغْ

یعنی مجھ پر بطور وحی قرآن بھیجا گیا، تاکہ اس کے ذریعہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤں، اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن کو قیامت تک یہ قرآن پہنچے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہیں، اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، قیامت تک اس کی تعلیم اور تلاوت باقی رہے گی، اور لوگوں پر اس کا اتباع لازم رہے گا۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا وہ ایسا ہو گیا جیسے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لی، اور ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص کو قرآن پہنچ گیا میں اس کا نذیر ہوں۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تاکید فرمائی: يَلْعَنُوا عَنِّي ذَوَايَا یعنی میرے احکام و تعلیمات لوگوں تک پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ اور صحت مند رکھے جس نے میرا کوئی مقالہ سنا پھر اس کو یاد رکھا پھر اس کو امت تک پہنچا دیا، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خود کسی کلام کے مفہوم کو اتنا نہیں سمجھتا جتنا بعد میں آنے والا سمجھتا ہے جس کو یہ کلام اس نے پہنچایا ہے۔

آخری آیت میں ان لوگوں کے اس قول کی تردید ہے کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے سب تحقیق کر لی، کوئی بھی آپ کی سچائی اور نبوت کی گواہی نہیں دیتا، اس کے متعلق ارشاد فرمایا الَّذِينَ اتَّخَذْتُمْ مِمَّنْ دُونَهُ آلِهَةً مَّا يَكْفُرُونَ یعنی یہود و نصاریٰ تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ تورات و انجیل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حلیہ شریف آپ کے وطن صلی پھر وطن حبت کا، اور آپ کے عادات و اخلاق اور آپ کے کارناموں کا ایسا تفصیلی ذکر ہے کہ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر نہیں، آپ کے صحابہ کرامؓ کے حالات کا مفصل تذکرہ تک تورات و انجیل میں موجود ہے، اس لئے اس کا کوئی امکان نہیں کہ جو شخص تورات و انجیل کو پڑھتا اور ان پر ایمان رکھتا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہچانے۔

اس جگہ حق تعالیٰ نے تشبیہ کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ جیسے لوگ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی پہچان اپنے بچوں کے لئے سب سے زیادہ تفصیلی اور یقینی ہوتی ہے، بچوں کے بدن کا ہر حصہ ماں باپ

کے سامنے آتا اور رہتا ہے، وہ بچپن سے لے کر جوانی تک اُن کے ہاتھوں اور گود میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ جتنا اپنی اولاد کو پہچان سکتے ہیں اتنا اولاد ان کو نہیں پہچان سکتی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی میں داخل تھے، پھر مسلمان ہو گئے، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خبر دی ہے کہ تم لوگ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہو جیسے اپنی اولاد کو اس کی کیا وجہ ہے؟ عبداللہ ابن سلام نے فرمایا کہ ہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں تازل فرمائے، اس لئے اس کا علم ہمیں یقینی اور قطعی طور پر ہے، بخلاف اپنی اولاد کے کہ اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری اولاد ہے بھی یا نہیں۔

حضرت زید بن سحنہ جو اہل کتاب میں سے ہیں انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات و انجیل کے بیان کردہ اوصاف ہی کے ذریعہ پہچانا تھا، صرف ایک وصف ایسا تھا جس کی ان کو پہلے تصدیق نہیں ہو سکی تھی، امتحان کے بعد تصدیق ہوئی، وہ یہ کہ آپ کا علم آپ کے غصہ پر غالب ہو گا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر تجربہ کیا تو یہ صفت بھی پوری طرح آپ میں پائی اسی وقت مسلمان ہو گئے۔

آخر آیت میں فرمایا کہ یہ اہل کتاب جو پوری طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود مسلمان نہیں ہوتے، یہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کر رہے، اور خسارہ میں پڑ رہے ہیں، الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا آيُنَا

اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا تھا

أَشْرَكَكُمْ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ

کہاں ہیں شرک تمہارے جن کا تم کو دعویٰ تھا، پھر نہ رہے گا اُن کے

فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿۲۳﴾

پاس کوئی فریب مگر یہی کہ ہمیں گے قسم ہر اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم نہ تھے شرک کرنے والے

أَنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا

دیکھو تو کیسا جھوٹ بولے اپنے اوپر اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو

يَفْتَرُونَ ۲۴) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ

بنایا کرتے تھے اور بعضے ان میں کان لگا سے رہتے ہیں تیری طرف اور ہم نے ان کے دلوں پر ڈال رکھی

أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ يَرَوْا كَلًّا

ہیں پرے تاکہ اس کو نہ سمجھیں اور رکھ دیا ان کے کانوں میں بوجھ، اور اگر دیکھ لیں تمام

آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّى إِذَا اجْعَأَوْكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ

نشانیاں تو بھی ایمان لاویں ان پر یہاں تک کہ جب آتے ہیں تیرے پاس تجھ سے جھگڑنے کو تو کہتے

الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۲۵) وَهُمْ

ہیں وہ کافر نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی اور یہ لوگ

يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْوَنَ عَنْهُ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ

روکتے ہیں اس سے اور بھاگتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو،

وَمَا يَشْعُرُونَ ۲۶)

اور نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر

کیفیت عدم فلاح مشرکین اور وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جس روز ہم تمام حقائق کو (میدانِ حشر میں) جمع کریں گے،

پھر ہم مشرکین سے (بواسطہ یا بلا واسطہ بطور زبرد تو بیخ کے) کہیں گے کہ (بتلاؤ) تمہارے

وہ شرکار جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے کہاں گئے (کہ تمہاری سفارش نہیں کرتی

جس پر تم کو بھروسہ تھا) پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی (ظاہر) نہ ہوگا کہ وہ

(اس شرک سے خود بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے اور بدحواسی کے عالم میں) یوں کہیں گے

قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہیں تھے (حق تعالیٰ نے فرمایا تعجب کی نظر سے)

ذرا دیکھو تو کس طرح (صریح) جھوٹ بولا اپنی جانوں پر اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ

تراشا کرتے تھے (یعنی ان کے بت اور جن کو وہ خدا کا شریک ٹھہرتے تھے) وہ سب غائب

ہو گئے (تشیع برانکار قرآن وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ) اور ان (مشرکین) میں بعضے ایسے

ہیں کہ (آپ کے قرآن پڑھنے کے وقت اس کے سننے کے لئے) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور

(چونکہ یہ سنتا طلب حق کیلئے نہیں محض تماشے یا تمسخر کی نیت سے ہوتا ہے اس لئے اس سے ان کو کچھ نفع نہیں ہوتا، چنانچہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اس سے کہ وہ اس (قرآن کے مقصود) کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں دھند بھر دیا ہے کہ وہ اس کو ہدایت کے لئے نہیں سنتے، یہ تو ان کے دلوں اور کانوں کی حالت تھی، اب ان کی بصارت اور نگاہ کو دیکھو) اگر وہ لوگ (آپ کی صدق نبوت کے) تمام دلائل کو (بھی) دیکھ لیں ان پر بھی ایمان نہ لائیں (ان کے عناد کی نوبت) یہاں تک (پہنچتی ہے) کہ جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں (اس طور پر کہ) یہ لوگ جو کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو کچھ لوگوں سے (منقول) چلی آئی ہیں (یعنی مذہب والے پہلے سے ایسی باتیں کرتے چلے آئے ہیں کہ معبود ایک ہی ہے اور یہ کہ انسان خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے، قیامت میں پھر زندہ ہونا ہے، جس کا حاصل عناد اور تکذیب ہی آگے اس سے ترقی کر کے جدال اور دوسروں کو بھی ہدایت سے روکنے کا کام شروع کیا) اور پھر یہ لوگ اس (قرآن) سے اور ویں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی (اس سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے) دور دور رہتے ہیں اور (ان حرکتوں سے) یہ لوگ اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں اور (حماقت اور غایت بغض سے) کچھ خبر نہیں رکھتے (کہ ہم کس کا نقصان کر رہے ہیں، ہمارے اس فعل سے رسول اور قرآن کا تو اس سے کچھ بگڑتا نہیں)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیت میں یہ مذکور تھا کہ ظالموں، کافروں کو فلاح نصیب نہ ہوگی، متذکرہ آیت میں اس کی تفصیل و تشریح ہے، پہلی اور دوسری آیت میں اُس سب سے بڑے امتحان کا ذکر ہے جو محشر میں رب الارباب کے سامنے ہونے والا ہے، ارشاد فرمایا **وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا**، یعنی وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے جس میں ہم ان سب کو یعنی ان مشرکین کو اور ان کے بنائے ہوئے معبودوں کو جمع کریں گے، **ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا إِنَّا سَاجِدُونَ لِلَّذِينَ كُنْتُمْ تُقَدِّمُونَ**، یعنی پھر ہم ان سے یہ سوال کریں گے کہ تم جن معبودوں کو ہمارا ہیم و شریک اور اپنا حاجت روا مشکل کشا سمجھا کرتے تھے آج وہ کہاں ہیں؟ تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے؟

اس میں لفظ **ثُمَّ** اختیار فرمایا گیا ہے جو تراخی اور دیر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ محشر میں جمع ہونے کے بعد فوراً ہی سوال جواب نہیں ہوگا، بلکہ

عرصہ دراز تک حیرت و تذبذب کے عالم میں کھڑے رہیں گے، مدت کے بعد حساب کتاب اور سوالات شروع ہوں گے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ تم کو میدانِ حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیری میں رہیں گے، آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے (یہ روایت حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے ذکر کی ہے)۔

اس روایت میں جو پچاس ہزار اور ایک ہزار کا فرق ہے یہی فرق قرآن کی دو آیتوں میں بھی مذکور ہے، ایک جگہ ارشاد ہے کَانَ مَقْدَرًا مِّنْ مِّائَةِ سَنَةٍ، یعنی اُس دن کی مدت پچاس ہزار سال ہوگی، اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَنفٍ سَنَةٍ، یعنی ایک دن تمہارے رب کے پاس ایک ہزار سال کا ہوگا۔ اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ یہ روزِ شَرَّتِ تَحْلِيفٍ و مشقت کے اعتبار سے دراز ہوگا، اور درجاتِ محنت و مشقت کے مختلف ہوں گے، اس لئے بعضوں کے لئے یہ دن پچاس ہزار سال کا اور بعض کے لئے ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سب سے بڑی امتحان گاہ میں اوّل تو ایک عرصہ دراز ایسا گزرے گا کہ امتحان شروع ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ یہ لوگ تمنا کرنے لگیں گے کہ کسی طرح امتحان اور حساب جلد ہو جائے، انجام کچھ بھی ہو، یہ ترڑا اور تذبذب کی تکلیف تو جائے، اسی طولِ قیام اور عرصہ دراز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لفظِ ثَمَّ کے ساتھ فرمایا ثَمَّ نَقُولُ، اسی طرح دوسری آیت میں مشرکین کی طرف سے جو جواب مذکور ہے وہ بھی لفظِ ثَمَّ کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی بڑے وقفہ کے بعد بہت غور و فکر اور سوچ بچار کر کے یہ جواب دیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، یعنی اللہ رب العالمین کی قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم تو مشرک نہ تھے، اس آیت میں ان کے جواب کو لفظِ فتنۃ سے تعبیر فرمایا ہے، اور یہ لفظ امتحان و آزمائش کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اور کسی پر فریفتہ و مفتون ہو جانے کے لئے بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلی صورت میں ان کے جواب امتحان کو امتحان سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اور دوسری صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ لوگ دنیا میں ان بتوں اور خود ساختہ معبودوں پر مفتون تھے، اپنے جان و مال اُن پر قربان کرتے تھے، مگر آج وہ ساری محبت و فریفتگی ختم ہو گئی، اور ان کا جواب بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ ان سے

برأت اور علحدگی کا دعویٰ کریں۔

ان کے جواب میں ایک عجیب چیز یہ ہے کہ میدان قیامت کے ہولناک مناظر اور رب الارباب کی قدرت کاملہ کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے کے بعد ان کو یہ جرات کیے ہوئی کہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ بولیں اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ اسی کی ذات بکریہ کی قسم بھی کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے۔

عامہ مفسرین نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کا یہ جواب کچھ عقل و ہوش اور انجام پنی پر مبنی نہیں، بلکہ فرط ہمت سے ہو کھلا ہٹ کی بنا پر ہے، اور ایسی حالت میں آدمی جو کچھ منہ میں آئے بولا کرتا ہے، لیکن میدانِ حشر کے عام واقعات و حالات میں غور کرنے کے بعد یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کی پوری کیفیت اور حالت کو سامنے لانے کے لئے ان کو یہ قدرت بھی دیدی کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہیں جس طرح دنیا میں کہا کرتے تھے، تاکہ کفر و شرک کے گناہِ عظیم کے ساتھ ان کا یہ عیب بھی اہل محشر کے سامنے آجائے کہ یہ جھوٹ بولنے میں بھی یکتا ہیں کہ اس ہولناک موقع پر بھی جھوٹ بولنے سے نہیں جھکتے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ سے اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جس طرح مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا جاتے ہیں اسی طرح خود رب العالمین کے سامنے بھی دروغ حلفی سے نہ چوکیں گے۔

محشر میں جب یہ قسمیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے انکاری ہو جائیں گے تو اس وقت قادرِ مطلق ان کے مونہوں پر غر سکوت لگا دیں گے، اور ان کے اعضاء و جوارح، ہاتھ پاؤں کو حکم دیں گے کہ تم شہادت دو کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے تھے، اس وقت ثابت ہو گا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں آنکھ، کان یہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی خفیہ پولیس تھی، وہ تمام اعمال و افعال کو ایک ایک کر کے سامنے رکھ دیں گے، اسی کے متعلق سورۃ یسین میں ارشاد ہے :-

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُغْلِقُ سُورُتُهُمْ وَنَجْمُهُمْ أَشْرَارٌ كَلْبُهُمْ بَنَاتٍ كَانُوا يَكْسِبُونَ، اس مشاہدہ قدرت کے بعد کسی کو یہ جرات نہ رہے گی کہ پھر کوئی بات چھپائے یا جھوٹ بولے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا، یعنی اُس روز وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے، اس کا مطلب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی بتلایا کہ پہلے پہلے تو خوب جھوٹ بولیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت کوئی غلط بات کہنے کی جرات نہ رہے گی۔

غرض حکم الحاکمین کی عدالت میں مجسم کو اپنا بیان دینے کا پورا موقع آزادی کے ساتھ دیا جائے گا، اور جس طرح وہ دنیا میں جھوٹ بولتا تھا اس وقت بھی اس کا یہ اختیار سلب ہوگا کیونکہ قادر مطلق اس کے جھوٹ کا پردہ خود اس کے ہاتھ پاؤں کے حوالہ سے چاک کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موت کے بعد جو پہلا امتحان قبر میں منکر نکیر فرشتوں کے سامنے ہوگا، جسکو داخلہ کا امتحان کہا جاسکتا ہے، اس کے متعلق حدیث میں ہے کہ منکر نکیر جب کافر سے سوال کریں گے **مَنْ رَبُّكَ وَمَا دِينُكَ**، یعنی تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ تو کافر کہے گا **هَاهُ لَا أَدْرِي**، یعنی ہائے ہائے میں کچھ نہیں جانتا، اس کے خلاف مؤمن **رَبِّيَ اللَّهُ وَمِمَّا دِينُيَ** سے جواب دے گا، معلوم ہوتا ہے کہ اس امتحان میں کسی کو جھوٹ بولنے کی جرأت نہ ہوگی، ورنہ کافر بھی وہی جواب دے سکتا تھا جو مسلمان نے دیا وجہ یہ ہے کہ وہ امتحان لینے والے فرشتے ہوں گے، نہ وہ غیب کا علم رکھتے ہیں، اور نہ ایسی قدرت کہ ہاتھ پاؤں کی گواہی لے لیں، اگر وہاں جھوٹ بولنے کا اختیار انسان کو ہوتا تو فرشتے تو اس کے جواب کے مطابق ہی عمل کرتے اور وہ نظام مختل ہو جاتا، بخلاف میدانِ حشر کے امتحان کے کہ وہاں سوال و جواب براہِ راست عالم و خیر اور قادر مطلق کے ساتھ ہوگا، وہاں کوئی جھوٹ بولے بھی تو چل نہیں سکے گا۔

تفسیر بحر محیط اور منظری میں بعض حضرات کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے شرک سے انکار کرنے والے لوگ ہوں گے جو کھلے طور پر کسی مخلوق کو خدا یا حنرا کا نائب نہیں کہتے تھے، مگر ان کا عمل یہ تھا کہ خدائی کے سارے اختیارات مخلوق کو بانٹ رکھے تھے، اور انہی سے اپنی حاجتیں مانگتے، انہی کے نام کی نذر و نیاز کرتے، انہی سے روزی، تند رستی، اولاد اور ساری مرادیں مانگا کرتے تھے، یہ لوگ اپنے آپ کو مشرک نہ سمجھتے تھے، اس لئے میدانِ حشر میں بھی قسم کھا کر یہی کہیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی رسوائی کو واضح فرمائیں گے۔

دوسرا سوال اس آیت میں یہ ہوتا ہے کہ بعض آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کفار و فجار سے کلام نہ فرمائیں گے، اور اس آیت سے صاف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان سے خطاب و کلام ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ خطاب و کلام بطور اکرام و اعزاز یا قبولیتِ دعا نہ ہوگا، زجر و توبیخ کے خطاب کی نفی اس آیت میں مراد نہیں، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطاب جو اس آیت میں مذکور ہے بواسطہ ملائکہ ہو، اور جس آیت میں خطاب و کلام الہی کی نفی کی گئی ہے

اس میں مراد کلام بلا واسطہ ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُوْنَ، اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ دیکھتے کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں پر کیسا جھوٹ بولا ہے، اور جو کچھ وہ اللہ پر افتراء کیا کرتے تھے آج سب غائب ہو گیا، اپنی جانوں پر جھوٹ بولنے سے مراد یہ ہے کہ وبال اس جھوٹ کا اپنی کی جانوں پر پڑنے والا ہے، اور افتراء سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ان کو اللہ کا بہیم و شریک ٹھہرانا ایک افتراء تھا، آج حقیقت سامنے آکر اس افتراء کی قلعی کھل گئی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افتراء سے مراد جھوٹی قسم ہے جو محشر میں کھائی تھی، پھر ہاتھوں پیروں اور اعضاء کی گواہی سے وہ جھوٹ کھل گیا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ افتراء سے مراد مشرکین کی وہ تاویلیں ہیں جو اپنے معبودات باطلہ کے بارہ میں دنیا میں کیا کرتے تھے، مثلاً مَا تَعْبُدُوْهُمْ اِلَّا لِيُقَيِّدُوْا اِلٰى اللّٰهِ زُلْفٰی، یعنی ہم ان بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے قریب کر دیں گے، محشر میں یہ افتراء اس طرح کھل گیا کہ ان کی سب بڑی مصیبت کے وقت کسی نے نہ ان کی سفارش کی نہ ان کے عذاب میں کچھ کمی کا ذریعہ بنے۔

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سوال و جواب ہوں گے معبودات باطلہ سب غائب ہوں گے، کوئی سامنے نہ ہوگا، اور قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ ارشاد ہے اَحْسِرْ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْزِلْ وَاَجْهَلُكُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ، یعنی قیامت میں حق تعالیٰ کا حکم یہ ہوگا کہ جمع کرو دو ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو اور ان کو جن کی یہ لوگ عبادت کیا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں معبودات باطلہ بھی حاضر و موجود ہوں گے۔

جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اُن کے غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت بہیم و شریک یا سفارش کرنے کے یہ غائب ہوں گے کہ ان لوگوں کو کوئی نفع نہ پہونچا سکیں گے ویسے حاضر و موجود ہوں گے، اس طرح دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں یہ سب ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں، پھر متفرق ہو جائیں، اور یہ سوال تفسیر کے بعد کیا جائے۔

ان دونوں آیتوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ جل شانہ

نے مشرکین کو حشر کے ہولناک میدان میں جو یہ اختیار دیا کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہہ سکیں، یہاں تک کہ جھوٹی قسم کھا کر انھوں نے شرک سے انکار کر دیا، اس میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ایک ایسی خبیث عادت ہے جو چھوٹی نہیں، یہاں تک کہ یہ لوگ جو دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھالیا کرتے تھے یہاں بھی باز نہ آئے اور پوری خلق خدا کے سامنے ان کی رسوائی ہوئی، اسی لئے قرآن وحدیث میں جھوٹ بولنے پر شدید وعید اور مذمت فرمائی گئی ہے، قرآن میں جا بجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فحور کا ساتھی ہے، اور جھوٹ اور فحور دونوں جہنم میں جائیں گے (ابن حبان فی صحیحہ)

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جائے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل جھوٹ ہے (مسند احمد) اور شب معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی دونوں بائیں چیر دی جاتی ہیں وہ پھر درست ہو جاتی ہیں، پھر چیر دی جاتی ہیں، اسی طرح یہ عمل اس کے ساتھ قیامت تک ہوتا رہے گا، آپ نے جبریل امین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی پورا مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑے یہاں تک کہ مزاج ومذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

نیز بیہقی وغیرہ میں بسند صحیح وارد ہے کہ مسلمان کی طبیعت میں اور بُری خصلتیں تو ہو سکتی ہیں، مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتا، اور ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔

وَهُمْ يَهُونَ عَنْهُ، عامۃ مفسرین ضحاک، قتادہ، محمد بن حنفیہ کے نزدیک یہ آیت عام کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو لوگوں کو قرآن سننے اور اس کا اتباع کرنے سے منع کرتے تھے، اور خود بھی اس سے دُور رہتے تھے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور دوسرے اُن چچاؤں کے متعلق ہے جو لوگوں کو آپ کی ایذا رسانی سے روکتے اور آپ کی حمایت کرتے تھے، مگر نہ قرآن پر ایمان لاتے نہ اس پر عمل کرتے، اس صورت میں یَهُونَ عَنْهُ کی ضمیر بجائے قرآن کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہوگی (مظہری بروایت ابن ابی حاتم عن سعید بن ابی ہلال)

وَكُنتَ تَرَىٰ إِذْ دُفِقُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا لَيْسَ تَنَارُهُ وَلَا تُكْذِبُ

اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ کھڑے کئے جاویں گے وہ دوزخ پر پس کہیں گے اے کاش ہم پھر بھیج دو جاوے

بِآيَاتِ رَبِّنَا وَتَكُونُ مِنَ السُّوءِ مُبِينِينَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا

اور ہم نہ جھٹلائیں اپنی رب کی آیتوں کو اور ہو جاویں ہم ایمان والوں میں، کوئی نہیں بلکہ ظاہر ہو گیا جو

يَخْفُونَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا هُمْ عَنْهُ وَإِنَّهُمْ

چھپاتے تھے پہلے، اور اگر پھر بھیجے جاویں تو پھر بھی وہی کام کریں جس سے منع کئے گئے تھے اور

لَكِن بُورُونَ ﴿۲۸﴾ وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ

بیشک جھوٹے ہیں، اور کہتے ہیں ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر نہیں

بِسَعْوَةٍ ثَيْنٍ ﴿۲۹﴾ وَكَوْنَتَ تَرَىٰ إِذْ دُفِقُوا عَلَى رُجُومٍ ط قَالَ أَلَيْسَ

زندہ ہوتا، اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت وہ کھڑے کئے جاویں گے اپنی رب کے شکنجے فرما دیا گیا

هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبَّنَا قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا

یہ سچ نہیں، کہیں گے کیوں نہیں قسم ہوا اپنے رب کی فرمائے گا تو چکھو عذاب بدلے میں اپنے

كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۰﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ط

کھنڈ کے، تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا،

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَحْسِرُ تَنَّا عَلَىٰ

یہاں تک کہ جب آپہنچے گی اُن پر قیامت اچانک تو کہیں گے اے افسوس! کیسی

مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْسَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ط

کو تاہی ہم نے اس میں کی اور وہ اٹھاویں گے اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر

أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿۳۱﴾ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ رَّ

خبردار ہو جاؤ کہ بوجھ ہر جس کو وہ اٹھاویں گے، اور نہیں ہے زندگی گمانی دنیا کی مگر کھیل اور

لَهُوَ ط وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

جی بھلانا اور آخرت کا گھر بہتر ہے پر ہیزگاروں کے لئے کیا تم نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر

اور اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک واقعہ نظر آئے) جبکہ یہ (منکرین) دوزخ کے پاس کھڑے کئے جاویں گے (اور قریب ہوگا کہ جہنم میں ڈال دیئے جاویں) تو ہزاروں متناؤں کے ساتھ کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہوئی کہ ہم (دنیا میں) پھر واپس بھیج دیئے جاویں اور اگر ایسا ہو جاوے تو ہم (پھر) اپنے رب کی آیات (مثل قرآن وغیرہ) کو کبھی جھوٹا نہ بتا دیں اور ہم رضوانِ ایمان والوں میں سے ہو جاویں (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ تمنا اور وعدہ سچی رغبت اور قصدِ اطاعت سے نہیں) بلکہ (اس وقت ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے (دنیا میں) دبایا (اور مٹایا) کرتے تھے، وہ آج ان کے سامنے آگئی ہے (مراد اس چیز سے آخرت کا عذاب ہے جس کی وعید کفر و معصیت پر دنیا میں ان کو کی جاتی تھی) اور دبانے سے مراد انکار ہے، مطلب یہ ہے کہ اس وقت جان کو بن رہی ہے، اس لئے جان بچانے کو یہ سارے وعدے ہو رہے ہیں اور دل سے ہرگز وعدہ پورا کرنے کا ارادہ نہیں یہاں تک کہ (اگر (بالعسر و عنبر) یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے جاویں تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا (یعنی کفر و نافرمانی) اور یقیناً یہ (اُن وعدوں میں) بالکل جھوٹے ہیں (یعنی نہ اس وقت ایفاء سے وعدہ کا قصد نہ دنیا میں جا کر ایفاء سے وعدہ کا اُن سے احتمال ہے) اور یہ (منکرین) کہتے ہیں کہ زندگی اور کہیں نہیں! بس یہی دنیا کی زندگی اور ہم (اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد پھر) زندہ نہ کئے جا دیں گے، (جیسا کہ انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں) اور اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا عجیب واقعہ نظر آوے) جب کہ یہ اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑے کئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے فرماوے گا کہ (کہو) کیا یہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا) امر واقعی نہیں وہ کہیں گے بیشک (واقعی ہے) قسم اپنے رب کی اللہ تعالیٰ فرماوے گا تو اب اپنے کفر کا مزہ چکھو (اس کے بعد دوزخ میں بھیج دیئے جاویں گے) بے شک (سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملنے کی (یعنی قیامت کے روز زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی کی) تکذیب کی (اور یہ تکذیب ٹھوڑے دنوں کی) یہاں تک کہ جب وہ معین وقت (یعنی قیامت کا دن مع مقدمات) ان پر دفعۃً (بلا اطلال) آپہونچے گا (اس وقت سارے دعوے اور تکذیب ختم ہو جاویں گے اور کہنے لگیں گے ہائے افسوس ہماری کوتاہی (اور غفلت) پر جو اس (قیامت) کے بارگاہ

(ہم سے) ہوئی اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے (کفر و نافرمانی کا) بار اپنی کمر پر لادے ہوئے ہوں گے، خوب سُن لو کہ بُری ہوگی وہ چیز جس کو اپنے اوپر لادیں گے، اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز لعب و لہو کے (بوجہ غیر نافع اور غیر باقی ہونے کے) اور کچھ لاکھ پر ہیز گاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سوچتے نہیں۔

معارف و مسائل

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: توحید، رسالت، عقیدہ آخرت، باقی سب عقائد انہی تین کے تحت داخل ہیں، اور یہ وہ اصول ہیں جو انسان کو اس کی اپنی حقیقت اور مقصد زندگی سے رُوشناس کر کے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک سیدھی اور صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، ان میں بھی عملی طور پر عقیدہ آخرت اور اس میں حساب جزاء و سزا کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رُخ ایک خاص طرف پھیر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام مضامین انہی تین میں دائر رہتے ہیں۔ مذکورہ آیات میں خصوصیت کے ساتھ آخرت کے سوال و جواب، وہاں کے شدید و مدید ثواب و عذاب کا اور دنیا سے ناپائیدار کی حقیقت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں مجرمین منکرین کا یہ حال بیان فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں جب ان کو دوزخ کے کنارے کھڑا کیا جائے گا اور وہ دہم و خیال سے بھی زیادہ ہولناک عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو وہ یہ تمنا ظاہر کریں گے کہ کاش ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جاتا تو ہم اپنے رب کی بھیجی ہوئی آیات اور احکام کی تکذیب نہ کرتے بلکہ ان پر ایمان لاتے اور مؤمنین میں داخل ہو جاتے۔

دوسری آیت میں علیم و خبیر حکم الحاکمین نے ان کی اس گھبرائی ہوئی تمنا کا پول اس طرح کھولا کہ ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ جیسے ہمیشہ سے جھوٹ کے عادی تھے وہ اپنے اس قول اور تمنا میں بھی جھوٹے ہیں، اور بات اس کے سوا نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو حقائق ان کے سامنے لائے گئے تھے اور یہ لوگ ان کو جاننے پہچاننے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے یا دنیا کی طمع خام کی وجہ سے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیا کرتے تھے آج وہ سب ایک ایک کر کے ان کے سامنے آ گئے، اللہ جل شانہ کی یکتائی اور قدرت کاملہ کے مظاہر آنکھوں سے دیکھے، انبیاء علیہم السلام کی سچائی کا

مشاہدہ کیا، آخرت میں دوبارہ زندہ ہونے کا مسئلہ جس کا ہمیشہ انکار رہتا تھا اب حقیقت بنکر سامنے آگیا، جزاء و سزا کا مظاہرہ دیکھا، دوزخ کا مشاہدہ کیا تو اب ان کے پاس کوئی حجت ^{لغت} کی باقی نہ رہی، اس لئے یوں ہی کہنے لگے کہ کاش ہم پھر دنیا میں واپس ہو جاتے، تو مؤمن ہو کر لوٹتے لیکن اُن کے پیدا کرنے والے علیم وخبیر مالک نے فرمایا کہ اب تو یہ ایسا کہہ رہے ہیں لیکن بالعرض ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے، تو وہ پھر اپنے اس قول و قرار کو بھول جائیں گے اور پھر سب کچھ وہی کریں گے جو پہلے کیا تھا، اور جن حرام چیزوں سے ان کو روکا گیا تھا یہ پھر ان میں مستلّا ہو جائیں گے، اس لئے ان کا یہ کہنا بھی ایک جھوٹ اور فریب ہے۔

ان کے اس قول کو جھوٹ فرمانا مال کار کے لحاظ سے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جواب دعد کر رہے ہیں کہ اگر دوبارہ دنیا میں لوٹا جائے جائیں تو تکذیب نہ کریں گے، مگر ایسا ہو گا نہیں، یہ وہاں جا کر پھر بھی تکذیب ہی کریں گے، اور اس کذب کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی جو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں سچے ارادہ سے نہیں بلکہ محض دفع الوقتی کے طور پر عذاب سے بچنے کے لئے کہہ رہے ہیں، دل میں اب بھی ان کا ارادہ نہیں۔

تیسری آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا **وَقَالُوا إِنَّا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا**، اس کا عطف عاؤوا پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان کو دوبارہ بھی دنیا میں لوٹا دیا جائے تو پھر دنیا میں پہنچ کر یہی کہیں گے کہ ہم تو اس دنیا کی زندگی کے سوا کسی دوسری زندگی کو نہیں مانتے بس یہیں کی زندگی زندگی ہے، دوبارہ ہم کو زندہ نہیں کیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کو اور پھر حساب کتاب اور جزاء و سزا کو آنکھوں سے دیکھ چکیں گے، تو یہ کیسے ممکن ہو گا کہ پھر یہاں آکر اس کا انکار کر دیں۔

جواب یہ ہے کہ انکار کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ واقع میں ان کو ان واقعات اور حقائق کا یقین نہ رہے، بلکہ جس طرح آج بہت سے کفار و مجرمین اسلامی حقائق کا پورا یقین رکھتے ہوئے محض عناد سے انکار و تکذیب پر جمے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ دنیا میں واپس آنے کے بعد قیام قیامت اور دوبارہ زندگی اور آخرت کے تمام حالات کا پورا یقین رکھنے کے باوجود محض شرارت اور عناد سے پھر تکذیب پر اتر آئیں گے جیسا کہ قرآن کریم نے اسی موجودہ زندگی میں بعض کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار تو کر رہے ہیں
مگر ان کے دلوں میں اس کے حق ہونے کا یقین ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا
أَلْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا

جیسے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو پہچاننا کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود آپ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات اپنے علم ازلی سے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو مؤمن صالح ہو جائیں گے بالکل جھوٹ اور فریب ہے، اگر ان کے کہنے کے مطابق دوبارہ دنیا کو پیدا کر کے ان کو اس میں چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی وہی بدقسمت لوگ رہیں گے جو پہلی زندگی میں کیا تھا۔

تفسیر منطوری میں بحوالہ طبرانی یہ روایت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہو کہ حساب کتاب کے وقت حق تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو میزانِ عدل کے پاس کھڑا کر کے فرمادیں گے کہ اپنی اولاد کے اعمال کا خود معائنہ کریں اور جس شخص کے اعمال صالحہ اس کے گناہوں سے ایک ذرہ بھی بڑھ جائیں تو اس کو آپ جنت میں پہنچا سکتے ہیں، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہو گا کہ میں جہنم کے عذاب میں صرف اسی شخص کو داخل کروں گا جس کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ وہ اگر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو پھر بھی وہی حرکتیں کرے گا جو پہلے کر گیا ہے۔ وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْثَارَهُمْ، روایات حدیث میں ہو کہ قیامت کے روز نیک لوگوں کے اعمال ان کی سواری بن جائے گی، اور بدکاروں کے اعمال بد بھاری بوجھ کی شکل میں ان کے سروں پر لادے جائیں گے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ کفار و فجار میدانِ حشر میں اپنی حبان بچانے کے لئے بوکھلاہٹ کیتے مختلف باتیں کریں گے، کہیں جھوٹی قسمیں کھا جائیں گے کہیں یہ تمنا کریں گے کہ دوبارہ دنیا میں ٹوٹا دیئے جائیں، مگر یہ کوئی نہ کہے گا کہ ہم اب ایمان لائے اور اب نیک عمل کیا کریں گے، کیونکہ حقیقتِ بدابست کے ساتھ ان کے سامنے آجائے گی کہ عالمِ آخرت دارِ عمل نہیں، اور یہ کہ ایمان کی صحت اسی وقت تک ہو جب تک ایمان بالغیب ہو، مشاہدہ کے بعد کی تصدیق تو اپنے مشاہدہ پر عمل ہے، خدا و رسول کی تصدیق نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے ثمرات یعنی دائمی عیش و راحت دنیا میں امن و اطمینان کی حیاتِ طیبہ اور آخرت میں نعمائے جنت حاصل کرنا صرف دنیا کی زندگی کے ذریعہ ہو سکتا ہے نہ اس سے پہلے عالمِ ارواح میں اس کا حصول ممکن ہے اور نہ اس سے گزرنے کے بعد عالمِ آخرت میں اس کی تحصیل ممکن ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ دنیا کی زندگی بہت بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے جس میں یہ عظیم الشان سودا خریدا جاسکتا ہے، اسی لئے اسلام میں

خودکشی حرام اور موت کی دعا یا تمنا کرنا ممنوع ہے، اس میں خدا تعالیٰ کی ایک بھاری نعمت کی ناشکری ہے، بعض بزرگوں کے حالات میں ہے کہ وفات کے قریب مولانا جامیؒ کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔

باد روز زندگی جامی نشد سیرِ غمت

وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتیم

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں اور متحد آیات قرآنیہ میں جو حیات دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے یا احادیث کثیرہ میں دنیا کی جو مذمت آئی ہے اس سے مراد حیات دنیا کے وہ لمحات و ساعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے غفلت میں گزریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی طاعت و ذکر میں گزرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت و دولت نہیں ہے۔

دن وہی دن ہو شب وہی شب ہے

جو تری یاد میں گزر جائے

ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

الدُّنْيَا مَلْعُونٌ وَمَلْعُونٌ	”یعنی دنیا بھی ملعون ہے، اور جو کچھ
مَّا فِيهَا إِلَّا ذِكْرُ اللَّهِ أَوْ عَالَمٌ	اس میں ہو سب ملعون ہو، مگر اللہ کی یاد اور
أَوْ مَعْلَمٌ،	علم یا طالب علم۔“

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو عالم اور طالب علم بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہو جاتے ہیں کیونکہ علم سے وہی علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنے، تو ایسے علم کا سیکھنا اور سکھانا دونوں ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، بلکہ امام جزیؒ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی احکام شریعت کی مطابقت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ ہی میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام، کسب معاش کے تمام جائز طریقے اور دوسری ضروریات جو حدود و شریعت سے باہر نہ ہوں وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں، اہل و عیال، اقرباء و احباب، پڑوسی اور مہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو احادیث صحیحہ میں صدقہ و عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور ذکر اللہ کے سوا کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، اساذ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہ نے خوب فرمایا ہے کہ

بگذر از یادِ گُل و گلبن کہ بچم یاد نیست
در زمین آسمان جز ذکر حق آباد نیست

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس دنیا میں ایسی چیز جو ہر انسان کو حاصل ہے اور سب سے زیادہ قیمتی اور محبوب ہے، وہ اس کی زندگی ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا ایک محدود وقت ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اپنی زندگی کی صحیح حد کسی کو معلوم نہیں کہ ستر سال ہوگی یا ستر گھنٹے، یا ایک سانس کی بھی مہلت نہ ملے گی۔

دوسری طرف یہ معلوم ہو گیا کہ رضائے الہی کی متاع گراںمایہ جو دنیا و آخرت کی راحت و عیش اور ابدی آرام کی ضامن ہے وہ صرف اسی محدود حیات دنیا میں حاصل کی جاسکتی ہے، اب ہر انسان جسکو اللہ تعالیٰ نے عقل و ہوش دیا ہے خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ زندگی کے ان محدود لمحات و ساعات کو کس کام میں خرچ کرنا چاہئے، بلاشبہ عقل کا تقاضا یہی ہوگا کہ اُن قیمتی اوقات کو زیادہ سے زیادہ اس کام میں خرچ کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو، باقی کام جو اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں ان کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جائے۔

ایک حکایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”یعنی عقلمند ہوشیار وہ آدمی ہے جو اپنے	أَتَكْتَسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَرَضِيَ
نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔۔۔۔۔	بِالْكَفَايَةِ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ
اور بقدر کفایت معاش پر راضی ہو جائے	الْمَوْتِ
اور ما بعد الموت کیلئے سارا عمل وقف کر دے	

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزَنُنَا الَّذِي يَفْقَرُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يَكْنُ بُونَا

ہم کو معلوم ہے کہ تجھ کو غم میں ڈالتی ہیں اُن کی باتیں سو وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے

وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَتْ

لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں، اور جھٹلاتے گئے ہیں

رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبِرُواْ عَلَى مَا كُذِّبُواْ وَأَوْذَوْاْ حَتَّىٰ آتَاهُم

بہت سے رسول تجھ سے پہلے صبر کرتے رہے جھٹلانے پر اور ایذا پر یہاں تک کہ پہنچی ان کو

نَصْرٌ نَّاجٍ وَلَا مَبْدَلُ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن

مدد ہماری اور کوئی نہیں بدل سکتا اللہ کی باتیں اور تجھ کو پہنچ چکے ہیں کچھ

نَبَايَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾ وَإِنْ كَانَ كِبَارُكَ إِعْرَاضَهُمْ فَإِنْ

حالات رسولوں کے اور اگر تجھ پر گراں ہے ان کا منہ پھیرنا تو اگر

اَسْتَطَعْتُ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلٰمًا فِي السَّمَاءِ

تجھ سے ہو سکے کہ دھونڈھ نکالے کوئی تھرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں

فَتَأْتِيهِمْ بَايَةٌ وَكُوشًا ۖ وَاللَّهُ لَجَمْعَهُمْ عَلَى الْهُدَى

پھر لائے انکے پاس ایک معجزہ اور اگر اللہ چاہتا تو جمع کر دیتا سب کو سیدھی راہ پر

فَلَا تَكُونُوا مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (٣٥) إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ

سو تو مت ہو تاوانوں میں مانتے دہی ہیں جو

يَسْمَعُونَ وَاللَّهُ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (٣٦)

سنتے ہیں ، اور مردوں کو زندہ کرے گا اللہ پھر اس کی طرف لائے جاویں گے ،

قَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن

در کہتے ہیں کیوں نہیں اُتر می اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف کہہ دی کہ اللہ کو قدرت ہے اس باپ پر

يُنَزِّلُ آيَةً وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾ وَمَا مِنْ

ہاتھ نشانی لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے ، اور نہیں ہے

ذَآبَتِي فِي الْأَرْضِ وَلَا طَيْرٌ يَطِيرُ بِنَجَاحِيهِ إِلَّا أَمَمُ

وئی چلنے والازمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہی اپنے دو بازوؤں سے مگر ہر ایک امت ہے

مَثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِمْ

ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی چیز پھر سب اپنے رب کے سامنے

تَحْشَرُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي

میں ہوں گے ، اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو وہ بہرے اور گونگے ہیں

لَظَلَمْتَ مَنْ يَشَاءُ اللَّهُ يُضِلُّهُ وَمَنْ يَشَاءُ يَجْعَلُهُ عَلَى

تیردلیں جسکو چاہے اللہ لہرا کرے اور جسکو چاہے دال دے

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿٣٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۚ

سیدنی راہ پر، لوہہ دیھو لو راوے تم پر عذاب اللہ

وَأَنْتُمْ السَّاعَةِ أَغْيَرُ اللَّهِ قَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ
 آوے تم پر قیامت کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے بتاؤ اگر تم

۱۔ چار سیاحات کے سفر ناموں اور حوالوں کے ساتھ

صَدِیقِیْنَ ۛۛۛ بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فِیْکَشِفْ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَاءَ

پچھے ہو ، بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر دیکر دیتا ہر اس مصیبت کو جس کے لئے اس کو پکارتے ہو اگر

وَتَلْسَوْنَ مَا تَشْرِکُوْنَ ۛۛۛ

چاہتا ہو اور تم بھول جاتے ہو جن کو شریک کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

کفار کے بیہودہ کلمات پر، ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان (کفار) کے اقوال مغوم کرتے ہیں سو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی غم میں نہ پڑیے بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ (براہ راست) آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا (قصداً) انکار کرتے ہیں، دگو اس سے آپ کی تکذیب بھی لازم آتی ہے مگر ان کا اصل مقصد آیات اللہ کی تکذیب ہی، جیسا کہ ان میں بعض مثلاً ابو جہل اس کے اقرار ہی بھی ہیں، اور جب ان کا اصل مقصد آیات اللہ کی تکذیب ہے تو ان کا یہ معاملہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا، وہ خود ہی ان کو سمجھ لیں گے، آپ کیوں غم میں مبتلا ہوں) اور (کفار کی یہ تکذیب کوئی نئی بات نہیں، بلکہ) بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے، جس پر انھوں نے صبری کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو (طرح طرح) کی ایذا میں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچ گئی (جس سے مخالف مغلوب ہو گئے، اس وقت تک وہ صبری کرتے رہے) اور (اسی طرح صبر کرنے کے بعد آپ کو بھی امداد الہی پہنچے گی، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی باتوں (یعنی رسولوں) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اور امداد کا وعدہ آپ سے ہو چکا ہے، جیسا فرمایا لَا غَلْبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ) اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصص (قرآن میں) پہنچ چکے ہیں (جن سے اللہ کی امداد اور مخالفین کا بالآخر مغلوب ہونا ثابت ہو جاتا ہے) اور حاصل اس تسلی کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہوا کہ ابتدائی چند روزہ صبر کے بعد وہ اپنے رسولوں کو امداد بھیج دیتے ہیں، جس سے دنیا میں بھی حق کا غلبہ ہوتا ہے اور باطل مغلوب ہو جاتا ہے، اور آخرت میں بھی ان کو عزت و فلاح ملتی ہے، آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونے والا ہے، آپ مغوم نہ ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ تمام انسانوں کے ساتھ شفقت و محبت انتہائی تھی، آپ باوجود اس تسلی کے یہ چاہتے تھے کہ یہ مشرکین اگر موجودہ معجزات اور نبوت کے دلائل پر مطمئن ہو کر ایمان نہیں لاتے تو جس قسم کے معجزات کا یہ مطالبہ کرتے ہیں وہی معجزات واقع ہو جائیں، شاید ایمان لے آویں اور اس اعتبار سے ان کا کفر دیکھ کر صبر نہ آتا تھا، اس لئے اگلی آیات میں

اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ بمقتضائے حکمت الہیہ ان کے فرمائشی معجزات واقع نہ کئے جاویں گے، آپ تا چندے صبر کریں، ان کے وقوع کی فکر میں نہ پڑیں، چنانچہ فرمایا وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَيَّ اور اگر آپ کو (منکرین) کا اعراض (دانکار) گراں گذرتا ہے (اور اس لئے جی چاہتا ہے کہ انکے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جاویں) تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں (جانے کو) کوئی سُرنگ یا آسمان میں (جانے کو) کوئی سیڑھی ڈھونڈ سھو (پھر اس کے ذریعہ زمین یا آسمان میں جا کر وہاں سے) معجزہ (فرمائشی معجزوں میں سے) لے آؤ تو (بہتر ہے آپ ایسا) کر لو (یعنی ہم تو ان کی یہ فرمائشیں بوجہ عدم ضرورت اور بمقتضائے حکمت کے پوری نہیں کرتے، اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ مسلمان ہی ہو جاویں تو آپ خود اس کا انتظام کیجئے) اور اللہ کو (تکویناً) منظور ہوتا تو ان سب کو راہ (راست) پیچ کر دیتا (لیکن چونکہ یہ خود ہی اپنا بھلا نہیں چاہتے اس لئے تو بنی اللہ کو یہ منظور نہیں ہوا، پھر آپ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) سو آپ (اس فکر کو چھوڑیئے اور) نادانوں میں سے نہ ہو جائے (امر حق و ہدایت کو تو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو (حق بات کو طلبِ حق کے ارادہ سے) سنتے ہیں اور (اگر اس انکار و اعراض کی پوری سزا ان کو دنیا میں نہ ملی تو کیا ہوا آخر ایک دن) مردوں کو اللہ تعالیٰ قبروں سے زندہ کر کے اٹھا دیں گے، پھر وہ سب اللہ ہی کی طرف (حساب کے لئے) لائے جاویں گے اور یہ (منکر) لوگ (براہِ عناد) کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان پر (ہمارے فرمائشی معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہو اس پر کہ وہ (ایسا ہی) معجزہ نازل فرمادیں، لیکن ان میں اکثر (اس کے انجام سے) بے خبر ہیں، (اس لئے ایسی درخواست کر رہے ہیں) اور وہ انجام یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لادیں گے تو سب فوراً ہلاک کر دیئے جاویں گے لَقَوْلِهِ تَعَالَىٰ وَأَنزَلْنَا مَنَاسِكَ الْفُصْحَىٰ إِلَّا مَرُوءًا، حاصل یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو اس لئے نہیں کہ پہلے معجزات کافی ہیں، لَقَوْلِهِ تَعَالَىٰ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اور ہم جانتے ہیں کہ فرمائشی معجزہ پر بھی ایمان نہ لادیں گے، جس سے فوری عذاب کے مستحق ہو جاویں گے اس لئے حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر نہ کیا جائے، اور آیت کے آخر میں وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْجَاهِلِينَ فرمانا محبت و شفقت کے طور پر ہے، لفظ جہالت عربی زبان میں اس معنی عام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، بخلاف اردو زبان کے، اس لئے اس کا ترجمہ لفظ جہل یا جہالت سے کرنا ادب کے خلاف ہے، اگلی آیات میں تنبیہ کے لئے قیامت اور تمام خلایق کے حشر کا ذکر ہے) اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر (خواہ خشکی میں یا پانی میں) چلتے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی

قسم ایسی نہیں جو کہ (قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنے میں) تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں اور گو یہ سب اپنی کثرت کی وجہ سے عرفاً بے انتہا ہوں، لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں کیونکہ ہم نے (اپنے) دفتر (روح محفوظ) میں کوئی چیز جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے (نہیں چھوڑی) (اگرچہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، ان کا علم ازلی اور محیط ہی کافی ہے لیکن لکھنے کے ذریعے منضبط کر لینا اہنام عامہ کے قریب تر ہے) پھر (اس کے بعد اپنے وقت معین پر) سب (انسان اور جانور) اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جاویں گے (آگے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا مضمون ہے) اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو (حق سننے سے) بہرے (جیسے) اور (حق کہنے سے) گونگے (جیسے) ہو رہے ہیں (اور اس کی وجہ سے) طرح طرح کی ظلمتوں میں (گرفتار) ہیں (کیونکہ ہر کفر ایک ظلمت ہے اور ان میں مختلف قسم کے کفر جمع ہیں پھر ان اقسام کفر کا بار بار تکرار الگ الگ ظلمتیں ہیں) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں (بوجہ اعراض عن الحق کے) بے راہ کرویں اور وہ جس کو چاہیں (اپنے فضل سے) سیدھی راہ پر لگا دیں، آپ (ان مشرکین سے) کہتے کہ (اچھا) یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آپہونچے تو کیا (اس عذاب اور ہول قیامت کو ہٹانے کے واسطے) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم (مشرک کے دعوے میں) سچے ہو تو چاہئے اس وقت بھی غیر اللہ ہی کو پکارو لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا) بلکہ (اس وقت تو) خاص اسی کو پکارنے لگو پھر جس (آفت) کے (ہٹانے) کے لئے تم (اس کو) پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو بٹا بھی دے (اور نہ چاہے تو نہ بھی بٹا دے) اور جن کو تم (اب اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو (اس وقت) ان سب کو بھول بھال جاؤ۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں جو یہ فرمایا ہے **فَاَعْتَمُ لَا يَكُنْ بَوَدَّكَ**، یعنی یہ کفار درحقیقت آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں، اس کا واقعہ تفسیر مظهر سی میں بروایت سدی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دوسرے دارا خنس بن شریق اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی، تو اخنس نے ابو جہل سے پوچھا کہ اے ابوالحکم (عرب میں ابوجہل) ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابوجہل کا لقب دیا گیا، یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی تیسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال صحیح صحیح بتلاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔

ابو جہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمد سچے ہیں، انھوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ

نہیں بولا، لیکن بات یہ ہو کہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو قصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں باقی قریش خالی رہ جائیں اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہو حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے، بیت اللہ کی درباری اور رکنی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے، اب اگر نبوت بھی ہم انہی کے اندر تسلیم کر لیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

ایک دوسری روایت ناجیہ ابن کعب سے منقول ہے کہ ابو جہل نے ایک مرتبہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں آپ پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں، اور نہ ہم آپ کی تکذیب کرتے ہیں ہاں ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جبکہ آپ لائے ہیں (منظری) ان روایات کی بنا پر آیت کو اپنے حقیقی مفہوم میں بھی لیا جاسکتا ہے کہ یہ کفار آپ کی ہتھیں بلکہ آیات اللہ کی تکذیب کرتے ہیں، اور اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کفار اگرچہ ظاہر میں آپ ہی کی تکذیب کرتے ہیں، مگر درحقیقت آپ کی تکذیب کا انجام خود اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کی تکذیب ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھے ایذا پہنچاتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانے کے حکم میں ہے۔ اور چھٹی آیت وَمَا مِنْ دَابَّةٍ سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز انسانوں کے ساتھ تمام جانور بھی زندہ کئے جا دیں گے، اور ابن جریر ابن ابی حاتم اور سیوطی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، پہاڑ اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ جانور نے بے سینگ کے جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اُس کا انتقام اس سے لیا جائے گا، (اسی طرح دوسرے جانوروں کے باہمی مظالم کا انتقام لیا جائے گا) اور جب اُن کے آپس کے حقوق و مظالم کے بدلے اور انتقام ہو چکیں گے، تو ان کو حکم ہوگا کہ سب مٹی ہو جاؤ، اور تمام جانور اسی وقت پھر مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے، یہی وقت ہوگا جبکہ کافر کہے گا: يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرْبًا، یعنی کاش میرا بھی یہی معاملہ ہو جاتا کہ مجھے مٹی بنا دیا جاتا، اور عذاب جہنم سے بچ جاتا۔

اور امام بغویؒ نے ایک دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب اہل حقوق کے حق ادا کئے جائیں گے یہاں کہ بے سینگ کی بکری کا انتقام سینگ والی بکری سے بھی لیا جاوے گا۔ حقوق خلق کی انتہائی اہمیت | یہ سب کو معلوم ہے کہ جانور کسی شریعت اور احکام کے مکلف

نہیں ان کے مکلف صرف انسان اور جن ہیں، اور ظاہر ہے کہ غیر مکلف سے جزاء و سزا کا معاملہ نہیں ہو سکتا، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رب العالمین کے غایت عدل و انصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلویا جائے گا باقی ان کے کسی اور عمل پر جزاء و سزا نہ ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ خلق اللہ کے باہمی حقوق و مظالم کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے آزاد نہیں کیا گیا، مگر افسوس کہ بہت دیندار اور عبادت گزار آدمی بھی اس میں غفلت برتتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَآخَذْنَا بِالنَّبَسَاءِ وَالضَّرَّاءِ

اور ہم نے رسول بھیجے تھے بہت سی امتوں پر تجھ سے پہلے پھر ان کو پکڑا ہم نے سختی میں اور تکلیف

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿۳۲﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن

میں تاکہ وہ گڑ گڑا دیں پھر کیوں نہ گڑ گڑائے جب آیا ان پر عذاب ہمارا ، لیکن

قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

سخت ہو گئے دل ان کے اور بھلے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے ،

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ

پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو انکو کی گئی تھی کھول دی ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک

إِذَا فَرَّخُوا بِمَا أُوتُوا آخَذْنَا بِهِمْ بَعْثَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴿۳۴﴾

کہ جب غش ہوئی ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک پس اس وقت وہ رہ گئے نا امید ،

فَقُطِعَ دَارُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۵﴾

پھرت گئی جسٹ ان ظالموں کی ، اور سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں پالنے والا ہمارے جہان کا

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے آپ سے پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے تھے (مگر انھوں نے ان کو نہ مانا) تو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں (اور اپنے کفر و معصیت سے توبہ کر لیں) سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے (کہ ان کا جرم معاف ہو جاتا) لیکن ان کے قلوب تو (ویسے ہی) سخت (کے سخت) رہے، اور شیطان ان کے اعمالِ بد کو ان کے خیال میں (بدستور) آراستہ (و مستحسن) کر کے دکھاتا رہا، پھر جب وہ لوگ (بدستور) ان چیزوں

کو بھولے (اور چھوڑے) رہے، جن کی ان کو (پنچھیروں کی طرف سے) نصیحت کی جاتی تھی (یعنی ایمانِ اطاعت) تو ہم نے اُن پر (عیش و عشرت کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اتر آگئے (اور غفلت و مستی میں ان کا کفر اور بڑھ گیا) اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً ربّے گمانِ عذاب میں) پکڑ لیا (اور عذاب شدید نازل کیا جس کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے) پھر (اس عذاب کے) ظالم لوگوں کی جڑ (تک) کٹ گئی اور اللہ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے (کہ ایسے ظالموں کا پاپ کٹا جن کی وجہ سے دنیا میں نحوست پھیلی تھی)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں شرک و کفر کا ابطال اور توحید کا اثبات ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے کہ پہلے مشرکین مکہ سے سوال کیا گیا کہ اگر تم پر آج کوئی مصیبت آپڑے، مثلاً خدا تعالیٰ کا عذاب اسی دنیا میں تم پر آجائے، یا موت یا قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہو جائے، تو اپنی دلوں میں غور کر کے بتلاؤ کہ تم اُس وقت اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لئے کس کو پکارو گے اور کس سے امید رکھو گے کہ وہ تمہیں عذاب اور مصیبت سے نجات دلائے، کیا یہ پھر کے خود تراشیدہ بُت یا مخلوق میں سے دوسرے لوگ جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے، اُس وقت تمہارے کام آئیں گے؟ اور تم اُن سے فریاد کرو گے یا صرف ایک اللہ جل شانہ کو ہی اس وقت پکارو گے اس کا جواب کسی ذی ہوش انسان کی طرف سے بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتا جو خود حق تعالیٰ نے ان کی طرف سے ذکر فرمایا کہ اس عام مصیبت کے وقت بڑے سے بڑا مشرک بھی سب بُتوں اور خود تراشیدہ معبودوں کو بھول جائے گا، اور صرف خدا تعالیٰ کو پکارے گا، تو اب نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تمہارے بُت اور وہ معبود جن کو تم نے خدا تعالیٰ کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو ہی اپنا مشکل کشا اور حاجت روا جانتے اور کہتے ہو جب اس بڑی مصیبت کے وقت تمہارے کام نہ آئے اور تمہیں یہ جبرأت و ہمت بھی نہ ہو سکی کہ ان کو اپنی امداد کے لئے بلاؤ، تو پھر اُن کی عبادت اور ان کی مشکل کشائی کس دن کام آئے گی۔

یہ مضمون سابقہ آیات کا خلاصہ ہے، ان میں بطور فرض کے یہ بتلایا گیا کہ تمہارے کفر و شرک اور نافرمانی کی سزا میں تم پر اسی دنیا کی زندگی میں بھی عذاب آسکتا ہے، اور یا عسر و زندگی میں عذاب نہ آیا تو قیامت کا آنا تو یقینی ہے، جہاں انسان کے سب اعمال و افعال کا جائزہ لیا جائے گا، اور جزاء و سزا کے احکام نافذ ہوں گے۔

یہاں قیامت سے مراد متعارف معنی قیامت کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ لفظ ساعت سے اس جگہ قیامت صغریٰ مراد ہو جو ہر انسان کی موت پر قائم ہو جاتی ہے جیسا کہ معروف ہے کہ: **مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ**۔ "یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو آج ہی قائم ہو گئی" کیونکہ قیامت کے حساب و کتاب کا ابتدائی نمونہ بھی قبر و برزخ میں سامنے آجائے گا اور وہاں کی جزاء و سزا کے نمونے بھی یہیں سے شروع ہو جائیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ نافرمانی کرنے والوں کو ان آیات میں متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنی اس نافرمانی کے ساتھ بے فکر ہو کر مت بیٹھو، ہو سکتا ہے کہ اسی دنیا کی زندگی میں تم پر اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب آجائے، جیسا پچھلی امتوں پر آیا ہے، اور یہ بھی نہ ہو تو پھر موت یا قیامت کے بعد کا حساب تو یقینی ہے لیکن اپنی زندگی کے محدود اوقات اور اس میں پیش آنے والے نہایت محدود تجربات پر

پوری دنیا اور پورے عالم کو قیاس کر نیا لے انسان کی طبیعت ایسی چیزوں میں حیلہ جو ہوتی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے انذار اور تنبیہات کو موہوم خیالات کہہ کر ٹال جاتے ہیں، خصوصاً جبکہ ایسے حالات بھی ہر زمانہ میں سامنے آتے ہیں کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی کھلی نافرمانیوں کے باوجود پھول پھل رہے ہیں، دنیا میں مال و دولت، عزت و شوکت

سب کچھ ان کو حاصل ہے، ایک طرف یہ مشاہدہ اور دوسری طرف اللہ کے پیغمبر کی یہ تحریف کہ نافرمانی کرنے والوں پر عذاب آیا کرتے ہیں جب ان دونوں کو ملا کر دیکھتے ہیں تو انکی حیلہ جو طبیعت اور شیطان ان کو یہی سکھاتا ہے کہ پیغمبر کا قول ایک فریب یا موہوم خیال ہے۔ اس کے جواب کے لئے مذکورہ صدر آیات میں حق تعالیٰ پچھلی امتوں کے واقعات

اور ان پر جاری ہونے والا قانون قدرت بیان فرمایا ہے، ارشاد فرمایا: **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَآخَذْنَا هُم بِآلِهَتِهِمْ وَآلِهَتُهُمْ يَتَصَرَّعُونَ**۔

"یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی اپنے رسول و دوسری امتوں کی طرف بھیجے، اور دوسری طرح سے ان کا امتحان لیا گیا، اول کچھ سختی اور تکلیف ان پر ڈال کر یہ دیکھا گیا کہ تکلیف و مصیبت سے گھبرا کر بھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا نہیں، جب وہ اس میں فیل ہوئے اور بجا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے اور سرکشی سے باز آنے کے وہ اور زیادہ اس میں منہمک ہو گئے، تو اب ان کا

دوسری قسم کا امتحان لیا گیا کہ ان پر دنیوی عیش و راحت کے دروازے کھول دیئے گئے اور حیات دنیا سے متعلق ان کو سب کچھ دیدیا گیا کہ شاید یہ لوگ نعمتوں کو دیکھ کر اپنے منعم و محسن کو پہچانیں، اور اس طرح ان کو خدا یاد آئے، لیکن وہ اس امتحان میں بھی ناکام ثابت ہوئے، اپنے محسن و منعم کو پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے وہ عیش و عشرت کی بھول بھلیا میں ایسے کھوئے گئے کہ اللہ اور رسول کے پیغامات و تعلیمات کو یکسر بھلا بیٹھے، اور چند روزہ

عیش میں بدمست ہو گئے تو دونوں طرح کے امتحان و آزمائش میں ناکام رہنے کے بعد ان پر ہر طرح کی حجت تمام ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب میں دفعۃً پکڑ لئے گئے، اور ایسے نیست نابود کر دیئے گئے کہ ان کا سلسلہ نسل بھی باقی نہ رہا، یہ عذاب پچھلی امتوں پر اکثر اس طرح آیا کہ کبھی آسمان سے کبھی زمین سے کبھی کسی دوسری صورت سے ایک عذاب عام آیا اور پوری قوم کی قوم اس میں کھسم ہو کر رہ گئی، نوح علیہ السلام کی پوری قوم کو پانی کے ایسے طوفان عام لے گھیر لیا جس سے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، قوم عاد پر ہوا کا شدید طوفان آٹھ دن تک مسلسل رہا جس سے ان کا کوئی فرد باقی نہ بچا، قوم ثمود کو ایک خوفناک آواز کے ذریعہ تباہ کر دیا گیا، قوم لوط علیہ السلام کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا جو آج تک اردن کے علاقہ میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے جس میں کوئی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحر میت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور بحر کوط کے نام سے بھی۔

غرض پچھلی امتوں کی نافرمانیوں کی سزا اکثر تو ان مختلف قسم کے عذاب کی شکل میں آئی جس میں بیک وقت پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ بظاہر طبعی موت سے مر گئے اور آگے کوئی اُن کا نام لینے والا بھی باقی نہ رہا۔

آیت مذکورہ میں یہ بھی بتلادیا کہ اللہ رب العالمین کسی قوم پر عذاب عام دفعۃً نہیں بھیجتے بلکہ بطور تنبیہ کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں، جن کے ذریعہ سعید و نیک نجات لوگ اپنی غفلت سے باز آکر صحیح راستہ پر لگ سکیں، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تکلیف اور مصیبت دنیا میں بطور سزا کے دی جاتی ہے اس کی صورت اگرچہ سزا کی ہوتی ہے لیکن حقیقت اس کی بھی سزا نہیں ہوتی، بلکہ غفلت سے جو نیکانے اور بیدار کرنے کے لئے ہوتی ہے، جو عین تقاضا رحمت ہے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے وَ لَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ یعنی ہم ان کو عذاب اکبر چکھانے سے پہلے ایک عذاب ادنیٰ چکھاتے ہیں تاکہ وہ اب بھی حقیقت کو سمجھ کر اپنے غلط راستہ سے باز آجائیں ۝

اپنی آیات سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ یہ دنیا تو دارالجزا نہیں بلکہ دارالعمل ہے، یہاں تو نیک و بد اور خیر و شر ایک ہی پلے میں ملتے ہیں، بلکہ بد نیکوں سے اچھے رہتے ہیں، پھر اس دنیا میں سزا جاری ہونے کا کیا مطلب ہے؟ جواب واضح ہے کہ اصل جزاء و سزا تو اسی روز قیامت میں ہوگی، جس کا نام ہی یوم الدین یعنی روز جزا ہے، لیکن کچھ تکلیفیں بطور نمونہ عذاب کے، اور کچھ راحتیں بطور نمونہ ثواب کے اس دنیا میں بمقتضائے رحمت بھیج دی جاتی ہیں، اور بعض

عارفین نے تو یہ فرمایا ہے کہ دنیا کی جتنی لذتیں اور راحتیں ہیں، وہ بھی سب بخیر ہیں جنت کی راحتوں کا، تاکہ انسان کو ان کی طرف رغبت پیدا ہو، اور جتنی تکالیف پریشانیاں رنج و غم اس دنیا میں ہیں وہ بھی سب کے سب بخیر ہیں عذابِ آخرت کے، تاکہ انسان کو ان سے بچنے کا اہتمام پیدا ہو، ورنہ بغیر کسی نمونہ کے نہ کسی چیز کی طرف کسی کو رغبت دلائی جاسکتی ہے اور نہ کسی چیز سے ڈرایا جاسکتا ہے۔

الغرض دنیا کی راحت و کلفت درحقیقت سزا و جزا نہیں، بلکہ سزا و جزا کے نمونے ہیں اور یہ پوری دنیا آخرت کا شوروم ہے جس میں تاجر اپنے مال کے نمونے دکھانے کے لئے دکان کے سامنے لگاتا ہے، کہ ان کو دیکھ کر خریدار کو رغبت پیدا ہو، معلوم ہوا کہ دنیا کا رنج و راحت درحقیقت سزا و جزا نہیں بلکہ خالق سے کٹی ہوئی مخلوق کا رشتہ پھر اپنے خالق سے جوڑنے کی ایک تہ بڑی حلق را با تو چسبید بخوگسند

تا ترا ناچار رواں سوگسند

خود آیت مذکورہ کے آخر میں بھی اس حکمت کا ذکر لکھا ہے تَنْصَرَفُونَ كُنْ كُنْ كُنْ فرمایا گیا ہے، یعنی ہم نے اُن پر جو محنت و مصیبت دنیا میں ڈالی اس کا منشاء درحقیقت عذابِ دنیا تھا بلکہ یہ تھا کہ مصیبت میں طبعی طور پر ہر شخص کو خدا یاد آیا کرتا ہے، اس لئے اس محنت میں ڈال کر اپنی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو تکلیف و مصیبت بطور عذاب کے بھی کسی شخص یا جماعت پر آتی ہے اس میں بھی ایک پہلو سے رحمتِ الہی کا کار فرما ہوتی ہے۔ اس کے بعد تیسری آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ کہ جب ان کی نافرمانی حد سے گزرنے لگی تو اب ایک خطرناک آزمائش میں ان کو مبتلا کیا گیا..... کہ ان پر دنیا کی نعمتوں و راحتوں اور کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اس میں اس بات پر عام انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا میں کسی شخص یا جماعت پر عیش و عشرت کی فراوانی دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیں، کہ یہی لوگ صحیح راستہ پر ہیں، اور یہی کامیاب زندگی کے مالک ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ حالت اُن مبتلائے عذاب نافرمانوں کی بھی ہوتی ہے، جن کو سخت سزا میں دفعۃً پکڑنا طے کر لیا جاتا ہے۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم یہ دیکھو کہ کسی شخص پر نعمت و دولت برس رہی ہے، حالانکہ وہ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں پر جما ہوا ہے، تو سمجھ لو کہ اس کے ساتھ استدراج ہو رہا ہے، یعنی اس کی عیش و عشرت اس کو سخت عذاب میں پکڑے جانے کی ایک علامت ہے (رواہ احمد عن عقبۃ ابن عامر کذا فی تفسیر ابن کثیر)

اور امام تفسیر ابن جریر نے بروایت عبادہ ابن صامتؓ نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ:

”جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا اور بڑھانا چاہتے ہیں تو دو وصف ان میں پیدا کر دیتے ہیں، ایک ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی اور دوسرے عفت اور عصمت، یعنی خلاف حق چیزوں کے استعمال سے پرہیز، اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں تو ان پر خیانت کے دروازے کھول دیتے ہیں یعنی وہ اپنی خیانتوں اور بد عملیوں کے باوجود دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں۔“

آخری آیت میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب عام آیا تو ظالموں کی نسل تک قطع کر دی گئی، اور اس کے آخر میں فرمایا: **وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ**، جس میں اشارہ کیا کہ مجرموں اور ظالموں پر جب کوئی عذاب و مصیبت آئے تو پورے عالم کے لئے ایک نعمت ہے جس پر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ

تو کہہ دیجھو تو اگر چھین لے اللہ تمھارے کان اور آنکھیں اور ہر کردے

قُلُوبَكُمْ مِّنْ أَلَةٍ غَيْرِ اللَّهِ يَأْتِيَكُم بِهِ أَنْظِرْ كَيْفَ نَصَرْتُ

تمھارے دلوں پر تو کون ایسا رب ہو اللہ کے سوا جو تم کو یہ چیزیں لادے دیکھ ہم کیونکر طرح طرح سے

الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصُدُّونَ ۝۳۶ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَشْكُرَ

بیان کرتے ہیں باتیں پھر بھی وہ کنارہ کرتے ہیں تو کہہ دیجھو تو اگر آوے تم پر

عَذَابُ اللَّهِ بَعْتَهُ أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الظَّالِمُونَ ۝۳۷

عذاب اللہ کا اچانک یا ظاہر ہو کر تو کون ہلاک ہوگا ظالم لوگوں کے سوا،

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مَبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ فَمَنْ آمَنَ

اور ہم رسول نہیں بھیجتے مگر خوشی اور ڈر سنانے کو پھر جو کوئی ایمان لایا

وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۳۸ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا

اور سنور گیا تو نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں اور جنھوں نے جھٹلایا

بِآيَاتِنَا يَمْسِكُهمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝۳۹

ہماری آیتوں کو ان کو پہنچے گا عذاب اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ یہ بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری شنوائی اور بینائی بالکل لے لے
 دے کہ نہ تم کو کچھ سنا سی دے نہ دکھائی دے، اور تمہارے دلوں پر ہر لگا دے (کہ تم دل سے کسی چیز کو
 سمجھ نہ سکو) تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود ہے کہ یہ (چیزیں) تم کو پھر دے دے (جب تمہارے
 اقرار سے بھی کوئی ایسا نہیں پھر کیسے کسی کو مستحق عبادت سمجھتے ہو) آپ دیکھتے تو کہ ہم کس
 (کس) طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے ظاہر کر رہے ہیں (پھر بھی ان دلائل میں غور اور ان کے نتیجہ
 کو تسلیم کرنے سے) یہ اعراض (بے رخی) کرتے ہیں، آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ یہ بتلاؤ اگر تم پر
 اللہ کا عذاب آپڑے خواہ بے خبری میں یا ہوشیاری میں تو کیا بجز ظالم لوگوں کے (اس عذاب سے)
 اور بھی کوئی ہلاک کیا جاوے گا (مطلب یہ ہے کہ اگر عذاب آیا وہ تمہارے ظلم کی وجہ سے تم پر ہی
 پڑے گا، مؤمن بچے رہیں گے، اس لئے تم کو ہوش کرنا چاہئے، اور مرگ انبواہ جتنے دار کا سہارا بھی
 بھول جانا چاہئے کہ اگر عذاب آہی گیا تو اس میں ہمارے ساتھ مسلمان بھی تو مبتلا ہوں گے) اور ہم
 پیغمبروں کو (جن کی پیغمبری دلائل قاطعہ سے ثابت کر چکے ہیں) صرف اس واسطے بھیجا کرتے ہیں
 کہ وہ (ایمان اور اطاعت کرنے والوں کو رضائے الہی اور نعمائے جنت کی) بشارت دیں اور
 (کفر و معصیت کرنے والوں کو اللہ کی ناراضی سے) ڈراویں (اس لئے نہیں بھیجتے کہ حجت تمام
 ہو جانے کے بعد بھی مخالفین از راہ عناد ان سے جو دہی تباہی فرمائشیں کیا کریں وہ سب کو پورا
 کر کے دکھایا کریں) پھر (ان پیغمبروں کی بشارت اور ڈرانے کے بعد) جو شخص ایمان لے آئے
 اور (اپنی حالت کی اعتقاد اور عملاً) اصلاح کر لے تو ان لوگوں پر (آخرت میں) کوئی اندیشہ
 نہیں اور نہ وہ وہاں مغموم ہوں گے، اور جو لوگ (اس تبشیر و انداز کے بعد بھی) ہماری آیتوں
 کو جھوٹا بتلاویں ان کو (بعض اوقات تو دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو ضرور) عذاب لگتا ہی ہو
 اس کے کہ وہ دائرۃ ایمان سے نکل جاتے ہیں۔

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں جانوں غیب کی بات

أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنِ اتَّبَعُوا إِلَّا مَا يُوْحِي إِلَيَّ ط قُلْ هَلْ

اور نہ میں کہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں میں اسی پر چلتا ہوں جو میری پاس اللہ کا حکم آتا ہے تو کہہ دے کب

يَسْتَدِينِي إِلَّا عَصِيَ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝ وَأَنْذِرْ بِهِ

براہر ہو سکتا ہو اندھا اور دیکھنے والا سو کیا تم غور نہیں کرتے اور خبردار کر دے اس

الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ

قرآن سے ان لوگوں کو جن کو ڈر ہو اس کا کہ وہ جمع ہوں گے اپنے رب کے سامنے اس طرح پر کہ اللہ کے سوا

دُونِیہ ولیّ وَلَا شَفِیعٌ لَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۵۱﴾

نہ کوئی ان کا حمایتی ہوگا اور سفارش کرنی والا، تا کہ وہ بچتے رہیں

خلاصہ تفسیر

آپ (ان معاند لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے تمام خزانے ہیں (کہ جو کچھ مجھ سے مانگا جائے وہ اپنی قدرت سے دیدوں) اور نہ میں تمام غیب کی چیزوں کو جانتا ہوں (جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے) اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے (جس میں مقتضائے وحی پر خود عمل کرنا بھی داخل ہے اور دوسروں کو دعوت دینا بھی، جیسا کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی حال تھا، پھر) آپ ان سے کہتے کہ اندھا اور بینا کہیں برابر ہو سکتا ہے (اور جب یہ بات سب کو مسلم ہے) تو کیا تم (آنکھوں والا بننا نہیں چاہتے اور اس تقریر مذکور میں) غور (کامل بقصد طلب حق) نہیں کرتے (کہ حق واضح ہو جائے اور تم بیناؤں میں داخل ہو جاؤ) اور اگر (اس پر بھی وہ عناد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث مباحثہ بند کر دیجئے اور آپ کا جو اصلی کام ہے تبلیغ رسالت کا اس میں مشغول ہو جائیے اور) ایسے لوگوں کو (کفر و معصیت پر عذاب الہی خاص طور پر) ڈراتے (جو اعتقاداً یا کم از کم احتمالاً) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں (کہ قیامت میں) اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جاویں گے کہ اللہ کے سوا جس جس کو مددگار یا سفارش کرنے والا کفار نے سمجھا تھا اس وقت ان میں سے) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی (مستقل) شفاعت کرنے والا، شاید یہ لوگ (عذاب سے) ڈر جاویں (اور کفر و معصیت سے باز آجائیں)۔

معارف و مسائل

کفار عرب کی طرف سے فراموشی | کفار مکہ کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار معجزات کا معاندانہ مطالبہ | معجزات اور اللہ تعالیٰ کی آیات بینات کا ظہور ہو چکا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بحالت یتیمی دنیا میں تشریف لانا لکھنے پڑھنے سے بالکل

الگ ایک اُمّی محض ہو کر رہنا، ایسی زمین میں پیدا ہونا جس کے آس پاس بھی نہ کوئی عالم تھا نہ علمی مرکز، عمر شریف کے چالیس سال اسی اہمیت محضہ کے عالم میں سائے اہل مکہ کے سامنے رہنا، پھر چالیس سال کے بعد دفعۃً آپ کی زبان مبارک سے ایسا محیر العقول حکیمانہ کلام جاری ہوا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام بلغاء عرب کو چیلنج دے کر ہمیشہ کے لئے ان کے مونہوں پر مہر لگا دی، اور جس کے حکمت پر درمعانی اور قیامت تک کی ضروریات انسانی کی رعایت کے ساتھ انسان کامل کی زندگی کا ایسا نظام عمل جس کو انسانی عقل و دماغ ہرگز مرتب نہیں کر سکتا، نہ صرف نظری اور فکری حیثیت سے جمع کر کے پیش کیا، بلکہ عملی طور پر بھی دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ رائج کر کے دکھلا دیا، اور وہ انسان جو اپنی انسانیت کو بھلا کر بیل، بکری، گھوڑے، گدھے کی طرح اپنی زندگی کا مقصد صرف کھانے، پینے، سونے، جاگنے کو قرار دے چکا تھا، اس کو صحیح انسانیت کا سبق دیا، اس کا بیج اس بلند مقصد کی طرف پھیر دیا جس کے لئے اس کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر دور اور اس میں پیش آنے والے عظیم القدر وقائع میں سے ہر ایک ایک مستقل معجزہ اور آیت الہیہ تھی، جس کے بعد کسی انصاف پسند عقلمند کے لئے مزید کسی آیت و معجزہ کے طلب کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔

لیکن کفار قریش نے اس کے باوجود دوسری قسم کے معجزات اپنی خواہش کے مطابق طلب کئے، ان کے مطلوبہ معجزات میں سے بھی بعض کو حق تعالیٰ نے واضح طور پر عمل میں لا کر دکھلا دیا، چاند کے داؤ ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا تھا، شوق قمر کا حجب نہ نہ صرف قریش نے بلکہ اس وقت کی دنیا میں رہنے والوں کی بڑی تعداد نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

لیکن اُن کے مطالبہ کے موافق ایسا عظیم الشان معجزہ ظاہر ہونے کے باوجود وہ اپنے اسی کفر و ضلالت اور ضد و عناد پر جمے رہے اور اللہ تعالیٰ کی اس آیت بینہ کو اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّؤْتٰیْہُمْ کہہ کر نظر انداز کر دیا، اور ان سب چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے بوجھنے کے باوجود اُن کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روزِ نثرِ معجزات کا مطالبہ رہتا تھا، اور جیسا کہ پچھلی آیتوں میں گزرا ہے: لَوْ لَا نَزَّلَ عَلَیْہِ اٰیٰۃٌ مِّنْ رَبِّہٖ قُلْ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیٰۃً وَلٰکِنْ اَکْثَرُہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ہ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم، سچ مچ اللہ کے رسول ہیں تو ان کا کوئی معجزہ کیوں ظاہر نہیں ہوتا، قرآن نے ان کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم

دیا کہ آپ ان لوگوں کو بتلا دیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، اس نے جس طرح تمہارے مانگے بغیر خود ہی بے شمار آیات بنیات اور معجزات نازل فرمادیے، اسی طرح وہ تمہارے مطلوبہ معجزات بھی نازل فرما سکتا ہے۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عادتہ اللہ اس بارے میں یہ ہو کہ جب کسی قوم کا مطلوبہ معجزہ دکھلا دیا جائے اور پھر وہ اس پر بھی ایمان نہ لائیں تو ان کو فوری عذاب میں پکڑ لیا جاتا ہے، اس لئے قوم کی مصلحت اس میں تھی اور ہے کہ ان کے مطلوبہ معجزات ظاہر نہ کئے جائیں، مگر بہت سے لوگ جو اس دقیق حکمت سے جاہل و بے خبر ہیں، ان کا اصرار یہی رہتا ہے کہ ہمارا مطلوبہ معجزہ دکھلایا جائے۔

مذکورہ صدر آیات میں ان لوگوں کے ایسے ہی سوالات و مطالبات کا جواب ایک خاص انداز سے دیا گیا ہے۔

کفارِ مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اوقات میں تین مطالبے پیش کئے تھے، اول یہ کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو بذریعہ معجزہ ہمارے لئے تمام دنیا کے خزانے جمع کرا دیجئے، دوسرے یہ کہ اگر آپ واقعی سچے رسول ہیں تو ہمارے مستقبل میں پیش آنے والے تمام مفید یا مضر حالات و واقعات بتا دیجئے، تاکہ ہم مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر صورتوں سے بچنے کا انتظام پہلے ہی کر لیا کریں، تیسرے یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری ہی قوم کا ایک انسان جو ہماری ہی طرح ماں باپ سے پیدا ہوا، اور تمام بشری صفات کھانے پینے، بازاروں میں پھرنے وغیرہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے وہ اللہ کا رسول بن جائے، کوئی فرشتہ ہوتا جس کی تخلیق اور اوصاف ہم سب سے ممتاز ہوتے، تو ہم اس کو خدا تعالیٰ کا رسول اور اپنا پیشوا مان لیتے۔

ان تینوں سوالات کے جواب میں ارشاد ہوا: **قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنِّي أَنْتُمْ إِلَّا مَا يُوْحِي إِلَيَّ** یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ ان لوگوں کے لایعنی سوالات کے جواب میں آپ ان سے صاف کہہ دیجئے کہ تم جو مجھ سے خزانے دنیا کا مطالبہ کرتے ہو تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب خزانے میرے ہاتھ میں ہیں، اور تم جو یہ مطالبہ کرتے ہو کہ مستقبل میں پیش آنے والے ہر مفید یا مضر معاملہ اور واقعہ کو میں تمہیں بتلا دوں تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں ہر غیب کی چیز کو حانتا ہوں، اور تم جو مجھ میں فرشتوں کی مخصوص صفات دیکھنا چاہتے ہو، تو میں نے کب کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجھ سے دلیل اس چیز کی مانگی جاسکتی ہے جن کا میں نے دعویٰ کیا ہے

یعنی یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اس کی بھیجی ہوئی ہدایات انسانوں کو پہنچاتا ہوں اور خود بھی ان کا اتباع کرتا ہوں، دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں، چنانچہ اس کے لئے ایک دو نہیں بے شمار واضح دلائل پیش کئے جا چکے ہیں۔

اس دعویٰ رسالت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کے سب خزانوں کا مالک ہو جائے، اور نہ یہ ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرح غیب کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے واقف ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ انسانی اور بشری صفات سے جدا کوئی فرشتہ ہو، بلکہ رسول کا منصب صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کا اتباع کرے، جس میں خود اس پر عمل کرنا بھی داخل ہے، اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دینا بھی۔ اس ہدایت نامہ سے منصب رسالت کی حقیقت کو بھی واضح فرما دیا گیا، اور رسول کے بارے میں جو غلط تصورات ان لوگوں نے قائم کر رکھے تھے ان کا ازالہ بھی کر دیا گیا، اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ عیسائیوں کی طرح اپنے رسول کو خدا نہ بنائیں اور خدائی کا مالک نہ قرار دیں، ان کی عظمت و محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کے متعلق یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط میں اور غلو میں نہ پڑ جائیں، کہ یہود نے تو اپنے انبیاء کے قتل تک سے گریز نہ کیا، اور نصاریٰ نے اپنے رسول کو خدا بنا دیا۔

اس کے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے ہاتھ میں نہیں ان خزانوں سے کیا مراد ہے؟ علماء تفسیر نے بہت سی چیزوں کے نام لئے ہیں، مگر خود قرآن کریم نے جہاں اللہ کے خزانوں کا ذکر کیا ہے تو اس میں فرمایا ہے: ذَٰلَکَ اَنْزَلْنَا مِنْ سَمٰوٰتِنَا مَآءً فَخَرَجَ مِنْهَا شَجَرٌ اَوْسَدٌ اَنْجَلٌ، یعنی کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خزانے اللہ کا مفہوم دنیا کی تمام چیزوں پر حاوی ہے کچھ خاص چیزوں کو متعین نہیں کیا جاسکتا، اور جن حضرات مفسرین نے مخصوص چیزوں کے نام لئے ہیں وہ بھی بطور مثال کے ہے، اس لئے اختلاف کچھ نہیں، اور جب اس آیت نے یہ بتلادیا کہ خدائی کے سارے خزانے سید الرسل امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں بھی نہیں ہیں تو پھر امت کے کسی بزرگ یا ولی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جسکو جو چاہیں دے سکتے ہیں کھلی ہوئی جہالت ہے۔

آخری جملہ میں فرمایا وَلَا اَقْرَبُ اِلٰیَّ مِنْکُمْ اِلٰیَّ یعنی میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں جس کی وجہ سے تم بشری صفات کو دیکھ کر رسالت کا انکار کرتے ہو۔ درمیانی جملہ میں طرز کلام بدل کر بجائے اس کے کہ اَقُوْلُ لَکُمْ اِلٰیَّ اَعْلَمُ الْغِیْبِ

فرمایا جاتا، یعنی یہ کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں غیب کو جانتا ہوں، ارشاد یوں فرمایا گیا کہ
وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ یعنی میں غیب کو نہیں جانتا۔

ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں اس طرز کلام کے بدلنے کی ایک لطیف توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تمام خدائی خزانوں کا مالک ہونا یا نہ ہونا، اسی طرح کسی شخص کا فرشتہ ہونا یا نہ ہونا یہ چیزیں تو مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں، مخاطب لوگ بھی سب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے سب آپ کے ہاتھ میں نہیں، اور آپ فرشتہ بھی نہیں، محض عناد سے اس کا مطالبہ کرتے تھے، اُن کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میں خزانے اللہ کا مالک ہوں یا یہ کہ میں فرشتہ ہوں۔

لیکن علم غیب کا مسئلہ ایسا نہ تھا، کیونکہ وہ لوگ اپنے نجومیوں، کاہنوں کے بارے میں بھی اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ غیب کو جانتے ہیں، تو اللہ کے رسول کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا کچھ مستبعد نہ تھا، خصوصاً جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے انھوں نے بہت سی غیب کی خبریں بھی سنی تھیں اور ان کے مطابق واقعہ ہونے کا مشاہدہ بھی کیا تھا، اس لئے یہاں صرف دعویٰ اور قول کی نفی کرنے کو کافی نہ سمجھا، بلکہ اصل فعل کی نفی کی گئی اور یہ فرمایا وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ، یعنی میں غیب کو نہیں جانتا، اس میں ان کی اس غلط فہمی کو بھی رفع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی یا الہام جن غیب کی چیزوں کا علم کسی فرشتہ یا رسول یا ولی کو دیدیا جائے اصطلاح قرآنی میں اس کو علم غیب یا اس کے جاننے والے کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اس معاملہ میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا تھا، بلکہ تمام فرشتوں اور اولین و آخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے ان سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا فرمایا گیا ہے، یہی پوری امت کا عقیدہ ہے، ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کی بے شمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف و خلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف حق تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفت ہے، جس طرح اس کے خالق و رازق قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو غیب کی لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔ خلاصہ یہ کہ سرور کائنات سید الرسل امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کے کمالات کے بارہ میں بڑا جامع جملہ یہ ہے کہ وہ بعد از خدا بزرگ قوتی قصہ مختصر۔
کمالاتِ علمی میں بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے بعد تمام فرشتوں اور انبیاء و رسل سے آپ کا
علم بڑھا ہوا ہے، مگر خدا تعالیٰ کے برابر نہیں، برابری کا دعویٰ کرنا عیسائیت کے غلو کا راستہ ہے۔
آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے، مطلب یہ ہے کہ نفسانی
جذبات اور ضد و عناد کو چھوڑ کر حقیقت کو دیکھو تاکہ تمہارا شمار اندھوں میں نہ رہے، تم بصیر
اور بینا ہو جاؤ اور یہ بینائی تمہیں ذرا سے غور و فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان واضح
بیانات کے بعد بھی اگر یہ لوگ اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث و مباحثہ کو موقوف
کر دیجئے اور جو اصلی کام ہے رسالت کا یعنی تبلیغ اس میں مشغول ہو جائیے، اور تبلیغ و انذار
کا رخ ان لوگوں کی طرف پھیر دیجئے، جو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پستی اور حساب کتنا
کا عقیدہ رکھتے ہیں، جیسے مسلمان یا وہ جو کم از کم اس کے منکر نہیں، بطور احتمال کے ہی بھی کم از کم ان کو
خطہ تو ہے کہ شاید ہمارے اعمال کا ہم سے حساب لیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے متعلق تین طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ جو یقینی طور پر اس
کے معتقد ہیں، دوسرے وہ جو متردد ہیں، تیسرے وہ جو بالکل منکر ہیں، اور تبلیغ و انذار کا حکم
انبیاء علیہم السلام کو اگرچہ ان تینوں طبقوں کے لئے عام ہے، جیسا کہ بہت سے ارشادات
قرآنی سے واضح ہے، لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے، اس لئے
اس آیت میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی، وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ
يَخَافُونَ أَنْ يُخْشَوْا إِلَىٰ رَبِّهِمْ۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ

اور مت دُور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اس کی

وَجْهَهُ ط مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ

رضا تجھ پر نہیں کہ ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ میرے حساب میں سے ان پر

عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۲﴾ وَكَذَلِكَ

ہے کچھ کہ تو ان کو دُور کرنے لگے پس ہو جاؤ گناہوں کے انصافوں میں اور اسی طرح

فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مِمَّنْ آتَاهُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ

ہم نے آزمایا کہ بعض لوگوں کو بعضوں سے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا

بَيْنَاظَ الْكَيْسِ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ﴿٥٣﴾ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ

ہم سب میں کیا نہیں ہر اللہ خوب جاننے والا شکر کرنے والوں کو، اور جب آویں تیرے پاس

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا قُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ

ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ دے تو سلام ہے تم پر لکھ لیا ہر تمھارے رب نے اپنے اوپر

الرَّحْمَةَ لَا أَنَّهُ مَن عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا أَوْ جَهَالَةً ثُمَّ تَابَ مِنْهُ

رحمت کو کہ جو کوئی کرے غم میں سے بُرائی، ناواقفیت سے پھر اس کے بعد توبہ کر لے

بَعْدَهُ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٤﴾ وَكَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْآيَاتِ

اور نیک ہو جاوے تو بات یہ ہے کہ وہ ہر بخشنے والا مہربان اور اس طرح ہم تفصیل سے بیان

وَلِلسَّيِّئِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٥٥﴾

کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جاوے طریقہ گنہگاروں کا

خلاصہ تفسیر

اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالنے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام بدوام مناسبتاً) اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، جس سے صرف اللہ کی رضا ہی کا قصد رکھتے ہیں (اور کوئی غرض جاہ و مال کی نہیں، یعنی ان کی عبادت میں مدد و امت بھی ہے اور اخلاص بھی، اور اخلاص اگرچہ امر باطنی ہے مگر آثار و علامات سے پہچانا بھی جاسکتا ہے، اور جب تک عدم اخلاص کی کوئی دلیل نہیں، اخلاص ہی کا گمان رکھنا چاہئے) اور ان (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور (یہ ان کے باطن کی تفتیش کا آپ سے متعلق نہ ہونا ایسا یقینی ہے جیسا کہ آپ کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی ان کے متعلق نہیں کہ آپ ان کو نکال دیں، یعنی اگر ان کے باطنی اخلاص کی تفتیش آپ کے ذمہ ہوتی تو اس کی گنجائش تھی کہ جن کے اخلاص..... کی تحقیق نہ ہو جائے ان کو الگ کر دیں، مگر وہ آپ کے ذمہ نہیں، اور دوسری کوئی وجہ ان کو نکالنے کے جواز کی موجود نہیں، اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مربی ہیں، اور مربی کے لئے اپنے ماتحتوں کے احوال کی تفتیش کرنے کا احتمال ہو سکتا تھا، مگر اس کا عکس کہ وہ لوگ اپنے پیغمبر کے باطنی احوال کی تفتیش کریں، اس کا کوئی احتمال ہی نہیں اس لئے وہ قطعاً منفی ہے، اس جگہ محتمل کو متیقن کے ساتھ برابر قرار دے کر اس کی نفی کی گئی تاکہ اس کا منفی ہونا بھی یقینی ہو جاوے (در نہ ان کے نکالنے سے) آپ نامناسب

کام کرنے والوں میں ہو جاویں گے اور ہم نے جو مؤمنوں کو غریب، کافروں کو ترسیں بنا رکھا ہے جو بظاہر مقتضائے قیاس سے بعید ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) اسی طور پر ہم نے (ان میں سے) ایک (یعنی کفار) کو دوسروں (یعنی مؤمنوں) کے ذریعہ آزمائش میں ڈال رکھا ہے (یعنی اس طرز عمل میں امتحان ہو کفار کا) تاکہ یہ لوگ (مؤمنوں کے متعلق) کہا کریں کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے (انتخاب کر کے) ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا ہے (یعنی اپنے دین اسلام کے لئے ان کو منتخب کیا ہے) کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے (ان غریب لوگوں نے اپنے منعم حقیقی کا حق پہچانا، طلب حق میں لگ گئے، دین حق اور قبول اللہ سے مشرف کئے گئے، اور ان رؤسائے ناشکری اور کفر کیا وہ اس نعمت سے محروم رہے) اور جب وہ لوگ آپ کے پاس آویں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں تو آپ (انکو بشارت سنانے کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہے (یعنی کفار پر جو ہر طرح کی آفات آخرت میں پڑیں گی ان سے تم مامون ہو، اور دوسرے یہ بھی کہ) تمہارے رب نے (اپنے فضل و کرم سے) رحمت کرنا (اور تم کو نعمتیں دینا) اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے (یہاں تک) کہ جو شخص تم میں سے کوئی بُرا کام کر بیٹھے (جو کہ) جہالت سے (ہو جاتا ہے، کیونکہ خلاف حکم کرنا عملی جہالت ہے مگر) پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے (اور آئندہ کو اپنے اعمال کی) اصلاح رکھے (اس میں یہ بھی آگیا کہ اگر وہ توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کر لے) تو اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ (اس کے لئے بھی) بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (کہ گناہ کی سزا بھی معاف کر دیں گے) اور بڑی رحمت کرنے والے ہیں (کہ طرح طرح کی نعمتیں بھی دیں گے) اور (جس طرح ہم نے اس مقام پر مؤمنین اور کفار کے حال و مآل کی تفصیل کر دی، اسی طرح ہم آیات کی (جو کہ دونوں فرقہ کے حال و مآل پر مشتمل ہوں) تفصیل کرتے رہتے ہیں) تاکہ مؤمنین کا طریقہ بھی ظاہر ہو جاوے اور تاکہ مجرمین کا طریقہ (بھی) ظاہر کر دیا جائے (اور حق و باطل کے واضح ہونے سے طالب حق کو معرفت حق آسان ہو جائے)۔

معارف مسائل

نخوت و جاہلیت کا ازالہ اور عزت و ذلت	جن لوگوں نے انسان ہونے کے باوجود انسانیت کو نہیں
کا اسلامی معیار اسلام میں امیر و غریب کا	پہچانا بلکہ انسان کو دنیا کے مختلف جانوروں میں سے
کوئی امتیاز نہیں	ایک ہو شیار جانور قرار دیا، جس نے دوسرے جانوروں
کو اپنا تابع و محکوم بنا کر سب سے خدمت لی، ان کے نزدیک انسان کی تخلیق کا منشاء اس کے	

سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ ایک جانور کی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حیوانی جذبات کو استعمال کرنے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھیں، اور جب مقصدِ زندگی صرف یہی ہو تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس دنیا میں اچھے بُرے، بڑے چھوٹے، باعزت و بے عزت، شریف و رذیل کے پہچاننے کا معیار یہی ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے، پہننے برتنے کا سامان زیادہ ہو وہ کامیاب اور باعزت اور شریف ہے، اور جس کے پاس یہ چیزیں کم ہوں وہ بے عزت، ذلیل اور نامراد و ناکام ہے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ و نظریہ پر اخلاق و اعمالِ صالحہ کی کوئی بحث ہی انسان کے شریف اور معزز ہونے میں نہیں آتی، بلکہ وہی عملِ صالح اور خلقِ خلقِ حسن ہوگا، جس کے ذریعہ یہ حیوانی مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں۔

اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین و مذہب کا پہلا اور آخری سبق یہی رہا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جو دائمی اور غیر منقطع ہوگی، وہاں کی راحت بھی مکمل اور دائمی ہوگی اور تکلیف و عذاب بھی مکمل اور دائمی، دنیا کی زندگی خود مقصد نہیں، بلکہ دوسری زندگی میں جو سامان کام آنے والا ہے اس کی فراہمی اس چند روزہ زندگی کا اصلی مقصد ہے۔

رہا مرنے کی تیاری میں مصروف

برا کام اور اس دنیا میں تھا کیا

اور انسان و حیوان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ حیوانات کو اگلی زندگی کا کوئی فکر نہیں، بخلاف انسان کے کہ اس کی سب سے بڑی فکر اہل عقل و ہوش کے نزدیک دوسری زندگی کی درستی ہے، اسی عقیدہ و نظریہ پر شرافت و رذالت اور عزت و ذلت کا معیار ظاہر ہے کہ زیادہ کھانا پینا یا زیادہ مال و دولت جمع کر لینا نہیں ہوگا، بلکہ اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ ہوں گے، جن پر آخرت کی عزت کا مدار ہے۔

دنیا جس وقت بھی انبیاء علیہم السلام کی ہدایات اور تعلیمات اور عقیدہ آخرت کے غافل ہوئی تو اس کا طبعی نتیجہ سامنے آگیا، کہ عزت و دولت اور شرافت و رذالت کا معیار صرف روٹی اور پیٹ رہ گیا، جو اس میں کامیاب ہو وہ شریف و معزز کہلاتا ہے، جو اس میں ناکام یا ادھورا ہے وہ غریب، بے عزت، رذیل و ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

اس لئے ہر زمانہ میں صرف حیاتِ دنیا کی بھول بھلیاں میں پھنسے ہوئے انسانوں نے مالدار کو معزز و شریف اور غریب و فقیر کو بے عزت و رذیل قرار دیا، حضرت نوح علیہ السلام

کی قوم نے ایمان لانے والے غریب لوگوں کو اسی معیار سے ردیل کہہ کر یہ اعتراض کیا کہ ہم ان ردیل لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی پیغام سنائیں تو ان غریب غیار کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، قَالُوا آتُونَا مِنْ لَدُنْكَ وَاتَّبِعْنَا الْآسَافَ لُدُنْ، یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ پر ایسی حالت میں ایمان لے آئیں جبکہ آپ کے متبعین ردیل قسم کے لوگ ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے اس دل خراش کلام کا جواب مخصوص پیغمبرانہ انداز میں یہ دیا کہ: وَمَا عَلَيَّ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، اِنْ جَسَابُهُمْ اِلَّا عَلَيَّ رَبِّي نُوْتَشْعُرُونَ، یعنی میں ان کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں کہ یہ فیصلہ کرسکوں کہ وہ ردیل ہیں یا شریف معزز، بلکہ ہر شخص کے عمل کی حقیقت اور اس کا حساب میرے رب ہی کو معلوم ہے، جو دلوں کے بھید سے باخبر ہے۔

نوح علیہ السلام نے ان جاہل اور متکبر انسانی شرافت و رذالت کی حقیقت سے نا آشنا لوگوں کا رخ ایک واضح حقیقت کی طرف پھیر کر یہ بتلادیا کہ شریف و ردیل کے الفاظ تم لوگ استعمال کرتے ہو اور ان کی حقیقت سے واقفیت نہیں، بس پیسہ والے کو شریف اور غریب کو ردیل کہنے لگے، حالانکہ شرافت و رذالت کا معیار پیسہ نہیں، بلکہ اعمال و اخلاق ہیں، اس موقع پر حضرت نوح علیہ السلام یہ فرما سکتے تھے کہ اعمال و اخلاق کے معیار پر یہ لوگ تم سے زیادہ شریف و معزز ہیں، لیکن پیغمبرانہ طرز تبلیغ و اصلاح نے اس کی اجازت نہ دی، کہ ایسا جملہ کہیں جس سے مخاطب کو شتعال ہو، اس لئے صرف اتنا فرمادیا کہ رذالت کا مدار تو افعال و اعمال پر ہے اور میں ان کے اعمال سے پوری طرح واقف نہیں، اس لئے ان کے شریف یا ردیل ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

نوح علیہ السلام کے بعد بھی ہر زمانہ میں قوم کے غریب لوگ خواہ وہ اپنے اخلاق و اعمال کے اعتبار سے کتنے ہی شریف اور باعزت ہوں مگر دنیا پرست، نخوت شعار لوگ ان کو حقیر و ذلیل کہتے آئے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی بصیرت اور اخلاق صالحہ کی بنا پر ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں پہل کی، یہاں تک کہ مذاہب مل کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کے نزدیک کسی پیغمبر کی صدق و حقانیت کی ایک دلیل یہ بن گئی کہ ان کے ابتدائی متبعین قوم کے غریب لوگ ہوں، یہی وجہ تھی کہ جب ہر قل شاہ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ دعوت اسلام کے لئے پہونچا اور اس نے آپ کی حقانیت و صدق کی تحقیق کرنا چاہی تو واقف کار لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو سوالات کئے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ اُن کے اکثر متبعین غریب عوام

ہیں یا قوم کے بڑے لوگ؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ غریب لوگ ہیں تو اس نے کہا اہم اتباع الرسول یعنی رسولوں کے ابتدائی متبعین یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پھر یہی سوال کھڑا ہوا، متذکرہ آیات میں اسی کا جواب خاص ہدایات کے ساتھ مذکور ہے۔

ابن کثیرؒ نے امام ابن جریرؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ کفار قریش کے چند سردار عتبہ، شیبہ ابن ربیعہ اور مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل وغیرہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آئے اور کہا، آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سننے اور ماننے سے ہمارے لئے ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ان کے ارد گرد ہر وقت وہ لوگ رہتے ہیں جو یا تو ہمارے غلام تھے، ہم نے ان کو آزاد کر دیا، اور یا وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہی رحم و کرم پر زندگی گزارتے تھے، ان حقیر و ذلیل لوگوں کے ہوتے ہوئے ہم ان کی مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے، آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر ہمارے آنے کے وقت وہ ان لوگوں کو مجلس سے ہٹا دیا کریں، تو ہم ان کی بات سنیں اور غور کریں۔

ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی بات نقل کی تو فاروق اعظمؓ نے یہ رائے دی کہ اس میں کیا حرج ہے، کچھ دنوں کے لئے آپ یہ بھی کر دیکھیں، یہ لوگ تو اپنے بے تکلف مجتہدین ہیں، ان لوگوں کے آنے کے وقت مجلس سے ہٹ جایا کریں گے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، جس میں سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرما دیا گیا، نزول آیت کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو معذرت کرنا پڑی کہ میری رائے غلط تھی۔

اور یہ غریب لوگ جن کے بارے میں یہ گفتگو ہوئی اُس وقت حضرت بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، عمار بن یاسرؓ، سالم مثنویؓ، ابی حذیفہؓ، صباح مثنویؓ، اُسیدؓ، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مقداد ابن عمروؓ، سعود بن القاریؓ، ذوالشمالینؓ وغیرہ صحابہ کرام تھے، جن کی عزت و شرافت کا پروانہ آسمان سے نازل ہوا، اور قرآن میں اسی کے متعلق دوسری جگہ اس کی تاکید ان الفاظ میں آئی،

وَأَصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ
وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ
عَنْ ذِكْرِ فَإِذَا تَبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ اپنے نفس کو ان لوگوں میں باندھ رکھیں جو صبح و شام یعنی ہر وقت اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اخلاص کے ساتھ، آپ اپنی نظریں ان کے سوا کسی پر نہ ڈالتے

جس کی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ حیات دنیا کی زینت مقصود ہو، اور ایسے لوگوں کی بات نہ مانئے جن کے دلوں کو ہم نے اپنے ذکر سے غفلت میں ڈال دیا، اور جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیرو ہو گئے، اور جن کا کام ہی حدود سے بھل جانا ہے۔

آیت مذکورہ میں ان غریب لوگوں کی صفت یہ بتلائی کہ وہ صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس میں صبح و شام سے مراد محاورہ کے مطابق روز و شب کے تمام اوقات ہیں، اور پکارتے سے مراد عبادت کرنا ہے، اور روز و شب کی اس عبادت کے ساتھ یہ قید بھی لگادی کہ یُرِیْوْنَ وَجْهَهُ جِس سے بتلا دیا کہ عبادت میں جب تک اخلاص نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

آخر آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان کا حساب آپ کے ذمہ نہیں، اور آپ کا حساب ان کے ذمہ نہیں، ابن عطیہ اور زحشری وغیرہ کی تحقیق کے مطابق اس میں حَسَابُہُمْ اور عَلَیْہُمْ کی ضمیریں ان رؤساءِ مشرکین کی طرف راجع ہیں، جو غریب مسلمانوں کو مجلس سے ہٹا دینے کی فرمائش کیا کرتے تھے، تو حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا کہ یہ لوگ خواہ ایمان لائیں نہ لائیں آپ بمقابلہ غریب مسلمین کے ان کی پروا نہ کریں، کیونکہ ان کے حساب کی ذمہ داری آپ پر نہیں، جیسا کہ آپ کے حساب کی ذمہ داری ان پر نہیں، اگر یہ ذمہ داری آپ پر ہوتی، یعنی ان کے مسلمان نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ ہوتا، تو اس صورت میں آپ رؤساءِ مشرکین کی خاطر غریب مسلمین کو مجلس سے ہٹا سکتے تھے، اور جب ایسا نہیں تو ان کو مجلس سے ہٹانا کھلی بے انصافی ہے، اگر آپ ایسا کریں تو آپ کا شمار بے انصاف لوگوں میں ہو جائے گا۔ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے اسی طرح ایک کو دوسروں کے ذریعہ

آزمائش میں ڈال رکھا ہے، تاکہ رؤساءِ قریش خدا تعالیٰ کی اس قدرت قاہرہ کا تماشا دیکھیں، کہ غریب مسلمان جن کو وہ حقیر و ذلیل سمجھتے تھے، اللہ کے رسول کا اتباع کرنے سے کس مقام پر پہنچے، اور دنیا و آخرت میں ان کو کیسی عزت حاصل ہوئی، اور وہ یہ کہتے پھریں کہ کیا یہی غریب لوگ اللہ کے انعام و اکرام کے مستحق تھے کہ ہم سب اشراف کو چھوڑ کر ان کو نواز آگیا۔

ہر دیش بر من دل سوختہ لطفِ دگر است

ایں گداہیں کہ چہ شائستہ انعام افتاد

کشاف وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ان کا یہ قول اس ابتلاء و امتحان کا نتیجہ ہے جو ان کا ضعف و مسلمین کے ذریعہ لیا گیا تھا۔ اس امتحان میں ناکام ہوئے، بجائے اس کے کہ قدرت کے اس مظاہرہ پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے کہ شرافت و رذالت، مال و دولت وغیرہ پر موقوف نہیں، بلکہ اس کا مدار اخلاق و اعمال پر ہے، وہ اَللّٰہُ تعالیٰ پر یہ الزام اٹھانے لگو

کہ مستحق اعزاز تو ہم تھے، یہیں چھوڑ کر ان کو اعزاز کیوں دیا گیا؟ حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں پھر ان کو اصل حقیقت کی طرف اس جملہ سے متوجہ فرمایا: **أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ**، یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون لوگ حق شناس اور شکر گزار ہیں، مطلب یہ ہو کہ حقیقت کے اعتبار سے شریف و معزز وہ شخص ہو جو اپنے محسن کا حق پہچانے اور شکر گزار ہو، اور وہی مستحق انعام اکرام ہے نہ کہ وہ جو رات دن اپنے منعم و محسن کی نعمتوں میں کھیلنے کے باوجود اس کی نافرمانی کرتا ہو۔

چند احکام و ہدایات | آیات مذکورہ سے چند احکام و ہدایات مستفاد ہوتی ہیں:

اول یہ کہ کسی کے پھٹے کپڑے یا ظاہری خستہ حالی دیکھ کر اس کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا کسی کو حق نہیں، بسا اوقات ایسے لباس میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے نزدیک نہایت معزز و مقبول ہیں، ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بہت سے شکستہ حال غبار آلود لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اللہ کے مقبول ہیں، اگر کسی کام کے لئے قسم کھا بیٹھیں کہ ایسا ہو گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا فرماتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ شرافت و رفاقت کا معیار محض دنیا کی دولت و ثروت کو سمجھنا انسانیت کی توہین ہے، اس کا اصل مدار اخلاق و اعمال صالحہ پر ہے۔

تیسرے یہ کہ کسی قوم کے مصلح اور مبلغ کے لئے اگرچہ تبلیغ عام بھی ضروری ہو، جس میں موافق مخالف، ماننے والے اور نہ ماننے والے سب مخاطب ہوں، لیکن ان لوگوں کا حق مقدم ہے جو اس کی تعلیمات کو اپنا کر اس پر چل رہے ہوں، دوسروں کی خاطر ان کو مؤخر کرنا یا نظر انداز کرنا جائز نہیں، مثلاً غیر مسلموں کی تبلیغ کے لئے ناواقف مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کو مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔

چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات بقدر شکر گزاری بڑھتے ہیں، جو شخص انعاماتِ الہیہ کی زیادتی کا طالب ہو اس پر لازم ہے کہ قول و عمل سے شکر گزاری کو اپنا شعار بنالے۔

آیت **وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْخَيْرِ** کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں اکثر حضرات نے ان آیات کو آیات سابقہ اور واقعہ سابقہ ہی سے متعلق قرار دیا ہے، اور اس کی تائید میں یہ روایت پیش کی ہے کہ جب رؤساء قریش نے بواسطہ ابوطالب یہ مطالبہ کیا کہ آپ کی مجلس میں غریب اور ادنیٰ درجہ کے لوگ رہتے ہیں، ان کی صف میں بیٹھ کر آپ کا کلام ہم نہیں سن سکتے، اگر ہمارے آنے کے وقت ان لوگوں کو آپ مجلس سے ہٹا دیا کریں تو ہم آپ کا کلام سنیں اور غور کریں۔

اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ مشورہ دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، مسلمان

تو اپنے مخلص دوست ہیں، اُن سے کہہ دیا جائے گا تو کچھ دیر کے لئے وہ مجلس سے ہٹ جایا کریں گے ممکن ہے کہ اس طرح یہ رؤساء قریش اللہ کا کلام سنیں اور مسلمان ہو جائیں۔

لیکن آیات سابقہ میں اس مشورہ کے خلاف یہ حکم نازل ہوا کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے ایسا کرنا ظلم اور بے انصافی ہے، اس حکم کے نازل ہونے پر حضرت فاروق اعظمؓ کو اپنی رائے اور مشورہ کی غلطی واضح ہوئی اور ڈرے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف رائے دے کر گنہگار ہو گیا، اس کی معذرت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔

اس پر آیات متذکرہ ان کی تسلی کے لئے نازل ہوئیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو گزشتہ غلطی پر مواخذہ نہ ہونے سے مطمئن فرمادیں، بلکہ صرف یہی نہیں کہ اس غلطی پر کوئی مواخذہ نہیں، بلکہ ارحم الراحمین کی بے شمار نعمتوں کا وعدہ بھی سنادیں، اور بارگاہ ارحم الراحمین کا یہ قانون ان کو بتلادیں کہ جب بھی کوئی مسلمان جہالت سے کوئی بُرا کام کر بیٹھے، اور پھر اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اس سے توبہ کر لے اور آئندہ کے لئے اپنے عمل درست کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، اور آئندہ اپنی دنیوی اور اخروی نعمتوں سے بھی اس کو محروم نہ فرمادیں گے۔

اس تشریح کے مطابق یہ آیات اس خاص واقعہ میں نازل ہوئیں جس کا بیان پچھلی آیتوں میں ہو چکا ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے ان آیات کے مضمون کو ایک مستقل ہدایت نامہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے، جو اُن لوگوں سے متعلق ہے، جن سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا، پھر ندامت ہوئی، اور توبہ کر کے اپنے عمل کو درست کر لیا۔

اور اگر غور کیا جائے تو ان دونوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہو کہ قرآن مجید کا کوئی حکم جو کسی خاص واقعہ میں نازل ہوا ہو اگر اس کے الفاظ اور مضمون عام ہے تو وہ صرف اسی واقعہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتا، بلکہ ایک عام حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اگر بالفرض آیات مذکورہ کا نزول اسی واقعہ مذکورہ میں ہوا ہو تب بھی یہ حکم ایک عام ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہر اُس گنہگار کو شامل ہے جس کو گناہ کے بعد بھی اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور نادام ہو کر اس نے اپنے آئندہ عمل کو درست کر لیا۔

اب ان آیات کی پوری تشریح دیکھئے، پہلی آیت میں ارشاد ہے، وَإِذَا أَجَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، یعنی جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، آیات سے مراد اس جگہ آیات قرآنی بھی ہو سکتی ہیں، اور اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کی عام نشانیاں بھی، تو ایسے لوگوں

کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپؐ ان کو سلام علیکم سے خطاب فرمائیں، یہاں سلام علیکم کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اللہ جل شانہ کا سلام پہنچا دیجئے، جس میں ان لوگوں کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے، اس صورت میں ان غریب مسلمانوں کی دل شکنی کا بہترین تدارک ہو گیا، جن کے بارہ میں رؤساء قریش نے مجلس سے ہٹا دینے کی تجویز پیش کی تھی، اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو سلامتی کی خوش خبری سنا دیجئے، کہ اگر ان لوگوں سے عمل میں کوتاہی یا غلطی بھی ہوئی ہے تو وہ معاف کر دی جائے گی، اور یہ ہر قسم کی آفات سے سلامت رہیں گے۔

دوسرے جملہ میں کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ میں اس احسان پر اور مزید احسان و انعام کا وعدہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ آپؐ ان مسلمانوں سے فرمادیں کہ تمھارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اس لئے بہت ڈریں اور گھبراتیں نہیں، اس جملہ میں اول تو رب استعمال فرما کر مضمون آیت کو مدلل کر دیا، کہ اللہ تعالیٰ تمھارا پالنے والا ہے، اور ظاہر ہو کہ کوئی پالنے والا اپنے پالے ہوئے کو ضائع نہیں کیا کرتا، پھر لفظ رب نے جس رحمت کی طرف اشارہ کیا تھا اس کو صراحت بھی ذکر فرمادیا، اور وہ بھی اس عنوان سے کہ تمھارے رب نے رحمت کرنے کو اپنے ذمہ لکھ لیا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی شریف بھلے انسان سے بھی وعدہ خلافی صادر نہیں ہوتی تو رب العالمین سے کیسے ہو سکتی ہے، خصوصاً جبکہ اس وعدہ کو بصورت معاہدہ لکھ لیا گیا ہو۔

صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد میں بروایت ابو ہریرہؓ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا، تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ اِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي، یعنی میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے۔

اور حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے تورات میں یہ لکھا دیکھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور ان کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، تو صفت رحمت کے تسو حصے کر کے اس میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کر دیا، اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی اثر رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اُسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے، ماں باپ اور اولاد میں، بھائی، بہنوں میں، شوہر بیوی میں، عام رشتہ داروں میں، پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو باہمی ہمدردی اور محبت و رحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایک حصہ رحمت کے نتائج ہیں، باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے رکھے ہیں،

اور بعض روایات میں اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی حیثیت سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اس سے انسان کچھ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنی مخلوق پر کیسی اور کس درجہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان بلکہ فرشتہ بھی اللہ جل شانہ کے شایان شان عبادت و طاعت تو ادا کر نہیں سکتا، اور جو اطاعت خلاف شان ہو وہ دنیا کے لوگوں کی نظر میں بجائے سبب انعام ہونے کے باعث ناراضی سمجھی جاتی ہے، یہ حال تو ہماری طاعت و عبادت اور حسنات کا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ عالی کی نسبت سے دیکھا جائے تو سینات سے کم نہیں، پھر اس پر مزید یہ کہ حقیقی سینات اور معاصی سے بھی کوئی بشر خالی نہیں، **إِلَّا مَنْ عَصَمَ اللَّهُ** ان حالات میں تقاضائے انصاف تو یہ تھا کہ کوئی بھی عذاب سے نہ بچتا، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہر انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہر وقت برس رہی ہیں، یہ سب اسی رحمت کا نتیجہ ہے، جو پروردگار عالم نے اپنے ذمہ لکھ لی ہے۔

توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے | اس کے بعد رحمت کاملہ کی تشریح ایک ضابطہ کی صورت میں اس طرح بیان فرمائی **أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا أَوْ جَهَالَتٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنَ** فَإِنَّهُ غُفُورٌ رَحِيمٌ یعنی جو آدمی جہالت سے کوئی بُرا کام کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ توبہ کر لے اور اپنے عمل کو درست کرے تو اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والے ہیں، اس کے گناہ کو معاف فرما دیں گے، اور بہت رحمت کرنے والے ہیں، کہ صرف معافی پر کفایت نہ ہوگی، بلکہ انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔

اس آیت میں لفظ جہالت سے بظاہر کسی کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ گناہ کی معافی کا وعدہ صرف اس صورت میں ہے جب کہ ناواقفیت اور جہل کے سبب کوئی گناہ سرزد ہو جاوے جان بوجھ کر گناہ کرنے والا اس حکم میں داخل نہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں، کیونکہ جہالت سے مراد اس جگہ عمل جہالت ہی، یعنی ایسا کام کر بیٹھے جیسا نتیجہ سے جاہل دے خبر کیا کرتا ہے، یہ ضرور نہیں کہ وہ واقع میں جاہل ہو، اس کی تائید خود لفظ جہالت سے بھی ہوتی ہے، کہ یہاں لفظ جہل کے بجائے جہالت کا لفظ شاید اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ جہل تو علم کا مقابل ہے، اور جہالت حلم و وقار کے مقابل ہے، یعنی لفظ جہالت محاورات میں بولا ہی جاتا ہے عمل جہالت کے لئے، اور اگر غور کیا جائے تو گناہ جب بھی کسی سے سرزد ہوتا ہے تو اس عمل جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لئے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جو شخص اللہ و رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ جاہل ہے، مراد اس سے یہی عملی جہالت ہے ناواقف اور بے علم ہونا ضروری نہیں، کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی ہدایت

نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، خواہ غفلت و جہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارت نفس اور اتبارع ہوئی کی وجہ سے۔

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں گناہ نگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ، دوسرے اصلاح عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے: **إِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ**، یعنی توبہ نام ہے ندامت کا۔

دوسرے آئندہ کے لئے اصلاح عمل، اس اصلاح عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا حدِ اختیار ان کو ادا کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے، اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ و تصرف کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذا پہنچانا ہے۔

اس لئے تکمیل توبہ کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ گزشتہ گناہ پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، اور آئندہ کے لئے اپنے عمل کو درست رکھے، اس گناہ کے پاس نہ جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے ترک ہو گئے ہیں ان کی قضا کرے، جو زکوٰۃ نہیں دی گئی وہ اب ادا کرے، قربانی، صدقہ الفطر کے واجبات میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے اور خود نہ کر سکے تو حج بدل کرائے، اور اگر اپنے سامنے حج بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے، کہ اس کے وارث اس کے ذمہ عائد شدہ واجبات کا قدیہ یا حج بدل کا انتظام کر لیں، خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح عمل کے لئے صرف آئندہ کا عمل درست کر لینا کافی نہیں، پچھلے فرائض و واجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے، یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرنا اختیار میں نہ ہو، مثلاً وہ مر جائے، یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحبِ حق راضی ہو جائے گا، اور یہ شخص سبکدوش ہو جائے گا۔

قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط

تو کہہ دے مجھ کو روکا گیا ہے اس سے کہ بندگی کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا

قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ لَا قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿۵۶﴾

تو کہہ میں نہیں چلتا تمہاری خوشی پر بیشک اب تو میں بہک جاؤں گا اور نہ رہوں گا ہدایت پائیوا لوں یا

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ ط

تو کہہ دے مجھ کو شہادت پہنچی میرے رب کی، اور تم نے اس کو جھٹلایا میرے پاس نہیں ہے جس چیز کی تم جلدی

بِهِ إِن الْحُكْمُ لِلَّهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَصِلِينَ ﴿۵۷﴾

کر رہی ہو حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کے، بیان کرتا ہر حق بات اور وہ سب اچھا فیصلہ کرنے والا ہے،

قُلْ لَّوْ أَنِّي عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بِلَيِّنِي وَ

تو کہہ اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو طے ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے اور

بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ﴿۵۸﴾

درمیان تمہارے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

خلاصہ تفسیر

آپ (ان معاندین سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو (حق تعالیٰ کی طرف سے) اس ممانعت کی گئی ہے کہ ان (معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو اور ان کے طریقہ کی گمراہی ظاہر کرنے کے لئے) آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے (باطل) خیالات کا اتباع نہ کروں گا، کیونکہ (اگر نعوذ باللہ میں ایسا کروں تو) اس حالت میں بے راہ ہو جاؤں گا اور راہ (راست) پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا، آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میری پاس تو (اس دین اسلام کے حق ہونے پر) ایک دلیل (کافی موجود) ہے جو میرے رب کی طرف سے (مجھ کو ملے ہوئی ہے، یعنی قرآن مجید جو کہ میرا معجزہ ہے، جس سے میری تصدیق ہوتی ہے) اور تم (بلاوجہ) اس کی تکذیب کرتے ہو (اور تم جو یہ کہتے ہو کہ اگر دین اسلام حق ہے تو ہمارے انکار پر آسمان سے پتھر برسے یا کوئی اور عذاب سخت آئے، جیسا کہ دوسری جگہ ان الفاظ سے مذکور ہے: إِنَّ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِندِنَا فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ إِنَّنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ (جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی عذاب

ایم، وہ میرے پاس (یعنی میری قدرت میں نہیں) حکم کسی کا نہیں (چلتا) بجز اللہ کے (اور اللہ کا حکم نازل عذاب کا ہوا نہیں تو میں کیسے عذاب دکھلا دوں) اللہ تعالیٰ حق بات کو (دلیل سے) بتلا دیتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا وہی ہے (چنانچہ اس نے میری رسالت کی واضح اور قوی دلیل قرآن کریم بھیج دیا، اور دوسرے واضح معجزات ظاہر فرمادیے، اور دلیل صحیح ایک بھی کافی ہوتی ہے تو تمہاری فرمائشیں دلیل ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے اس وقت نازل عذاب کے ذریعہ فیصلہ نہیں فرمایا) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) وہ چیز ہوتی جس کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی عذاب) تو (اب تک) میرا اور تمہارا باہمی قضیہ (کبھی کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے (کہہ کر کے ساتھ کیا معاملہ کس وقت کیا جائے)

رابط آیات آیات مذکورہ میں کفار کی طرف سے نازل عذاب کی عاجلانہ فرمائش اور اس کا جواب خیر القاصین میں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ تامہ کا ذکر آئے۔
بالظاہر میں مذکور تھا، آگے تمام معلومات و مقدمات پر اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کا احاطہ بیان کیا جاتا ہے۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبُرْ

اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا اور وہ جانتا ہے جو کچھ جنگل

وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ سَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي

اور دریا میں ہر اور نہیں جھڑتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں گرتا کوئی دانہ

ظَلُمْتُ الْأَرْضِ وَلَا رَاطِبٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ

زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز، مگر وہ سب کتاب میں

مُبَيَّنٌ ۝۵۹ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم

میں ہے، اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر چکے

بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ

ہو دن میں پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تاکہ پورا ہو وہ وعدہ جو مقرر ہو چکا ہو پھر اسی کی طرف

مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝۶۰ وَهُوَ الْقَاهِرُ

تم لوٹاؤ گے پھر خبر دے گا تم کو اس کی جو کچھ تم کرتے ہو اور وہی غالب ہے

فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ

اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہو تم پر نگہبان یہاں تک کہ جب آئیے تم میں سے

الْمَوْتُ تَرَفُّتَهُ مُرْسِلًا وَهَمَّ لَا يُفْرِطُونَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوا

کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اسکو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتہ اور وہ کوتاہی نہیں کرتے، پھر پہنچائے ہوئے

إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمْ الْحَقُّ ۖ لَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ

اللہ کی طرف جو مالک ان کا ہو سچا سن رکھو حکم اس کا ہو اور وہ بہت جلد

الْحَسِيبِينَ ﴿٦٢﴾

حساب لینے والا ہے

خلاصہ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی اسی کی قدرت میں) ہیں خزانے تمام مخفی اشیاء (مکنہ) کے (ان میں سے جس چیز کو جس وقت اور جس قدر چاہیں ظہور میں لاتے ہیں، ان اشیاء میں عذاب کی قیاس بھی آگئیں، مطلب یہ کہ اور کسی کو ان چیزوں پر قدرت نہیں، اور جس طرح قدرت کا ملکہ ان کی ساتھ خاص ہے، اسی طرح ان کا علم تمام اور کامل بھی، چنانچہ) ان حشر انہ مخفیہ کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے، اور وہ ان تمام چیزوں کو بھی جانتا ہے جو خشکی میں ہیں اور جو دریا میں ہیں اور کوئی پتہ (تک درخت سے) نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ (تک) زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز (مثلاً پھل وغیرہ کے) گرتی ہے، مگر یہ سب کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہیں، اور وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے کہ (اکثر) رات میں (سونے کے وقت) تمہاری روح (نفسانی) کو جس سے احساس و ادراک متعلق ہے، ایک گونہ قبض کر لیتا ہے (یعنی معطل کر دیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو (دواماً) جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ (اسی سونے جاگنے کے دوروں سے) میعاد معین (دنیاوی زندگی کی) تمام کردی جادے پھر اسی (اللہ کی) طرف (مگر) تم کو جانا ہے، پھر تم کو بتلا دے گا جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے، (اور اس کے مناسب جزاء اور سزا جاری کرے گا) اور وہی (اللہ تعالیٰ قدرت سے) اپنے بندوں کے اوپر غالب ہیں برتر ہیں اور (اے بندو) تم پر (تمہارے اعمال اور جان کی، نگرانی کرنے والے فرشتے) بھیجتے ہیں (جو زندگی بھر تمہارے اعمال کو بھی

دیکھتے ہیں اور تمھاری جان کی بھی حفاظت کرتے ہیں) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت پہنچتی ہے تو (اس وقت) اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کر لیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے (بلکہ جس وقت حفاظت کا حکم تھا حفاظت کرتے رہے) جب موت کا حکم ہو گیا تو یہی محافظ روح قبض کرنے والے فرشتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں) پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جاویں گے، خوب سن لو (اس وقت) فیصلہ اللہ ہی کا ہو گا اور کوئی دخل نہ دے سکے گا) اور وہ بہت جلد حساب لے لے گا۔

معارف و مسائل

گناہوں سے بچنے | تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکن اعظم کا نسخہ اکسیر عقیدہ توحید ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ یکہ ایک اور اکیلا جاننے کا نام توحید نہیں، بلکہ اس کو تمام صفات کمال میں بھتاو بے مثل ماننے اور اس کے سوا کسی مخلوق کو ان صفات کمال میں اس کا سہیم و شریک نہ سمجھنے کو توحید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال: حیات، علم، قدرت، سمیع، بصر، ارادہ، مشیت، خلق، رزق وغیرہ وہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہو سکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں: ایک علم، دوسرے قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود و غیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حادی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری پوری محیط ہے، مذکورہ دو آیتوں میں انہی دو صفتوں کا بیان ہے، اور یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں پر مکمل یقین اور اس کے استحضار کی کیفیت پیدا کر لے تو اس سے کوئی جرم و گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، ظاہر ہے کہ اگر ایک انسان کو اپنے ہر قول و عمل اور نشست و برخاست میں ہر قدم پر یہ استحضار ہے کہ ایک علیم و خیر قادر مطلق مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے، اور میرے ظاہر و باطن اور دل کے ارادہ اور خیال تک سے واقف ہے تو یہ استحضار کبھی اس کا قدم اس قادر مطلق کی نافرمانی کی طرف نہ اٹھنے دے گا، اس لئے یہ دونوں آیتیں انسان کو انسان کا مل بنانے اور اس کے اعمال و اخلاق کو درست کرنے اور درست رکھنے میں نسخہ اکسیر ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: وَعِنْدَكَ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ لفظ مَفَاتِح جمع ہے، اس کا مفرد مَفْتَح بفتح میم بھی ہو سکتا ہے، جو خزانہ کے لئے بولا جاتا ہے

اور مفتوح بکسر میم بھی ہو سکتا ہے، جس کے معنی ہیں کنجی، لفظ مفاتح میں دونوں معنی کی گنجائش ہے، اسی لئے بعض مفسرین اور مترجمین نے اس کا ترجمہ خزانوں سے کیا ہے، اور بعض نے کنجیوں سے، اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ کنجیوں کا مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا مراد ہوتا ہے۔

قرآنی اصطلاح میں علم غیب اور قدرت عامہ مطلقہ صرف تو آپچی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا۔ (منظہری) پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات و واقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، یا کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں،

ہیں، مثلاً یہ کہ کون، کب اور کہاں پیدا ہوگا، کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کتنے سانس لے گا، کتنے قدم اٹھائے گا، کہاں مرے گا، کہاں دفن ہوگا، رزق کس کو کتنا اور کس وقت ملے گا، بارش کس وقت، کہاں اور کتنی ہوگی۔

اور دوسری قسم کی مثال وہ حل ہے جو عورت کے رحم میں وجود تو خستیار کر چکا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی، خوب صورت ہے یا بد صورت، نیک طبیعت ہے یا بد خصلت، اسی طرح اور ایسی چیزیں جو وجود میں آجانے کے باوجود مخلوق کے علم و نظر سے غائب ہیں۔

عَنْدَکَ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے پاس ہیں خزانے غیب کے، اس کے پاس ہونے سے مراد اس کی ملک اور قبضہ میں ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ غیب کے خزانوں کا علم بھی اس کے قبضہ میں ہے، اور ان کو وجود و ظہور میں لانا بھی اسی کی قدرت میں ہے کہ کب کب اور کتنا کتنا وجود میں آئے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں مذکور ہے: **وَمَنْ شَاءَ إِلَّا عِنْدَ نَازِحِ آيَاتِنَا وَمَا نُنْزِلُکَ إِلَّا بِعَقْدٍ رَّعْلُوْمٍ**، یعنی ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک خاص انداز سے نازل کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جملہ سے حق تعالیٰ کا بے مثال کمال علمی بھی ثابت ہو گیا اور کمال قدرت بھی، اور یہ بھی کہ یہ علم محیط اور قدرت مطلقہ صرف اللہ جل شانہ کی صفت ہے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی، آیت میں لفظ **عَنْدَکَ** کو مقدم کر کے قواعد عربیت کے مطابق اس حصر اور اختصاص کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، آگے اس اشارہ کو صراحت میں تبدیل کر کے پوری طرح دلنشین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا: **لَا یَعْلَمُ کَھَا لَا کَھُو**، یعنی ان خزانوں غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس لئے اس جملہ سے دو باتیں ثابت ہوتیں، اول حق تعالیٰ کا تمام غیب کی چیزوں پر علم محیط کے ساتھ مطلع اور ان سب پر قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہونا، دوسرے ذات حق

جلّ شانہ کے سوا کسی مخلوق یا کسی چیز کو ایسا علم و قدرت حاصل نہ ہونا۔

قرآن کی اصطلاح میں لفظ غیب کے جو معنی (بحوالہ تفسیر مظہری) اور بیان کئے گئے ہیں، کہ وہ چیزیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا آچکی ہیں مگر ابھی تک کسی مخلوق پر ان کا ظہور نہیں ہوا، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو مسئلہ غیب پر سطحی نظر میں جو جو شبہات عوام کو پیش آیا کرتے ہیں خود بخود ختم ہو جاتیں۔

لیکن عام طور پر لوگ لفظ غیب کے لغوی معنی لیتے ہیں، کہ جو چیز ہمارے علم و نظر سے غائب ہو، خواہ دوسروں کے نزدیک اس کا علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں اس کو بھی غیب کہنے لگتے ہیں، اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں، مثلاً علم نجوم، جفر، رمل، یا، تحصیل کی لکیروں وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، یا کشف و الہام کے ذریعہ کسی شخص کو واقعات آئندہ کا علم ہو جاتا ہے، یا مان سون کا رخ اور اس کی قوت و رفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے یا دوباراں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور ان میں بہت سی باتیں صحیح بھی ہو جاتی ہیں، یہ سب چیزیں عوام کی نظر میں علم غیب ہوتی ہیں، اس لئے آیت مذکورہ پر یہ شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن حکیم نے تو علم غیب کو ذات حق جلّ شانہ کی خصوصیت بتلایا ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

جواب واضح ہے کہ کشف و الہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دیدی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علم غیب نہ رہا، اسی طرح اسباب و آلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جاسکے وہ بھی اصطلاح قرآنی کے لحاظ سے علم غیب نہیں، جیسے محکمہ موسمیات کی خبریں، یا نبض دیکھ کر مرلین کے مخفی حالات بتلا دینا، وجہ یہ ہے کہ محکمہ موسمیات کو یا کسی حکیم ڈاکٹر کو ایسی خبریں دینے کا موقع جب ہی ہاتھ آیا جب ان واقعات کا مادہ پیدا ہو کر ظاہر ہو جاتا ہے، فرق اتنا ہے کہ ابھی اس کا ظہور عام نہیں ہوتا آلات کے ذریعہ اہل فن کو ظاہر ہوتا ہے، عوام بے خبر رہتے ہیں، اور جب یہ مادہ قومی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محکمہ موسمیات ہمینہ دو ہمینہ بعد ہونیوالی بارش کی خبر آج نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی اس بارش کا مادہ سامنے نہیں آیا، اسی طرح کوئی حکیم ڈاکٹر سال سال پہلے کی کھائی ہوئی، یا دو سال بعد کھائی جانے والی دوا یا غذا وغیرہ کا پتہ آج نبض دیکھ کر نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کا کوئی اثر عادت نبض میں نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ کسی چیز کے آثار و نشانات دیکھ کر اس کے

وجود کی خبر دیدی جاتی ہے، اور جب اس کے آثار و نشانات اور مادہ ظاہر ہو چکا تو اب وہ غیب میں شامل نہ رہا بلکہ مشاہدہ میں آگیا، البتہ لطیف یا ضعیف ہونے کی وجہ سے عام مشاہد میں ابھی نہیں آیا، جب قوت پکڑ لے گا تو عام مشاہدہ میں بھی آجائے گا۔

اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ و اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے، علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں سے کسی چیز سے کسی کو حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان خبروں کے غلط ہونے کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

رہا علم نجوم وغیرہ سو اس میں جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں ان کا علم تو علم ہے، مگر وہ غیب نہیں، جیسے حساب لگا کر کوئی یہ کہے کہ آج ۵ بج کر اکتالیس منٹ پر آفتاب طلوع ہوگا یا فلاں مہینہ فلاں تاریخ کو چاند گرہن یا سورج گرہن ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ ایک محسوس چیز کی رفتار کا حساب لگا کر وقت کی تعیین کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ہوائی جہازوں اور ریلوں کے کسی پورٹ یا اسٹیشن پر پہنچنے کی خبر دیدیتے ہیں، اس کے علاوہ نجوم وغیرہ سے جو خبریں معلوم کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ دھوکہ کے سوا کچھ نہیں، تنو جھوٹ میں ایک سچ نیکل آنا کوئی علم نہیں۔

حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کے بارے میں بھی بہت سے اہل فن کچھ کہا کرتے ہیں، مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کا درجہ بھی وہی تخمینہ و اندازہ کا ہے یقینی نہیں، اور تنو میں دو چار کا صحیح ہو جانا ایک طبعی امر ہے وہ کسی علم و آگہی سے تعلق نہیں رکھتا۔

ہاں جب ایکسرے کے آلات ایجاد ہوئے تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اس کے ذریعہ حمل کا نر یا مادہ ہونا معلوم ہو جایا کرے گا، مگر تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ایکسرے کے آلات بھی یہ متعین نہیں کر سکتے کہ حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز قرآنی اصطلاح میں غیب ہے اس کا سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں، اور جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب و آلات کے ذریعہ عادیہً حاصل ہو جاتا ہے وہ درحقیقت غیب نہیں، گو ظہور عام نہ ہونے کی وجہ سے اس کو غیب کہتے ہوں۔

اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف و الہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دیدیا گیا تو وہ غیب کی حدود سے نکل گیا، اس کو قرآن میں غیب کی بجائے انباء الغیب کہا گیا ہے، جیسا کہ متعدد آیات میں مذکور ہے: **تِلْكَ آيَاتُ الْغَيْبِ** **نُوحِيْمَا لَكَ**، اس لئے آیت مذکورہ میں **لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ**، یعنی غیب کے

خزانوں کو بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اس میں کسی شبہ یا استثناء کی گنجائش نہیں۔
 اس جملہ میں تو حق جل شانہ کی یہ خصوصی صفت بتلائی گئی ہے کہ وہ عالم الغیب ہی، ہر غیب کو جانتا ہے، بعد کے جملوں میں غیب کے بالمقابل علم شہادت یعنی حاضر و موجود چیزوں کے علم کا بیان ہے کہ ان کے علم میں بھی اللہ جل شانہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا علم محیط ہے کوئی ذرہ اس سے باہر نہیں، ارشاد فرمایا کہ وہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور اس چیز کو جو دریا میں ہے، اور کوئی پتہ کسی درخت کا نہیں گرتا جس کا علم اس کو نہ ہو، اسی طرح کوئی دانہ جو زمین کے تاریک حصہ میں مستور ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، اور ہر تر و خشک میں نکل کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے علم میں ہے اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کے متعلق دو چیزیں حق تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہیں، جن میں کوئی فرشتہ یا رسول یا کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں، ایک علم غیب، دوسرے موجودات کا علم محیط جس سے کوئی ذرہ مخفی نہیں، پہلی آیت میں انہی دونوں مخصوص صفات کا بیان..... اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کے پہلے جملہ میں پہلی خصوصیت کا بیان ہے، وَعَيْنَاهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ، اور بعد کے جملوں میں تمام کائنات و موجودات کے علم محیط کا ذکر اس طرح فرمایا کہ پہلے ارشاد ہوا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور جو دریا میں ہے، مراد اس سے نکل کائنات و موجودات ہے، جیسے صبح و شام کا لفظ بول کر پورا زمانہ اور مشرق و مغرب کا لفظ بول کر پوری زمین مراد لی جاتی ہے، اسی طرح بر و بحر یعنی خشکی اور دریا بول کر مراد اس سے پورے عالم کی کائنات و موجودات ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔

آگے اس کی مزید تشریح و تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر احاطہ علمی صرف یہی نہیں کہ بڑی بڑی چیزوں کا اس کو علم ہو، بلکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی، مخفی سے مخفی چیز بھی اس کے علم میں ہے، فرمایا وَمَا تَسْقُطُ مِنْ ذَرَّةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا یعنی سارے جہان میں کسی درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا جو اس کے علم میں نہ ہو، مراد یہ ہے کہ ہر درخت کا ہر پتہ گرنے سے پہلے اور گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے وہ جانتا ہے کہ ہر پتہ درخت پر لگا ہوا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، اور کب اور کہاں گرے گا، اور پھر وہ کس کس حال سے گزرے گا، گرنے کا ذکر شاید اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتہ کا درخت سے گرنا اس کے نشوونما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہی، آخری حال کا ذکر کر کے تمام حالات کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَا حَبِطَ فِي ظُلُمَاتٍ الْأَرْضِ، یعنی ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، پہلے درخت کے پتہ کا ذکر کیا جو عام نظروں کے سامنے گرتا ہے، اس کے بعد دانہ کا ذکر کیا، جو کاشتکار زمین میں ڈالتا ہے، یا خود بخود کہیں زمین کی گہرائی اور اندھیری میں مستور ہو جاتا ہے، اس کے بعد پھر تمام کائنات پر علم باری تعالیٰ کا حاوی ہونا ترا درخشک کے عنوان سے ذکر فرمایا، اور فرمایا کہ یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں لکھی ہوئی ہیں، کتاب مبین سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک لوح محفوظ ہے، اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد علم الہی ہے، اور اس کو کتاب مبین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے لکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے، اس میں بہودنیان کی راہ نہیں رہتی اسی طرح اللہ جل شانہ کا یہ علم محیط تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا صرف تخمینہ نہیں بلکہ یقینی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ اس طرح کا علم محیط جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال خارج نہ ہو یہ صرف ذات حق جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہر سورۃ لقمان میں ہے :

إِنَّمَا أَنْتَ مُثْقَلٌ بِحَبِّتٍ
مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيَّ صَخْرَةً
أَوْ فِي السَّمَوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ
يَا بُنَيَّ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ
خَبِيرٌ

”یعنی اگر کوئی دانہ رانی کے برابر ہو پھر
وہ پتھر کے جگر میں پیوست ہو یا آسمان
میں یا زمین میں کہیں ہو اللہ تعالیٰ اُن سب
کو جمع کر لیں گے، بیشک اللہ تعالیٰ
لطیف اور ہر چیز سے خبردار ہے“

آیۃ الکرسی میں ہے :

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ
مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

”یعنی اللہ تعالیٰ سب انسانوں کے اگلے
اور پچھلے سب حالات سے واقف ہیں
اور سارے انسان مل کر اس کے علم میں
کسی ایک چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، بجز اتنے علم کے جو اللہ تعالیٰ کسی کو دینا چاہیں“

سورۃ یونس میں ہے :

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ
مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا
فِي السَّمَاءِ

”یعنی ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز
زمین و آسمان میں آپ کے رب کے علم سے
جدا نہیں ہے“

اور سورۃ طلاق میں ہے :

وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عِلْمًا

یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط
ہے

اسی طرح بے شمار آیات میں یہ مضمون مختلف عنوانات سے آیا ہوا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بیان فرما دیا گیا ہے کہ غیب کا علم (جس کو قرآن میں غیب کہا گیا ہے اور اس کی تفسیر اوپر گذر چکی ہے) یا تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے، کسی فرشتہ یا رسول کے علم کو اسی طرح ہر ذرہ کائنات پر محیط سمجھنا وہ عیسائیوں کی طرح رسول کو خدا کا درجہ دیدینا ہے اور خدا تعالیٰ کے برابر قرار دیدینا ہے جو بتصریح قرآن کریم شرک ہے، سورۃ شعراء میں شرک کی یہی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے :

تَأْتِيهِ الْبُيُوتُ مِنْ شَتَّىٰ
مُتَبَعِينَ ۚ وَهُوَ يَكْمُلُ
فِي الْيَوْمِ الْأَمِينِ

یعنی قیامت کے روز مشرکین کہیں گے
کہ بخدا ہم سخت گمراہی میں تھے کہ تم کو
یعنی بتوں کو رب العالمین کے برابر کرتے تھے

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے اور سب فرشتوں اور انبیاء سے زیادہ عطا فرمایا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی برابر کسی کا علم نہیں، نہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر یہ رسول کی تعظیم کا وہ غلو ہو گا جو عیسائیوں نے اختیار کیا، کہ رسول کو خدا کے برابر ٹھہرا دیا، اسی کا نام شرک ہے، نعوذ باللہ منہ۔

یہاں تک پہلی آیت کا بیان تھا، جس میں اللہ جل شانہ کی صفت علم کی خصوصیت کا بیان ہے، کہ وہ ہر غیب و شہادت اور ہر ذرہ ذرہ کائنات پر حاوی ہے، دوسری آیت میں اسی طرح حق تعالیٰ کی صفت قدرت اور اس کے قادر مطلق ہونے کا بیان ہے جو اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، ارشاد ہے :

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى، یعنی اللہ تعالیٰ ہر رات میں تمہاری روح کو ایک گونہ قبض کر لیتا ہے، اور پھر صبح کو جگا کر اٹھا دیتا ہے، تاکہ تمہاری مقررہ عمر پوری کر دے، اور پھر دن بھر میں تم جو کچھ کرتے رہتے ہو وہ سب اس کے علم میں ہے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کاملہ ہے کہ انسان کے جینے، مرنے، اور مکرر دوبارہ زندہ ہونے کا ایک نمونہ ہر روز اس کے

سامنے آتا رہتا ہے، حدیث میں نیند کو موت کا بھائی فرمایا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ نیند انسان کے تمام قویٰ کو ایسا ہی محطل کر دیتی ہے جیسے موت۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے نیند اور پھر اس کے بعد بیداری کی مثال پیش فرما کر انسان کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس طرح ہر رات اور ہر صبح میں ہر شخص شخصی طور پر مگر جینے کی ایک مثال کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح پورے عالم کی اجتماعی موت اور پھر اجتماعی زندگی کو سمجھ لو، جس کو قیامت کہا جاتا ہے، جو ذات اس پر قادر ہے اس کی قدرت کاملہ سے وہ بھی مستبعد نہیں، اسی لئے آخر آیت میں فرمایا، ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنْفِخُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ یعنی پھر تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو جتلائے گا جو تم عمل کیا کرتے تھے۔ مراد یہ ہے کہ اعمال کا حساب ہوگا، پھر اس پر جزاء و سزا ہوگی۔

تیسری آیت میں اسی مضمون کی مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں پر ایک قوتِ قاہرہ رکھتا ہے، جب تک اس کو ان کا زندہ رکھنا منظور ہوتا ہو تو حفاظت کرنے والے فرشتے ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیتا ہے، کسی کی مجال نہیں جو اس کو نقصان پہنچائے اور جب کسی بندہ کا مقررہ وقت عمر کا پورا ہو جاتا ہے تو یہی حفاظت کرنے والے فرشتے اس کی موت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور اب اس کی موت کے اسباب فراہم کرنے میں ذرا کمی نہیں کرتے، اور پھر مگر یہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ رُدُّوْا إِلَى اللَّهِ، یعنی دوبارہ زندہ ہو کر پھر اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر کئے جائیں گے، اس جگہ احکم الحاکمین کے سامنے پیشی اور عمر بھر کے حساب کا جب خیال کیا جائے تو کس کی مجال ہے جو پورا اتر سکے، اور عذابِ رح تکلی، اس لئے اس کے ساتھ ہی ارشاد فرمایا اِلَیَّ اللَّهُ مَوْلَاهُمْ الْحَقِّ، یعنی اللہ تعالیٰ صرف حاکم اور حکم الحاکمین ہی نہیں وہ اپنے بندوں کے مولیٰ بھی ہیں جو ہر موقع پر ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا اَلَا لَهُ الْحُكْمُ، بیشک فیصلہ اور حکم صرف اسی کا ہے، یہاں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایک ذات اور اربوں انسانوں کی پوری پوری عمروں کا حساب نہٹے گا کس طرح؟ اس لئے اس کے بعد فرمایا وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِینَ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے، وہ بہت جلد سب حساب پورا فرمائیں گے۔

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهُ تَضَرُّعًا وَ

تو کہہ کون تم کو بچالاتا ہے جنگل کے اندھیروں سے اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو

خُفْيَةً ۚ لَّيْنٌ اَنْجِنَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

تم اس کو غریزہ کرنا اور چپے سے کہ اگر ہم کو بچالیوے اس بلا سے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے

قُلْ اللّٰهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

تو کہہ دے اللہ تم کو بچاتا ہے اس سے اور ہر سختی سے پھر بھی تم شرک کرتے ہو

خلاصہ تفسیر

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات (یعنی شدائد) سے اس حالت میں نجات دیدیتا ہے کہ تم اس کو (نجات دینے کے لئے) پکارتے ہو (کبھی) تذلل ظاہر کر کے اور (کبھی) چپکے چپکے (اور یوں کہتے ہو) کہ (اے اللہ) اگر آپ ہم کو ان (ظلمات) سے (اب کے) نجات دیدیں تو (پھر) ہم ضرور حق شناسی (پر قائم رہتے) والوں سے ہو جاویں (یعنی آپ کی توحید کے بڑی حق شناسی ہے قائل رہیں، اور اس سوال کا جواب چونکہ متعین ہے اور وہ لوگ بھی کوئی دوسرا جواب نہ دیں گے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے (جب کبھی نجات ملتی ہے) اور (ان ظلمات مذکورہ کی کیا تخصیص ہے بلکہ) ہر غم سے (وہی نجات دیتا ہے مگر) تم (ایسے ہو کہ) پھر بھی (بعد نجات پانے کے بدستور) شرک کرنے لگتے ہو (جو کہ اعلیٰ درجہ کی ناحق شناسی ہے، اور وعدہ کیا تھا حق شناسی کا، غرض یہ کہ شدائد میں تمھارے اقرار سے توحید کا حق ہونا ثابت ہو جاتا ہے، پھر انکار کب قابل التفات ہے)

معارف و مسائل

علم الہی اور قدرت | پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کے علم و قدرت کا کمال اور ان کی بے مثال مطلقہ کے کچھ مظاہر وسعت بیان کی گئی تھی، مذکورہ آیات میں اسی علم و قدرت کے کچھ آثار اور

مظاہر کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں لفظ ظلمات، ظلمتہ کی جمع ہے، جن کے معنی ہیں اندھیری، ظلمات البر والبحر کے معنی خشکی اور دریا کی اندھیریاں ہے، چونکہ اندھیری کی مختلف قسمیں ہیں رات کی اندھیری

گھٹا بادل کی اندھیری، اگر دو غبار کی اندھیری اور دریا میں موجوں کی اندھیری، ان تمام قسموں کو شامل کرنے کے لئے لفظ ظلمات جمع استعمال فرمایا گیا ہے۔

اگرچہ انسان کے سونے اور آرام کرنے کے لئے اندھیری بھی ایک نعمت ہے، لیکن عام حالات میں انسان کا کام روشنی ہی سے چلتا ہے، اور اندھیری سب کاموں سے معطل کرنے کے علاوہ بہت سے مصائب اور آفات کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے عرب کے محاورہ میں لفظ ظلمات مصائب اور حوادث و آفات کے لئے بولا جاتا ہے، اس آیت میں بھی جمہور مفسرین نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اللہ جل شانہ نے مشرکین مکہ کو تنبیہ اور ان کی غلط کاری پر آگاہ کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں سے یہ سوال کریں کہ برسی اور بحری سفروں میں جب بھی وہ کسی مصیبت میں گھر جاتے ہیں، اور اس وقت تمام بتوں کو بھول کر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، کبھی علانیہ طور پر اپنی ذلت و عاجزی کا اعتراف کرتے ہیں اور کبھی دل دل میں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اس مصیبت سے تو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں بچا سکتا، اور اس خیال کے ساتھ یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دیدی تو ہم شکر و حق شناسی کو اپنا شیوہ بنالیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں گے، اسی کو اپنا کارساز سمجھیں گے، اس کے سوا کسی کو اس کا شریک سمجھیں گے کیونکہ جب ہماری مصیبت میں کوئی کام نہ آیا تو ہم ان کی پوجا پاٹ کیوں کریں، تو اب آپ ان سے پوچھئے کہ ان حالات میں کون ان کو مصائب اور ہلاکت سے نجات دیتا ہے؟ چونکہ ان کا جواب متعین اور معلوم تھا کہ وہ اس بداعت کا انکار نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بہت یاد دیتا اس حالت میں ان کے کام نہیں آیا، اس لئے دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے خود ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ ہی کہہ دیجئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دیں گے، بلکہ تمہاری ہر تکلیف و پریشانی اور بے چینی کو وہی دور فرمائیں گے، مگر ان سب کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود پھر جب تم کو نجات اور آرام مل جاتا تو تم پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہو، اور بتوں کی پوجا پاٹ میں لگ جاتے ہو، یہ کیسی غداري اور مہلک قسم کی چال ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان بھی ہے کہ ہر انسان کو ہر مصیبت اور تکلیف سے نجات دینے پر اس کو پوری قدرت ہے، اور یہ بھی کہ ہر قسم کی مصیبتوں اور تکلیفوں اور پریشانیوں کو دور کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور

یہ بھی کہ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت اور بدراہمت ہے کہ ساری عمر بتوں اور دیوتاؤں کو پوجنے اور پکارنے والے بھی جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اس وقت وہ بھی صرف خدا تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں، اور اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

عبرت | مشرکین کا یہ طرز عمل ان کی غداری کے اعتبار سے کتنا ہی بڑا جرم ہو، مگر مصیبت پڑنے کے وقت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور حقیقت کا اعتراف ہم مسلمانوں کے لئے ایک تازیانہ عبرت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے باوجود مصیبتوں کے وقت بھی خدا تعالیٰ کو یاد نہیں کرتے، بلکہ ہمارا سارا دھیان مادی سامانوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، ہم اگرچہ مورتوں اور تصویری بتوں کو اپنا کار ساز نہیں سمجھتے، مگر یہ مادی سامان اور اسباب و آلات بھی ہمارے لئے بتوں سے کم نہیں، جن کی فکر دوں میں ہم ایسے گم ہیں کہ خدا تعالیٰ اور اس کی قدرت کاملہ کی طرف کبھی دھیان نہیں ہوتا۔

حوادث و مصائب | ہم ہر بیماری میں صرف ڈاکٹروں اور دواؤں کو اور ہر طوفان اور سیلاب کے کاہلی علاج | وقت صرف مادی سامانوں کو اپنا کار ساز سمجھ کر اسی کی فکر میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ مالک کائنات کی طرف دھیان تک نہیں جاتا، حالانکہ قرآن کریم نے بار بار واضح الفاظ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے مصائب اور حوادث عموماً انسانوں کے اعمالِ بد کے نتائج اور آخرت کی سزا کا ہلکا سا نمونہ ہوتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ مصائب مسلمانوں کے لئے ایک طرح کی رحمت ہوتے ہیں، کہ ان کے ذریعہ غافل انسانوں کو چو نکایا جاتا ہے، تاکہ وہ اب بھی اپنے اعمالِ بد کا جائزہ لے کر ان سے باز آنے کی فکر میں لگ جائیں، اور آخرت کی بڑی اور سخت سزا سے محفوظ رہیں، اسی مضمون کے لئے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”یعنی ہم لوگوں کو تھوڑا سا عذاب قریب دنیا میں چکھا دیتے ہیں آخرت کے بڑے عذاب پہلے تاکہ وہ اپنی غفلت اور برائیوں سے باز آجائیں“

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ
الْأَلَدِّ نَذِيرًا
الَّذِينَ كَفَرُوا لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَيَرْجِعُونَهُ

قرآن کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے:

وَمَا آصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ
فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَ
يَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (شوری)

”یعنی جو مصیبت تم کو پہونچتی ہے وہ تمہارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے اور بہت سے برے اعمال کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے“

اس آیت کے بیان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”قسم ہوا اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کسی انسان کو جو کسی لکڑی سے معمولی خراش لگتی ہے، یا قدم کو کہیں لعنہ لگتا ہے، یا کسی رگ میں خلش ہوتی ہے یہ سب کسی گناہ کا اثر ہوتا ہے، اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت ہیں۔“

بیضادمیؒ نے فرمایا کہ مراد اس سے یہ ہے کہ مجرموں اور گناہگاروں کو جو امراض اور آفات پیش آتے ہیں وہ سب گناہوں کے آثار ہوتے ہیں، اور جو لوگ گناہوں سے معصوم یا محفوظ ہیں ان کے امراض اور آفات ان کے صبر و استقلال کے امتحان اور جنت کے بلند درجات عطا کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عام انسان جو گناہوں سے خالی نہیں ان کو جو بھی بیماریاں اور حوادث مصائب یا تکلیف اور پریشانی پیش آتی ہے وہ سب گناہوں کے نتائج اور آثار ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام مصائب اور پریشانیوں کا اور ہر قسم کے حوادث اور آفات کا اصلی اور حقیقی علاج یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کیا جائے، پچھلے گناہوں سے استغفار اور آئندہ ان سے پرہیز کرنے کا پختہ ارادہ کریں، اور اللہ تعالیٰ ہی سے رنج مصائب کی دعا کریں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ مادی اسباب دوا، علاج اور مصائب سے بچنے کی مادی تدبیریں بے کار ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل کارساز حق تعالیٰ کو سمجھیں اور مادی اسباب کو بھی اسی کا انعام سمجھ کر استعمال کریں کہ سب اسباب اور آلات اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور اسی کی عطا کردہ نعمتیں ہیں اور اسی کے حکم اور مشیت کے تابع انسان کی خدمت کرتے ہیں، آگ، ہوا، پانی، مٹی اور دنیا کی تمام طاقتیں سب اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہیں، بغیر اس کے ارادہ کے نہ آگ جلا سکتی ہے، نہ پانی بجھا سکتا ہے، نہ کوئی دوا نفع دے سکتی ہے نہ کوئی غذا نقصان پہنچا سکتی ہے، مولانا ردیؒ نے خوب فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ، باحق زندہ اند

تجربہ شاہد ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر صرف مادی سامانوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو جوں جوں یہ سامان بڑھتے ہیں پریشانیاں اور مصائب اور بڑھتے ہیں مریض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شخصی طور پر کسی دوا یا انجکشن کا کسی وقت مفید ثابت ہونا یا کسی مادی تدبیر کا کامیاب

ہو جانا غفلت و مصیبت کے ساتھ بھی ممکن ہے، لیکن جب مجموعی حیثیت سے پوری خلق خدا کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب چیزیں ناکام نظر آتی ہیں، موجودہ زمانہ میں انسان کو راحت پہنچانے اور اس کی ہر تکلیف کو دور کرنے کے لئے کیسے کیسے آلات اور سامان ایجاد کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں کہ اب سے پچاس سال پہلے کے انسان کو ان کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا امراض کے علاج کے لئے نئی نئی زرداثر دوائیں اور طرح طرح کے انجکشن اور بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر اور ان کے لئے جابجا شفا خانوں کی بہتات کون نہیں جانتا کہ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے کا انسان ان سب سے محروم تھا، لیکن مجموعی حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان آلات و سامان سے محروم انسان اتنا بیمار اور کمزور نہ تھا، جتنا آج کا انسان بیماریوں کا شکار ہے، اسی طرح آج عام وباؤں کے لئے طرح طرح کے ٹیکے موجود ہیں، حوادث سے انسان کو بچانے کے لئے آگ بجھانے والے انجن اور مصیبت کے وقت فوری اطلاع اور فوری امداد کے ذرائع اور سامان کی فراوانی ہے، لیکن جتنا جتنا یہ مادی سامان بڑھتا جاتا ہے، انسان حوادث اور آفات کا شکار پہلے سے زائد ہوتا جاتا ہے، وجہ اس کے سوا نہیں کہ پچھلے دور میں خالق کائنات کی غفلت اور کھلی نافرمانی اتنی نہ تھی جتنی اب ہے، وہ سامان راحت کو خدا تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر شکر گزاری کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اور آج کا انسان بغاوت کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا ہے، اس لئے آلات اور سامان کی بہتات اس کو مصیبت سے نہیں بچاتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مشرکین کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ مصیبت کے وقت وہ بھی خدا ہی کو یاد کرتے تھے، مومن کا کام یہ ہے کہ اپنے تمام مصائب اور تکلیفوں کے دور کرنے کے لئے مادی سامان اور تدبیروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، ورنہ انجام وہی ہوگا جو روزِ مشاہدہ میں آرہا ہے، کہ ہر تدبیر مجموعی حیثیت سے الٹی پڑتی ہے، سیلابوں کو روکنے اور ان کے نقصانات سے بچنے کی ہزار تدبیریں کی جاتی ہیں مگر وہ آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں، امراض کے علاج کی نئی نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، مگر امراض روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، اشیاء کی گرانی رفع کرنے کے لئے ہزاروں تدبیریں کی جاتی ہیں، اور وہ سطحی طور پر مؤثر بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے نتیجہ یہ ہے کہ گرانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، چوری، ڈکیتی، اغواء، رشوت ستانی، چور بازاری کو روکنے کے لئے کتنی مادی تدبیریں آج ہر حکومت استعمال کر رہی ہے، مگر حساب لگائیے تو ہر روز ان جرائم میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے، کاش آج کا انسان صرف شخصی اور سطحی نفع نقصان کی سطح سے ذرا بلند ہو کر حالات کا جائزہ لے تو اس کو ثابت ہوگا کہ مجموعی حیثیت

سے ہماری مادی تدبیریں سب ناکام ہیں بلکہ ہمارے مصائب میں اضافہ کر رہی ہیں، پھر اس قرآنی علاج پر نظر کرے کہ مصائب سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے، کہ عاملین کائنات کی طرف رجوع کیا جائے، مادی تدبیروں کو بھی اسی کی عطا کی ہوئی نعمت کے طور پر استعمال کیا جائے، اس کے سوا سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ قَوْلِكُمْ

تو کہہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب اوپر سے یا تمہارے

أَوْ مِمَّنْ تَحْتِ أَرْضِكُمْ أَوْ يَكْسِلُكُمْ شَيْعًا وَّيُنْزِلُ بَعْضَكُمْ

پاؤں کے نیچے سے یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور پکھلا دے ایک کو لڑائی

بِأَسْبَغِطِ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرْنَا الْأَيَّاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ①۵

ایک کی، دیکھ کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ سمجھ جاویں،

وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ①۶

اور اس کو جھوٹ بتلایا تیری قوم نے حالانکہ وہ حق ہی، تو کہہ دے کہ میں نہیں تم پر وارو غم

لِكُلِّ نَبِيٍّ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ①۷

ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہو اور قریب ہو کہ اُس کو جان لو گے

خلاصہ تفسیر

آپ (یہ بھی) کہتے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہو اسی طرح) اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر و شرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے (جو زمین ہے اس) سے زلزلہ یا غرق ہو جانا اور ان عذابوں کے اسباب قریبہ تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، کبھی نہ کبھی ایسا ہو گا خواہ دنیا میں یا آخرت میں، یا کہ تم کو (اغراض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو (آپس میں) بھڑا دے (یعنی لڑوا دے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعہ مزہ) چکھا دے (اور اس کا سبب قریب فعل اختیار ہی ہے، اور یا سب آفتیں جمع کر دے، غرض نجات دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا دونوں اسی کی قدرت میں ہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دیکھئے تو یہی ہم کس (کس) طرح (دلائل توحید) کو مختلف پہلوؤں سے

بیان کرتے ہیں شاید وہ (لوگ) سمجھ جاویں اور (اللہ تعالیٰ کے عذاب دینے پر قادر ہونے اور کفر و شرک کے سبب عذاب ہونے کو جاننے کے باوجود) آپ کی قوم کے لوگ (قریش اور عرب بھی) اس (عذاب) کی تکذیب کرتے ہیں، (اور اس کے واقع نہ ہونے کے معتقد ہیں) حالانکہ وہ یقینی (واقع ہونے والا) ہے، (اور اس کو سن کر وہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ کب ہوگا تو) آپ (یوں) کہہ دیجئے کہ میں تم پر (عذاب واقع کرنے کے لئے) تعینات نہیں کیا گیا ہوں (کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ) ہر خبر کے (مدلول) کے وقوع کا ایک وقت (اللہ کے علم میں معین) ہے اور جلدی ہی تم کو معلوم ہو جائے گا (کہ یہ عذاب آیا)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کے وسیع علم اور بے مثال قدرت کا یہ اثر مذکور تھا کہ ہر انسان کی ہر مصیبت کو وہی دور کر سکتا ہے، اور مصیبت کے وقت جو اس کو پکارتا ہو اللہ تعالیٰ کی امداد اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ اس کو تمام کائنات پر قدرت بھی کامل ہے اور تمام مخلوق پر رحمت بھی کامل، اس کے سوا نہ کسی کو قدرت کاملہ حاصل ہے اور نہ تمام مخلوق پر رحمت و شفقت۔

مذکورہ آیات میں قدرت کاملہ کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جلیہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ ہے کہ کوئی عذاب کوئی مصیبت اور کیسی ہی بڑی سے بڑی آفت ہو اس کو ٹال سکتا ہے اسی طرح اس کو اس پر بھی قدرت حاصل ہے کہ جب کسی فرد یا جماعت کو اس کی سرکشی کی سزا اور عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو ہر قسم کا عذاب اس کے لئے آسان ہے، کسی مجرم کو سزا دینے کے لئے دنیا کے حکام کی طرح اس کو نہ کسی پولیس اور فوج کی حاجت ہے اور نہ کسی مددگار کی ضرورت، اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا: هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَلَقَ رِجًّا مِّمَّا يَتَّبِعُكَ مِنْ تَحْتِ الْسَّمَاءِ وَيَنْزِلُ فِيكَ مِنَ الْغَمَامِ غَمَامًا مُبْرِقًا ۚ ذَٰلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ بھیج دے تم پر کوئی عذاب تمھارے اوپر سے یا تمھارے پاؤں تلے سے یا تمھیں مختلف پارٹیوں میں بانٹ کر آپس میں بھڑا دے اور ایک کو دوسرے کے ہاتھ سے عذاب میں ہلاک کر دے۔

عذاب الہی کی تین قسمیں | یہاں عذاب الہی کی تین قسموں کا ذکر ہے، ایک جو اوپر سے آئے، دوسرے جو نیچے سے آئے، تیسرے جو اپنے اندر سے پھوٹ پڑے، پھر لفظ عَذَابًا کو اس جگہ تنوین کے ساتھ نکرہ لاکر عربی قواعد کے اعتبار سے اس پر بھی متنبہ کر دیا کہ ان تینوں

قسموں میں بھی مختلف قسمیں اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔

حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اوپر سے عذاب آنے کی مثالیں پچھلی آیتوں میں بہت سی گزر چکی ہیں، جیسے قوم نوح علیہ السلام پر بارش کا سخت سیلاب آیا اور قوم عاد پر ہوا کا طوفان مسلط ہوا اور قوم لوط علیہ السلام پر اوپر سے پتھر برسائے گئے، آل فرعون پر خون اور مینڈک وغیرہ برسائے گئے، اصحاب فیل نے جب مکہ پر چڑھائی کی تو پرندوں کے ذریعہ ان پر ایسی کنکریں برساتی گئیں جن سے وہ سب کے سب کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح ہو کر رہ گئے۔

اسی طرح نیچے سے آنے والے عذاب کی بھی پچھلی قوموں میں مختلف صورتیں گزر چکی ہیں قوم نوح علیہ السلام پر تواد پر کا عذاب طوفان بارش کے ساتھ اور نیچے کا عذاب زمین کا پانی اُبلنا شروع ہو گیا، غرض اوپر اور نیچے کے دونوں عذاب ایک وقت گرفتار ہو گئے، اور قوم فرعون پاؤں تلے کے عذاب میں غرق کی گئی، قارون بھی مع اپنے خزانوں کے اسی عذاب میں گرفتار ہوا، اور زمین کے اندر دھنس گیا۔

اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہو جاویں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا، غدار، کام چور، حنائن جمع ہو جاویں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے، مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ شعب الایمان بیہقی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: **كَمَا تَكُونُونَ كَذَلِكَ يُؤْتَرُ عَلَيْكُمْ**، یعنی جیسے تمہارے اعمال بھلے یا بُرے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلط کئے جائیں گے، اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو گے تو تمہارے حکام و امراء بھی رحم دل، انصاف پسند ہوں گے، اور تم بدعمل ہو گے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلط کر دیئے جائیں گے، مشہور مقولہ **أَعْمَالُكُمْ عَمَلُ أَعْمَالِكُمْ** کا یہی مفہوم ہے۔

اور مشکوٰۃ میں بحوالہ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب

بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ

میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہ ہوں

اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت و رحمت ڈال دیتا ہوں، اور جب

میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل اُن پر سخت کر دیتا ہوں وہ ان کو ہر طرح کا بُرا عذاب چکھاتے ہیں، اس لئے تم حکام اور امراء کو بُرا کہو میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ، تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دے۔“

اسی طرح ابو داؤد، نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیدیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم و امیر کے لئے کوئی بُرائی مقدر ہوتی ہے تو بُرے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔ (الحديث)

ان روایات اور آیت مذکورہ کی مستزکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو ننگا اور مٹھا اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانون الہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر اور اپنی سواری کے گھوڑے اور بار برداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

خلق را با تو چہ نیست بد خو کنند

تا ترا ناچار رو آنسو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے بالا دست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلاف مزاج، تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلط کر کے درحقیقت تمہارا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، تاکہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کر کے آخرت کے عذابِ کبیر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم و جور اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی، کام چوری، غداری، نیچے سے آنے والا عذاب ہے، اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا

جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آجائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو، ورنہ صرف مادی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی امید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں، جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے۔

خویش را دیدیم در سوائی خویش

امتحان ماکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ لفظ عَذَابُ جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے، آسمان سے برسے والے پتھر، خون، آگ اور پانی کا سیلاب اور بالاد حکام کا ظلم و جور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں، اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی زمین سے اُبل کر غرق ہو جانا، یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْ يَلْبَسَكُمْ شِيعًا یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں، اور باہم ایک دوسرے کے لئے عذاب بن جائیں، اس میں لفظ يَلْبَسُكُمْ، لباس کے مادہ سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں، اسی معنی سے لباس اُن کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لے، اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ و اشتباہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔

اور لفظ شِيعٍ، شِيعَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع، قرآن مجید میں ہے رَانَ مِنْ شِيعَتِهِ لَا بُرْهَانٍ یعنی فوج علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام، اسی لئے عرف و محاورہ میں لفظ شِيعَۃ ایسی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی خاص غرض کے لئے جمع ہوں، اور اس غرض میں ایک دوسرے کے معاون ہوں جس کا با محاورہ ترجمہ آجکل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔

اسی لئے آیت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے، اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

”یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن

مارنے لگو

راخرجہ ابن ابی حاتم عن یزید بن سلم، منہری

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے، ہمارا گدڑ مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں شریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی، اس کے بعد آپ دعا میں مشغول ہو گئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا، ایک یہ کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، دوسرے یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمائی، تیسری دعا یہ کہ میری امت آپس کے جنگ و جدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعا سے روک دیا گیا (منہری بحوالہ بغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمادے جو سب کو تباہ و برباد کر دے یہ دعا قبول ہوئی، اور آپس میں نہ بھڑ جائیں اس دعا کو منع کر دیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے ان کی پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا ہے گا، وہ عذاب آپس کی جنگ و جدل اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہو کر باہمی آویزش اور جنگ و جدل سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے، اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ و جدل کے ذریعہ آئے گا۔

سورۃ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

”یعنی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی

کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر

اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی“

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا

مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ

(ہود)

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں (بلا وجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں وہ رحمت

خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔

ایک آیت میں ارشاد ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے، آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی لپستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف اور تشدد نظر آئے گا، ہماری بد اعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہو گیا، کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا، اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطے میں ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل و نسب متعلق ہو سب بھائی بھائی تھے، کوہ و دریا کی دشوار گزار منازل ان کی وحدت میں حائل نہ تھیں، نسب خاندان، رنگ زبان کا تفاوت اُن کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا، انکی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی، عربی، مصری، شامی، ترکی، ہندی، چینی، کی تقسیمیں صرف شناخت اور تعارف کے لئے تھیں اور کچھ نہیں، بقول اقبال مرحوم

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اُس کا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی وسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی اور لسانی اور وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا، اور پھر ان میں سے بھی ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر بھی تشدد اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی، وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگزر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کے لئے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی، آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حق و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں، یہی وہ اغراض و اہواء کا اختلاف ہے جو قوم ملت کے لئے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔

ہاں اس جگہ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو یا نفسانی اغراض و اہواء کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصولِ اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے، جن میں فریقین کی حجت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے، مگر قرآن و سنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی، فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے، ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالہ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہو کہ:

اِخْتِلَافٌ اُفْتِیْ سِرْحَمَۃً۔ ”میری امت کا اختلاف رحمت ہے“ امتِ محمدیہ کی خصوصیت اس لئے اختیار فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء متقیین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول و شرآن و سنت کے ماتحت ہوگا، اور صدق نیت اور للہیت سے ہوگا، کوئی نفسانی غرض جاہ و مال کی ان کے اختلاف کی محرک نہ ہوگی، اس لئے وہ کسی جنگِ جدل کا سبب بھی نہ بنے گا، بلکہ علامہ عبدالرزاق منادی شایع جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسلک اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکامِ خدا و رسول ہی کہلائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام، اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے، ایک روڈ کی کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے، مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزل مقصود پر پہنچنے کا، اس لئے رستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کے لئے وسعت و رحمت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں، اور جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں، ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک راجح ہے، مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے مسلک کو بھی وہ باطل نہیں کہتے، بلکہ ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے ہیں، فقہاء صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کے بے شمار حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے، جنگِ جدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مذاہب فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک صحیح علم و دیانت ہے ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

یہ اختلاف ہے جو رحمت ہی رحمت اور لوگوں کے لئے وسعت و سہولت کا ذریعہ

اور بہت سے مفید نتائج کا حامل ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ فروعی مسائل میں راویوں کا اختلاف جہاں تک اپنی حد کے اندر رہے وہ کوئی مضر چیز نہیں، بلکہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو کھولنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں معین ہے، اور جہاں دیانت دار عقلاء جمع ہوں گے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف نہ ہو، ایسا قانون تو یا پے عقلوں میں ہو سکتا ہے جن کو کوئی سمجھ بوجھ نہ ہو، یا بے دنیوں میں ہو سکتا ہے جو کسی پارٹی وغیرہ کی رعایت سے خلاف ضمیر رائے میں اتفاق کا اظہار کریں۔

اختلاف رائے جو اپنی حدود کے اندر ہو یعنی قرآن و سنت کے قطعی اور اعتقادی مسائل اور قطعی احکام میں نہ ہو، صرف فروعی مسائل اجتہادیہ میں ہو، جن میں قرآن و سنت کی نصوص ساکت یا بہم ہیں، اور وہ بھی جنگ و جدل اور لعن و طعن کی حد تک نہ پہنچے تو وہ بجائے مضر ہونے کے مفید اور ایک نعمت و رحمت ہے، جیسے کائنات عالم کی تمام چیزوں کا شکل و صورت، رنگ و بو اور خاصیت و منفعت میں اختلاف ہے، حیوانات میں لاکھوں مختلف قسمیں، بنی نوع انسان میں مزاجوں اور پیشوں، صنعتوں اور رہن سہن کے طریقوں میں اختلاف، یہ سب اس علم کی رونق بڑھانے والے اور بیشمار منافع کے اسباب ہیں۔ بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتوؤں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُن کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو ہم کدھر جائیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے، کہ جس طرح کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں طبیعوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے، پس اس کا علاج کرتے ہیں، دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگویی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ اور افضل سمجھیں اس کا اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور در صورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام

یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے، لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے، مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے، اگر حقیقت کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ داری، خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب ہے اگرچہ راز کو، باغی ایک جماعت بنا کر یا ہم متفق ہو جائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کے لئے مہلک ہے، اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے، معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں اور نہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں ہو بلکہ ساری خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دین کی کمی اور اغراض و آہوا کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لئے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کی پارٹیاں بن کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ جہل اور ہنس اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی حمایت سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مذہب کا اس عشو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی تکرار ہی کا سبب قرار دیا ہے (ترمذی، ابن ماجہ)

دوسری آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ کی برادری یعنی قریش مکہ کی مخالفت حق کا ذکر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ یہ لوگ جو آپ سے وقوع عذاب کا معین وقت پوچھتے ہیں، آپ ان سے فرمادیں کہ میں اس کام کے لئے مسلط نہیں کیا گیا، بلکہ ہر بات کا ایک وقت اللہ کے علم میں مقرر ہے، وہ اپنے وقت پر ہورہے گی، اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي الْأَيْتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو کہ جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر

حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ط وَإِنَّمَا يَتَّبِعُكَ الشَّيْطَانُ

یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی اور بات میں اور اگر بھلا دے تجھ کو شیطان

فَلَا تَقْعُدُوا بِعَدُوِّكُمْ الَّذِينَ كَرِهْتُمْ بِالْغُلَمَاءِ ۖ إِنَّكُمْ عَنْهُمْ بِغَافِلُونَ ۖ وَمَا عَلَى

تو مت بیٹھ یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ اور پرہیزگاروں

الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرِي لَعَلَّهُمْ

پر نہیں ہے جھگڑنے والوں کے حساب میں سے کوئی چیز لیکن اُن کے ذمہ نصیحت کرنی

يَتَّقُونَ ۖ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ

ہونا کہ وہ ڈریں، اور چھوڑ دے ان کو جنہوں نے اپنا دین کو کھیل اور تماشہ اور دھوکہ دیا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكَرَ رَبِّهِمْ ۚ أَنْ تَبْسُلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ وَ

ان کو دنیا کی زندگی نے اور نصیحت کران کو قرآن سے تاکہ گرفتار نہ ہو جائے کوئی اپنے کئے میں،

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۖ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلُّ

کہ نہ ہو اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے والا، اور اگر بدلے میں دے سارے

عَدْلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ

بدلے تو قبول نہ ہوں اس سے وہی لوگ ہیں جو گرفتار ہوئے اپنے کئے میں،

لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۖ

اُن کو پینا ہے گرم پانی اور عذاب ہے دردناک بدلے میں کفر کے

قُلْ أَنتَ عُوَا مِّنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ

تو کہہ دے کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور نہ نقصان اور

نُرَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْنَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ

کیا پھر جاویں ہم اٹلے پاؤں اس کے بعد کہ اللہ سیدھی راہ دکھا چکا ہم کو مثل اس شخص کے کہ

الشَّيْطَانُ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ لَّكَ أَصْحَابُ يَدْعُونَكَ

رستہ بھلا دیا ہو اس کو جنہوں نے جنگل میں جبکہ وہ حیران ہو اس کے رفیق بلاتے ہیں اس کو

إِلَى الْهُدَىٰ ائْتِنَا قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَ

رستہ کی طرف کہ چلا آہائے پاس تو کہہ دے کہ اللہ نے جو راہ بتلائی وہی سیدھی راہ ہے اور

أَمْرُنَا لِلْإِسْلَامِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۖ ۱۱ وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَ

ہم کو حکم ہوا ہے کہ تابع رہیں پروردگار عالم کے، اور یہ کہ قائم رکھو نماز کو اور

اَتَّقُوهُ ۖ وَهُوَ الَّذِي اِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۶۲﴾ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ

ڈرتے رہو اللہ سے اور وہی ہے جس کے سامنے تم سب اکٹھے ہو گے اور وہی ہے جس نے پیدا کیا

السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ

آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر اور جس دن کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گا ،

قَوْلَهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ عِلْمُ الْغَيْبِ

اسی کی بات سچی ہے اور اس کی سلطنت ہے جس دن پھونکا جائے گا صور جاننے والا چھپی

وَالشَّهَادَةِ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۶۳﴾

اور کھلی باتوں کا اور وہی ہے حکمت والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر

اور (اے مخاطب) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات (اور احکام) میں عیب جی کر رہے ہیں تو ان لوگوں (کے پاس بیٹھنے) سے کنارہ کش ہو جا، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاوے اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے (یعنی ایسی مجلس میں بیٹھنے کی ممانعت یاد نہ ہے) تو (جب یاد آوے) یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالموں کے پاس مت بیٹھ بلکہ فوراً اٹھ کھڑا ہو) اور (اگر کوئی واقعی دنیوی یا دینی ضرورت ایسی مجلس میں جانے کی ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ) جو لوگ (ممنوعات شرعیہ سے جن میں بلا ضرورت ایسی مجالس میں جانا بھی داخل ہے) احتیاط رکھتے ہیں، ان پر ان (طاعین و مکذبین) کی باز پرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی بضرورت وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے) ولکن اُن کے ذمہ (بشرط قدرت) نصیحت کر دینا ہو شاید وہ (طعن دینے والے) بھی (ان خرافات سے) احتیاط کرنے لگیں (خواہ قبول اسلام کر کے خواہ ان کے لحاظ سے) اور (کچھ مجالس تکذیب کی تخصیص نہیں، بلکہ) ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہ جھٹوں نے اپنے (اس) دین کو (جس کا ماننا ان کے ذمہ فرض تھا یعنی اسلام کو) لہو و لعب بنا رکھا ہے (کہ اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں) اور دنیوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے (کہ اس کی لذات میں مشغول ہیں) اور آخرت کے منکر ہیں، اس لئے اس تمسخر کا انجام نظر نہیں آتا اور (کنارہ کشی و ترک تعلقا کے ساتھ ایسے لوگوں کو) اس قرآن کے ذریعہ سے (جس سے یہ تمسخر کر رہے ہیں) نصیحت بھی کرتا رہ تاکہ کوئی شخص اپنے کردار (بد) کے سبب (عذاب میں) اس طرح نہ پھنس جاوے

کہ کوئی غیر اللہ نہ اس کا مددگار ہو اور نہ سفارشی ہو اور یہ کیفیت ہو کہ اگر (بالفرض) دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے ڈالے کہ اس کو خرچ کر کے عذاب سے بچ جاوے تب بھی اس سے نہ لیا جاوے (تو نصیحت سے یہ فائدہ ہے کہ اعمالِ بد کے انجام پر تنبیہ ہو جاتا ہے، آگے مانتا نہ ماننا دوسرا جانے چنانچہ) یہ (تمسخر کرنے والے) ایسے ہی ہیں کہ (نصیحت نہ مانی اور) اپنے کردار (بد) کے سبب (عذاب میں) پھنس گئے (جس کا آخرت میں اس طرح ظہور ہو گا کہ) ان کے لئے نہایت تیز (کھولتا ہوا پانی) پینے کے لئے ہو گا اور (اس کے علاوہ اور اس طرح بھی) دردناک سزا ہوگی اپنے کفر کے سبب کہ کردار بد یہی ہے جس کا ایک شعبہ تمسخر تھا) آپ (سب مسلمانوں کی طرف سے ان مشرکین سے) کہہ دیجئے کہ کیا ہم اللہ کے سوا (تمہاری مرضی کے موافق) ایسی چیز کی عبادت کریں کہ نہ وہ (اسکی عبادت کرنیکی صورتیں) ہم کو نفع پہنچانے پر قادر ہوں گے اور نہ وہ (اسکی عبادت کرنیکی صورتیں) ہم کو نقصان پہنچانے پر قادر ہوں گے (مراد اس سے آئمہ باطلہ ہیں کہ بعض کو تو اصلاً قدرت نہیں اور جن کو کچھ ہی بالذات نہیں اور مجبور میں کم از کم اپنے موافق اور مخالفت کو نفع و ضرر پہنچانے کی تو قدرت ہونا چاہی تو کیا ہم ایسوں کی عبادت کریں) اور کیا (معاذ اللہ) ہم (اسلام سے) اُلٹے پھر جاویں، بعد اس کے کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے (طریقِ حق کی) ہدایت کر دی ہے (یعنی اوّل تو شرک خود ہی قبیح ہے، پھر خصوصاً بعد اختیار اسلام کے تو اور زیادہ شنیع ہے ورنہ ہماری تو وہ مثال ہو جاوے) جیسے کوئی شخص ہو کہ اس کو شیطانوں نے کہیں جنگل میں (پہنکا کر) راہ سے بے راہ کر دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو (اور) اس کے کچھ ساتھی بھی تھے کہ وہ اس کو ٹھیک راستہ کی طرف (پکار پکار کر) بلارہے ہیں کہ (ادھر) ہمارے پاس آ (مگر وہ غایت حیرت سے نہ سمجھتا ہے نہ آتا ہے، حاصل یہ کہ جیسا یہ شخص راہ پر تھا لیکن اپنے راہ داں رفقا سے جدا ہو کر غولانِ بیا بانی کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر بے راہ ہو گیا، اور وہ رفقا اب بھی اس کو راہ پر لاتے ہیں، مگر وہ نہیں آتا، ایسی ہی ہماری حالت ہو جاوے کہ راہ اسلام پر ہو کر اپنے ہادیِ پیغمبر سے جدا ہوں اور مضلین کے پیچھے میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاویں اور وہ ہادی پھر بھی خیر خواہی سے دعوتِ اسلام کرتے رہیں اور ہم گمراہی کو نہ چھوڑیں، یعنی کیا ہم تمہاری مرضی پر عمل کر کے اپنی ایسی مثال بنالیں) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ جب اس مثال سے معلوم ہوا کہ راہ سے بے راہ ہونا برا ہے اور یہ (یقینی بات ہے کہ راہِ راست وہ اللہ ہی کا (بتلایا ہوا) راہ ہے) اور وہ اسلام ہے، پس یقیناً اس کا ترک کرنا بے راہ ہونا ہے، پھر ہم کب چھوڑ سکتے ہیں) اور آپ کہہ دیجئے کہ ہم شرک کیسے کر سکتے ہیں، ہم کو (تو) یہ حکم ہوا ہے کہ ہم پورے مطیع ہو جاویں پروردگارِ عالم کے (جو منحصر ہے اسلام میں) اور یہ (حکم ہوا ہے) کہ نماز کی پابندی کرو (جو کہ

توحید پر ایمان کی ظاہر علامت ہے) اور (یہ حکم ہوا ہے کہ) اس سے (یعنی اللہ سے) ڈرو (یعنی مخالفت نہ کرو، جس میں سب سے بڑھ کر شرک ہے) اور وہی (اللہ) ہے جس کے پاس تمام سب رقیامت کے دن قبروں سے نکل کر حساب کے لئے، جمع کئے جاؤ گے (وہاں مشرکین کو اپنے شرک کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا) اور وہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بافائدہ پیدا کیا (جس میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خالق کے وجود اور توحید پر استدلال کیا جائے پس یہ بھی توحید کی ایک دلیل ہے) اور (اوپر جو مَحْشَرُونَ میں حشر یعنی قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دی ہے اس کو بھی کچھ مستبعد مت سمجھو کیونکہ وہ قدرتِ الہیہ کے سامنے اس قدر آسان ہے کہ) جس وقت اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا کہ (حشر) تو ہو جا بس وہ (حشر فوراً) ہو پڑے گا اس کا یہ (کہنا با اثر ہے) (خالی نہیں جاتا) اور (حشر کے روز) جبکہ صور میں (بحکم الہی دوسری بار فرشتہ کی) بھونک ماری جائے گی، ساری حکومت (حقیقتاً بھی ظاہر ابھی) خاص اُسی (اللہ) کی ہوگی (اور وہ اپنی حکومت سے موحّدین و مشرکین کا فیصلہ کرے گا) وہ (اللہ) جانتے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا پس مشرکین کے اعمال و احوال کا بھی اس کو علم ہی) اور وہی ہے بڑی حکمت والا (اس لئے مناسب مناسب جزاء ہر ایک کو دے گا اور وہی ہے) پوری خبر رکھنے والا (اس لئے کسی امر کا اخفاء اس سے ممکن نہیں)۔

معارف و مسائل

اہل باطل کی مجلسوں سے پرہیز کا حکم آیات مذکورہ میں مسلمانوں کو ایک اہم اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہئے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:-

پہلی آیت میں لفظ **خَوْضُونَ**، خوض سے بنا ہے، جس کے اصلی معنی پانی میں اترنے اور اس میں گزرنے کے ہیں، اور لغو و فضول کاموں میں داخل ہونے کو بھی خوض کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ عموماً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، **وَكُنَّا نَخُوضُ مِمَّا خَالَتْ** اور **فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ**، وغیرہ آیات اس کی شاہد ہیں۔

اس لئے خوض فی الآیات کا ترجمہ اس جگہ عجیب جوی یا جھگڑنے کا کیا گیا ہو یعنی جب آپ اُن لوگوں کو دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں محض لہو و لعب اور استہزاء و تمسخر کے لئے دخل دیتے ہیں اور عجیب جوی کرتے ہیں تو آپ اُن سے اپنا رخ پھیر لیں۔

اس آیت کا خطاب عام ہر مخاطب کو ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں اور امت کے افراد بھی، اور درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب بھی عام مسلمانوں کو سننے کے لئے ہے ورنہ آپ تو بچپن میں بھی کبھی ایسی مجلس میں شریک نہیں ہوئے، اس لئے کسی ممانعت کی آپ کو ضرورت نہ تھی۔

پھر اہل باطل کی مجلس سے رُخ پھیرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اُس مجلس سے اُٹھ جائیں، دوسرے یہ کہ وہاں رہتے ہوئے کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، انکی طرف التفات نہ کریں، لیکن آخر آیت میں بتلادیا گیا کہ مراد پہلی ہی صورت ہے، کہ اُن کی مجلس میں بیٹھے نہ رہیں، وہاں سے اُٹھ جائیں۔

آخر آیت میں فرمایا کہ اگر تم کو شیطان بھلا دے، یعنی بھول کر ان کی مجلس میں شریک ہو گئے خواہ اس طرح کہ ایسی مجلس میں شریک ہونے کی ممانعت یاد نہ رہی، یا اس طرح کہ یہ یاد نہ رہا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تذکرے اپنی مجلس میں کیا کرتے ہیں، تو اس صورت میں جس وقت بھی یاد آجائے اسی وقت اُس مجلس سے اُٹھ جانا چاہئے، یاد آ جانے کے بعد وہاں بیٹھا رہنا گناہ ہے، دوسری ایک آیت میں بھی یہی مضمون ارشاد ہوا ہے، اور اس کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ اگر تم وہاں بیٹھے رہے تو تم بھی انہی جیسے ہو۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت کا اصل منشاء گناہ کی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی ہے، جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اُٹھ جائے لیکن اگر وہاں سے اُٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عوام کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ کنارہ کشی کی کوئی دوسری صورت اختیار کر لیں مثلاً کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، اور ان لوگوں کی طرف التفات نہ کریں، مگر خواص جن کی دین میں اقتدار کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہر حال اُٹھ جانا ہی مناسب ہے۔

اس کے بعد فرمایا **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَاكُمْ بِالْحَقِّ**، یعنی اگر تجھ کو شیطان بھلا دے، اس کا خطاب عام مسلمانوں کو ہے تو بات صاف ہے کہ بھول اور نسیان ہر انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، اور اگر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول و نبی پر بھی بھول اور نسیان کا اثر ہو جایا کرے تو ان کی تعلیمات پر کیسے اعتماد و اطینان رہ سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی کسی خاص حکمت و مصلحت کے تحت بھول تو

ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً ان کو تنبیہ بذریعہ وحی ہو جاتی ہے جس سے وہ بھول پر قائم نہیں رہتے، اس لئے بالآخر ان کی تعلیمات بھول اور نسیان کے شبہ سے پاک ہو جاتی ہیں۔

بہر حال آیت کے اس جملہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بہود نسیان سے کسی غلطی میں مبتلا ہو جائے تو وہ معاف ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حدیث میں ارشاد ہے،

رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ

”یعنی میری امت سے خطا اور بھول کا

اور اس کام کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے جو

کسی نے زبردستی اس سے کرا دیا ہو۔“

وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ

یعنی جو چیز

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں اور اس کو بند کرنا یا کرنا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ و اختیار میں نہ ہو، ہاں اگر ایسی مجلس میں بہ نیرت اصلاح

شریک ہو اور ان لوگوں کو حق بات کی تلقین کرے تو مضائقہ نہیں۔“ اور آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آ جانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاصؒ نے

یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایسے ظالم بے دین اور دریدہ دہن لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا مطلقاً گناہ ہے، خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں،

کیونکہ ایسے لوگوں کو ایسی بیہودہ گفتگو شروع کرتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے، وجہ استدلال

کی یہ ہے کہ اس میں مطلقاً ظالموں کے ساتھ بیٹھنے کو منع فرمایا گیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں کہ وہ اس وقت بھی ظلم کرنے میں مشغول ہوں۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی یہی مضمون واضح طور پر بیان ہوا ہے فرمایا کہ

وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۖ

میل جول اور میلان نہ رکھو، ورنہ تمہیں بھی جہنم کی آگ سے پالا پڑے گا۔

جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی

محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر

دوسری آیت اس کے بعد نازل ہوئی، وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ

جَسَارِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَئِنْ ذُكِّرْتُمْ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ۚ

یعنی جو لوگ احتیاط رکھنے والے

ہیں وہ اگر اپنے کام سے مجہر حرام میں جائیں تو ان شہیر لوگوں کے اعمالِ بد کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچاویں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آجائیں۔

تیسری آیت میں بھی تقریباً اسی مضمون کی مزید تاکید اس طرح ارشاد فرمائی گئی ہے:

وَذُرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا، اس میں لفظ دُرْ، وَذُرْ سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ دینا، معنی آیت کے یہ ہیں کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب یعنی مشغلہ اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کے لئے بھیجا گیا ہے، اس کو لہو و لعب بنا رکھا ہے، اس کا اتہزار و تمسخر کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی لہو و لعب کو بنالیا ہے، دونوں معنی کا حاصل تقریباً ایک ہی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَغَرَّهُمْ الدُّنْيَا، یعنی اُن کو دنیا کی چند روزہ زندگی نے غرور اور دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، یہ اُن کے مرض کا اصلی سبب بیان فرمادیا کہ انکی اس ساری سرکشی اور نافرمانی کا اصلی سبب یہ ہے کہ دنیا ہی کی چند روزہ زندگی پر مفتون ہیں، اور آخرت کو بھلائے بیٹھے ہیں، اگر آخرت اور قیامت کا اعتقاد ہوتا تو ہرگز وہ یہ حرکتیں نہ کرتے۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کو دو حکم دیئے گئے ہیں، اول یہ کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں جس کا بیان مذکورہ جملہ میں آچکا ہے، دوسرے یہ کہ صرف ان لوگوں سے کنارہ کشی اور اعراض بھی کافی نہیں، بلکہ ایجابی طور پر یہ بھی ضروری ہو کہ قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت بھی کرتے رہیں اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے بھی رہیں۔ آخر آیت میں اس عذاب کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی، کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو یہ اپنے کردارِ بد کے جال میں خود پھنس جائیں گے، آیت میں اس جگہ اَنْ يُنْسَلَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جن کے معنی قید ہو جانے اور پھنس جانے کے ہیں۔

چونکہ دنیا میں انسان اس کا خوگر ہے کہ اگر کبھی کوئی غلطی یا ظلم کسی پر کر بیٹھا ہے اور اس کی سزا اس کے سامنے آگئی تو سزا سے بچنے کے لئے تین قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے اپنے ظلم کی پاداش سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر اس سے عاجز ہو گیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے، اور یہ بھی نہ چلی تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے کچھ مال خرچ کر دے

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلادیا کہ خدا کے مجرم کے لئے سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش بغیر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے چل سکتی ہے اور نہ کوئی مال قبول کیا جاسکتا ہے، بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ اس سب مال کو سزا سے بچنے کا فدیہ بنا نا چاہے تب بھی یہ فدیہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

آخر آیت میں فرمایا اُولَئِكَ الَّذِينَ ابْيسُوا بِمَا كَسَبُوا اَلَهُمْ شَرُّ ابْتِغَاءٍ حَمِيْلُوْا عَذَابًا لَّيْسَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمالِ بد کی سزا میں پکڑ لئے گئے ہیں، ان کو پینے کے لئے جہنم کا کھولتا ہوا پانی ملے گا، جس کے متعلق دوسری آیت میں ہے کہ وہ ان کی انتڑیوں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دے گا، اور اس پانی کے علاوہ دوسرے بھی دردناک قسم کے عذاب ہوں گے اُن کے کفر و انکار کے بدلے میں۔

اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ آخرت سے غافل صرف دنیا کی زندگی پر مگن ہیں، ان کی صحبت و مجالست بھی... انسان کے لئے ہلک ہے، اس کا انجام یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے والا بھی اس عذاب کا شکار ہوگا جس میں وہ مبتلا ہیں۔

ان تینوں آیتوں کا حاصل مسلمان کو بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچانا ہے جو انسان کے لئے سیم قاتل ہے، قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام بُرائیوں اور جرائم میں مبتلا کرنے والی چیز اس کی بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد انسان اول تو خلافتِ ضمیر اور خلافتِ طبع برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو یہ بُرائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ بُرائی کو بھلائی اور بھلائی کو بُرائی سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص اول گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ نقطہ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس کو بھی گناہ سے دل میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور پچھلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو یکے بعد دیگرے سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دل کی نورانی لوح بالکل سیاہ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی، قرآن مجید میں اسی کو لفظ ذٰن سے تعبیر فرمایا ہے، کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ یعنی ان کے دلوں میں ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے رنگ لگ گیا کہ اب صلاحیت ہی مفقود ہو گئی۔

اور جہاں تک غور کیا جائے انسان کو اس حالت پر پہنچانے والی چیز اکثر اس کا غلط

ماحول اور بری صحبت ہوتی ہے، نعوذ باللہ منہما، اسی لئے بچوں کے مربیوں کا فرض ہے کہ بچوں کو ایسے ماحول اور سوسائٹی سے بچانے میں پوری کوشش کریں۔

اگلی تین آیتوں میں بھی شرک کے ابطال اور توحید اور آخرت کے اثبات کا مضمون ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ النَّارَ اتَّخِذْ أَصْنَامًا آلِهَةً ۚ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو کیا تو مانتا ہے بتوں کو خدا

إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۷﴾ وَكَذَلِكَ نُرِي

میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہ ہیں اور اسی طرح ہم دکھانے لگے

إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ

ابراہیم کو عجائبات آسمانوں اور زمینوں کے اور تاکہ اُس کو

الْمُرْقِنِينَ ﴿۸﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَى اللَّيْلِ رَاكُوبًا ۖ وَقَالَ

یقین آ جاوے، پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا

هَذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلِينَ ﴿۹﴾ فَلَمَّا

یہ ہے رب میرا پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو پھر جب

رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَمْ

دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت

يَهْدِيَنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿۱۰﴾ فَلَمَّا سَآءَ

کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک میں رہوں گا گمراہ لوگوں میں پھر جب دیکھا

الشَّمْسُ بِأَرْغَاةٍ ۖ قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ

سورج جھمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا یہ سب بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا

لِقَوْمٍ إِنِّي بُرِّئُ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿۱۱﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

اپنی میری قوم میں ہزار ہوں ان سے جن کو تم مشرک کرتے ہو، میں نے متوجہ کر لیا اپنی منہ کو اسی کی طرف

لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا ۚ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲﴾

جس نے بنائے آسمان اور زمین سب ایک متوجہ ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ وَلَا أَخَافُ

اور اس سے جھگڑا کیا اس کی قوم نے بولا کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو اللہ کے ایک ہونے میں اور وہ مجھ کو سمجھا

مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يُشَاءَ رَبِّي شَيْءًا وَسِعَ

چکا اور میں ڈرتا نہیں ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کا نگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچائی چاہے، احاطہ

رَبِّي كُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ

کر لیا ہے میرے رب کے علم نے سب چیزوں کا کیا تم نہیں سوچتے اور میں کیونکر ڈروں

مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ

تمھارے شریکوں سے اور تم نہیں ڈرتے اس بات سے کہ شریک کرتے ہو اللہ کا انکو جس کی نہیں اتاری

عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ

اس نے تم پر کوئی دلیل اب دونوں فرقوں میں کون مستحق ہے دل جمعی کا، بولو اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾

سمجھ رکھتے ہو

وقف لازم

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آذر (نام) سے فرمایا کہ کیا تو بتوں کو معبود قرار دیتا ہے، بیشک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو (جو اس اعتقاد میں تیرے شریک ہیں) صریح غلطی میں دیکھ رہا ہوں (اور ستاروں کے متعلق آگے گفتگو آئے گی، درمیان میں ابراہیم علیہ السلام کا صحت نظر کے ساتھ موضوع ہونا کہ ماقبل و مابعد دونوں سے اس کا تعلق ہے فرماتے ہیں) اور ہم نے ایسی ہی (کامل) طور پر ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات (بچشم معرفت) دکھلائیں، تاکہ وہ (خالق کی ذات و صفات کے) عارف ہو جاویں اور تاکہ (از دیار معرفت سے) کامل یقین کرنے والوں سے ہو جاویں آگے ستاروں کے متعلق گفتگو کہ تمہارا منظرہ کا ہی مذکور ہے کہ اوپر کی گفتگو تو بتوں کے متعلق ہو چکی، پھر (اسی دن یا کسی اور دن) جب رات کی تاریکی ان پر (اسی طرح اور سب پر) چھا گئی تو انھوں نے ایک ستارہ دیکھا (کہ چمک رہا ہے) آپ نے (اپنی قوم سے مخاطب ہو کر) فرمایا کہ (تمھارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمھارا)

رب (اور میرے احوال میں متصرف) ہے (بہت اچھا، اب تھوڑی دیر میں حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے چنانچہ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ افق میں جا چھپا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا (اور محبت لازم اعتقاد ربوبیت سے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ میں رب نہیں سمجھتا) پھر (اسی شب میں یا کسی دوسری شب میں) جب چاند کو دیکھا (کہ چمکتا ہوا نکلا ہے) تو (پہلے ہی کی طرح) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا) رب (اور متصرف فی الاحوال) ہے (بہت سزا، اب تھوڑی دیر میں اس کی کیفیت بھی دیکھنا چنانچہ وہ بھی غروب ہو گیا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب (حقیقی) ہدایت نہ کرتا رہے (جیسا اب تک ہدایت کرتا رہتا ہے) تو میں بھی (تمہاری طرح) گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں پھر (یعنی اگر چاند کا قصہ اسی قصہ کوکب کی شب کا تھا تب تو کسی شب کی صبح کو اور اگر چاند کا قصہ اسی قصہ کوکب کی شب کا تھا تو قصہ قمر کی شب کی صبح کو یا اسکے علاوہ کسی اور شب کی صبح کو) جب آفتاب دیکھا کہ بڑی آفتاب چمکتا ہوا نکلا ہے تو پہلی وار کی طرح پھر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے موافق) یہ میرا (اور تمہارا) رب (اور متصرف فی الاحوال) ہے (اور یہ تو سب مذکورہ ستاروں) میں بڑا ہے (اس پر خاتمہ کلام) کا ہو جاوے گا، اگر اس کی ربوبیت باطل ہو گئی تو چھوٹوں کی بدرجہ اولیٰ باطل ہو جاوے گی، غرض شام ہوئی تو وہ بھی غروب ہو گیا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار (اور نفور) ہوں (یعنی برائت ظاہر کرتا ہوں) اعتقاداً تو ہمیشہ سے بیزار ہی تھے) میں (سب طریقوں سے) یک سو ہو کر اپنا رخ (ظاہر کا اور دل کا) اس (ذات) کی طرف (کرتا تم سے ظاہر کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں (تمہاری طرح) شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں (نہ اعتقاداً نہ قولاً نہ عملاً) اور ان سے ان کی قوم نے (بیہودہ) حجت کرنا شروع کی (وہ یہ کہ یہ رسم قدیم ہے وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ، اور معبودان باطلہ کے انکار پر ڈرایا بھی کہ کبھی تم کو یہ کسی آفت میں نہ پھنسا دیں کسا پدل علیہ الجواب بقولہ ولا اخاف الہ) آپ نے (پہلی بات کے جواب میں تو یہ) فرمایا کہ کیا تم اللہ (کی توحید) کے معاملہ میں مجھ سے (باطل) حجت کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھ کو (استدلال صحیح کا) طریقہ بتلا دیا ہے (جس کو میں تمہارے رویہ و پیش کر چکا ہوں) اور محض رسم قدیم ہونا اس استدلال کا جواب نہیں ہو سکتا، پھر اس سے احتجاج تمہارے لئے بیکار (اور میرے نزدیک غیر قابل التفات) اور (دوسری بات کے جواب میں یہ فرمایا کہ) میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ (استحقاق عبادت میں) شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا کہ وہ مجھ کو کوئی صدمہ پہنچا سکتے ہیں کیونکہ ان میں خود صفت قدرت ہی مفقود ہے اور اگر کسی چیز میں ہو بھی

تو استقلالِ قدرت مفقود ہے) ہاں لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے (تو وہ دوسری بات ہو وہ ہو جاوے گی، لیکن اس سے آہلہ و اربابِ باطلہ کی قدرت کا ثبوت یا اُن سے خوف کی ضرورت کب لازم آئی اور) میرا پروردگار (جس طرح قادرِ مطلق ہے جیسا ان اشیاء سے معلوم ہوا اسی طرح وہ) ہر چیز کو اپنے (احاطہ) علم میں (بھی) گھیرے ہوئے ہے (غرض قدرت و علم دونوں اُسی کے ساتھ مختص ہیں، اور تمھارے آہلہ کو نہ قدرت ہے نہ علم ہے) کیا تم (سننے ہو اور) پھر (بھی) خیال نہیں کرتے اور (جس طرح میرے نہ ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمھارا معبودِ علم و قدرت سے محض معترئی ہیں، اسی طرح یہ بات بھی تو ہے کہ میں نے کوئی کام ڈر کا کیا بھی تو نہیں تو پھر) میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) استحقاقِ عبادت اور اعتقادِ ربوبیت میں (شریک بنایا ہے، حالانکہ) تم کو ڈرنا چاہئے (دو وجہ سے، اول تم نے ڈر کا کام یعنی شرک کیا ہے، جس پر عذاب مرتب ہوتا ہے، دوسرے خدا کا عالم اور قادر ہونا معلوم ہو چکا ہے، مگر تم اس بات کے وبال سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کے معبود ہونے پر اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل (لفظاً یا معنی) نازل نہیں فرمائی (مطلب یہ کہ ڈرنا چاہئے تم کو پھر اُلٹا مجھ کو ڈراتے ہو) سو (بعد اس تقریر کے انصاف سے سوچ کر بتلاؤ کہ) ان دو (مذکورہ) جماعتوں میں سے (یعنی مشرکین و موحدین میں سے) امن کا (یعنی اس کا کہ اس پر خوف واقع نہ ہو) زیادہ مستحق کون ہے (اور خوف بھی وہ جو واقع میں قابلِ اعتبار ہے، یعنی آخرت کا) اگر تم (کچھ) خبر رکھتے ہو :

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین عرب کو خطاب اور بُت پرستی چھوڑ کر صرف خدا پرستی کی دعوت کا بیان تھا۔

ان آیات میں اسی دعوتِ حق کی تائید ایک خاص انداز میں فرمائی گئی ہے، جو طبعی طور پر اہل عرب کے لئے دلنشین ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جدِ امجد ہیں اور اسی لئے سارا عرب ان کی تعظیم پر ہمیشہ سے متفق چلا آیا ہے، ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے بُت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، اور پھر سب کو توحیدِ حق کا سبق دیا تھا۔

پہلی آیت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم نے

اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود بنالیا ہے، میں تم کو اور تمھاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

مشہور یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ہے، اور اکثر مؤرخین نے ان کا نام تابخ بتلایا ہے اور یہ کہ آزر ان کا لقب ہوا اور امام رازیؒ اور علماء سلف میں سے ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تابخ اور چچا کا نام آزر ہے، ان کا چچا آزر غمزدگی وزارت کے بعد شرک میں مبتلا ہو گیا تھا، اور چچا کو باپ کہتا عربی محاورات میں عام ہے، اسی محاورہ کے تحت آیت میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ فرمایا گیا ہے، آزر قانی نے شرح مواہب میں اس کے کئی شواہد بھی نقل کئے ہیں۔

اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت اپنے | آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں یا چچا بہر حال گھر اور اپنے خاندان سے شروع کرنی چاہیے | نسبی طور پر ان کے قابل احترام بزرگ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے دعوت حق اپنے گھر سے شروع فرمائی، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم ہوا ہے **وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ**، یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈرائیے، اور آپ نے اس کے ماتحت سب سے پہلے اپنے خاندان ہی کو کوہِ صفا پر چڑھ کر دعوت حق کے لئے جمع فرمایا۔

تفسیر تخریج میں ہے کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر خاندان کے کوئی واجب الاحترام بزرگ دین کے صحیح راستہ پر نہ ہوں تو ان کو صحیح راستہ کی طرف دعوت دینا احترام کے خلاف نہیں بلکہ ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دعوت حق اور اصلاح کا کام اپنے قریبی لوگوں سے شروع کرنا سنتِ انبیاء ہے۔

دو قومی نظریے، مسلمان ایک | نیز اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے خاندان اور قوم کی قوم اور کافر دوسری قوم ہے | نسبت اپنی طرف کرنے کے بجائے باپ سے یہ کہا کہ تمھاری قوم گمراہی میں ہے، اس میں اس عظیم قربانی کی طرف اشارہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی راہ میں اپنی مشرک برادری سے قطع تعلق کر کے ادا کی اور اپنے عمل سے بتلادیا کہ مسلم قومیت رشتہ اسلام سے قائم ہوتی ہے، نسبی اور وطنی قومیتیں اگر اس سے متصادم ہوں تو وہ سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد

فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد

قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو ذکر کر کے آئندہ آنے والی

امتوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بھی اُن کے نقش قدم پر چلیں، ارشاد ہے: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَّاءُ وَآمِنُكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ، یعنی اُمتِ محمدیہ کے لئے اسوۂ حسنہ اور قابل اقتدار ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عمل کہ انھوں نے اپنی نبی اور وطن برادری سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمھارے غلط معبودوں سے بیزاریں، اور ہمارے تمھارے درمیان بغض و عداوت کی دیوار اس وقت تک حائل ہے جب تک تم ایک اللہ کی عبادت اختیار نہ کر لو۔

معلوم ہوا کہ یہ دو قومی نظریے ہیں جس نے پاکستان بنوایا ہے، اس کا اعلان سب سے پہلے حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہے، اُمتِ محمدیہ اور دوسری تمام امتوں نے حسب ہدایت یہی طریقہ اختیار کیا، اور عام طور پر مسلمانوں میں قومیت اسلام معروف ہو گئی، حجۃ الوداع کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قافلہ ملا، آپ نے پوچھا کہ تم کس قوم سے ہو، تو جواب دیا نَحْنُ قَوْمٌ مُّسْلِمُونَ (بخاری) اس میں عرب کے سابقہ دستور کے مطابق کسی قبیلہ یا خاندان کا نام لینے کے بجائے مُسْلِمُونَ کہہ کر اُس حقیقی قومیت کو بتلادیا جو دنیا سے لے کر آخر تک چلنے والی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ اپنے باپ سے خطاب کے وقت تو برادری کی نسبت اُن کی طرف کر کے اپنی بیزاری کا اعلان فرمایا اور جس جگہ قوم سے اپنی بیزاری اور قطع تعلقی کا اعلان کرنا تھا وہاں اپنی طرف منسوب کر کے خطاب کیا، جیسے اگلی آیت میں: لِقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ إِتَىٰ بَرِّئًا مِّمَّا تَشْرِكُونَ، یعنی اے میری قوم! میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں، اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ نسب اور وطن کے لحاظ سے تم میری قوم ہو، لیکن تمھارے مشرکانہ افعال نے مجھے تمھاری برادری سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برادری اور ان کے باپ دُورے شرک میں مبتلا تھے کہ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے، اور ستاروں کی بھی، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دونوں مسلوں پر اپنے باپ اور اپنی قوم سے مناظرہ کیا۔

پہلے بت پرستی کا ضلالت و گمراہی ہونا ذکر فرمایا، اگلی آیات میں ستاروں کا قابل عبادت نہ ہونا بیان فرمایا، اور اس سے پہلے ایک آیت میں بطور تمہید کہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی ایک خاص شان اور علم و بصیرت میں اعلیٰ مقام کا ذکر اس طرح فرمایا: وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَكْمُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونًا مِنَ السُّمُوعِينَ، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو اس طرح دکھلادیا کہ ان کو سب چیزوں کی حقیقت و اشکات طور پر معلوم ہو جائے، اور ان کا یقین مکمل ہو جائے اسی کا نتیجہ تھا جو

بعد کی آیات میں ایک عجیب طرح کے مناظرہ کی شکل میں اس طرح مذکور ہے :

تبلیغ و دعوت میں حکمت و تدبیر سے کام لینا سنتِ انبیاء ہے | یعنی ایک رات میں جب تاریکی چھا گئی اور ایک کوکب یعنی ستارہ پر نظر پڑی تو اپنی قوم کو سنا کر کہا کہ یہ ستارہ میرا رب ہے، مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالات عقائد کی رو سے یہی میرا اور تمہارا رب یعنی پالنے والا ہے، اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہو گیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر حجت قائم کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا، اور فرمایا لَا أُحِبُّ إِلَّا فَلِئِنَّ، آفِلِئِنَّ کا یہ لفظ آقُول سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غروب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ میں غروب ہو جانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا، اور جس کو خدایا معبود بنایا جائے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت و عظمت کا مستحق ہونا چاہئے، مولانا رومیؒ نے ایک شعر میں اسی واقعہ کو بیان فرمایا ہے، یہ

خلیل آسا در ملک یقین زن
نوائے لَا أُحِبُّ إِلَّا فَلِئِنَّ زن

اس کے بعد پھر کسی دوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ خستیاں فرمایا اور کہا کہ تمہارے عقائد کے مطابق یہ میرا رب ہے، مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آجائے گی، چنانچہ جب چاند غروب ہو گیا تو فرمایا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا رہتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہو جاتا، اور چاند ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھ بیٹھتا، لیکن اس کے طلوع و غروب کے بدلنے والے حالات نے مجھے متنبہ کر دیا کہ یہ ستارہ بھی قابلِ عبادت نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ میرا رب کوئی دوسری شے ہے جس کی طرف مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز آفتاب کو بٹکتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اسی طریقہ پر فرمایا کہ تمہارے خیال کے مطابق یہ میرا رب ہے، اور یہ تو سب سے بڑا ہے، مگر اس بڑی کی حقیقت و حیثیت بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی، چنانچہ آفتاب بھی اپنے وقت پر غروب ہو گیا، تو قوم پر آخری حجت تمام کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرما دیا کہ يٰقَوْمِ اِنِّیْ بُرِّئُ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ، یعنی اے میری قوم! میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بیزار ہوں، کہ تم نے خدا تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدائی کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلادیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالتے والا) ان تمام مخلوقات میں سے کوئی نہیں ہو سکتا، جو خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہیں، اور ہر وقت ہر آن عروج و نزول اور طلوع و غروب کے تغیرات میں گھری ہوئی ہیں، بلکہ ہمارا سب کا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اس لئے میں نے اپنا بیچ تمہارے سب خود تراشیدہ بتوں اور تغیرات و تاثرات میں گھرے ہوئے ستاروں سے پھیر کر صرف ایک خدائے وحدہ لا شریک کی طرف کر لیا ہے، اور میں تمہاری طرح مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس واقعہ مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت و موعظت سے کام لے کر یحبارگی ان کی نجوم پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا، بلکہ ایک ایسا انداز قائم کیا، جس سے ہر ذی عقل انسان کا قلب و دماغ خود متاثر ہو کر حقیقت کو پہچان لے، ہاں بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں اول ہی شدت اختیار فرمائی، اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کر دیا، وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا نام معقول گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا، بخلاف نجوم پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور جلی نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نجوم پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو استدلال بیان فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تغیر پذیر ہو اور اس کے حالات اول بدل ہوتے رہتے ہوں، اور وہ اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا رب قرار دیں، اس استدلال میں سیاروں کے طلوع و غروب اور درمیانی تمام حالات سے استدلال کیا جاسکتا تھا، کہ وہ اپنی حرکات میں خود مختار ہیں کسی کے حکم کے تابع ایک خاص روش پر چل رہے ہیں، لیکن حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے ان تمام حالات و کیفیات میں سے استدلال کے لئے ان سیاروں کے غروب کو پیش کیا، کیونکہ ان کا غروب عوام کی نظروں میں ایک طرح سے ان کا زوال سمجھا جاتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا عام طرز استدلال وہ ہوتا ہے جو عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو، وہ فلسفیانہ حقائق کے پیچھے زیادہ نہیں پڑتے، بلکہ عام ذہنوں کے مطابق خطاب فرماتے ہیں، اس لئے ان سیاروں کی بے بسی اور بے اثری ثابت کر کے لئے ان کے غروب کو پیش کیا، ورنہ ان کے بے بس اور بے قدرت ہونے پر تو طلوع سے بھی استدلال ہو سکتا تھا، اور اس کے بعد غروب سے پہلے تک جتنے تغیرات پیش آتے ہیں ان سے بھی اس پر دلیل پکڑی جاسکتی ہے۔

مبتغین اسلام کے لئے | حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرز مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لئے چند ہدایات | چند اہم ہدایات حاصل ہوتیں: اول یہ کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں

نہ ہر جگہ سختی مناسب ہے نہ ہر جگہ نرمی، بلکہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے، چنانچہ بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا، کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ کو چاہئے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کر سکی تدبیر کرے اور دوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ اظہار حق و حقیقت کے لئے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے یوں خطا نہیں کیا کہ تم ایسا کرو، بلکہ اپنا حال بتلا دیا کہ میں تو ان طلوع و غروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا، اس لئے میں نے اپنا رخ ایک ایسی ہستی کی طرف کر لیا ہے جو ان سب چیزوں کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے، مقصد تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے، مگر حکیمانہ انداز میں صریح خطاب سے پرہیز فرمایا، تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور مبلغ کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لئے مؤثر ہو۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ

جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انھوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان انہی کے واسطے ہو

الْأَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۸۹﴾ وَبَلَكَ حُجَّتْنَا أَلَيْنَاهَا أَجْرَهُمُ

دل جمعی اور دہی ہیں سیدھی راہ پر اور یہ ہماری دلیل ہو کہ ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس

عَلَىٰ قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۹۰﴾

کی قوم کے مقابلہ میں درجے بلند کرتے ہیں ہم جس کے چاہیں تیرا رب بھمت والا ہو جانے والا

وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن

اور بخشا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب سب کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت کی ہم نے

قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَ

ان سب سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو اور ایوب اور یوسف کو اور

مُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۸۳﴾ وَنَزَّلْنَا

موسیٰ اور ہارون کو اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام والوں کو اور زکریا اور

يَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۸۴﴾ وَإِسْمَاعِيلَ وَ

یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو سب ہیں نیک بختوں میں اور اسمعیل اور

الْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۸۵﴾ وَمِن

الیسع کو اور یونس کو اور لوط کو اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر اور ہدایت

آبَاءَهُمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ

کی ہم نے بعضوں کو ان کے باپ داروں میں سے اور انکی اولاد میں سے اور بھائیوں میں سے اور انکو ہم نے پسند کیا اور

إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۸۶﴾ ذَٰلِكَ هُدَىٰ اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ

سیدھی راہ چسلا یا ، یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر چلاتا ہے جسکو چاہے اپنے

مِّنْ عِبَادَةٍ ۖ وَلَوْ آشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۸۷﴾

بندوں میں سے اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو البتہ ضائع ہو جاتا جو کچھ انھوں نے کیا تھا،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الرِّكَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۖ فَإِن

یہی لوگ تھے جن کو دی ہم نے کتاب اور شریعت اور نبوت پھر اگر ان

يَكْفُرْ بِمَا هُوَ لَا يَفْعَلُ وَكُنَّا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَفِرَتَيْنِ ﴿۸۸﴾

باتوں کو نہ مانیں مکہ والے تو ہم نے ان باتوں کے لئے مقرر کر دیئے ہیں ایسے لوگ جو ان سے منکر نہیں

خلاصہ تفسیر

جو لوگ (اللہ پر) ایمان رکھتے ہیں اور اپنے (اس) ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں

کرتے، ایسوں ہی کے لئے (قیامت میں) امن ہے اور وہی (دنیا میں) راہ (راست) پر چلے

لے رہے ہیں اور وہ صرف موحّدین میں بخلاف مشرکین کے کہ گمبالمعنی اللغوی خدا پر ایمان رکھتے ہیں

کیونکہ خدا کے قائل ہیں، لیکن شرک بھی کرتے ہیں جس سے ایمان شرعی منہی ہو جاتا ہے، جب موحّدین

قابل امن ہیں سو اس صورت میں خود متم ڈر نہ کہ مجھ کو ڈراتے ہو، حالانکہ نہ تمھارے آہلہ ڈرنے

کے قابل نہ میں نے کوئی کام ڈر کا کیا اور نہ دنیا کا خوف قابل اعتبار اور تمھاری حالت تمہیں اعتبار

سے محل خوف ہے) اور یہ (حجت جو ابراہیم علیہ السلام نے توحید پر قائم کی تھی) ہماری

(دی ہوئی) حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی رجب ہماری
 دی ہوئی تھی تو یقیناً اعلیٰ درجہ کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی کیا تخصیص ہی ہم (تو) جس کو چاہو
 ہیں (علی و علی) مرتبوں میں بڑھادیتے ہیں (چنانچہ سب انبیاء کو یہ رفعت درجات عطا فرمائی) بیشک
 آپ کا رب بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے کہ ہر ایک کا حال اور استعداد جانتا ہے اور ہر ایک
 کے مناسب اس کو کمال عطا فرماتا ہے (اور ہم نے جیسا ابراہیم علیہ السلام کو کمال ذاتی علم
 و عمل دیا، اسی طرح کمال اضافی بھی دیا کہ ان کے اصول اور فروع سے بہتوں کو کمال دیا چنانچہ)
 ہم نے ان کو (ایک بیٹا) اسحاق دیا اور (ایک پوتا) یعقوب دیا اور اس سے دوسری اولاد کی
 نفی نہیں ہوئی اور دونوں صاحبوں میں سے ہر ایک کو (طریق حق کی) ہم نے ہدایت کی، اور
 (ابراہیم سے) پہلے زمانہ میں ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (جن کا ابراہیم علیہ السلام کے اجداد
 میں ہونا مشہور ہے اور اصل کی فضیلت فرع میں بھی مؤثر ہوتی ہے طریق حق کی) ہدایت کی
 اور ان (ابراہیم علیہ السلام) کی اولاد (نحوی یا عرفی یا شرعی) میں سے (آخر تک جتنے مذکور ہیں
 سب کو طریق حق کی ہدایت کی یعنی) داؤد (علیہ السلام) کو اور (ان کے صاحبزادہ) سلیمان
 (علیہ السلام) کو اور ایوب (علیہ السلام) کو اور یوسف (علیہ السلام) کو اور موسیٰ
 (علیہ السلام) کو اور ہارون (علیہ السلام) کو (طریق حق کی ہدایت کی) اور رجب یہ ہدایت
 پر چلے تو ہم نے ان کو جزائے خیر بھی دی مثل ثواب و زیادہ قرب کے اور جس طرح نیک کاموں
 پر ان کو جزا دی) اسی طرح (ہماری عادت ہے کہ) ہم نیک کام کرنے والوں کو (مناسب)
 جزا دیا کرتے ہیں اور نیز ہم نے طریق حق کی ہدایت کی، زکریا (علیہ السلام) کو اور (ان کے
 صاحبزادہ) یحییٰ (علیہ السلام) کو اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور ایسا (علیہ السلام) کو
 (اور یہ) سب (حضرات) پورے شائستہ لوگوں میں تھے اور نیز ہم نے طریق حق کی ہدایت
 کی، اسمعیل (علیہ السلام) کو اور یسح (علیہ السلام) کو اور یونس (علیہ السلام) کو اور لوط (علیہ السلام)
 کو اور (ان میں سے) ہر ایک کو (ان زمانوں کے) تمام جہان والوں پر زنبوت سے ہم نے فضیلت
 دی اور نیز ان (حضرات مذکورین) کے کچھ باپ دادوں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو،
 (طریق حق کی ہم نے ہدایت کی) اور ہم نے ان (سب) کو راہ راست (یعنی دین حق) کی ہدایت
 کی (اور وہ دین جس کی ان سب کو ہدایت ہوئی تھی) اللہ کی (جانب سے جو) ہدایت (ہوئی ہی)
 وہ یہی (دین) ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت (یعنی منزل پر پہنچانے
 کی صورت میں) کرتا ہے (چنانچہ اب جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی اسی کی ہدایت اس معنی سے
 ہوئی کہ ان کو صحیح راستہ دکھادیا، پھر منزل پر پہنچایا یا نہ پہنچانا ان کا کام ہے، مگر ان میں سے

بعض نے اس کو چھوڑ کر شرک اختیار کر لیا، اور شرک اس قدر ناپسند چیز ہے کہ غیر انبیاء تو کس شمار میں ہیں) اگر فرضاً یہ حضرات (انبیاء مذکورین) بھی (نعوذ باللہ) شرک کرتے تو جو کچھ یہ (نیک) اعمال کیا کرتے تھے ان سے سب اکارت ہو جاتے (آگے مسئلہ نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ) یہ (جتنے مذکور ہوئے) ایسے تھے کہ ہم نے ان (کے مجموعہ) کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (کے علوم) اور نبوت عطاء کی تھی (تو نبوت امر عجیب نہیں جو یہ کافر لوگ آپ کے منکر ہوئے ہیں، کیوں کہ نظام موجود ہیں) سو اگر (نظیر موجود ہونے پر بھی) یہ لوگ (آپ کی) نبوت کا انکار کریں تو (آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) ہم نے اس کے (ماننے کے) لئے ایسے بہت لوگ مقرر کر دیئے ہیں (یعنی مہاجرین و انصار) جو اس کے منکر نہیں ہیں۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اپنے باپ آذر اور پوری قوم غرود کے ساتھ مذکور تھا، جس میں اُن کی بُت پرستی اور نجوم پرستی کے خلاف یقینی شہادتیں پیش کرنے کے بعد آیات مذکورہ میں اپنی قوم کو خطاب فرمایا کہ تم مجھے اپنے بتوں سے ڈراتے ہو کہ میں ان کا انکار کروں گا تو یہ مجھے برباد کر دیں گے، حالانکہ نہ بتوں میں اس کی قدرت ہے اور نہ میں نے کوئی کام ایسا کیا ہے جس کے نتیجے میں مجھے کوئی مصیبت پہنچے، بلکہ ڈرنا تمہیں چاہئے کہ تم نے جرم بھی ایسا سخت کیا ہے کہ اللہ کی مخلوق بلکہ مخلوق کی مصنوعات کو خدا کا شریک اور برابر کر دیا، اور پھر خدا تعالیٰ علیم و خیر اور قادر مطلق ہونا بھی کسی عقل والے سے مخفی نہیں تو اب تم خود سوچ کر بتلاؤ کہ امن اور اطمینان کا مستحق کون ہے اور ڈرنا کس کو چاہئے؟

ان آیات میں سے پہلی آیت میں یہ مضمون ارشاد فرمایا کہ عذاب مامون و مطمئن صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں، اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی ملاوٹ نہ کریں، حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام سہم گئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی ظلم اپنی جان پر بذریعہ گناہ کے نہیں کیا، اور اس آیت میں عذاب سے مامون ہونے کی یہ شرط ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی ظلم نہ کیا ہو، تو پھر ہماری نجات کی کیا سبیل ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے، آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات

وصفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے وہ عذاب سے مامون اور ہدایت یافتہ ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، دریاؤں کو پوجنے والی مخلوق اپنی
بیوقوفی سے ان چیزوں کو باختیار سمجھتی ہے، اور ان کی عبادت چھوڑنے سے اس کو ڈرتی
ہے کہ کہیں یہ چیزیں ہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیں، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے گُر کی بات ان کو بتلائی کہ خدائے قدوس جو تمہارے ہر کام سے باخبر بھی ہے اور تمہارے
ہر بھلے بُرے پر پوری طرح قادر بھی ہے اس سے تو تم ڈرتے نہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرنے
سے کوئی مصیبت آجائے گی اور جن چیزوں میں نہ علم ہے نہ قدرت ان سے ایسے ڈرتے ہو؟
یہ سوئے بے عقلی کے اور کیا ہے، ڈرنا صرف اللہ تعالیٰ سے چاہئے، اور جس کا اس پر ایمان ہو وہ
کسی خطرہ میں نہیں۔

اس آیت میں وَلَمْ يَلْبِسُوا اٰیٰمَنَا فَهُمْ بِظُلْمٍ قُرَّيَا ہے، اس میں ظلم سے تو رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے موافق شرک مراد ہے، عام گناہ مراد نہیں، لیکن لفظ بِظُلْمٍ کو نکرہ
لا کر عربی زبان کے قواعد کے مطابق عام کر دیا جو ہر قسم کے شرک کو شامل ہے، اور لفظ لَمْ يَلْبِسُوا
لبس سے بنا ہے جس کے ایک معنی ہیں اُدھر ہنایا خلط ملط کر دینا، اور مراد آیت کی یہ ہے کہ
جو آدمی اپنے ایمان میں کسی قسم کا شرک ملا دے یعنی خدا تعالیٰ کو تمام صفات کمال کے ساتھ ماننے
کے باوجود غیر اللہ کو بھی ان میں سے بعض صفات کا حامل سمجھے وہ اس امن و ایمان کے خارج ہو۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ کھلے طور پر شرک و بت پرست
ہو جائے، بلکہ وہ آدمی بھی مشرک ہے جو اگرچہ کسی بت کی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور کلمہ اسلام
پڑھتا ہے، مگر کسی فرشتہ یا رسول یا کسی ولی اللہ کو اللہ کی بعض صفات خاصہ کا شریک ٹھہرائے
اس میں اُن عوام کے لئے سخت تنبیہ ہو جو اولیاء اللہ اور ان کے مزار کو حاجت روا سمجھتے ہیں اور
عملاً اُن کو ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا خدائی کے اختیارات اُن کے حوالے کر دیئے گئے ہیں، ان کو باللہ منہ۔
دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اپنی قوم
کے مناظرہ میں کھلی فتح پائی، اور اُن کو لا جواب کر دیا، یہ ہمارا ہی انعام تھا کہ ان کو صحیح نظریہ عطا کیا
پھر اُس کے واضح دلائل بتلا دیئے، کسی کو اپنی عقل و فہم یا تقریر اور زور و خطابت پر ناز نہ ہونا چاہئے
بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے کسی کا بیڑا پار نہیں ہوتا، نرسی عقل انسانی ادراک حقائق کیلئے
کافی نہیں، جس کا مشاہدہ ہر دور میں ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے ماہر فلاسفر مگر اسی کے راستہ پر
پڑ جاتے ہیں اور بہت سے اُن پر ٹھ جابل صحیح عقیدہ اور نظریہ کے پابند ہو جاتے ہیں، مولانا رومیؒ
نے خوب فرمایا ہے ۵

بے عنایات حق و خالصان حق
گر ملک باشد سیہ ستش ورق

آخر آیت میں فرمایا تَرْفَعُ ذَرْجَتِ مَنْ تَشَاءُ، یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو پورے عالم میں اور قیامت تک آنے والی نسلوں میں خاص عزت و مقام عطا ہوا کہ یہودی، نصرانی، مسلمان، بدھ مت وغیرہ سب کے سب ان کے تقدس کے قائل اور ان کی تعظیم کرتے چلے آئے ہیں، یہ بھی ہمارا ہی فضل و انعام ہے کہ کسی کے کسبِ اکتساب کا اس میں دخل نہیں۔

اس کے بعد کی کچھ آیتوں میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی ہے جن میں سے بعض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء و اجداد ہیں، اور اکثر ان کی اولاد ہیں، اور بعض ان کے بھائی بھتیجے ہیں، ان آیتوں میں ایک طرف تو ان حضرات کا ہدایت پر ہونا، صالحین ہونا، صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرمایا گیا ہے، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب اور قبول فرمالیا ہے، اور دوسری طرف یہ بتلایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں اپنے باپ اور برادری اور وطن کو چھوڑ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت کے درجاتِ عالیہ اور دائمی اور بے مثال راحتوں سے پہلے دنیا میں بھی ان کو اپنی برادری سے بہتر برادری اور وطن سے بہتر وطن عطا فرمایا، اور یہ شرفِ عظیم عطا فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد قیامت تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے گئے وہ سب ان کی اولاد میں ہیں، ایک شاخ جو حضرت اسحق علیہ السلام سے چلی اس میں تمام انبیاء بنی اسرائیل آئے اور دوسری شاخ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلی اس میں سید الاولین و الآخرین نبی الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اور یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ عزت و ذلت اور نجات و عذاب کا اصل مدار انسان کے اپنے ذاتی اعمال پر ہے، لیکن آباء و اجداد میں کسی نبی، ولی کا ہونا یا اولاد میں علما، صلحاء کا ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس سے بھی انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ان سترہ انبیاء علیہم السلام میں جن کی فہرست آیات مذکورہ میں دی گئی ہے ایک حضرت نوح علیہ السلام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جدِ امجد ہیں، باقی سب کو ان کی ذریت فرمایا ہے، وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَ سُكْيَمُونَ الْآیۃ، اس میں ایک اشکال تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دختر میں سے ہیں، یعنی پوتے نہیں کہ تو اسے ہیں، تو ان کو ذریت کہنا کیسے صحیح

ہوگا؟ اس کا جواب عامہ علماء و فقہاء نے یہ دیا ہے کہ لفظ ذریت پوتوں اور نواسوں دونوں کو شامل ہے اور اسی سے استدلال کیا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔

دوسرا اشکال حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ اولاد میں نہیں بلکہ بھتیجے ہیں لیکن اس کا جواب بھی واضح ہے کہ عرف میں چچا کو باپ اور بھتیجے کو بیٹا کہنا بہت ہی متعارف ہے آیات مذکورہ میں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انعامات الہیہ بیان فرما کر ایک طرف تو یہ قانون قدرت بتلادیا گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرتا ہو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی اس سے بہتر چیزیں عطا فرمادیتے ہیں، دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ حالات سنا کر اس طرف ہدایت کرنا مقصود ہے کہ تم لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے تو دیکھو جن کو تم بھی سب بڑا مانتے ہو یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا پورا خاندان وہ سب یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قابل عبادت صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک کرنا یا اس کی مخصوص صفات کا سا بھی بتلانا کفر و گمراہی ہے، تم لوگ خود اپنے مسلمات کی رو سے بھی ملزم ہو۔

آٹھویں آیت میں یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا اور اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے ارشاد فرمایا کہ: فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِمِثْلِهِ بِكُفْرَتِهِ، یعنی اگر آپ کے کچھ مخاطب آپ کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین کی ہدایت پیش کر دینے کے باوجود وہ انکار ہی پر تیلے ہوئے ہیں، تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ ہم نے آپ کی دعوت و ہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بڑی قوم کو مقدر کر رکھا ہے، وہ کفر و انکار کے پاس نہ جائیں گے، اس میں عہد مبارک کے موجودین مہاجرین و انصار بھی داخل ہیں، اور قیامت تک آنے والے مسلمان بھی، اور یہ آیت ان سب لوگوں کے لئے مایہ فخر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاَحْشِرْنَا فِيْ زُمْرَتِهِمْ

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ فَبِمَا كَسَبَتْ اَفْئِدَتُهُمْ اَقْبَلَتْ اَقْلًا لَا اَسْأَلُكُمْ

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سوتو چل ان کے طریقہ پر تو کہہ دو کہ میں نہیں مانگتا تم سے

عَلَيْهِ اَجْرًا ط اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ۙ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ

اس پر کچھ مزدوری، یہ تو محض نصیحت ہی جہان کے لوگوں کو اور نہیں پہچانا انھوں نے اللہ کو

حَقَّ قَدْرِهِ اِذْ قَالُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ط قُلْ

پورا پہچاننا جب کہنے لگے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز پوچھ تو

مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى

کسی نے اُتاری وہ کتاب جو موسیٰؑ لے کر آیا تھا روشن تھی اور ہدایت تھی

لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ يُبَدُّ وَهَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۚ

لوگوں کے واسطے جسکو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا

وَعَلَيْكُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ قُلِ اللَّهُ لَا تَعْلَمُ

اور ہم کو بچھلا دیں جن کو نہ جانتے تھے ستم اور نہ تمھارے باپ دادا سے تو کہہ دے کہ اللہ نے اتاری پھر

ذَرُّهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ ٩١ وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مَبْرُكٌ

چھوڑ دے ان کو اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں اور یہ قرآن کتاب ہے جو کہ ہم نے اُتاری برکت والی

مُصَدِّقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ حَوْلَهَا

تصدیق کرنے والی ان کی جو اس سے پہلی ہیں اور تاکہ توڈراوے مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ

کو اور جن کو یقین ہے آخرت کا وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ہیں اپنی نماز

يُحَافِظُونَ ﴿٩٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ

سے خبردار ، اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان

قَالَ أَوْحَىٰ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ

کہے مجھ پر وحی اُتری اور اُس پر وحی نہیں اُتری کچھ بھی اور جو کہے کہ میں بھی اُتارتا ہوں مثل

مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَوْ تَرَى إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ

اس کے جواب میں اُتارا اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور

الْمَلِئِكَةُ بِأَسْطُرٍ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ

فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ

بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب اس سبب سے کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹی

الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٢﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا

باتیں اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے اور البتہ تم ہمارے پاس آ گئے

فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ

ایک ایک ہو کر جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تم کو پہلی بار اور چھوڑ آئے تم جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا

ظَهَرِ كُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ

تھا اپنی پیٹھ کے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ سفارش کرنے والوں کو جن کو تم بتلایا کرتے تھے کہ

فِيكُمْ شُرَكَاءُ أَطْلَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ

اُن کا تم میں سا جھڑی، البتہ منقطع ہو گیا تمہارا علاقہ اور جاتے رہے جو دعوے کہ تم

تَزْعُمُونَ ﴿۹۴﴾

کیا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

(اور ہم جو غم نہ کرنے کو اور صبر کرنے کو کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ سب انبیاء نے ایسا ہی کیا ہے چنانچہ) یہ حضرات (مذکورین) ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (اس صبر کی) ہدایت کی تھی سو (اس باب میں) آپ بھی انہی کے طریق (صبر) پر چلے (چونکہ آپ کو بھی اس کی ہدایت کی گئی ہے) کیونکہ ان سے آپ کو نفع نہ کوئی ضرر ہو جس کی وجہ سے غم اور بے صبری ہو اور اس مضمون کے اظہار کے واسطے ان سے تبلیغ کے وقت آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے (اس تبلیغ قرآن) پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا (جس کے ملنے سے نفع اور نہ ملنے سے ضرر ہو) بے غرض نصیحت کرتا ہوں) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہانوں کے واسطے ایک نصیحت ہے (جس کو ماننے سے تمہارا ہی نفع اور نہ ماننے سے تمہارا ہی نقصان ہے) اور ان (منکر) لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ (منہ بھر کر) یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز (یعنی کوئی کتاب) ابھی نازل نہیں کی (یہ کہنا ناقدر شناسی اس لئے ہے کہ اس سے مسئلہ نبوت کا انکار لازم آتا ہے) اور نبوت کا منکر اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے، اور تصدیق حق واجب ہے، پس اس میں قدر شناسی واجب میں اخلاص ہوا، یہ تو تحقیقی جواب تھا، اور الزامی مسکت جواب دینے کے لئے آپ (ان سے) یہ کہتے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ (علیہ السلام) لائے تھے (یعنی توریت جس کو تم بھی مانتے ہو) جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (خود مثل) نور (کے واضح) ہے اور (جن کی ہدایت کے لئے وہ آئی تھی ان) لوگوں کے لئے وہ (لو جہ بیان شرائع کے ذریعہ) ہدایت ہے جس کو تم نے (اپنی اغراض نفسانیہ کے لئے) متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن

(میں جتنے اوراق کو چاہا ان) کو ظاہر کر دیتے ہو (جس میں تمہارے مطلب کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی) اور بہت سی باتوں کو جواب دینے مطلب کے خلاف ہیں، یعنی جن اوراق میں وہ لکھی ہوئی ہیں ان کو چھپاتے ہو اور اس کتاب کی بدولت، تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو (قبل کتاب ملنے کے) نہ تم (یعنی قوم بنی اسرائیل جو کہ وقت نزول آیت موجود تھی) جانتے تھے اور نہ تمہارے (قریب سلسلہ کے) بڑے (جانتے تھے، مطلب یہ کہ جس توریت کی یہ حالت ہو کہ اس کو اولاً تو تم مانتے ہو، دوسرے بوجہ نور و ہدیٰ ہونے کے ماننے کے قابل بھی ہے، تیسرے ہر وقت تمہارے استعمال میں ہے، گو وہ استعمال شرمناک ہو، لیکن اس کی وجہ سے گنجائش انکار تو نہیں ہے چوتھے تمہارے حق میں وہ بڑی نعمت اور منت کی چیز ہے، اسی کی بدولت عالم بنے بیٹھے ہو، اس حیثیت سے بھی اس میں گنجائش انکار نہیں، یہ بتلاؤ کہ اس کو کس نے نازل کیا ہے، اور چونکہ اس سوال کا جواب ایسا متعین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کے سوا کوئی جواب نہ دیتے، اس لئے خود ہی جواب دینے کے لئے حضور کو حکم ہو کہ آپ (وہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے (کتاب مذکور کو) نازل فرمایا ہے (اور اس سے ان کا دعویٰ عام باطل ہو گیا) پھر یہ جواب سنا کر، اُن کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے (یعنی آپ کا منصبی کام ختم ہو گیا، نہ مانیں تو آپ فکر میں نہ پڑیں ہم آپ ہی سمجھ لیں گے) اور (جس طرح توریت ہماری نازل کی ہوئی کتاب تھی اسی طرح) یہ (قرآن) بھی (جس کی تکذیب یہود کے قول مذکور سے اصل مقصود ہے) ایسی ہی کتاب ہو جس کو ہم نے (آپ پر) نازل کیا ہو جو بڑی (خیر و) برکت والی ہے (چنانچہ اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا موجب فلاح و نفع دارین ہے اور) اپنے سے پہلے (نازل شدہ) کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرنیوالی ہو رسولہم نے اس قرآن کو نفع خلاق اور تصدیق کتب الہیہ کے لئے نازل فرمایا، اور اس لئے نازل فرمایا کہ تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) مکہ والوں کو اور آس پاس والوں کو (خصوصیت کے ساتھ عذاب الہی سے جو کہ مخالفت پر ہوگا) ڈرا دیں (اور یوں انذار عام بھی کریں لیسگوْنَ لَعَا لَیْمَیْنِ ذَیْنِیْرًا) اور آپ کے انداز کے بعد گو سب ایمان نہ لاویں لیکن) جو لوگ آخرت کا (پورا) یقین رکھتے ہیں (جس سے عذاب کا اندیشہ ہو جائے اور اس سے بچنے کی فکر پڑ جائے اور ہمیشہ طلب طریق نجات اور تعین حق کی دھن لگ جائے خواہ کسی دلیل نقلی سے یا تجویز عقلی سے) ایسے لوگ (تو) اس (قرآن) پر ایمان لے (ہی) آتے ہیں اور (ایمان و اعتقاد کے ساتھ اس کے اعمال کے بھی پابند ہوتے ہیں، کیونکہ عذاب سے نجات ناممکن ہے موعود ہے، چنانچہ) وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (اور جب اس عبادت پر جو کہ ہر روز پانچ بار مکرر اور شاق ہے مداومت کرتے ہیں تو دوسری عبادات کے جو کہ گاہ گاہ اور سہل ہیں بدرجہ اولیٰ پابند ہوں گے، حاصل

یہ کہ کسی کے ماننے نہ ماننے کی فکر نہ کیجئے جو اپنا بھلا چاہیں گے مان لیں گے، جو نہ چاہیں گے نہ نہیں گئے آپ اپنا کام کیجئے) اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے (اور مطلق نبوت یا خاص نبوت کا منکر ہو، جیسا اور بعض کا قول آیا ہے، مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّثْلَ هَذَا) اور بعض کا قول تھا (لَا تَبْعَثِ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا) یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آتی (جیسے مسلمان وغیرہ) اور اسی طرح اس سے بھی زیادہ ظالم کون ہوگا (جو شخص کہ یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے (حسب دعویٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نازل کیا ہے، اسی طرح کائنات میں بھی لا ذکر دکھا) تاہوں (جیسا نصر یا عبداللہ مذکور کرتا تھا، غرض یہ سب لوگ بڑے ظالم ہیں) اور (ظالموں کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ (ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک منظر دکھلائی دے) جبکہ یہ ظالم لوگ (جن کا ذکر ہوا) موت کی (روحانی) سختیوں میں (گرفتار) ہوں گے اور (موت کے) فرشتے (جو ملک الموت کے احوال ہیں ان کی روح نکالنے کے واسطے ان کی طرف) اپنے ہاتھ بڑھائے ہوں گے (اور شدت کے ظاہر کرنے کو یوں کہتے جاتے ہوں گے کہ) ہاں (جلدی) اپنی جانیں نکالو (کہاں بچاتے پھرتے تھے، دیکھو) آج (مرنے کے ساتھ ہی) تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (یعنی جس میں تکلیف جسمانی بھی ہو اور ذلت روحانی بھی ہو) اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی (جھوٹی) باتیں بکتے تھے (جیسے مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَّا رُوحًا وَإِنَّا لَنَرَاهُ فِي صَدْرِهِ) اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات (کے قبول کرنے) سے (جو کہ ذریعہ ہدایت تھی) تکبر کرتے تھے، (یہ کیفیت تو موت کے وقت ہوگی) اور (جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمادیں گے) تم ہمارے پاس (یار و مددگار سے) تنہا تنہا (ہو کر) آگئے (اور اس حالت سے آئے) جس طرح ہم نے اڈل بار (دنیا میں) تم کو پیدا کیا تھا (کہ نہ بدن پر کپڑا نہ پاؤں میں جوتا) اور جو کچھ ہم نے تم کو (دنیا میں ساز و سامان) دیا تھا، (جس پر تم بھولے بیٹھے تھے) اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے (ساتھ کچھ نہ لائے، مطلب یہ کہ مال و دولت کے بھروسہ پر نہ رہنا، یہ سب یہاں ہی رہ جاوے گا) اور (تم میں جو بعض کو اپنے باطل معبودوں کی شفاعت کا بھروسہ تھا سو) ہم تو تمہارے ہمراہ (اس وقت) تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے (جس سے ثابت ہوا کہ واقع میں بھی تمہارے ساتھ نہیں ہیں) جن کی نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں (کہ تمہارا جو معاملہ عبادت ہمارے ساتھ ہوتا تھا وہی ان کے ساتھ ہوتا تھا) واقعی تمہارے (اور ان کے) آپس میں تو قطع تعلق ہو گیا کہ آج تم ان سے بیزار اور وہ تم سے بیزار (شفاعت کیا کریں گے) اور وہ تمہارا دعویٰ (جو مذکور ہوا) سب تم سے گیا گذرا ہوا (کچھ کام کا نہ نکلا) تو اب پوری پوری مصیبت پڑے گی۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کے عظیم الشان انعامات اور ان کے بلند درجات کا ذکر تھا، جن میں پوری نسلِ آدم علیہ السلام کو عموماً اور اہل مکہ و عرب کو خصوصاً عملِ صورت میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کو اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرائے اور اس کے لئے اپنی محبوب چیزوں کی قربانی پیش کرے جیسے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کی کہ ماں باپ اور قوم و وطن سب کو اللہ کے لئے چھوڑ دیا، پھر بنابر بیت اللہ کی عظیم خدمت کے لئے ملکِ شام کے سبزہ زاروں کو چھوڑ کر مکہ کا رنگستان اختیار کیا، بیوی اور بچہ کو جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم ہوا تو فوری تعمیل کی، اکلوتے محبوب بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تو اپنے حذرِ اختیار تک اس کی مکمل تعمیل کر دیکھائی، ایسے اطاعت گزاروں کا اصل بدلہ توفیقات کے بعد جنت ہی میں ملے گا، لیکن دنیا میں بھی حق تعالیٰ ان کو وہ مرتبہ اور دولت عطا فرماتے ہیں جس کے سامنے ساری دنیا کی دولتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ نے اپنی قوم و برادری کو اللہ کے لئے چھوڑا تو اس کے بدلہ میں ان کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت ملی جو بیشتر ان کی اولاد ہی میں ہیں، عراقی اور شامی وطن کو چھوڑا، تو اللہ کا ظہر اور بلدِ امین اور اقامتِ عترتی یعنی مکہ نصیب ہوا، ان کی قوم نے ان کو ذلیل کرنا چاہا، تو اس کے بدلہ میں ان کو ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کا امام اور پیشوا بنا دیا کہ دنیا کی مختلف اقوام و مذاہب آپس کے بڑے بڑے اختلاف کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم پر متفق چلے آئے ہیں۔

اس سلسلہ میں سترہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی تھی جن میں سے بیشتر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد و ذریت میں داخل ہیں، اور یہ بتلایا گیا تھا کہ یہ سب وہ بزرگترین ہستیٰ ہیں جن کو حق تعالیٰ نے سارے عالم کے انسانوں میں سے اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب فرمایا اور ان کو سیدھا راستہ دکھلایا ہے۔

مذکورہ صدر آیات میں پہلی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر اہل مکہ کو سنایا گیا ہے کہ کسی قوم کے آباء و اجداد محض باپ دادا ہونے کی حیثیت سے قابلِ تقلید نہیں ہو سکتے کہ ان کے ہر قول و فعل کو قابلِ اتباع سمجھا جائے، جیسا کہ عموماً عرب اور اہل مکہ کا خیال تھا، بلکہ تقلید و اتباع کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جس کی پیروی کرتے ہیں وہ خود بھی ہدایت کے صحیح راستہ پر ہے یا نہیں، اس لئے

انبیاء علیہم السلام کی ایک مختصر فہرست شمار کر کے فرمایا گیا کہ اُولَئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ، یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، پھر فرمایا فَبِهَدٰیهِمْ اقْتَدِبْ۔ یعنی آپ بھی ان کی ہدایت اور طریق کار کو اختیار فرمادیں۔

اس میں ایک ہدایت تو اہل عرب اور تمام امت کو یہ ہے کہ تقلیدِ آبائی کی دہم پرستی کو چھوڑیں، اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ بزرگوں کا اتباع کریں۔ دوسری ہدایت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ آپ بھی انہی انبیاء سابقین کا طریق اختیار فرمائیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے شریعتوں میں فروعی اور جزوی اختلاف پہلے بھی ہوتے رہے، اور ملتِ اسلام میں بھی ان سے مختلف بہت سے احکام نازل ہوئے ہیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کے طریق پر چلنے اور عمل کرنے کا کیا مطلب ہوا؟ دوسری آیات اور روایات حدیث کے پیش نظر اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام فروعی اور جزوی احکام میں انبیاء سابقین کا طریق کار اختیار کرنے کا حکم نہیں، بلکہ اصولِ دین، توحید، رسالت آخرت میں ان کا طریق اختیار کرنا مقصود ہے جو کسی پیغمبر کی شریعت میں آدل بدل نہیں ہوئی، آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی ایک عقیدہ اور طریقہ رہا ہے، باقی فروعی احکام جن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، ان میں بھی طریقہ کا مشترک رہا اور جن میں حالات کے بدلنے کی وجہ سے بتقاضائے وقت و حکمت کوئی دوسرا حکم دیا گیا اس کی تعمیل کی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب تک آپ کو بذریعہ وحی کوئی خاص ہدایت نہ آتی تھی تو آپ فروعی معاملات میں بھی پچھلے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار پر چلتے تھے (منظری وغیرہ)

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے اعلانِ حکم دیا گیا جس کا اعلان تمام انبیاء سابقین بھی کرتے چلے آئے ہیں، وہ یہ کہ قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِیْنَ، یعنی میں تمہاری زندگی سنوارنے کے لئے جو ہدایات تمہیں دے رہا ہوں اس پر تم سے کوئی فیس اور معاوضہ نہیں لیتا، تم اس کو مان لو تو میرا کوئی نفع نہیں اور نہ مانو تو کوئی نقصان نہیں، یہ تو تمام دنیا جہان کے لوگوں کے لئے نصیحت و نیر خواہی کا پیغام ہے، تعلیم و تبلیغ پر کوئی معاوضہ نہ لینا تمام انبیاء علیہم السلام ہمیشہ مشترک چلا آیا ہے، اور تبلیغ کے مؤثر ہونے میں اس کا بڑا دخل ہے۔

دوسری آیت اُن لوگوں کے جواب میں آئی ہے جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی بشر پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں فرمائی، یہ کتابوں اور رسولوں کا قصہ ہرگز سے غلط ہے۔ اس کے کہنے والے اگر مکہ کے بت پرست ہیں جیسا کہ ابن کثیرؒ نے فرمایا تو معاملہ ظاہر ہو کہ وہ کسی کتاب اور نبی کے قائل نہ تھے، اور اگر یہودی ہیں جیسا کہ دوسرے مفسرین نے اختیار فرمایا اور آیت کا سلسلہ کلام بظاہر اس کی تائید میں ہے تو پھر اُن کا ایسا کہنا محض غصہ اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا، جو خود اُن کے بھی مذہب کے خلاف تھا، امام بغویؒ کی ایک روایت میں ہے کہ اسی لئے یہودی بھی اس شخص سے ناراض ہو گئے جس نے یہ بات کہی تھی، اور اسی غلطی کی وجہ سے اس کو مذہبی پیشوائی کے عہدہ سے ہٹا دیا تھا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ بیہودہ کلمہ کہا انہوں نے حق تعالیٰ کو پہچاننے کی طرح نہیں پہچانا، ورنہ یہ گستاخانہ کلمہ ان کے منہ سے نہ نکلتا، آپ ان لوگوں سے جو مطلق آسمانی کتابوں کا انکار کرتے ہیں یہ کہہ دیجئے کہ اگر بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نہیں بھیجی تو یہ بتلاؤ کہ یہ تورات جس کو تم بھی مانتے ہو اور اسی کی وجہ سے قوم کے چودھری بنے بیٹھے ہو یہ کس نے نازل کی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ تم وہ ٹیڑھے چلنے والے ہو کہ جس کتاب تورات کو تم آسمانی کتاب کہتے اور مانتے ہو اس کے ساتھ بھی تمہارا یہ معاملہ ہے کہ تم نے اس کو بندھی ہوئی کتاب کے بجائے متفرق اوراق میں لکھ چھوڑا ہے، تاکہ جب تمہارا جی چاہے کسی ورق کو درمیان سے نکال دو، اور اس کے مضمرات سے انکار کر دو، جیسے تورات کی وہ آیات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات اور صفات کے متعلق تھیں ان کو تم نے نکال دیا ہے، آیت کے آخری جملہ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ کا یہی مطلب ہے، قرطیس کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ورق کاغذ۔ اس کے بعد انہی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا وَعَلَّمْتُم مَّا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اُنتم وہ لوگ کہ تمہیں اس سے پہلے خبر تھی، نہ تمہارے باپ دادا کو۔

آخر آیت میں فرمایا: قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ، یعنی اس سوال کا جواب کہ جب اللہ نے کوئی کتاب ہی نہیں بھیجی تو تورات کس نے نازل کی وہ تو کیا دیں گے، آپ ہی فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی نازل فرمائی ہے، اور جب اُن پر حجت تمام ہو گئی تو آپ کا کام ختم ہو گیا، اب وہ جن لوگوں میں کھوئے ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔

ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف نازل ہونے والی کتابوں کے بارے میں اُن پر حجت تمام

کرنے کے بعد تیسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقٌ لِّذِي
بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا، یعنی جس طرح تورات کا خدا تعالیٰ کی طرف سے
نازل ہونا انھیں بھی تسلیم ہے اسی طرح یہ قرآن بھی ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے حق و صدق ہونے
کے واسطے ان کے لئے یہ شہادت کافی ہے کہ قرآن ان سب چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جو تورات
و انجیل میں نازل ہوئی ہیں، اور تورات و انجیل کے بعد اس کے نازل کرنے کی ضرورت اس لئے
ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں قوس بنی اسرائیل کے لئے بھیجی گئی تھیں ان کی دوسری شاخ بنی اسماعیل جو
عرب کہلاتے ہیں اور ام القرئی یعنی مکہ اور اس کے ارد گرد بستے ہیں، ان کی ہدایت کے لئے کوئی
خاص پیغمبر اور کتاب اب تک نہ آئی تھی، اب یہ قرآن ان کے لئے خصوصاً اور پورے عالم کے لئے
عموماً نازل کیا گیا ہے، مکہ معظمہ کو قرآن کریم نے ام القرئی فرمایا، یعنی تمام شہروں اور قبیلوں
کی جڑ اور بنیاد، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی روایات کے مطابق ابتداء آفرینش میں پیدائش زمین
کی ابتداء یہیں سے ہوئی ہے، نیز یہ کہ سارے عالم کا قبلہ عبادت میں مرکز توجہ یہی ہے (منظری)۔
أُمُّ الْقُرَىٰ کے ساتھ وَمَنْ حَوْلَهَا فرمایا، یعنی مکہ کے تمام اطراف جس میں پورا عالم مشرق و مغرب
اور جنوب و شمال داخل ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَهُمْ عَلَىٰ
صَلَاحِهِمْ يُحَافِظُونَ، یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے
ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، اس میں یہود اور مشرکین کی ایک مشترک بیماری
پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ بے فکری کہ جس کو چاہا مانا جس کو چاہا رد کر دیا، اور اس کے خلاف محاذ
بنالیا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جس شخص کو آخرت اور یوم الحساب
پر ایمان ہوگا اس کو خوف خدا ضرور اس طرف متوجہ کرے گا، کہ دلائل میں غور کرے، اور حق بات
کو قبول کرنے میں آبائی رسوم جاہلیت کی پروا نہ کرے۔

اور اگر غور کیا جائے تو آخرت سے بے فکری ہی اُمُّ الْاِمْرَاضِ ہے، کفر و شرک بھی
اسی کا نتیجہ ہوتا ہے اور سارے گناہ اور معاصی بھی، آخرت پر یقین رکھنے والے سے اگر کبھی کوئی
غلطی اور گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اور بالآخر توبہ کر کے آگے
کے لئے گناہ سے بچنے کا عزم کرتا ہے، اور درحقیقت خوف خدا اور فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو
انسان کو انسان بناتی اور جہاں سے باز رکھتی ہے، اسی لئے قرآن کریم کی کوئی سورت بلکہ کوئی
رکوع بھی شاید اس سے خالی نہیں کہ جس میں فکر آخرت کی طرف متوجہ نہ کیا گیا ہو، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ
جَمَلَةً هُمْ مِّنْهَا هَمًّا وَاحِدًا اَهَمَّ الْاٰخِرَةِ

إِنَّ اللَّهَ فُلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ

اللہ ہے کہ پھوڑ نکالتا مردہ اور گٹھلی، نکالتا ہے مردہ سے زندہ اور نکالتے والا

الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمُ اللَّهُ فَإِنِّي تَوَفَّكُونَ ﴿۹۵﴾ فُلِقُ الْأَصْبَاحِ

زندہ سے مردہ یہ ہے اللہ پھر تم کو دھر بیٹے جاتے ہو، پھوڑ نکالتے والا صبح کی روشنی کا

وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ

اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند حساب کے لئے یہ اندازہ رکھا ہوا ہے

الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا

زور آور خبردار کا، اور اسی نے بنادیئے تمھارے واسطے ستارے کہ ان کے وسیلہ سے راستے

بِهَافِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۹۷﴾

معلوم کرو اندھیروں میں جنگل اور دریا کے البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں،

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ط

اور وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے پھر ایک تو تمھارا ٹھکانا اور ایک امانت رکھو جگہ

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ﴿۹۸﴾

البتہ ہم نے کھول کر سنائیے پتے اس قوم کو جو سوچتے ہیں

خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو (یعنی زمین میں دبانی کے بعد جو دانہ یا گٹھلی پھوٹتی ہے یہ اللہ ہی کا کام ہے) وہ جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکال لاتا ہے (جیسے نطفہ سے آدمی پیدا ہوتا ہے) اور وہ بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالتے والا ہے (جیسے آدمی کے بدن سے نطفہ ظاہر ہوتا ہے) اللہ یہ ہے (جس کی ایسی قدرت ہے) سو تم (اس کی عبادت چھوڑ کر) کہاں (غیر اللہ کی عبادت کی طرف) اُلٹے چلے جا رہے ہو وہ (اللہ تعالیٰ) صبح (صادق) کا (رات میں سے) نکالنے والا ہے (یعنی رات ختم ہو جاتی ہے اور صبح صادق ظاہر ہوتی ہے) اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنائی ہے (کہ سب تھکے تھکے سو کر آرام پاتے ہیں) اور سورج اور چاند کی رفتار کو حساب سے رکھا ہے (یعنی ان کی رفتار منضبط ہے جس سے اوقات کے انضباط میں سہولت ہو) یہ کہ حساب سے انکی

رفتار ہو) ٹھہرائی ہوئی بات ہر ایسی ذات کی جو کہ قادر (مطلق) ہے کہ اس طرح حرکت پیدا کرنے پر اس کو قدرت ہے اور (بڑے علم والا ہے) کہ اس رفتار کی مصلحتیں اور حکمتیں جانتا تھا اس لئے اس خاص طرح پر ٹھہرا دیا، اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمھارے (فائدہ کے) لئے ستاروں کو پیدا کیا (اور وہ فائدہ یہ ہے) تاکہ تم ان کے ذریعہ سے (رات کے) اندھیروں میں خشکی میں بھی اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو، بیشک ہم نے (یہ) دلائل (توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (اور گو پہنچیں گے سب کو مگر نافع) ان (ہی) لوگوں کیلئے (ہوں گے) جو (بھلے بڑے کی کچھ) خبر رکھتے ہیں (کیونکہ غور ایسے ہی لوگ کیا کرتے ہیں) اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (اصل میں) ایک شخص سے (کہ آدم علیہ السلام ہیں) پیدا کیا پھر (آگے) تو توالد و تناسل کا اس طرح سلسلہ جاری چلا آ رہا ہے کہ تم میں سے ہر شخص کے لئے مرتبہ مادہ میں، ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے، (یعنی ماں کا رحم) اور ایک جگہ چند رہنے کی (یعنی باپ کی پشت لقولہ تعالیٰ مِنْ أَبْنِی الصُّلْبِ) بیشک ہم نے (یہ) دلائل (بھی) توحید و انعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (عام طور پر مگر ان کا نفع بھی مثل سابق) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوگا) جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یہ تفصیل ہوگئی یُخْرِجُ الْحَيَّ الْمَيِّتَ)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کی ہٹ دھرمی اور حقائق و نتائج سے غفلت کا تذکرہ تھا، اور ان سب خرابیوں کی اصل بنیاد خدا تعالیٰ اور اس کے بے مثال علم و قدرت سے بے خبری ہے، اس لئے مذکورہ چار آیات میں حق تعالیٰ نے غافل انسان کے اس روگ کا علاج اس طرح فرمایا ہے کہ اپنے وسیع علم اور عظیم قدرت کے چند نمونے اور انسان پر اپنے انعامات و احسانات کا ایک سلسلہ ذکر فرمایا، جن میں ادنیٰ غور کرنے سے ہر سلیم الفطرت انسان خالق کائنات کی عظمت اور بے مثال قدرت کا اور اس بات کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ عظیم الشان کارنامے ساری کائنات میں سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی قدرت میں نہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: إِنَّ اللَّهَ فَلِئِنَّ الْحَبِّ وَالنَّوْی، یعنی اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے ورنہ کو اور گٹھلیوں کو، اس میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بتلایا گیا ہے کہ خشک دانہ اور خشک گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے ہر ابھر درخت نکال دینا صرف

اسی ذات پاک کا فعل ہے جو خالق کائنات ہے، انسان کے سعی و عمل کو اس میں کوئی دخل نہیں، کاشتکار کی ساری کوششوں کا حاصل اس سے زائد نہیں ہوتا کہ دانہ اور گٹھلی کے اندر سے جو نازک کوئیل قدرت خداوندی نے نکالی ہے اس کی راہ سے موانع اور مضر چیزوں کو دور کر دے، زمین کوئل وغیرہ کے ذریعہ نرم کرنا پھر کھاؤ ڈالنا پانی دینا ان سب اعمال کا اثر زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نکلنے والی نازک کوئیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، باقی اصل کام کہ دانہ اور گٹھلی بھٹ کر اس میں سے درخت کی کوئیل نکلے اور پھر اس میں رنگ برنگ کے عجیب و غریب پتے اور پھر ایسے پھل پھول لگیں کہ انسان کی عقل و دماغ اس کا ایک پتہ یا ایک پھٹری بنانے سے عاجز ہے، اس میں ظاہر ہے کہ کسی انسانی عمل کو دخل نہیں، اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا: أَفَرَأَيْتُمْ مَا كَحَرُمُونَ وَإِنَّكُمْ تَزِدُّوهُ آمَ تَحْنُ الْمَرْحُومُونَ، یعنی کیا تم اُن دانوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم مٹی میں ڈال دیتے ہو کہ ان کو تم نے بویا اور بنایا ہے یا ہم نے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی بے جان چیزوں میں سے جاندار چیزوں کو پیدا کرتا ہے، بے جان سے مراد نطفہ یا انڈا ہے، جن سے انسان اور حیوانات کی تخلیق ہوتی ہے، اسی طرح جانداروں سے بے جان چیزیں نکال دیتا ہے، یہاں بجان چیزوں مراد ہی نطفہ اور انڈا ہے، کہ وہ جاندار چیزوں سے نکلتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا لَكُمْ اللَّهُ فَاثِي تَوَفَّكُونَ، یعنی یہ سب کام صرف ایک اللہ تعالیٰ کے کئے اور بنائے ہوئے ہیں، پھر یہ جانتے ہو جتے ہوئے تم کس طرف بہکے چلے جا رہے ہو کہ خود تراشیدہ بتوں کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا معبود کہنے لگے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، فالق کے معنی پھاڑنے والا اور اصباح کے معنی یہاں وقت صبح کے ہیں، فالق الاصباح کے معنی ہیں پھاڑنے والا صبح کا، یعنی گہری اندھیری کی چادر کو پھاڑ کر صبح کا نکالنے والا، یہ بھی اُن افعال و اعمال میں سے ہے جس میں جن بشر اور ساری کائنات کی قوتیں ہیچ ہیں، اور ہر آنکھوں والا دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ رات کی اندھیری کے بعد صبح کا اجالا پیدا کرنے والا نہ کوئی انسان ہو سکتا ہے نہ فرشتہ، نہ کوئی دوسری مخلوق، بلکہ یہ صرف اُس مافوق الادراک ہستی کا کام ہے جو سارے جہان کی پیدا کرنے والی ہے۔

مخلوقات کے آرام کے لئے رات کی قدرتی اور جبری تعین ایک عظیم نعمت ہے اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَجَعَلَ الْبَيْتَ مَسْكَنًا، لفظ سکن، سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سکن

کہا جاتا ہے جس پر پہنچ کر انسان سکون و اطمینان اور راحت حاصل ہو اسی لئے انسان کے رہنے کے گھر کو قرآن میں سکُن فرمایا ہے، جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اٰبِيُوْكُمْ سَكَنًا، کیوں کہ انسان کا گھر خواہ ایک چھوٹی بڑی ہو وہاں پہنچ کر انسان کو عادت سکون و راحت حاصل ہوتی ہو اس لئے معنی اس جملہ کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو ہر جان دار کے لئے سکون و راحت کی چیز بنائی ہے، فالق الاصباح میں اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسان دن کے اُجالے سے حاصل کرتا ہے، رات کی تاریکی میں نہیں ہو سکتی، اس کے بعد جَعَلَ اٰلِیْنَ سَكَنًا فرمایا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ جس طرح دن کا اجالا ایک عظیم نعمت ہے، کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے سب کاروبار کرتا ہے، اسی طرح رات کی تاریکی کو بھی بُرا نہ جانو وہ بھی ایک بڑی نعمت ہے، کہ اس میں دن بھر کا تھکا ماندا انسان آرام کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ آئندہ کل میں پھر نشاط اور حسی کے ساتھ کام کر سکے، ورنہ انسانی فطرت مسلسل محنت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ رات کی تاریکی کو راحت کے لئے متعین کر دینا ایک مستقل نعمت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک خاص مظہر ہو، مگر یہ نعمت روزانہ بے مانگے مل جاتی ہے، اس لئے انسان کا رہیائہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کتنا بڑا احسان و انعام ہے، غور کیجئے کہ اگر ہر شخص اپنے اختیاء و ارادہ سے اپنے آرام کا وقت معین کرتا تو کوئی صبح کو آٹھ بجے سونے کا ارادہ کرتا، کوئی بارہ بجے، کوئی چار بجے اور کوئی رات کے مختلف حصوں میں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی بھی ایسا گھنٹہ نہ آتا جس میں انسانی کاروبار، محنت مزدوری، کارخانے اور فیکٹریاں نہ چل رہی ہوتیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سونے والوں کے آرام میں بھی خلل آتا اور کام کرنے والوں کے کام میں بھی، سونے والوں کے آرام میں کام کرنے والوں کے شور و غلب اور کھڑکے اور دھماکے نخل ہوتے اور کام کرنے والوں کے کام میں ان لوگوں کی غیر حاضری مغل ہوتی جو اس وقت سو رہے ہیں، اس کے علاوہ سونے والوں کے بہت سے وہ کام رہ جاتے جو اُن کے سونے کے وقت میں ہی ہو سکتے ہیں، اللہ جل شانہ کی قدرتِ قاہرہ نے نہ صرف انسان پر بلکہ ہر جان دار پر رات کے وقت نیند کا غلبہ ایسا مسلط کر دیا کہ وہ کام چھوڑ کر سو جانے کے لئے مجبور ہوتا ہے، شام ہوتے ہی ہر پرندہ، درندہ، اور چوپائے اپنے اپنے مستقر اور گھر کا رخ کرتے ہیں، ہر انسان جبری طور پر کام چھوڑ کر آرام کرنے کی فکر میں لگتا ہے، پوری دنیا میں ایک سناٹا پھا جاتا ہے، رات کی تاریکی نیند اور آرام میں معین و مددگار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ عادت زیادہ روشنی میں نیند نہیں آتی۔ غور کیجئے کہ اگر ساری دنیا کی حکومتیں اور عوام مل کر بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ

سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو اولاً اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں، ثانیاً اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو جانوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا، اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟ یہ اللہ جل شانہ ہی کی قدرتِ قاہرہ ہے جس نے جبری طور پر ہر انسان اور ہر جاندار پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

شمسی اور قمری حساب | ارشاد فرمایا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا، حُسْبَانٌ بضم مصدر ہے، حساب کرنے اور شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب اور ان کی رفتار کو ایک خاص حساب سے رکھا ہے، جس کے ذریعہ انسان سالوں، مہینوں، دنوں اور گھنٹوں کا بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب آسانی لگا سکتا ہے۔

یہ اللہ جل شانہ ہی کی قدرتِ قاہرہ کا عمل ہے کہ ان عظیم الشان نورانی گروں اور ان کی حرکات کو ایسے مستحکم اور مضبوط انداز سے رکھا ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان میں کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان کی مشینری کو نہ کسی ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ پرزے گھسنے اور بدلنے سے کوئی سابقہ پڑتا ہے، یہ دونوں نور کے گروں اپنے اپنے دائرہ

میں ایک معین رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں، لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْبَلَدُ سَابِقُ النَّهَارِ، ہزاروں سال میں بھی ان کی رفتار میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، افسوس کہ قدرت کے اس مستحکم اور غیر متبدل نظام ہی سے انسان دھوکا کھا گیا کہ اسکی چیزوں کو مستقل بالذات بلکہ معبود و مقصود بنا بیٹھا، اگر ان کا یہ نظام کبھی ٹوٹا کرتا، ان کی مشینری درست کرنے کے لئے کچھ دنوں یا گھنٹوں کے وقفے ہوا کرتے تو انسان سمجھ لیتا کہ یہ مشین خود بخود نہیں چل رہی، بلکہ اس کا کوئی چلانے والا ہے، اور بنانے والا ہے، مگر آئے روشنی طبع تو برمن بلا شہسی، ان گروں کے غیر متبدل اور مستحکم نظام نے انسان کی نظروں کو خیرہ کر دیا، اور اپنی طرف لگا لیا، یہاں تک کہ وہ اس کو بھول بیٹھا کہ یہ

کوئی محبوب ہی اس پردہ زنگاری میں

آسمانی کتابیں اور انبیاء و رسل اس کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنے ہی کے لئے نازل ہوئے۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ سالوں اور مہینوں کا حساب شمسی بھی ہو سکتا ہے اور قمری بھی، دونوں ہی اللہ جل شانہ کے انعامات ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عام آن پڑھ دنیا کی سہولت اور ان کو حساب کتاب کی الجھن سے بچانے کے لئے

اسلامی احکام میں قمری سن و سال استعمال کئے گئے، اور چونکہ اسلامی تاریخ اور اسلامی احکام سب کا مدار قمری حساب پر ہے، اس لئے امت پر فرض ہے کہ وہ اس حساب کو قائم اور باقی رکھے، دوسرے حسابات شمسی وغیرہ اگر کسی ضرورت سے اختیار کئے جائیں تو کوئی گناہ نہیں، لیکن قمری حساب کو بالکل نظر انداز اور محو کر دینا گناہ عظیم ہے جس سے انسان کو یہ بھی خبر نہ رہے کہ رمضان کب آئے گا اور ذی الحجہ اور خرم کب۔

آخر آیت میں فرمایا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ، یعنی یہ حیرت انگیز مستحکم نظام حرکات جس میں کبھی ایک منٹ اور سیکنڈ کا فرق نہ آئے یہ اسی ذات پاک کی قدرت کا کرشمہ ہو سکتا ہے جو عزیز یعنی ہر چیز پر غالب اور قوی بھی ہے، اور علیم یعنی ہر چیز اور ہر کام کی جاننے والی بھی۔

تیسری آیت میں ارشاد ہے: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، یعنی آفتاب و ماہتاب کے علاوہ دوسرے ستارے بھی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے خاص مظاہر ہیں، اور ان کے پیدا کرنے میں ہزاروں حکمنوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے بحری اور برمی سفروں میں جہاں رات کی تاریکی کے وقت سمتوں کا پتہ لگانا بھی آسان نہیں رہتا، ان ستاروں کے ذریعہ اپنے راستے متعین کر سکتا ہو، تجربہ شاہد ہے کہ آج اس مشینری کے زمانہ میں بھی انسان ستاروں کی ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو۔ اس آیت میں بھی انسان کی اس غفلت اور کوتاہ نظری پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ ستارے بھی کسی بنانے والے اور چلانے والے کے تابع فرمان چل رہے ہیں، نہ اپنے وجود میں مستقل ہیں نہ اپنی بقا و عمل میں، جو لوگ صرف اپنی نظر میں جما کر بیٹھ رہے، اور ان کے بنانے والے کی طرف نظر نہ کی وہ سخت کوتاہ نظر اور فریب خور وہ ہیں۔

آنان کہ بجز روتے تو جائے نگر اند

کو تہ نظر اند چہ کو تہ نظر اند

اس کے بعد ارشاد فرمایا: قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ، یعنی ہم نے دلائل قدرت خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے، ان لوگوں کے لئے جو خبر رکھتے ہیں، اس میں اشارہ فرمادیا کہ جو لوگ ان کھلی کھلی نشانیوں سے بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتے وہ بے خبر اور بے ہوش ہیں۔

چوتھی آیت میں ارشاد ہے: وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ كُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ، مستقر، قرار سے بنا ہے، اس جگہ کو مستقر کہتے ہیں جو کسی چیز کے لئے جاگزار ہو

اور مستودع، ودیعت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو کسی کے پاس عارضی طور سے چند روز رکھ دینے کے، تو مستودع اس جگہ کو کہا جائے گا جہاں کوئی چیز عارضی طور پر چند روز رکھی جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات پاک ہے جس نے انسان کو ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا، پھر اس کے لئے ایک مستقر یعنی مدت تک رہنے کی جگہ بنادی، اور ایک مستودع یعنی چند روز رہنے کی جگہ۔

قرآن کریم کے الفاظ تو یہی ہیں، ان کی تعبیر و تفسیر میں بہت احتمال ہیں، اسی لئے علماء تفسیر کے اقوال اس میں مختلف ہیں، کسی نے فرمایا مستودع ماں کا پیٹ، اور مستقر یہ دنیا ہے، کسی نے فرمایا کہ مستودع قبر ہے اور مستقر دار آخرت، اور بھی متعدد اقوال ہیں، اور الفاظ قرآنی میں سب کی گنجائش ہے، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر منطہری میں اس کو ترجیح دی کہ مستقر دار الاخرت کا مقام جنت یا دوزخ ہے، اور انسان کی ابتداء و آفرینش سے آخرت تک جتنے مراحل اور درجات ہیں وہ سب مستودع یعنی چند روزہ قیام کی جگہ ہیں، خواہ شکم یا دوزخ یا زمین پر رہنے سے پہلے کی جگہ یا قبر و برزخ، قرآن کریم کی ایک آیت سے بھی اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، جس میں فرمایا: لَتَوَكَّبْنَ طَبَقًا عَن طَبَقٍ، یعنی تم ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی طرف ہمیشہ چڑھتے رہو گے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دار آخرت سے پہلے پہلے انسان اپنی پوری زندگی میں ایک مسافر کی حیثیت رکھتا ہے، جو ظاہری سکون و قرار کے وقت بھی درحقیقت سفر عمر کے منازل طے کر رہا ہے،

مسافر ہوں کہاں جانا ہے، ناواقف ہوں منزل سے

ازل سے پھرتے پھرتے گوز تک پہنچا ہوں مشکل سے

اس آخری آیت میں ظاہری ٹیپ ٹاپ اور مخلوقات کی نیرنگیوں میں مشغول ہو کر اپنی اصلی مستقر اور خدا و آخرت سے غافل ہو جانے والے کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں، تاکہ وہ حقیقت کو پہچانے اور دنیا کے دھوکہ و فریب سے نجات پائے، مولانا جامیؒ نے خوب فرمایا کہ

ہم اندر زمین ترازین است و کہ تو طفلی دغا نہ رنگین است

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ

اور اسی نے اتارا آسمان سے پانی، پھر نکالی ہم نے اس سے اُگنے والی

كُلِّ شَيْءٍ ۖ فَأَخْرِجْنَاهُ خَضِرًا يُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا ۖ

ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا،

وَمِنَ النَّحْلِ مِمَّنْ طَلَعَهَا قُتُونٌ وَإِنِّى لَآتِيَنَّكُمْ وَجَنَّتْ مِّنْ أَعْنَابٍ

اور کھجور کے گٹا بھجے میں سے پھل کے ٹچے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے

وَالنَّارِثُونَ وَالسَّرْمَانُ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انْظُرُوا إِلَى

اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک

ثَمَرَةٍ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ إِنِّى لَكُمْ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۹۹﴾

درخت کے پھل کو جب پھل لاتا ہو اور اس کے پھنے کو، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں واسطے ایمان والوں کے

وَجَعَلَ لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَ

اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے شریک جنوں کو حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہی اور تراشتے ہیں اس کو واسطے بیٹروں کے

بَنَاتٍ يُغَيِّرُ عِلْمَ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيعُ

بیٹیاں جہالت سے وہ پاک ہے اور بہت دور ہر ان باتوں کے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں، نئی طرح پر

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنِّى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ

بنانے والا آسمان اور زمین کا، کیونکر ہو سکتا ہے اس کے بیٹا حالانکہ اس کے کوئی

صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذَلِكُمْ

عورت نہیں، اور اس نے بنائی ہر چیز اور وہ ہر چیز سے واقف ہے، یہی اللہ

اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ

تمہارا رب ہے نہیں کوئی معبود سوا اس کے پیدا کرنے والا ہر چیز کا سو تم اسی کی عبادت کرو

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۱۰۲﴾

اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے

خلاصہ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے آسمان (کی طرف) سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس (ایک ہی پانی) کے ذریعہ سے ہر قسم کے (رنگ برنگ) نباتات کو (زمین سے) نکالا (ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے اتنی مختلف قسم کی نباتات جن کے رنگ دیبا، زائقہ، فوائد و بیحد مختلف ہیں اس قدر عجیب کرشمہ قدرت ہے) پھر ہم نے اس (کو نیل) سے (جوا و ذرا زمین سے نکلتی ہے، جن کو بعض مقامات میں سوئی یا کھوئی کہتے ہیں اور رنگ میں زرد ہوتی ہے)

سبز شاخ نکالی کہ اس (شاخ) سے ہم اوپر تلے والے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں (یہ تو غلوں کی کیفیت ہے جس کا ذکر اجمالاً فائق الحب والنوی میں آچکا اور کھجور کے درختوں سے) یعنی ان کے گچھے میں سے خوشے نکالتے ہیں جو (ماتے بوجھ کے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور (اسی پانی سے ہم نے) انگوروں کے باغ (پیدا کئے) اور زیتون و انار (کے درخت پیدا کئے) جو کہ (بعضے انار اور بعضے زیتون پھل کی صورت شکل و مقدار و رنگ وغیرہ کے اعتبار سے) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور (بعضے) ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے (ذرا) ہر ایک کے پھل کو تو دیکھو جب وہ پھلتا ہے کہ اس وقت بالکل کچا پدمزہ ناقابل انتفاع ہوتا ہے) اور (پھر) اس کے پھنے کو دیکھو کہ اس وقت سب اوصاف میں کیسا کامل ہو گیا، یہ بھی خدا کی قدرت کا ظہور ہے) ان (امور) میں (بھی) دلائل (توحید کے موجود) ہیں اور گویا باعتبار تبلیغ کے سب کے لئے ہیں مگر انتفاع کے اعتبار سے) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہیں) جو ایمان دلانے کی فکر رکھتے ہیں (یہ میوے اور پھلوں کا بیان ہوا جن کا ذکر اجمالاً والنوی میں آچکا ہے)

اور (مشرک) لوگوں نے (اپنے اعتقاد میں) مشیاطین کو (ایسے) اللہ کا (جس کے صفات و افعال اوپر مذکور ہوئے) شریک قرار دے رکھا ہے کہ ان کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں اور خدا کے مقابلہ میں ان کے کہنے پر چلتے ہیں) حالانکہ ان لوگوں کو (خود ان کے اقرار کے موافق بھی) خدا (ہی) نے پیدا کیا ہے (جب خالق کوئی اور نہیں تو معبود بھی کوئی اور نہ ہونا چاہئے) اور ان (مشرکین میں سے بعض) لوگوں نے اللہ کے حق میں بیٹے اور بیٹیاں (اپنے اعتقاد میں) محض بلا دلیل تراش رکھی ہیں (جیسے نصاریٰ حضرت مسیح کو اور بعض یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے) وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ (خدا تعالیٰ کی شان میں) بیان کرتے ہیں (یعنی یہ کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس کے کوئی اولاد ہو) وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد (یعنی نیست سے ہست کرنے والا) ہے اور دوسرا کوئی موجد نہیں، پس معبود بھی کوئی اور نہ ہوگا، اس سے تو شریک کی نفی ہوئی اور اولاد کی نفی کی دلیل یہ ہے کہ اولاد کی حقیقت یہ ہو کہ میاں بی بی ہوں اور ان دونوں کی مقارنت سے تیسری جان (ارحیم پیدا ہو تو) اللہ کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے، حالانکہ اس کے کوئی بی بی تو ہے نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے (جیسا ان لوگوں کو پیدا کیا و خلقہم اور زمین و آسمان کو پیدا کیا، بدیع السموات الخ اسی طرح اس نے) ہر چیز کو پیدا کیا، اور (جس طرح وہ خالقیت میں یکتا ہے، اسی طرح اس صفت میں بھی یکتا ہے کہ) وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (ازلا بھی ابد بھی اور اس وصف میں بھی اس کا کوئی شریک

نہیں اور تخلیق بدون علم کے ہو نہیں سکتی، اس سے بھی ثابت ہوا کہ اور کوئی خالق نہیں، یہ (ذات جس کے صفات کمال بیان کئے گئے یہ) ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہر چیز کا پیدا کرنے والا (جیسا اوپر بیان ہوا جب یہ صفات اللہ ہی میں ہیں) تو تم لوگ اس (ہی) کی عبادت کرو اور (پھر یہ کہ) وہ (ہی) ہر چیز کا کار ساز (حقیقی) ہے (دوسرا کوئی کار ساز بھی نہیں پس اس کی عبادت کرو گے تو وہ تم کو نفع حقیقی پہنچائے گا اور دوسرا کیا دیدے گا، غرض خالق بھی وہی علیم بھی وہی وکیل بھی وہی، اور یہ سب امور مقتضی ہیں کہ معبود بھی وہی ہو)۔

معارف و مسائل

ان مضامین میں ایک عجیب ترتیب کی رعایت ہے، وہ یہ کہ یہاں تین قسم کی کائناتیں مذکور ہیں، سفلیات، علویات، کائناتِ جو، یعنی فضاے آسمانی میں پیدا ہونے والی اشیاء، اور بیان شروع کیا سفلیات سے کہ وہ ہم سے اقرب ہیں، اور پھر اس کے دوحصے کئے، ایک بیان زمین سے اُگنے والی نباتات اور درختوں، باغوں کا، دوسرے حیوانات انسان اور جانوروں کا اول کو مقدم کیا کہ بہ نسبت دوسرے کے نسبتہ ظاہر ہے، اور دوسرے کا معاملہ کہ روح پر موقوف ہر دقیق ہے، چنانچہ نطفہ کے مختلف مراحل اور حالات اور اکِ اطباء کے ساتھ مخصوص ہے، بخلاف نباتات کے بڑھنے، پھلنے پھولنے وغیرہ کے کہ عام طور سے مشاہد ہے، پھر فضاے آسمانی کی کائنات کو ذکر کیا، صبح و شام، پھر علویات کو ذکر کیا، شمس و قمر و نجوم، پھر چونکہ سفلیات کا زیاں مشاہدہ ہوتا ہے، اس کو مکرر لاکر اس پر ختم فرمایا، مگر پہلے وہ اجمالاً مذکور تھا اب تفصیل سے ذکر کیا گیا، لیکن تفصیل کی ترتیب میں اجمال کی ترتیب کا عکس کر دیا گیا، کہ بیان انفس کو مقدم کیا، اور بیان نباتات کو مؤخر، ممکن ہے کہ اس کا مبنی یہ ہو کہ اس مفصل بیان میں اظہارِ نعمت کا عنوان اختیار کیا گیا ہے تو اس حیثیت سے منعم علیہ بوجہ مقصود و متبوع ہونے کے قابلِ تقدیم کے ہوا اور نباتات میں ترتیبِ سابق باقی ہے کہ جنوب یعنی غلات کی کیفیت دانہ اور گٹھلی پر مقدم رہی، اور بارش کا درمیان میں ذکر آنا نباتات کے تابع ہے، اور اس میں ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ بارش کی مختلف حیثیات ہیں، مبداء کے اعتبار سے تو علوی اور منتهی کے اعتبار سے سفلی اور مسافت کے اعتبار سے فضائی ہے۔

لَا تَدْرِيكَ إِلَّا بَصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ إِلَّا بَصَارُهُ وَهُوَ اللَّطِيفُ

نہیں پاسکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پاسکتا ہے آنکھوں کو اور وہ نہایت لطیف

النَّبِيرُ ۱۰۳ قَدْ جَاءَكُمْ بِصَاحِبٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَمَن أَبْصَرَ

اور خبردار ہے، تمہارے پاس آچکیں نشانیاں تمہارے رب کی طرف سے، پھر جس نے دیکھ لیا

فَلِنَفْسِهِ وَمَن عَنِ قَعْلِيهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۱۰۴ وَ

سواپنے واسطے اور جو اندھا رہا سواپن نقصان کو اور میں نہیں تم پر نگہبان اور

كَذَلِكَ نَصْرَفُ الْأَيَاتِ وَلِيَقُولُوا إِذَا سَأَلَكَ

یوں طرح طرح سے سمجھاتے ہیں ہم آیتیں اور تاکہ وہ کہیں کہ تو نے کسی سے پڑھا ہی، اور تاکہ واضح کر دیں ہم انکو

لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۱۰۵ اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ لَا إِلَهَ

واسطے سمجھ والوں کے، اور تو چل اس پر جو حکم تجھ کو آئے تیرے رب کا کوئی معبود نہیں

إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۱۰۶ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا

سوا اس کے اور منہ پھیرے مشرکوں سے، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ

أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِمْ

لوگ شرک نہ کرتے اور ہم نے نہیں کیا تجھ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہے تو اُن پر

بِوَكِيلٍ ۱۰۷

دار و عشر

خلاصہ تفسیر

(اور اس کے علیم ہونے کی اور اس میں منفرد ہونے کی یہ کیفیت ہے کہ) اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی (دنیا میں تو اس طرح کہ کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا، جیسا کہ دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ اہل جنت گو دیکھیں گے جیسا کہ یہ بھی دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، لیکن احاطہ محال ہے گا اور جس محسوس بالبصر کے ظاہر کا احاطہ احساس بصر سے محال ہو تو اس کی حقیقت باطنی کا کہ ظاہر کے مقابلہ میں بدرجہا خفی تر ہے، احاطہ کرنا عقل سے جو کہ احساس سے بڑھ کر زیادہ محمل خطا ہے بدجہ آدنی محال ہوگا) اور وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) سب نگاہوں کو (جو کہ اس کے احاطہ سے عاجز تھیں وجوہاً) محیط ہو جاتا ہے اسی طرح اور چیزوں کو بھی علماً محیط ہے، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ) اور اس امر سے کہ وہ سب کو محیط ہے اور اس کو کوئی محیط نہیں لازم آگیا کہ وہی بڑا باریک بین، باخبر ہے اور کوئی دوسرا نہیں، اور یہ وہ کمالِ علم ہے جس میں

اللہ تعالیٰ یکتا ہے، آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ، اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بی کے ذرائع (یعنی توحید و رسالت کے حق ہونے کے دلائل عقلیہ و نقلیہ) پہنچ چکے ہیں سو جو شخص (ان کے ذریعہ سے حق کو) دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا، اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا (یعنی تمہارے اعمال کا) نگران نہیں ہوں (یعنی جیسا نگران کرتے والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ناشائستہ حرکت نہ کرنے دے، یہ میرے ذمہ نہیں، میرا کام صرف تبلیغ ہے) اور (دیکھئے) ہم اس (عمدہ) طور پر دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ سب کو پہنچا دیں، اور تاکہ یہ (منکرین تعصب سے) یوں کہیں کہ آپ نے کسی سے (ان مضامین کو) پڑھ لیا ہے (مطلب یہ کہ تاکہ ان پر اور زیادہ الزام ہو کہ ہم تو اس طرح واضح کر کے حق کو ثابت کرتے تھے اور تم پھر لغو بہانے تراشتے تھے) اور تاکہ ہم اس (قرآن کے مضامین) کو دانشمندی کے لئے خوب ظاہر کر دیں (یعنی قرآن کے نازل کرنے کے تین فائدے ہیں، ایک یہ کہ آپ کو اجر تبلیغ ملے، دوسرے یہ کہ منکرین پر زیادہ جرم قائم ہو، تیسرے یہ کہ دانشمندی و طالبان حق کو حق ظاہر ہو جاوے پس) آپ (یہ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا) خود اس طریق پر چلتے رہتے جس (پر چلنے) کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہو (اور اس طریق میں بڑی چیز یہ عقائد ہو کہ) اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں (اور اس میں تبلیغ کا حکم بھی اہل ہے) اور (اس پر قائم رہ کر) مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے (کہ افسوس! انہوں نے قبول کیوں نہ کیا) اور (وجہ خیال نہ کرنے کی یہ ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ کرتے (لیکن ان لوگوں کی بدعنوانیوں سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کو سزا دیں، اس لئے ایسا ہی سامان جمع کر دیا، پھر ان کو آپ کیا مسلمان بنا سکتے ہیں) اور آپ اس فکر میں پڑیں ہی کیوں، ہم نے آپ کو ان (کے اعمال) کا نگران نہیں بنایا اور نہ آپ (ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے) مختار ہیں پس جب آپ کے متعلق ان کے جرائم کی تفتیش ہے اور نہ ان کی سزا کا حکم ہے، پھر آپ کو کیوں تشویش ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ النعام کی ان پانچ آیات میں سے پہلی آیت میں ابصار بصر کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نگاہ اور دیکھنے کی قوت اور ادراک کے معنی پالینا، پکڑ لینا، احاطہ کر لینا ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ ادراک کی تفسیر احاطہ کر لینا بیان فرمائی ہے (بجرحیط)

معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ ساری مخلوقات جن و انس و ملائکہ اور تمام حیوانات کی نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ یہ نگاہیں اس کی ذات کا احاطہ

کر لیں، اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی نگاہوں کو پوری طرح دیکھتے ہیں اور ان کا دیکھنا ان سب پر محیط ہے، اس مختصر آیت میں حق تعالیٰ کی دو مخصوص صفتوں کا ذکر ہے، اول یہ کہ ساری کائنات میں کسی کی نگاہ بلکہ سب کی نگاہیں مل کر بھی اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان اور جنات اور فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے، اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صفت میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ (منظہری بحوالہ ابن ابی حاتم)

اور یہ خاص صفت حق جل و علا شانہ کی ہی ہو سکتی ہے، ورنہ نگاہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت بخشی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی چھوٹی سے چھوٹی آنکھ دنیا کے بڑے سے بڑے کڑے کو دیکھ سکتی اور نگاہ سے اس کا احاطہ کر سکتی ہے، آفتاب و ماہتاب کتنے بڑے بڑے گمے ہیں کہ زمین اور ساری دنیا کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر ہر انسان بلکہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی آنکھ ان کڑوں کو اسی طرح دیکھتی ہے کہ نگاہ میں ان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے، اس کا علم اس حاسہ بصر سے کیسے حاصل ہو سکتا
تو دل میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

حق تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں، اور انسانی حواس اور عقل و خیال سب محدود چیزیں ہیں، ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود کسی محدود چیز میں نہیں سما سکتا، اسی لئے دنیا کے عقلاء و فلاسفہ جنہوں نے عقلی دلائل سے خالق کائنات کا پتہ لگانے اور اس کی ذات و صفات کے ادراک کے لئے اپنی عمریں بحث و تحقیق میں صرف کیں، اور صوفیائے کرام جنہوں نے کشف و شہود کے راستہ سے اس میدان کی سیاحت کی، سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ذات و صفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا نہ پاسکتا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے

دور بینانِ بارگاہِ الست : غیر ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست
اور حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے

چہ شبہا نشستم دریں سیر گم
کہ حیرت گرفت از سستینم کہ قم

رُودیت باری تعالیٰ کا مسئلہ | انسان کو حق تعالیٰ کی زیارت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تمام علماء اہلسنت والجماعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اور زیارت نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی کہ رَبِّ آرنیْ اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے "تو جواب میں ارشاد ہوا کہ نَوَّ قَرَّآنِیْ" آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے " ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا کہ تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مومنین کو حق تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح و قوی احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور خود قرآن کریم میں موجود ہے:

وَجُوهٌ یُّوْمَعِیْنِ نَاصِرَةٌ ۖ اِلٰی	قیامت کے روز بہت سے چہرے تروتیا
رَبِّہَا نَاطِرَةٌ ۖ	ہشاش ہشاش ہوں گے اور اپنے رب کی
	طرف دیکھ رہے ہوں گے

البتہ کفار و منکرین اس روز بھی سزا کے طور پر حق تعالیٰ کی رودیت سے مشرف نہ ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے:

کَلَّا اِنَّہُمْ عَنْ رَبِّہِمْ	"یعنی کفار اس روز اپنے رب کی زیارت
یَوْمَہِیْنِ لَمَّ یُجْزَوْنَ ۖ	سے محجوب و محروم ہوں گے"

اور آخرت میں حق تعالیٰ کی زیارت مختلف مقامات پر ہوگی، عرصہ محشر میں بھی، اور جنت میں پہنچنے کے بعد بھی، اور اہل جنت کے لئے ساری نعمتوں سے بڑی نعمت حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں اُن سے زائد اور کچھ چاہئے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اُس وقت حجاب درمیان سے اٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی، یہ حدیث صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ سے منقول ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے، اور صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا، آپ نے چاند کی طرف نظر فرمائی

اور پھر فرمایا کہ (آخرت میں) تم اپنے رب کو ایسی طرح عیاں نہ دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔
ترمذی اور مسند احمد کی ایک حدیث میں بردایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے، اُن کو روزانہ صبح و شام حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی۔
خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو حق تعالیٰ کی زیارت نہیں ہو سکتی، اور آخرت میں سب جنت کو ہوگی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شب معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی درحقیقت عالم آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہان کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، آسمانوں سے اوپر آخرت کا مقام ہے، وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ جب آیت قرآن لَا تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رویت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر قیامت میں کیسے ہوگی؟ اس کا جواب کھلا ہوا یہ ہے کہ آیت قرآن کے یہ معنی نہیں کہ انسان کے لئے حق تعالیٰ کی رویت و زیارت ناممکن ہے، بلکہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسانی نگاہ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کی ذات غیر محدود اور انسان کی نظر محدود ہے۔

قیامت میں بھی جو زیارت ہوگی وہ ایسی طرح ہوگی کہ نظر احاطہ نہیں کر سکے گی، اور دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں جو اس طرح کی رویت کو بھی برداشت کر سکے، اس لئے دنیا میں رویت مطلقاً نہیں ہو سکتی، اور آخرت میں قوت پیدا ہو جائے گی، تو رویت و زیارت ہو سکے گی، مگر نظر میں ذات حق کا احاطہ اُس وقت بھی نہ ہو سکے گا۔

دوسری صفت حق تعالیٰ شانہ کی اس آیت میں یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی نظرساری کائنات پر محیط ہے، دنیا کا کوئی ذرہ اس کی نظر سے چھپا ہوا نہیں، یہ علم مطلق اور احاطہ علمی بھی حق تعالیٰ شانہ کی ہی خصوصیت ہے، اس کے سوا کسی مخلوق کو تمام اشیاء کائنات اور ذرہ ذرہ کا علم نہ کبھی..... حاصل ہوا ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ مخصوص صفت ہے رب العزت جل شانہ کی۔
اس کے بعد ارشاد فرمایا وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ، لطیف عربی لغت کے اعتبار سے دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک معنی مہربان، دوسرے بمقابل کثیف، یعنی وہ چیز جو اس کے ذریعہ محسوس و معلوم نہیں کی جاسکتی۔

اور خبیر کے معنی ہیں بانبر، معنی اس جملہ کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ لطیف ہیں اس لئے حواس کے ذریعہ ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، اور خبیر ہیں، اس لئے ساری کائنات کا کوئی ذرہ ان کے علم و خبر سے باہر نہیں، اور اگر لطیف کے معنی اس جگہ مہربان کے لئے جاویں تو اشارہ اس طرف

ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہمارے ہر قول و فعل بلکہ ارادہ اور خیال سے بھی باخبر ہیں جس کا اقتضایہ تھا کہ ہم ہر گناہ پر پھڑے جایا کرتے، مگر چونکہ وہ لطیف و مہربان بھی ہیں، اس لئے ہر گناہ پر مواخذہ نہیں فرماتے۔

دوسری آیت میں لفظ بصائر، بصیرت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عقل و دانش یعنی وہ قوت جس کے ذریعہ انسان غیر محسوس چیزوں کا علم حاصل کر سکتا ہے، بصائر سے مراد آیت میں وہ دلائل اور ذرائع ہیں جن سے انسان حق اور حقیقت کو معلوم کر سکے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھارے پاس حق بینی کے ذرائع اور وسائل پہنچ چکے ہیں، یعنی قرآن آیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ کے معجزات آئے، آپ کے اخلاق و معاملات و تعلیمات مشاہدہ میں آئیں یہ سب حق بینی کے ذرائع ہیں۔

تو جو شخص ان ذرائع سے کام لے کر صاحب بصیرت بن گیا، اس نے اپنا نفع حاصل کر لیا اور جو ان ذرائع کو چھوڑ کر حق سے اندھا رہا تو اپنا ہی نقصان کیا۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ”میں تمھارا نگران نہیں“ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذمہ دار نہیں کہ لوگوں کو زبردستی کر کے ناشائستہ کاموں سے روک ہی دیں، جیسے نگراں اور محافظ کا کام ہوتا ہے، بلکہ رسول کا منصبی فریضہ صرف احکام کا پہنچا دینا اور سمجھا دینا ہے، پھر کوئی اپنے اختیار سے ان کا اتباع کرے یا نہ کرے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

توحید و رسالت پر جو واضح دلائل پھیلی آیت میں بیان ہو چکے ہیں، تیسری آیت میں ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا: كَذٰلِكَ نُصِرُّكَ الْاٰیٰتِ، یعنی ہم اسی طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا، وَلَيَقُوْلُوْا اَدَسَمٰ سَتَ وَلَيُنَبِّئَنَّكَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ جس کا حاصل یہ ہے کہ سارا ہدایت کا سامان معجزات اور دلائل بے مثل کتاب قرآن اور ایک اُمّی محض کی زبان مبارک سے ایسے علوم و حقائق کا اظہار جن سے ساری دنیا کے فلاسفہ اور حکماء عاجز ہیں، ایسا بلیغ کلام جس میں قیامت تک آنے والے جن و بشر کو چیلنج کیا گیا کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورت جیسا کلام کوئی بنا سکے تو لائے اور ساری دنیا اس سے عاجز رہی، یہ سب حق بینی کا سامان ایسا تھا کہ ہر جھٹ دھرم منکر کو بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر جانا چاہئے تھا، لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں زلیغ اور کجی تھی، وہ یہ کہنے لگے کہ درست یعنی یہ علم تو آپ نے کسی سے پڑھ لئے ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا وَلَيُنَبِّئَنَّكَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ، جس کا حاصل یہ ہو کہ دشمن

جن کی سمجھ درست اور فہم سلیم ہے ان کے لئے یہ بیان نافع و مفید ثابت ہوا، خلاصہ یہ ہے کہ سامان ہدایت تو سب کے سامنے رکھا گیا مگر کچھ فہموں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، سلیم الفہم لوگ اس کے ذریعہ دنیا کے رہبر بن گئے۔

چوتھی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ آپ یہ نہ دیکھتے کہ کون مانتا ہو اور کون نہیں مانتا، آپ خود اس طریق پر چلتے رہتے جس طریق پر چلنے کے لئے آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف وحی نازل ہوئی ہے، جس میں بڑی چیز یہ اعتقاد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، نیز اس وحی میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے، اس پر قائم رہ کر مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے کہ افسوس! انھوں نے کیوں قبول نہ کیا۔

پانچویں آیت میں اس کی وجہ یہ بتلائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تنکوینی طور پر یہ منظور ہوتا کہ سب انسان مسلمان ہو جائیں تو یہ شرک نہ کر سکتے، لیکن ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ ان کو سزا ملے تو ایسا ہی سامان جمع کر دیا، پھر آپ ان کو کیسے مسلمان بنا سکتے ہیں، اور آپ اس فکر میں پڑیں کیوں، ہم آپ کو ان کے اعمال کا نگران نہیں بنایا، اور نہ آپ ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے مختار ہیں، اس لئے آپ کو ان کے اعمال سے تشویش نہ ہونی چاہئے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ

اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو

عَدًّا وَابْغِزْ عَلِيمٌ كَذَلِكَ زَيْنًا لِّكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ

بے ادبی سے بدوں سمجھے اسی طرح ہم نے مرتب کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو، پھر ان سب

رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۰۸﴾ وَأَقْسَمُوا

کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلائے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے اور وہ قسمیں کھاتے ہیں

بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا

اللہ کی تاکید سے کہ اگر آوے ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور اس پر ایمان لا دیں گے ، ، ،

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ

تو کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اسے مسلمانو کیا خبر ہو کہ جب نشانیاں آویں گی تو

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا

یہ لوگ ایمان لے ہی آویں گے اور ہم اُلٹا دیں گے ان کے دل اور ان کی آنکھیں جیسے کہ

لَمْ يُوْثِقُوْا مِنْ اٰیٰتِهِۦ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرْتُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰

ایمان نہیں لائے نشانوں پر پہلی بار اور ہم چھوڑے رکھیں گے ان کو ان کی سرکش میں بہکتے ہوئے

وَلَوْ اَنَّا نَزَّلْنٰ اِلَيْهِمْ السَّلٰكَةَ وَكَلَّمَهُمُ

اور اگر ہم اُناریں اُن پر فرستے اور باتیں کریں ان سے

السَّمَوٰتِ وَحَسْرَتًا عَلَيْهِمْ كُلُّ شَيْءٍ قُبْلًا مَا كَانُوا لِيَوْمٍ مِّنْهُ اِلَّا

مردے اور زندہ کریں ہم ہر چیز کو اُن کے سامنے تو بھی یہ لوگ ہرگز ایمان لائے نہ تھے

اَن يَّشَاءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝۱۱۱ وَكَذٰلِكَ

مگر یہ کہ چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر جاہل ہیں اور اسی طرح

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شٰطِطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحٰى

کر دیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو، جو کہ سکھاتے ہیں

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۗ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ

ایک دوسرے کو ملمع کی ہوتی باتیں فریب دینے کے لئے اور اگر تیرا رب چاہتا

مَا فَعَلُوْهُ فَاِنَّهُمْ وَاٰفِتْرُوْنَ ۝۱۱۲ وَلِتَصْغٰى اِلَيْهِ اَفْكَةٌ

تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے، سو تو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ، اور اس لئے کہ مائل ہوں ان ملمع

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرٰضُوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا

کی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل جن کو یقین نہیں آخرت کا اور وہ اس کو بھی پسند کر لیں اور کئے جاویں

هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝۱۱۳

جو کچھ بُرے کام کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور دشنام مت دو ان (معبودان باطلہ) کو جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا کی توحید کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہِ جہل حد سے گذر کر یعنی غصہ میں آکر، اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ اور اس کا تعجب نہ کیا جائے کہ ایسی گستاخی کرنا بول کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی، کیونکہ ہم نے (دنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل (بھلا ہو یا بُرا ہو) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے سب جمع ہو جائیں

کہ ہر ایک کو اپنا طریقہ پسند ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ عالم اصل میں ابتلا و امتحان کا ہے، پس اس میں سزا ضرور نہیں (پھر البتہ اپنے وقت پر) اپنے رب ہی کے پاس ان (سب) کو جانا ہے، سو (اس وقت) وہ ان کو جتنا دیکھا جو کچھ بھی وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (اور مجرمین کو سزا دیدیگا) اور ان (منکر) لوگوں نے قسموں میں بڑا زور لگا کر اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس (یعنی انکے فرمائی نشانوں میں سے) کوئی نشان (ظہور میں) آجائے تو وہ (یعنی ہم) ضرور ہی اس (نشان) پر ایمان لے آویں گے (یعنی نشان ظاہر کرنے والے کی نبوت کو مان لیں گے) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ نشان سب خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں (وہ ان میں جس طرح چاہے تصرف فرمادے دوسرے کو دخل دینا اور فرمائش کرنا بے جا ہے، کیونکہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کس کا ظاہر ہونا حکمت ہے اور کس کا ظاہر نہ ہونا حکمت ہے، البتہ بعثتِ رسل کے وقت مطلقاً کسی نشان کو ظاہر کر دینا اس میں حکمت یقینی ہے، سو اللہ تعالیٰ بہت سے نشان صدق دعویٰ رسالت محمدؐ یہ پر ظاہر فرما چکے ہیں جو کہ دلالت کے لئے کافی ہیں، بس یہ ان کی فرمائش کا جواب ہو گیا) اور چونکہ مسلمانوں کے دل میں خیال تھا کہ خوب ہو اگر یہ نشان ظاہر ہو جاویں، شاید ایمان لے آویں ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم کو اس کی کیا خبر (بلکہ ہم کو خبر ہے) کہ وہ (فرمائی) نشان جس وقت (ظہور میں) آجادیں گے یہ لوگ (غایت عناد سے) جب بھی ایمان نہ لاویں گے اور ان کے ایمان نہ لانیکی وجہ سے ہم بھی ان کے دلوں کو (حق طلبی کے قصد سے) اور ان کی نگاہوں کو (حق بینی کی نظر سے) پھیر دیں گے (اور ان کا یہ ایمان نہ لانا ایسا ہے) جیسا یہ لوگ اس (قرآن) پر (کہ حجرۃ عظیمہ پر) پہلی دفعہ (جبکہ وہ آیا) ایمان نہیں لاتے (تو اب ایمان نہ لانے کو بعید مت سمجھو) اور (تقلیب ابصار یعنی نگاہوں کو بے کار کرنے کا مطلب ظاہری تقلیب نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ) ہم ان کو ان کی سرکشی (وکفر) میں حیران (سرگرداں) رہنے دیں گے (ایمان کی توفیق نہ ہوگی کہ یہ معنوی تقلیب ہے) اور ان کے عناد کی تو یہ کیفیت ہے کہ اگر ہم (ایک فرمائش نشان کیا کسی کسی اور بڑے بڑے فرمائش نشان بھی ظاہر کر دیتے، مثلاً یہ کہ) ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے (جیسا وہ کہتے ہیں) لَوْ لَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ (اور ان سے مردے زندہ ہو کر) بآئیں کرنے لگتے (جیسا وہ کہتے ہیں) فَاَوْفَا بَاٰبَاۡنَا (اور یہ تو صرف اتنا ہی کہتے ہیں) تَاۡتٰی بِاَلٰہِ الْمَلٰٓئِکَۃِ قَبِيْلًا (ہم) اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ تمام موجودات (غیبیہ) کو (جس میں جنت و دوزخ سب ہی کچھ آگیا) ان کے پاس ان کی آنکھوں کے رو برد لا کر جمع کر دیتے، کہ سب کو کھلم کھلا دیکھ لیتے) تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے، ہاں مگر خدا ہی چاہے (اور انکی تقدیر بدل دے) تو اور بات ہے (پس جب ان کے عناد و شرارت کی یہ کیفیت ہے اور خود

بھی وہ اس کو جانتے ہیں کہ ہماری نیت اس وقت بھی ایمان لانے کی نہیں تو اس کا مقصد نایہ تھا کہ نشانوں کی فرمائش نہ کرتے کہ محض بیکار ہے، لیکن ان میں زیادہ لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں کہ ایمان لانے کا تو قصد نہیں پھر خواہ مخواہ کی فرمائشیں کہ جہالت ہونا اس کا ظاہر ہے) اور یہ لوگ جو آپ سے عداوت کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات آپ ہی کے لئے نہیں ہوتی، بلکہ جس طرح یہ آپ سے عداوت رکھتے ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے، کچھ آدمی (جن سے اصل معاملہ تھا) اور کچھ جن (ابلیس اور اس کی اولاد) جن میں سے بعضے (یعنی ابلیس اور اس کا لشکر) دوسرے بعضوں کو (یعنی کافر آدمیوں کو) چکنی چپڑی باتوں کا دوسو سہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں (مراد اس سے کفر و مخالفت کی باتیں ہیں کہ ظاہر میں نفس کو بھلی معلوم ہوتی تھیں، اور باطن میں مہلک تھیں، اور یہی دھوکہ ہے، جب یہ کوئی نئی بات نہیں تو اس کا غم نہ کیجئے کہ آپ کے ساتھ یہ لوگ ایسے معاملات کیوں کرتے ہیں، اصل یہ ہے کہ اس میں بعض حکمتیں ہیں، اس وجہ سے ان کو ایسے امور پر قدرت بھی ہو گئی ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ (یہ) چاہتا کہ یہ لوگ ایسے امور پر قادر نہ رہیں (تو) پھر، یہ ایسے کام نہ کر سکتے (مگر بعض حکمتوں سے ان کو قدرت دیدی ہے) سو جب اس میں حکمتیں ہیں تو ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ (دین کے بارہ میں) افتراء پر دازی کر رہے ہیں (جیسے انکار نبوت جس پر عداوت مرتب ہے) اس کو آپ رہنے دیجئے (اس کی فکر و غم میں نہ پڑیے) ہم خود متعین وقت پر مناسب سزا دیں گے کہ ان حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے، اور وہ شیاطین ان کافر آدمیوں کو اس لئے دوسو سہ ڈالتے تھے تاکہ اس (فریب آمیز بات) کی طرف ان لوگوں کے قلوب مائل ہو جاویں جو آخرت پر (جیسا چاہئے) یقین نہیں رکھتے (مراد کافر لوگ ہیں، اگرچہ اہل کتاب ہوں، کیونکہ جیسا چاہئے ان کو بھی یقین نہیں، ورنہ انکار نبوت پر جس پر قیامت میں سزا ہوگی کبھی جرأت نہ کرتے) اور تاکہ (میلان نفسانی کے بعد) اس کو (اعتقاد قلبی سے بھی) پسند کر لیں اور تاکہ (اعتقاد کے بعد) مرتکب (بھی) ہو جاویں ان امور کے جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، اور اس میں ایک اہم اصولی مسئلہ کی ہدایت دی گئی ہے کہ جو کام خود کرنا جائز نہیں اس کا سبب اور زور لگنا بھی جائز نہیں۔

آیت کا شان نزول ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عجم محترم ابوطالب مرض الموت میں تھے تو قریش کے مشرک سردار جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور ایذا رسانی میں لگے ہوئے تھے، اور قتل کی سازشیں کرتے رہتے تھے، ان کو یہ فکر ہوئی کہ ابوطالب کی وفات ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن جائے گی، کیونکہ ان کے بعد اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کریں تو یہ ہماری عزت و شرافت کے خلاف ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ ابوطالب کے سامنے تو ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے، اُن کی موت کے بعد اکیلا پا کر قتل کر دیا، اس لئے اب وقت ہے کہ ہم مل کر خود ابوطالب ہی سے کوئی فیصلہ کن بات کر لیں۔

یہ بات تقریباً ہر لکھا پڑھا مسلمان جانتا ہے کہ ابوطالب اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف محبت بلکہ عظمت و جلالت بھی ان کے دل میں پیوست تھی، اور آپ کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہتے تھے۔

چند قریشی سرداروں نے یہ مشورہ کر کے ابوطالب کے پاس جانے کے لئے ایک وفد مرتب کیا، جس میں ابوسفیان، ابوہل، عمرو بن عاص وغیرہ قریشی سردار شامل تھے، ابوطالب سے اس وفد کی ملاقات کے لئے وقت لینے کا کام ایک شخص مطلب نامی کے سپرد ہوا، اس نے ابوطالب سے اجازت لے کر اس وفد کو وہاں پہونچایا۔

وفد نے ابوطالب سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو سخت تکلیف اور ایذا پہونچا رکھی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ انکو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو بُرائے کہیں تو ہم اس پر صلح کر لیں گے کہ وہ اپنے دین پر جس طرح چاہیں عمل کریں، جس کو چاہیں معبود بنائیں، ہم ان کو کچھ نہ کہیں گے۔

ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ آپ کی برادری کے سردار آئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیں، برا بھلا نہ کہیں، اور ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو چھوڑ دیں گے، اس طرح باہمی مخالفت ختم ہو جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر میں تمھاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کے لئے تیار ہو جاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک ہو جاؤ گے، اور عجم کے لوگ بھی تمھارے تابع اور باج گزار بن جائیں گے۔

ابو جہل بولا، کہ ایسا کلمہ ایک نہیں ہم دس کہنے کو تیار ہیں، بتلاتے وہ کیا ہیں، آپ نے فرمایا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، یہ سنتے ہی سب برہم ہو گئے، ابوطالب نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے بھتیجے! اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو، کیونکہ آپ کی قوم اس کلمہ سے گھبر گئی ہو۔ آپ نے فرمایا! چچا جان! میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا، اگر وہ آسمان سے آفتاب کو اتار لادیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دیں جب بھی میں اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا ہرگز نہ کہوں گا، مقصود یہ تھا کہ ان کو مایوس کر دیں۔

اس پر یہ لوگ ناراض ہو کر کہنے لگے یا تو آپ ہمارے معبودوں (بتوں) کو بُرا کہنے سے باز آجائیے، ورنہ ہم آپ کو بھی گالیاں دیں گے اور اس ذات کو بھی جس کا رسول آپ اپنے آپ کو بتلاتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ، یعنی آپ ان بتوں کو بُرا نہ کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کو بُرا کہنے لگیں اپنی بے راہ روی اور بے سمجھی سے۔ اس میں لَا تَسُبُّوا لفظ سب سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں گالی دینا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے فطری اخلاق کی بنا پر پہلے ہی اس کے پابند تھے، کبھی بچپن میں بھی کسی انسان بلکہ کسی جانور کے لئے بھی گالی کا لفظ آپ کی زبان مبارک پر جاری نہیں ہوا، ممکن ہے بعض صحابہ کرام کی زبان سے کبھی کوئی سخت کلمہ نکل بھی گیا ہو جس کو مشرکین مکہ نے گالی سے تعبیر کیا، اور قرشی سرداروں کے اس وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس معاملہ کو رکھ کر یہ اعلان کر دیا کہ آپ ہمارے بتوں کو سب و شتم کرنے سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کے خدا کو سب و شتم کریں گے۔

اس پر قرآنی حکم یہ نازل ہوا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو روک دیا گیا، کہ وہ مشرکین کے معبودات باطلہ کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کریں، اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابلِ نظر ہے کہ اس سے پہلی آیت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو رہا تھا، مثلاً ارشاد ہے: اِنِّمَ مَا اَوْحٰی اِلَیْكَ مِنْ رَبِّكَ اور اَخْرَضَ عَنْ الْمُشْرِكِیْنَ اور مَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِیْظًا اور مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِیْلٍ، ان تمام صیغوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب تھے، کہ آپ ایسا کریں یا ایسا نہ کریں، اس کے بعد اس آیت میں طرزِ خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پھیر کر عام مسلمانوں کی طرف کر دیا گیا، فرمایا لَا تَسُبُّوا اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی کسی کو گالی دی ہی نہیں تھی، ان کو براہِ راست اس کلام کا مخاطب بنانا ان کی دل شکنی کا سبب

..... ہو سکتا ہے، اس لئے خطاب عام کر دیا گیا، اور تمام صحابہ کرام بھی اس میں احتیاط فرمانے لگے (کنزانی البحر المحیط)

رہا یہ معاملہ کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت اب بھی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں وہاں کسی کی دل آزاری نہ پیش نظر ہے، اور نہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا منظور ہے، اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کبھی کسی شخص کا کوئی عیب یا برائی کسی مسئلہ کی تنقیح کی لئے ذکر کی جاتی ہے، جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز سامنے آتا رہتا ہے، لیکن عدالت کے سامنے ہونے والے بیان کو دنیا میں کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے فلاں کو گالی دی ہے، اسی طرح ڈاکٹر وں اور حکیموں کے سامنے انسان کے بہت سے ایسے عیب بیان کئے جاتے ہیں کہ ان کو دوسری جگہ اور دوسری طرح کوئی بیان کرے گا تو گالی سمجھی جائے، لیکن بغرض علاج ان کے بیان کرنے کو کوئی گالی دینا نہیں کہتا۔

اسی طرح قرآن کریم نے جا بجا بتوں کے بے حس و بے شعور اور بے علم و قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں، اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہو جائے، جس کے نتیجہ میں ارشاد ہوا ہے **فَنَعَتَ الْطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ**، یعنی یہ بت بھی کمزور ہیں اور ان کے چاہنے والے بھی کمزور، یا یہ ارشاد ہوا کہ **إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ** یعنی تم اور جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ یہاں بھی کسی کو برا بھلا کہنا مقصود نہیں، مگر اسی اور غلطی کا انجام بد بیان کرنا مقصود ہے، اور فقہار جمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کی چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبب ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے، جیسے مواضع مکروہہ میں تلاوت قرآن کا ناجائز ہونا سب کو معلوم ہے۔ (روح المعانی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور قرآن کریم میں تو نہ پہلے کبھی ایسا کلام آیا تھا جس کو لوگ گالی سمجھیں، اور نہ آئندہ آنے کا کوئی خطرہ تھا، ہاں مسلمانوں سے اس کا امکان تھا ان کو اس آیت نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

اس واقعہ اور اس پر قرآنی ہدایت نے ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا، اور چند اصولی مسائل اس سے نکل آئے۔

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہی | مثلاً ایک اصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجے میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے، کیونکہ معبوداتِ باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضے سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو بُرا کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس بُرائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ ہاں انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجے میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے، تو اس گالی دلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اُس نے خود گالی دی۔

اسی معاملہ کی ایک دوسری مثال عہد رسالت میں یہ پیش آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بیت اللہ شریف زمانہ جاہلیت کے کسی حادثہ میں مہندم ہو گیا تھا تو قریش مکہ نے بخت و نبوت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بنا، ابراہیمی کے خلاف ہو گئیں، ایک تو یہ کہ جس حصہ کو حطیم کہا جاتا ہو یہ بھی بیت اللہ کا جز ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا، دوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا باہر نکلنے کے لئے، اہل جاہلیت نے غربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا، اور وہ بھی سطح زمین سے بلند کر دیا، تاکہ بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی و اجازت سے ہو سکے۔ ہر شخص بے محابانہ جاسکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو مہندم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنادوں، مگر خطرہ یہ ہے کہ تمھاری قوم یعنی عام عرب ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو مہندم کرنے سے کہیں ان کے دلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس لئے

میں نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا۔

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بنائے ابراہیمی کے مطابق بنانا ایک طاعت اور کارِ ثواب تھا، مگر اس پر لوگوں کی تاواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتیب دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا۔ اس واقعہ سے بھی یہی اصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس پر ایک قومی اشکال ہے، جس کو روح المعانی میں ابو منصور سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد و قتال لازم فرمایا ہے، حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہو کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے، اور مسلمان کا قتل حرام ہے، تو اس اصول پر جہاد بھی ممنوع ہو جانا چاہئے، ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوت قرآن پر لیز اذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں، تو کیا ہم ان کے اس غلط رویہ کی بناء پر اپنی عبادات سے دستبردار ہو جائیں گے۔

اس کا جواب خود ابو منصور نے دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزوم مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو، چلیے معبودات باطلہ کو برا کہنا، اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں، اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بنائے ابراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں، اس لئے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا، اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں، یا کوئی مقصد اسلامی اس پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں اور پیش آنے والے مفسدہ جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں، یہی وجہ ہو کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کے لئے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے، اس کو دیکھ کر ابن سیرین واپس ہو گئے، مگر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں، نماز جنازہ فرض ہے اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس کی کوشش تا بقدر در کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔

یہ واقعہ بھی روح المعانی میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لئے خلاصہ اس اصول کا جو آیت مذکورہ سے نکلا ہے یہ ہو گیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے، بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔

اس اصول سے فقہاء امت نے ہزاروں مسائل کے احکام نکالے ہیں، فقہاء نے فرمایا کہ کسی شخص کا بیٹا نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے کہوں گا تو انکار کرے گا اور اس کے خلاف کرے گا جس سے اس کا سخت گناہ گار ہونا لازم آئے گا تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے، بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کر لیا جائے تو بہت اچھا ہو، تاکہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہو جائے (خلاصۃ الفتاویٰ) اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرآن سے یہ معلوم ہو جائے کہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اختیار کرے گا، جس کے نتیجہ میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کر دینا بہتر ہے، امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مسئلہ نقل کیا ہے باب من ترک بعض الاختیار مخافة ان یقصر فہم بعض الناس فیقوۃ فی اشد منہ، یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض و واجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتداء اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز و تلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا،

..... مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، بلکہ خود آیت مذکورہ کے شان نزول میں جو واقعہ ابو جہل وغیرہ رؤساق قریش کا ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپؐ توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، جس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں یہ کام کسی حال میں نہیں کر سکتا اگرچہ وہ آفتاب و ماہتاب لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

اس لئے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہو گئی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، ہاں جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں، اور ان کے ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائیگا۔ پچھلی آیات میں اس کا ذکر تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے ہوئے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں کے باوجود ہٹ دھرم لوگوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا، اپنے انکار اور ضد پر جھگڑے، اگلی آیات میں اس کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا ایک نیاروپ یہ بدلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص خاص قسم کے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قریشی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ اگر آپ ہمیں یہ معجزہ دکھلا دیں کہ کوہ صفا پورا سونا ہو جائے تو ہم آپ کی نبوت و رسالت کو مان لیں گے، اور مسلمان ہو جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا معاہدہ کرو کہ اگر یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو تم سب مسلمان ہو جاؤ گے، انھوں نے قسمیں کھالیں، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے کہ اس پہاڑ کو سونا بنا دیجئے، حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے کہ اگر آپ چاہیں تو ہم ابھی اس پورے پہاڑ کو سونا بنا دیں، لیکن قانون الہی کے مطابق اس کا نتیجہ ہو گا کہ اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب پر عذاب عام نازل کر کے ہلاک کر دیا جائے گا، جیسا پچھلی قوموں میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے، کہ انھوں نے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کیا، وہ دکھایا گیا، اور وہ پھر بھی مستکرم ہو گئے، تو ان پر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب نازل ہو گیا، رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ان لوگوں کی عادات اور ہٹ دھرمی سے واقف تھے، بمقتضائے شفقت آپ نے فرمایا کہ اب میں اس معجزہ کی دعا نہیں کرتا، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، **وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ**، جس میں کفار کے قول کی نقل کی ہے، کہ انھوں نے مطلوبہ معجزہ ظاہر ہونے پر مسلمان ہو جانے کے لئے قسمیں کھالیں، اس کے بعد کی آیت **إِنَّمَا الْإِنْسَانُ لِرَبِّهِ** میں ان کے قول کا جواب ہے کہ معجزات اور نشانیاں سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، اور جو معجزات ظاہر ہو چکے ہیں وہ بھی اسی کی طرف سے تھے، اور جن کا مطالبہ کیا جا رہا ہو ان پر بھی وہ پوری طرح قادر ہے، لیکن از روئے عقل و انصاف ان کو ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہونے کے مدعی ہیں، اور اس دعوے پر بہت سے دلائل اور شہادتیں معجزات کی صورت میں پیش فرما چکے ہیں، اب

دوسرے فریق کو اس کا توحق ہے کہ ان دلائل اور شہادتوں پر جرح کرے ان کو غلط ثابت کرے، لیکن ان پیش کردہ شہادتوں میں کوئی جرح نہ کریں اور پھر یہ مطالبہ کریں کہ ہم تو دوسری شہادتیں چاہتے ہیں، یہ ایسا ہوگا جیسا عدالت میں کوئی مدعا علیہ مدعی کے پیش کردہ گواہوں پر تو کوئی جرح نہ کرے، مگر یہ کہے کہ میں تو ان گواہوں کی شہادت نہیں مانتا، بلکہ فلاں معین شخص کی گواہی پر بات مانوں گا، اس کو کوئی عدالت قابل سماعت نہ سمجھے گی۔

اسی طرح نبوت و رسالت پر بے شمار آیات بینات اور معجزات ظاہر ہو جانے کے بعد جب تک ان معجزات کو غلط ثابت نہ کریں ان کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ہم تو فلاں قسم کا مجسزہ دیکھیں گے جب ایمان لائیں گے۔

اس کے بعد آخر آیات تک مسلمانوں کو فہمائش اور خطاب ہے کہ تمہارا کام دین حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو صحیح طریقہ سے پہنچا دینا ہے، پھر بھی اگر وہ ہٹ دھرمی کرنے لگیں تو ان کی فکر میں پڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ زبردستی کسی کو مسلمان بنانا نہیں، اگر زبردستی بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ زبردست کون ہے، وہ خود ہی سب کو مسلمان بنا دیتے، اور ان آیات میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ بھی بتلادیا گیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزات کو بھی بالکل کھلے اور واضح طور پر ظاہر کر دیں یہ جب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا نادانیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضد اور عناد اور ہٹ دھرمی سے ہے، جس کا علاج کسی مجسزہ سے نہیں ہوا کرتا، آخری آیت **وَكُنتُمْ أَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ الْمُبِينَ** میں اسی مضمون کا بیان ہے کہ اگر ہم اُن کو ان کے فرمائشی معجزات سب دکھلا دیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ فرشتوں سے ان کی ملاقات اور مُردوں سے گفتگو کرا دیں، جب بھی وہ ماننے والے نہیں، بعد کی دو آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر آپ سے عداوت کرتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں، پچھلے تمام انبیاء کے بھی دشمن ہوتے چلے آئے ہیں، آپ اس سے دلگیر نہ ہوں۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكْمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ

سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے تمہاری تم پر کتاب

مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ

واضح اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے

مِّنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَ تُكُونُوا مِنَ الْمُسْتَضْرِّينَ ۝۱۱۳ وَتَمَّتْ

تیرے رب کی طرف سے ٹھیک ہو تو مت ہو شک کرنے والوں میں سے اور تیرے رب کی

كَلِمَاتُ رَبِّكَ صِدْقٌ قَدْ وُعِدَ لَكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ

بات پوری سچی ہے اور انصاف کی، کوئی بدلنے والا نہیں اسکی بات کو اور وہی سننے والا

الْعَلِيمُ ۱۱۵) وَإِنْ تُطِيعْ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ

جاننے والا اور اگر تو کہنا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بہکا دیں گے اللہ کی

سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۱۱۶)

راہ سے وہ سب تو چلتے ہیں اپنے خیال پر اور سب اٹکل ہی دوڑاتے ہیں،

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ

تیرا رب خوب جاننے والا ہے اس کو جو بہکتا ہو اس کی راہ سے اور وہی خوب جاننے والا ہے

بِالْمُهْتَدِينَ ۱۱۷)

ان کو جو اس کی راہ پر ہیں

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ میرے تمھارے درمیان جو مقدمہ رسالت میں اختلاف ہے کہ میں بحکم سرکاری اس کا مدعی ہوں اور تم منکر اور یہ مقدمہ اجلاس حکم الحاکمین سے میرے حق میں اس طرح طے اور فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل، یعنی قرآن مجید خود قائم فرما دیا ہے اور تم پھر بھی نہیں مانتے تو کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ اس خدائی فیصلہ کو کافی نہ قرار دوں اور) اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، حالانکہ وہ ایسا (کامل فیصلہ کر چکا) ہے کہ اس نے ایک کتاب (جو اپنے اعجاز میں) کامل (ہے) تمھارے پاس بھیج دی ہے (جو اپنے اعجاز کی وجہ سے دلالت علی النبوة میں کافی ہے، پس اس کے دو کمال تو یہ ہیں، اعجاز و تنزیل من اللہ، اور اس کے علاوہ اور وجہ سے بھی کامل، اور اس سے جو اور مقاصد ہدایت و تعلیم کے متعلق ہیں ان کے لئے کافی ہے، چنانچہ) اس کی (ایک یعنی تیسری) حالت (کمال کی) یہ ہے کہ اس کے مضامین (جو دین کے باب میں اہم ہیں) خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں اور (چوتھا وصف کمال اس کا یہ ہے کہ کتب سابقہ میں اس کی خبر دی گئی تھی جو علامت ہے اس کے مہتمم بالشان ہونے کی، چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (یعنی توراۃ و انجیل) دی ہے وہ اس کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے واقعیت کے ساتھ بھیجا گیا ہے (اس کو جانتے تو سب ہیں، پھر جن میں حق گوئی

کی صفت تھی، انھوں نے ظاہر بھی کر دیا، اور جو معاند تھے وہ ظاہر نہ کرتے تھے) سو آپؐ مشبہ کرنے والوں میں نہ ہوں اور رہا پانچواں وصف کمال اس کا یہ ہر کہ (آپؐ کے رب کا یہ) کلام واقعیت اور اعتدال کے اعتبار سے (بھی) کامل ہے (یعنی علوم و عقائد میں واقعیت اور اعمال ظاہری اور باطنی میں اعتدال لئے ہوئے ہے، اور چھٹا وصف کمال اس کا یہ ہر کہ) اس کے (اس) کلام کا کوئی بدلنے والا نہیں (یعنی کسی کی تحریف و تغیر سے اس کا اللہ محفوظ ہے ورنہ لفظ لفظاً اور ایسی کامل دلیل پر بھی جو لوگ تکذیب قلبی و زبانی سے پیش آویں) وہ (یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اقوال کو) خوب سن رہے ہیں (اور ان کے عقائد کو) خوب جان رہے ہیں، اپنے وقت پر ان کو کافی سزا دیں گے) اور (باوجود وضوح دلائل کے) دنیا میں زیادہ لوگ ایسے (منکر اور گمراہ ہی) ہیں کہ اگر (بالفرض) آپؐ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپؐ کو اللہ کی راہ (راست) سے بے راہ کر دیں (کیونکہ وہ خود گمراہ ہیں چنانچہ عقائد میں) وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور (اقوال میں) بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں (اور ان کے مقابلہ میں بعضے بندگان خدا راہ پر بھی ہیں اور) بالیقین آپؐ کا رب ان کو (بھی) خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ (راست) سے بے راہ ہو جاتا ہے اور وہ (ہی) ان کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ پر چلتے ہیں (پس گمراہوں کو سزا ملے گی راہ والوں کا انعام و اکرام ہوگا) :

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں اس کا ذکر تھا کہ مشرکین مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے حق و صحیح ہونے پر کھلے کھلے معجزات اور دلائل دیکھنے اور جاننے کے باوجود ہٹ دھرمی سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فلاں فلاں قسم کے خاص معجزات ہمیں دکھلائے جائیں تو ہم ماننے کو تیار ہیں، قرآن کریم نے ان کی کج بحثی کا یہ جواب دیا کہ جو معجزات یہ اب دیکھنا چاہتے ہیں ہم انہیں ان کا ظاہر کرنا بھی کچھ مشکل نہیں، لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ ان کو دیکھنے کے بعد بھی سرکشی سے باز نہ آئیں گے، اور قانون قدرت کے ماتحت اس کا نتیجہ پھر یہ ہوگا کہ ان سب پر عذاب آجائے گا۔

اسی لئے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے مانگے ہوئے معجزات کے ظاہر کرنے سے شفقت کی بنا پر انکار کر دیا، اور جو معجزات و دلائل اب تک اُن کے سامنے آچکے ہیں انہی میں غور کرنے کی طرف ان کو دعوت دی، مذکورہ آیات میں اُن دلائل کا بیان ہے جن سے بدیہی طور پر قرآن کریم کا حق اور کلام الہی ہونا ثابت ہے۔

پہلی آیت میں جو ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ میرے اور تمھارے درمیان مقدمہ رسالت و نبوت میں اختلاف ہے، میں اس کا مدعی ہوں اور تم منکر، اور یہ مقدمہ الحکم الحاکمین کے اجلاس سے میرے حق میں اس طرح طے اور فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل خود قرآن کا اعجاز ہے، جس نے تمام اقوام عالم کو چیلنج کیا کہ اگر اس کے کلام الہی ہونے میں کسی کو شبہ ہو تو اس کلام کی ایک چھوٹی سی سورت یا آیت کا مقابلہ کر کے دکھلاؤ جس کے جواب میں تمام عرب عاجز رہا، اور وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو پست کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، آبرو سب کچھ قربان کر رہے تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا کہ قرآن کے مقابلہ کے لئے ایک دو آیت بنا کر پیش کر دیتا، یہ کھلا ہوا معجزہ کیا قبول حق کے لئے کافی نہ تھا، کہ ایک اسی جس نے کہیں کسی سے تعلیم نہیں پائی اس کے پیش کئے ہوئے کلام کے مقابلہ سے پورا عرب بلکہ پورا جہان عاجز ہو جائے، یہ درحقیقت الحکم الحاکمین کی عدالت سے اس مقدمہ کا واضح فیصلہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول برحق اور قرآن اللہ جل شانہ کا کلام ہے۔

پہلی آیت میں اسی کے متعلق فرمایا أَفَعَيِّرَ اللَّهُ آيَاتِي حُكْمًا، یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے بعد میں کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، یہ نہیں ہو سکتا اس کے بعد قرآن کریم کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو خود قرآن کریم کے حق اور کلام الہی ہونے کا ثبوت ہیں، مثلاً فرمایا: هُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا جس میں قرآن کریم کے چار خصوصی کمالات کا بیان ہے، اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ یہ ایک کتاب کامل اور معجز ہے کہ سارا جہان اس کے مقابلہ سے عاجز ہے، تیسرے یہ کہ تمام اہم اور اصولی مضامین اس میں بہت مفصل واضح بیان کئے گئے ہیں، چوتھے یہ کہ قرآن کریم سے پہلے اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام حق ہے، پھر جن میں کوئی سچائی اور حق گوئی کی صفت تھی، انھوں نے اس کو ظاہر بھی کر دیا، اور جو لوگ معاند تھے وہ باوجود یقین کے اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔

قرآن کریم کی ان چار صفات کو بیان کرتے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے، فَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُمْتَرِينَ، یعنی ان واضح دلائل کے بعد آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی وقت بھی شبہ کرنے والوں میں نہ تھے نہ ہو سکتے تھے، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ نہ میں نے کبھی شک کیا، اور نہ کبھی سوال کیا، معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظوں میں خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن درحقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے، اور آپ کی طرف اسناد کرنے سے مبالغہ اور تاکید کرنا منظور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہا گیا تو دوسروں کی کیا ہستی ہے جو کوئی شک کر سکیں۔

دوسری آیت میں قرآن حکیم کی اور دوسری ازسی صفات کا بیان ہے جو قرآن کے کلام الہی ہونے کا کافی ثبوت ہیں، ارشاد ہے وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَعَدًا لَّا لَمُبَدِّلَیْ یَکَلِّمُنَّہُ، یعنی کامل ہے کلام آپ کے رب کا، سچائی اور انصاف اور اعتدال کے اعتبار سے اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

لفظ تَمَّتْ میں کامل ہونے کا بیان ہے، اور کَلِمَتُ رَبِّکَ سے مراد قرآن ہے دجر محیط عن قَادَہٗ قرآن کے مکمل مضامین دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں تاریخ عالم کے عبرت آموز واقعات و حالات اور نیک اعمال پر وعدہ اور بُرے اعمال پر سزا کی وعید بیان کی گئی ہے، دوسرے وہ جن میں انسان کی صلاح و فلاح کے لئے احکام بیان کئے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے متعلق قرآن مجید کی یہ دو صفتیں بیان فرمائیں، صِدْقًا وَعَدًا، صدق کا تعلق پہلی قسم سے ہے، یعنی جتنے واقعات و حالات یا وعدہ وعید قرآن میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں، ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں، اور عدل کا تعلق دوسری قسم یعنی احکام سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں، اور لفظ عدل کا مفہوم دو معنی کو شامل ہے، ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم اور حق تلفی نہ ہو، دوسرے اعتدال کہ نہ بالکل انسان کی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں، اور نہ ایسے جن کو انسانی جذبات اور اس کے فطری ہلکات برداشت نہ کر سکیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام احکام الہیہ انصاف اور اعتدال پر مبنی ہیں نہ ان میں کسی پر ظلم ہے، اور نہ ان میں ایسی شدت اور تکلیف ہے جس کو انسان برداشت نہ کر سکے، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ کسی عمل کی تکلیف نہیں دیتے، اس کے ساتھ ہی اس آیت میں لفظ تَمَّتْ لاکر یہ بھی بتلادیا کہ صرف یہی نہیں کہ قرآن کریم میں ۰۰۰۰ صدق و عدل کی صفات موجود ہیں، بلکہ وہ ان صفات میں ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے۔

اور یہ بات کہ تمام قرآنی احکام تمام اقوام دنیا کے لئے اور قیامت تک آینوالی نسلوں اور بدلنے والے حالات کے لئے انصاف پر بھی مبنی ہوں اور اعتدال پر بھی، یہ اگر

ذرا بھی غور کیا جائے تو صرف احکام خداوندی ہی میں ہو سکتا ہے، دنیا کی کوئی قانون ساز اسمبلی تمام موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کا نہ پورا اندازہ لگا سکتی ہے، اور نہ ان سب حالات کی رعایت کر کے کوئی قانون بنا سکتی ہے، ہر ملک و قوم اپنے ملک اور اپنی قوم کے بھی صرف موجودہ حالات کے پیش نظر قانون بناتی ہے، اور ان قوانین میں بھی تجربہ کرنے کے بعد بہت سی چیزیں عدل و اعتدال کے خلاف محسوس ہوتی ہیں، تو ان کو بدلنا پڑتا ہے، دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں یا آئندہ حالات کی پوری رعایت کر کے ایسا قانون وضع کرنا جو ہر قوم ہر ملک ہر حال میں عدل و اعتدال کی صفات لئے ہوئے ہو، یہ انسانی فکر و نظر سے بالاتر ہے، صرف حق جل و علا شانہ کے ہی کلام میں ہو سکتا ہے، اس لئے یہ پانچویں صفت قرآن کریم کی کہ اس میں بیان کئے ہوئے گزشتہ اور آئندہ کے تمام واقعات اور وعدہ و وعید سب سچے ہیں، ان میں خلاف واقع ہونے کا ادنیٰ شبہ نہیں ہو سکتا، اور اس کے بیان کئے ہوئے تمام احکام پوری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عدل و اعتدال لئے ہوئے ہیں، نہ ان میں کسی پر ظلم ہے، نہ اعتدال و میانہ روی سے سیر ہو تجاوز ہے، یہ بجائے خود قرآن کے کلام الہی ہونے کا محکم ثبوت ہے۔

چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے، اس لئے بدلا جائے، یا یہ کہ کوئی دشمن زبردستی اس کو بدل ڈالے، اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب چیزوں سے بالاتر اور پاک ہے، اس نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ إِنَّا نَحْفَظُكَ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ، یعنی ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، پھر کس کی مجال ہے کہ خدا کی حفاظت کو توڑ کر اس میں کوئی تغیر تبدیل کر سکے، چنانچہ چودہ سو برس اس پر گزر چکے ہیں، اور ہر قرن ہر زمانہ میں قرآن کے مخالف اس کے ماننے والوں کی نسبت تعداد میں بھی زیادہ لے ہے، قوت میں بھی، مگر کسی کی مجال نہیں ہو سکی کہ قرآن کے ایک زبردست فرق پیدا کر سکے، ہاں بدلنے کی ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کر کے بدل دیا جائے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب ہے، اس کے بعد نسخ کا کوئی احتمال نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، یعنی اللہ جل شانہ اس تمام گفت کو کو

سنے ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں، اور سب کے حالات اور اسرار سے واقف ہیں ہر ایک کے عمل کا بدلہ اس کے مطابق دیں گے۔

تیسری آیت میں حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ زمین پر بسنے والے بنی آدم کی اکثریت گمراہی پر ہے، آپ اس سے مرعوب نہ ہوں ان کی باتوں پر کان نہ دھریں قرآن نے متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ، دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُذْمَنَيْنِ، مطلب یہ ہے کہ عادیۃ انسان پر عادی اکثریت کا رعب غالب ہو جاتا ہے، اور ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ:-

”دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں، کیونکہ وہ عقائد و نظریات میں محض خیالات اور اوہام کے پیچھے چلتے ہیں اور احکام میں محض تخمینہ اور اٹکل سے کام لیتے ہیں، جن کی کوئی بنیاد نہیں۔“

خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان کی عادی اکثریت سے مرعوب ہو کر ان کی موافقت کا خیال بھی نہ فرمادیں، کیونکہ یہ سب بے اصول اور بے راہ چلنے والے ہیں، آخر آیت میں فرمایا کہ: ”بالیقین آپ کا رب ان کو خوب جانتا ہے، جو اس کی راہ سے بے راہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ پر چلتا ہے، پس جیسے گمراہوں کو سزا ملے گی، سیدھی راہ والوں کو انعام و اکرام حاصل ہوگا۔“

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۸﴾

سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر ناکارہ لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہو

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ

اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اس جانور میں سے کہ جس پر ناکارہ لیا گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا

لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرُّتُمْ إِلَيْهِ وَارْتَابَ

ہو جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر اور بہت لوگ

کثیراً لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ

بہکاتے پھرتے ہیں اپنے خیالات پر بغیر تحقیق، تیرا رب ہی

هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ط

خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا

إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ﴿۱۲۰﴾

جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب سزا پائیں گے اپنے کئے کی

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرْ أَسْمَاءُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسُّوسٌ ط

اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا اور یہ کھانا گناہ ہے

وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَيُوحِيَنَّ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيَجَادِيَ لَكُمْ وَوَإِنَّ

اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے رفیقوں کے تاکہ وہ تم سے بھگڑا کریں اور اگر

أَلْعَنُوا لَهُمْ إِنَّكُمْ كَمِثْلُهُمْ ﴿۱۲۱﴾

تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے

رَبِّطِ آيَاتِ | اور پر وَ إِنْ تُطِخْ كَيْ الْفَاطِمْ فِي اَهْلِ اضْلَالِ كَيْ اتَّبَاعِ سِے مَطْلَقًا مَنَعِ فَرَمَا يَتَحَا

آگے باقتضائے ایک واقعہ کے ایک خاص امر میں اتباع کرنے سے منع فرماتے ہیں، وہ

خاص واقعہ مذبح و غیر مذبح کی حلت کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو شبہ ڈالنا چاہا

کہ اللہ کے مارے ہوئے جانور کو تو کھاتے نہیں ہو اور اپنے مارے ہوئے یعنی ذبیحہ کو کھاتے ہو،

اخر جہ ابوداؤد والحاکم عن ابن عباسؓ، بعض مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں یہ شبہ نقل کیا اس پر آیاتیں لَمَشْرُكُونَ تَحْ نازل ہوئیں، رواہ ابوداؤد والترمذی عن ابن

عباسؓ کذا فی الباب۔

حاصل جواب یہ ہے کہ تم مسلمان ہو اللہ کے احکام کا التزام کئے ہوئے ہو، اور اللہ تعالیٰ

نے حلال و حرام کی تفصیل بتلا دی ہے، پس اس پر چلتے رہو، حلال پر حرام ہونے کا اور حرام پر

حلال ہونے کا شبہ مست کرو، اور مشرکین کے دساؤں کی طرف التفات نہ کرو۔

اور تحقیق اس جواب کی یہ ہے کہ اصول کے اثبات کے لئے تو دلائل عقلیہ درکار ہیں

اور بعد ثابہ ہو جانے اصول کے اعمال و فروع میں صرف دلائل نقلیہ کافی ہیں، عقلیات کی

ضرورت نہیں، بلکہ بعض اوقات مضر ہے کہ اس سے شبہات کے دروازے کھلتے ہیں، کیوں کہ

فروع میں دلیل قطعی کی کوئی سبیل نہیں، البتہ اگر کوئی طالب حق جو یاے شفاءے قلب ہو اس کے

روبر واقعات و خطابیات کا تبرعاً پیش کر دینا مضائقہ نہیں، لیکن جب یہ بھی نہ ہو بلکہ

مجادلہ ہی ہو تو اپنے کام میں لگنا چاہئے، اور معترض کی طرف التفات نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر معترض کسی شرع کا عقلی قطعی دلیل کے مخالف ہونا ثابت کرنا چاہے تو اس کا جواب بذمہ مدعی حق ہوگا، مگر مشرکین کے شبہ میں اس کا احتمال ہی نہیں، اس لئے اس جواب میں صرف مسلمانوں کو بقاعدہ مذکورہ بالا خطاب ہے، کہ ایسی خرافات پر نظر مت کرو، حق کے معتقد اور عامل رہو، اس بناء پر اس مقام میں مشرکین کے شبہ کا جواب صراحتہً مذکور نہ ہونا محل مشبہ نہیں ہو سکتا، مگر اس پر بھی اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جہاں مَکَلُوا میں ذِکْرَ اسْمِ اللہ اور لَا تَکْفُرُوا میں لَمْ یُنْکَرِ اسْمِ اللہ مذکور ہے، اور یہ عادت سے اور دوسرے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ذِکْرَ اسْمِ اللہ ذبح کے وقت ہوگا اور لَمْ یُنْکَرِ اسْمِ اللہ کے تحقق کی دو صورتیں ہوں گی، عدم ذبح اور عدم ذکر عند الذبح، پس حاصل جواب شبہ کا یہ ہوا کہ حلت کا مدار مجموعہ دو امر کا ہے، ایک ذبح جو نجس خون کو نکال کر نجاست سے پاک کر دیتا ہے، اور وہ نجاست ہی بدیہً ممالحت تھی، دوسرے اللہ کا نام لینا کہ مفید برکت ہے جو کہ حیواناتِ دمیہ میں شرطِ حلت ہے، اور کسی چیز کے وجود کے لئے مانع کا دور کرنا اور شرط کا وجود دونوں امر ضروری ہیں، پس اس مجموعہ سے حلت ثابت ہوگی۔

خلاصہ تفسیر

اور جب اوپر کفار کے اتباع کا مذموم ہونا معلوم ہو گیا (سو جس (حلال) جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شریکت) لیا جاوے اس میں سے (بے تکلف) کھاؤ (اور اس کو مباح و حلال سمجھو) اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ حلال کو حرام جانتا خلاف ایمان ہے) اور تم کو کون امر (از قبیل عقیدہ) اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم ایسے جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شریکت) لیا گیا ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (دوسری آیت میں) ان سب جانوروں کی تفصیل بتلا دی ہے جن کو تم پر حرام کیا ہے، مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جاوے تو حلال ہیں (اور اس تفصیل میں یہ مذکور علی اسم اللہ داخل نہیں پھر اس کے کھانے میں اعتقاداً کیوں انقباض ہوا اور ان لوگوں کے شبہات کی طرف اصلاً التفات نہ کرو کیونکہ) یہ یقینی بات ہے کہ بہت سے آدمی (کہ ان ہی میں سے یہ بھی ہیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی) اپنے غلط خیالات (کی بناء پر) بلا کسی سند کے گمراہ کرتے (پھرتے) ہیں (لیکن آخر کہاں تک خیر منادیں گے) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حد (ایمان) سے نکل جانے والوں کو (جن میں یہ بھی ہیں) خوب جانتا ہے (پس یکبارگی سزا دیگا) اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو (مثلاً حلال کو حرام اعتقاد کرنا

باطنی گناہ ہے جیسا کہ اس کا عکس بھی (بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئی عتقرب (قیامت میں) سزا ملے گی اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر (بطریق مذکور) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو) جیسا کہ مشرکین ایسے جانوروں کو کھاتے ہیں (اور یہ امر (یعنی ماہم پیکر اسم اللہ علیہ کا کھانا) بے حکمی ہے (غرض نہ ترک میں اُن کا اتباع کرو اور نہ فعل میں) اور (ان لوگوں کے شبہات اس لئے قابل التفات نہیں کہ) یقیناً شیاطین (جن) اپنے (ان) دوستوں (اور پیرووں) کو (یہ شبہات) تعلیم کر رہے ہیں تاکہ یہ تم سے (بیکار) جدال کریں (یعنی اول تو یہ شبہات نص کے خلاف دوسرے غرض محض جدال اس لئے قابل التفات نہیں) اور اگر تم (خدا نخواستہ) ان لوگوں کی اطاعت (عقائد یا افعال میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ (کہ خدا کی تعلیم پر دوسرے کی تعلیم کو ترجیح دو جہاں برابر سمجھنا بھی شرک ہے، یعنی ان کی اطاعت ایسی بُری چیز ہے اس لئے اس کے مقدمات یعنی التفات سے بھی بچنا چاہئے)

معارف و مسائل

مَا ذِکْرَ اسْمِ اللّٰهِ عَلَیْہِ میں ذبحِ ختیاہی اور ذبحِ اضطراری یعنی تیرہ باز اور کتے کا شکار جبکہ اس کے چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھی جاوے، اور ذکر حقیقی و ذکر حکمی سب داخل ہے، پس امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس پر بسم اللہ ہو اترک کر دی جائے وہ حکماً مَا ذِکْرَ اسْمِ اللّٰهِ عَلَیْہِ میں داخل ہے، البتہ عمدتاً ترک کرنے سے امام صاحب کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔

اَوْ مَن كَانَ مَيِّتًا فَاحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ نُورًا اَبَدِيًّا فِي

بھلا ایک شخص جو کہ مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو دی روشنی کہ لُو پھر تاہو

النَّاسِ كَمَنْ مِّثْلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط

اس کو لوگوں میں برابر ہو سکتا ہو اس کے کہ جن کا حال یہ ہو کہ پڑا ہوا اندھیروں میں وہاں سے نکل نہیں سکتا،

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۲)

اسی طرح مزین کر دیئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام ؛ ؛ ؛

خلاصہ تفسیر

ایسا شخص جو کہ پہلے مُردہ (یعنی گمراہ) تھا پھر ہم نے اس کو زندہ (یعنی مسلمان) بنا دیا

اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایات دیدیں جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفہ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے، اس عالم میں زمین پانی اور ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند سورج اور مکمل ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں اور یہی اداء فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے، پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا وغیرہ چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے، تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی، کیونکہ اس نے اپنے مقصد زندگی کو چھوڑ دیا، تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہو گئی تمام کائنات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک انسان جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو اس بات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو گا کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے، اور یہ کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر رہا ہے، تو وہ زندہ کہلائے گا، سچی ہے، اور اس کو پورا نہیں کرتا تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

اب سوچنا یہ ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا اور اس کے فرائض کیا ہیں، اور مذکورہ صدر اصول کے مطابق یہ متعین ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد زندگی اور ڈیوٹی کو ادا کر رہا ہے تو زندہ ہو، ورنہ مردہ کہلائے گا سچی ہے، جن بے بصیرت لوگوں نے انسان کو دنیا کی ایک خود رو گھاس یا ایک ہوشیار قسم کا جانور قرار دیدیا ہے اور ان کے نزدیک ایک انسان اور گدھے کتے میں کوئی امتیاز نہیں، ان سب کا مقصد زندگی انھوں نے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، پھر مرجانا ہی قرار دے لیا ہے، وہ تو اہل عقل و شعور کے نزدیک قابل خطاب نہیں، عقلاً دنیا خواہ کسی مذہب و ملت اور کسی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں ابتداءً علم سے آج تک انسان کے مخدوم کائنات اور فضل المخلوقات ہونے پر متفق چلے آئے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ افضل و اعلیٰ اسی چیز کو سمجھا اور کہا جاسکتا ہے جس کا مقصد زندگی اعلیٰ و افضل ہونے کے اعتبار سے ممتاز ہو، اور ہر سمجھ بوجھ والا انسان یہ بھی جانتا ہے کہ کھانے پینے، سونے جاگنے، رہنے سہنے، اوڑھنے پہننے میں انسان کو دوسرے جانوروں سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں، بلکہ بہت سے جانور اس سے بہتر اور اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں، اس سے بہتر قدرتی لباس میں ملبوس ہیں، اس سے بہتر ہوا و فضا میں رہتے بستے ہیں، اور جہاں تک اپنے نفع نقصان کے پہچاننے کا معاملہ ہے اس میں بھی ہر جانور بلکہ ہر درخت ایک حد تک با شعور ہے، مفید چیزوں کے حاصل کرنے اور مضر چیزوں سے بچنے کی خاصی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے،

اسی طرح دوسروں کے لئے نفع رسانی کے معاملہ میں تو تمام حیوانات اور نباتات کا قدم بظاہر ہر انسان سے بھی آگے نظر آتا ہے، کہ ان کے گوشت، کھال، ہڈی، پٹھے اور درختوں کی جڑ سے لیکر شاخوں..... اور پتوں تک ہر چیز مخلوق کے لئے کارآمد اور ان کی ضروریات زندگی پیدا کرنے میں بے شمار فوائد کی حامل ہے، بخلاف انسان کے کہ نہ اس کا گوشت کسی کے کام آتا ہے نہ کھال، نہ بال نہ ہڈی نہ پٹھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان حالات میں پھر حضرت انسان کس بنا پر مخدوم کائنات اور فضل المخلوقات ٹھہرتے ہیں، اب حقیقت شناسی کی منزل قریب آپہنچی... اور اس غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں کے عقل و شعور کی رسائی صرف موجودہ زندگی کے وقتی اور ہنگامی نفع نقصان تک ہی، اور اسی زندگی میں وہ دوسروں کے لئے فائدہ بخش نظر آتی ہے، اس دنیا کی زندگی سے پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا آنے والا ہے، اس میدان میں جمادات نباتات تو کیا کسی بڑے سے بڑے ہوشیار جانور کی عقل و شعور بھی کام نہیں دیتی، اور نہ اس میں ان میں ان میں سے کوئی چیز کسی کیلئے کارآمد یا مفید ہو سکتی ہے، بس یہی وہ میدان ہے جن میں مخدوم کائنات اور فضل المخلوقات انسان کو کام کرنا ہے، اور اسی سے اس کا امتیاز دوسری مخلوقات سے واضح ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد زندگی پورے عالم کی ابتداء و انتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لئے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بُری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت و سکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے، اور جب انسان کا مقصد زندگی اور کمال انسانی کا یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بنکر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صورت وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء و انتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع و نقصان کو وحی الہی کی روشنی میں پہچانے کیونکہ نری عقل انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو متحرک کیا ہے نہ کر سکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء و حکماء اور فیلسوفانِ عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

زیر کانِ مومشگانِ دہی

کردہ ہر حشر طوم خطِ الہی

اور جب مقصد زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہی جو حی الہی کا تابع اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہو گیا کہ جو ایسا نہیں وہ مردہ کہلانے کا مستحق ہی، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ۵

زندگی از بہر طاعت و بندگی است ؛ بے عبادت زندگی مشر مندگی است
آدمیت لحم و شحم و پوست نیست ؛ آدمیت جز رضائے دوست نیست
یہ قرآنی مثال تھی مومن و کافر کی کہ مومن زندہ اور کافر مردہ ہے، دوسری مثال ایمان و کفر کی نور و ظلمت کے ساتھ دی گئی ہے۔

ایمان نور اور کفر ظلمت | ایمان کو نور اور کفر کو ظلمت اور اندھیری قرار دیا گیا ہے، ذرا غور کیا جائے تو یہ مثال بھی کوئی خیالی مثال نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے، یہاں بھی روشنی اور اندھیری کے اصل مقصد پر غور کیا جائے تو حقیقت سامنے آجائے گی کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نزدیک و دور کی ہشیا کو دیکھ سکیں جس کے نتیجے میں مضر چیزوں سے بچنے اور مفید کو اختیار کرنے کا موقع ملے۔

اب ایمان کو دیکھو کہ وہ ایک نور ہے جس کی روشنی تمام آسمانوں اور زمین اور ان سب کے باہر کی تمام چیزوں پر حاوی ہے، صرف یہی روشنی پورے عالم کے انجام اور تمام امور کے صحیح نتائج کو دکھا سکتی ہے، جس کے ساتھ یہ نور ہو تو وہ خود بھی تمام نقصان دہ و مضر چیزوں سے بچ سکتا ہے، اور دوسروں کو بھی بچا سکتا ہے، اور جس کو یہ روشنی حاصل نہیں وہ خود اندھیرے میں ہے، مجموعہ عالم اور پوری زندگی کے اعتبار سے کیا چیز نافع ہے کیا مضر اس کا وہ کوئی امتیاز نہیں کر سکتا، صرف پاس پاس کی چیزوں کو ٹٹول کر کچھ پہچان سکتا ہے، موجودہ دنیا کی زندگی یہی آس پاس کا ماحول ہے، کافر اس زندگی اور اس کے نفع نقصان کو تو پہچان لیتا ہے، مگر بعد میں آنے والی دائمی زندگی کی اس کو کچھ خبر نہیں، نہ اس کے نفع و ضرر کا اسے کچھ ادراک ہے، قرآن کریم نے اسی مضمون کے لئے ارشاد فرمایا ہے:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ، یعنی یہ لوگ ظاہری دنیاوی زندگی اور اس کے کھرے کھوٹے کو تو کچھ پہچانتے ہیں، مگر عالم آخرت سے قطعاً غافل ہیں۔

دوسری ایک آیت میں پھلی منکر اور کافرا متوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے فرمایا ہے: وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ، یعنی آخرت کے معاملہ میں ایسی شدید غفلت اور بے عقلی برتنے والے اس دنیا میں بیوقوف نادان نہ تھے، بلکہ مستبصرین، یعنی روشن خیال لوگ تھے، مگر یہ ظاہری سطحی روشن خیالی صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کے سنوارنے ہی میں کام دے سکتی تھی

آخرت کی دائمی زندگی میں اس نے کچھ کام نہ دیا۔

اس تفصیل کو سننے کے بعد قرآن مجید کی آیت مذکور کو پھر ایک مرتبہ پڑھ لیجئے :

أَوَمَنْ كَانَ مِثْلًا فَاَجِئْتَهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، مَطْلَبُ يَهْ بِهْ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا، مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو پہلے مردہ یعنی کافر تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا، یعنی مسلمان بنا دیا، اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور یعنی ایمان دیدیا جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں میں پھرتا ہے، اس شخص کی برابر ہو سکتا ہے جس کی مثال ایسی ہے کہ وہ قسم قسم کی اندھیروں میں گھرا ہوا ہے، جس سے نکلنے نہیں پاتا، یعنی کفر کی اندھیروں میں مبتلا ہے، وہ خود ہی اپنے نفع نقصان کو نہیں پہچانتا، اور ہلاکت سے نہیں بچ سکتا دوسروں کو کیا نفع پہنچا سکتا ہے۔

نور ایمان کا فائدہ دوسروں | اس آیت نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ فرما کر اس طرف بھی ہدایت کر دی گئی ہے کہ نور ایمان صرف کسی مسجد یا خالقہ یا گوشہ و حجرہ کے ساتھ مخصوص نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور دیا ہے وہ اس کو لے کر سب جگہ لوگوں کے رزم و رُخا میں لئے پھرتا ہے، اور ہر جگہ اس روشنی سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے، نور کسی ظلمت سے دب نہیں سکتا، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی اندھیرے میں مغلوب نہیں ہوتا، ہاں اس کی روشنی دور تک نہیں پہنچتی، تیز روشنی ہوتی ہے تو دور تک پھیلتی ہی، کم ہوتی ہے تو تھوڑی جگہ کو روشن کرتی ہے، مگر اندھیری پر بہر حال غالب ہی رہتی ہے، اندھیری اس پر غالب نہیں آتی، وہ روشنی ہی نہیں جو اندھیری سے مغلوب ہو جائے، اسی طرح وہ ایمان ہی نہیں جو کفر سے مغلوب یا مرعوب ہو جائے، یہ نور ایمان انسانی زندگی کے ہر شعبہ ہر حال ہر دور میں اس کے ساتھ ہے۔

اسی طرح اس مثال میں ایک اور اشارہ یہ بھی ہے کہ جس طرح روشنی کا فائدہ ہر انسان و حیوان کو ارادہ دے ارادہ ہر حال میں کچھ نہ کچھ پہنچتا ہے، فرض کرو کہ نہ روشنی والا پہنچتا ہو کہ دوسرے کو فائدہ پہنچے، نہ دوسرا یہ قصد کر کے نکلا ہے کہ اس کی روشنی سے مجھے فائدہ پہنچے، مگر جب روشنی کسی کے ساتھ ہوگی تو اس سے جبری اور قدرتی طور پر سب کو ہی فائدہ پہنچے گا، اسی طرح مومن کے ایمان سے دوسروں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے، خواہ اس کو احساس ہو یا نہ ہو، آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّ لِلَّذِي ظَلَمَ لِنَفْسِهِ مِنْ اَعْمَالٍ لَّبَاءٌ لَّهَا سَاقَاتٌ مِّنَ النَّارِ وَهُمْ فِيهَا كَالْعِجَلِ الْغُرَىٰ، یعنی ان واضح کھلے ہوئے دلائل کے باوجود منکرین اور کفار جو بات کو نہیں مانتے اس کی وجہ یہ ہو کہ ہر کس بخیاں خواہ خبطے دار و شیطان اور نفسانی خواہشات نے انکی نظروں میں انکے بُرے اعمال ہی کو خوبصورت اور بھلا بنا رکھا ہو

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرًا مَّجْرِمِيهَا لِيَسْأَلُوا فِيهَا

اور اسی طرح کہے ہیں ہم نے ہر بستی میں گناہگاروں کے سردار کہ چیلے کیا کریں وہاں

وَمَا يَسْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ (۱۲۳) وَإِذَا جَاءَهُمْ

اور جو چیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے ، اور جب آتی ہر ان کے

آيَةً قَالُوا الْبَشَرُ لَشَيْءٌ مُّثَلُ مَا أُوتِيَ رُسُلُ

پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ نہ دیا جائے ہم کو جیسا کچھ کہ دیا گیا ہو

اللَّهُ ۚ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ

اللہ کے رسولوں کو، اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو جہاں بھیجے اپنے پیغام ، عنقریب پہنچے گی

أَجْرُمُوا صَفَارًا عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ لِّمَا كَانُوا

گناہگاروں کو ذلت اللہ کے ہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ

يَكْفُرُونَ ۝ (۱۲۴) فَمَنْ يُّرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ

مکر کرتے تھے ، سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہر اس کے سینہ کو

لِلْإِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّهُ يَشْغَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا

واسطے قبول کرنے اسلام کے اور جس کو چاہتا ہو کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ

حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ

بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہو آسمان پر اسی طرح ڈالے گا اللہ

الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۲۵)

عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر

خلاصہ تفسیر

اور دیہ کوئی نئی بات نہیں، جس طرح مکہ کے رؤساء ان جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں

اور ان کے اثر سے دوسرے لوگ شامل ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہم نے (پہلی امتوں میں بھی)

ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو (اڈل) جرائم کا مرتکب بنایا، (پھر ان کے اثر سے اور عوام

بھی ان سے مل گئے) تاکہ وہ لوگ وہاں (انبیاء کو ضرر پہنچانے کے لئے) شراکتیں کیا کریں،

(جن سے ان کا مستحق سزا ہونا خوب ثابت ہو جاوے) اور وہ لوگ (گولپے خیال میں

دوسروں کو ضرر پہنچاتے ہیں لیکن واقع میں، اپنے ہی ساتھ شرارت کر رہے ہیں (کیونکہ اس کا وبال تو انہی کو بھگتنا پڑے گا) اور (غایت جہل سے) ان کو اس کی ذرا خبر نہیں اور ان کفار مکہ کا جرم یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو ربا و جود اس کے کہ وہ اپنے اعجاز کی وجہ سے دلالت علیٰ نسبتہ میں کافی ہوتی، مگر یہ لوگ پھر بھی، یوں کہتے ہیں کہ ہم (ان نبی پر) ہرگز ایمان نہ لاویں گے، جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے (یعنی وحی و خطاب یا صحیفہ و کتاب جس میں ہم کو آپ پر ایمان لانے کا حکم ہو، اور اس قول کا جرم عظیم ہونا ظاہر ہے کہ تکذیب اور عناد اور استکبار اور گستاخی سب اس کا جامع ہے، آگے اللہ تعالیٰ اس قول کو رد فرماتے ہیں کہ) اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام (وحی کے ذریعہ سے) بھیجتا ہے (کیا ہر کس و ناکس اس شرف کے قابل ہو گیا؟) تاں نجد خدا سے بخشنده آگے اس جرم کی سزا کا بیان ہے کہ (عنقریب ان لوگوں کو جھوٹوں نے یہ جرم کیا ہے خدا کے پاس پہنچ کر) یعنی آخرت میں، ذلت پہنچے گی (جیسا انھوں نے اپنے کونبی کے مقابلہ میں عزت و نبوت کا مستحق سمجھا تھا) اور سزا سے سخت (ملے گی) ان کی شرارتوں کے مقابلہ میں سو (اور جو مومن و کافر کا حال مذکور ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ) جس شخص کو اللہ تعالیٰ (نجات کے) راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب) کو اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں (کہ اس کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا اور وہ فوراً مذکور یہی ہے) اور جس کو (تکویناً و تقدیراً) بے راہ رکھنا چاہو ہیں اس کے سینہ (یعنی قلب) کو (اسلام کے قبول کرنے سے) تنگ (اور) بہت تنگ کر دیتے ہیں (اور اس کو اسلام لانا ایسا مصیبت نظر آتا ہے) جیسے کوئی (فرض کر دے) آسمان میں چڑھنا چاہتا ہو (اور چڑھا نہیں جاتا اور جی تنگ ہوتا ہے اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے) پس جیسا اس شخص سے چڑھا نہیں جاتا) اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر (چونکہ ان کے کفر اور شرارت کے سبب) پھٹکار ڈالتا ہے (اس لئے ان سے ایمان نہیں لایا جاتا) ۛ

معارف و مسائل

پچھلی آیت کے آخر میں یہ ذکر تھا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں جس طرح اچھے اور نیک اعمال کے ساتھ کچھ محنت و مشقت لگی ہوئی ہے ان کی راہ میں یہاں رکاوٹیں پیش آتی ہیں اسی طرح بُرے اعمال کے ساتھ چند روزہ نفسانی لذات اور خواہشات کا ایک فریب

ہوتا ہے جو حقیقت اور انجام سے غافل انسان کی نظر میں اُن بُرے اعمال ہی کو مزین کر دیتا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے ہوشیار اس میں مستلزم ہو جاتے ہیں۔

کیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس کا بیان ہے کہ اسی امتحان اور آزمائش کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ ابتداء عالم سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ہر بستی کے رئیس و مالدار اور بڑے لوگ ہی حقیقت اور انجام سے غافل چند روز کی فانی لذتوں میں مست ہو کر جہرا ستم کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، اور عوام کی عادت یہ ہوتی ہے کہ بڑے لوگوں کے پیچھے چلنے اور ان کی نقل اتارنے ہی کو اپنی سعادت اور کامیابی سمجھتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء و مشائخ جو اُن کو ان کے بُرے اعمال سے روکنا اور اس کے انجام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، یہ بڑے لوگ ان کے خلاف طرح طرح کی شرارتیں کیا کرتے ہیں، جو ظاہر میں تو ان بزرگوں کے خلاف شرارتیں اور سازشیں اور ان کی دل آزاری کا سامان ہوتا ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے ان سب کا وبال خود انہی کی طرف لوٹتا ہے، اور اکثر دنیا میں بھی اس کا ظہور ہو جاتا ہے۔

اس ارشاد میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑوں اور رئیسوں و مالداروں کی رئیس نہ کریں، ان کے پیچھے چلنے کی عادت چھوڑیں، انجام بدی کو شعار بنائیں اور پھلے بُرے کو خود پہچانیں۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دینا مقصود ہے کہ رؤسائے قریش جو آپ کی مخالفت پر لگے ہوئے ہیں اس سے آپ دل گیر نہ ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے انبیاء علیہم السلام کو بھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے، اور انجام کار وہ رسوا اور ذلیل ہوئے اور اللہ کا کلمہ بلند ہوا۔

دوسری آیت میں انہی قریشی سرداروں کی ایک ایسی گفتگو کا ذکر ہے جو حق کے مقابلہ میں محض ہٹ دھرمی اور استہزاء و تمسخر کے انداز میں تھی، پھر اس کا جواب دیا گیا۔

امام بخاریؒ نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش کے سب سے بڑے سردار ابو جہل نے ایک مرتبہ کہا کہ بنو عبد مناف (یعنی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) سے ہم نے ہر محاذ پر مقابلہ کیا جس میں کبھی ہم ان سے پیچھے نہیں رہے، لیکن اب وہ یوں کہتے ہیں کہ تم شرافت و بزرگی میں ہمارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہمارے خاندان میں ایک نبی آئے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، پھر کہا کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم کبھی ان کا اتباع نہ کریں گے، جب تک خود ہمارے پاس ایسی ہی وحی نہ آنے لگے، جیسی اُن کے پاس آتی ہے، آیت مذکورہ میں وَإِذَا جَاءَهُمْ أَيْدِيُكَ قَالَُوا لَنْ نُّؤْمِنَ بِكَ نُوْنِي

مِثْلَ مَا أُوتِيَ رَسُولُ اللَّهِ كَإِذَا هُوَ مُطْلَبٌ هُوَ۔

نبوت و رسالت کسی اور اختیاری قرآن کریم نے یہ قول نقل کرنے کے بعد جواب دیا، اللہ اعلم نہیں، بلکہ ایک عہدہ ہے جس کے عطا کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

خاندانی شرافت یا قوم کی سرداری اور مالداری کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، حالانکہ نبوت اللہ تعالیٰ کی خلافت کا عہدہ ہے جس کا حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں، کتنے ہی کمالات حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی اپنے اختیار سے یا کمال کے زور سے نبوت و رسالت حاصل نہیں کر سکتا وہ خالص عطاء حق جل شانہ ہے، وہ جس کو چاہتے ہیں عطا فرمادیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ رسالت و نبوت کوئی کسی اور اختیار پر چیز نہیں جس کو علمی، عملی کمالات یا مجاہدہ و ریاضت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا جاسکے، کوئی شخص مقامات و ولایت میں کتنی ہی اونچی پرواز کر کے بھی نبوت حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ محض فضل خداوندی ہے جو خداوندی علم و حکمت کے ماتحت خاص بندوں کو دیا جاتا ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ کے علم میں یہ مقام اور عہدہ دینا منظور ہوتا ہے اس کو شروع ہی سے اس کے قابل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے اس کے اخلاق و اعمال کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا سَبِّحْ لِلَّهِ الَّذِينَ آجَرُوا صَغَارٌ عِندَ اللَّهِ وَ عِندَ آبَائِهِمْ كَأَنَّهُمْ كُفَرُوا اس میں لفظ صغار، حاصل مصدر ہے جس کے معنی میں ذلت و رسوائی، معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ یہ حق کے مخالف جو آج اپنی قوم میں بڑے اور رئیس کہلاتے ہیں عنقریب ان کی بڑائی اور عزت خاک میں ملنے والی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے پاس سخت ذلت و رسوائی پہنچنے والی ہے، اور سخت عذاب ہونے والا ہے۔

اللہ کے پاس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کے روز جب یہ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تو ذلیل و خوار ہو کر حاضر ہوں گے، اور پھر ان کو سخت عذاب دیا جائے گا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ اس وقت ظاہر میں یہ بڑے عزت دار اور رئیس ہیں لیکن اللہ کی طرف سے ان کو سخت ذلت و رسوائی پہنچنے والی ہے، وہ دنیا میں بھی ہو سکتی ہے اور آخرت میں بھی، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کے متعلق دنیا کی تاریخ میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے، کہ انجام کار ان کے مخالفین دنیا میں بھی ذلیل ہوئے، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے مخالفین جو اپنی عزت کی ڈینگ مارا کرتے تھے، ایک ایک کر کے یا تو دائرہ

اسلام میں داخل ہو گئے، اور جو نہ ہوئے تو ذلیل و خوار ہو کر ہلاک ہوئے، ابو جہل، ابو لہب وغیرہ قریشی سرداروں کا حال دنیا کے سامنے آ گیا، اور فتح مکہ نے ان سب کی کمزریاں توڑ دیں۔

دین میں شرح صدر اور اس کی علامات | تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پانے والوں اور گمراہی پر جے رہنے والوں کے کچھ حالات اور علامات بتلائی گئی ہیں، ارشاد فرمایا:

فَمَنْ يُّرِيدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيْهِ يَسِّرْهُ يَسِّرْهُ صَدَقَ سِرُّهُ لِّلَّذِيْ سَلَٰمٌ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سبب اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں۔

حاکم نے مستدرک میں اور سیوطی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

شرح صدر یعنی سبب اسلام کے لئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

مؤمن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں، جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور

قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے (حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلاف حق

سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی

ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے جس کو شرح صدر حاصل ہو گیا ہے؟ فرمایا ہاں! علامت

یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے، دنیا

کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت

کی تیاری کرنے لگتا ہے، پھر فرمایا وَمَنْ يُّرِيدِ اَنْ يُّضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا

كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ، یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا

دل تنگ اور سخت تنگ کر دیتے ہیں، اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا

ایسا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان میں چڑھنا۔

امام تفسیر کلبی نے فرمایا کہ اس کا دل تنگ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حق

اور بھلائی کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا۔ یہ مضمون حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی منقول

ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت

ہونے لگتی ہے، اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کو دین میں شرح صدر | یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کو حق تعالیٰ

حاصل تھا، اس لئے شکوک و شبہات نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور بلا واسطہ شاگردی

کے لئے منتخب فرمایا تھا ان کو اسلامی احکام میں شبہات

اور دسادمس کم سے کم پیش آئے، ساری عمر میں صحابہ کرامؓ نے جو سوالات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے پیش کئے گئے وہ چنے چنیدہیں، وجہ یہ تھی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا گہرا نقش ان کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا، جس کے سبب ان کو شرح صدر کا مقام حاصل تھا ان کے قلوب خود بخود حق و باطل کا معیار بن گئے تھے، حق کو آسانی کے ساتھ فوراً قبول کرتے اور باطل ان کے دلوں میں راہ نہ پاتا تھا، پھر جوں جوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دوری ہوتی چلی گئی، شکوک و شبہات نے راہ پانی شروع کی، عقائد کے اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

شکوک و شبہات کے دور کرنے کا اصلی طریقہ بحث و مباحثہ نہیں شرح صدر کی تحصیل ہوئی ہے، اور بحث و مباحثہ کی راہ سے اس کو حل کرنا چاہیے

ہے جو اس کا صحیح راستہ نہیں ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں اور ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سہرا ملتا نہیں راستہ وہی ہے جو صحابہ کرام اور اسلاف امت نے اختیار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور ان کے انعام کا احتضار کر کے اس کی عظمت و محبت دل میں پیدا کی جائے، تو شبہات خود بخود کا فور ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي، یعنی اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے آخر آیت میں فرمایا كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ، یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈال دیتا ہے، اور حق بات ان کے دل میں نہیں اُترتی، اور ہر بُرائی اور بیہودگی کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں۔

وَهَذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ

اور یہ ہر راستہ تیرے رب کا سیدھا ہم نے واضح کر دیا نشانیوں کو غور

يَذْكُرُونَ ﴿١٢٩﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ

کریموں کی واسطے اپنی کے لئے ہر سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے

بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٠﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا لِّمَعْشَرٍ

بہ سبب ان کے اعمال کے اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو فرمائے گا اے جماعت

الْجِنِّ قَدْ اسْتَكْبَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ وَقَالَ أَوْلِيَهُمْ مِنَ الْإِنْسِ

جنات کی تم نے بہت کچھ تاج کر لئے اپنے آدمیوں میں سے اور کہیں گے ان کے دوستدار آدمیوں میں

رَبَّنَا اسْمِمْ بَعْضَنَا بِبَعْضٍ وَبَلَّغْنَا آجَلَنَا الَّذِي أَجَلْتَ لَنَا

اے رب ہمارے کام نکالا ہم میں ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا

قَالَ النَّارُ مَثْوً لَّكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ

فرما دیگا آگ ہو گھر تمہارا رہا کرو گے اسی میں مگر جب چاہے اللہ البتہ تیرا رب

حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۸﴾

حکمت والا خبردار ہے

خلاصہ تفسیر

اور (اوپر جو اسلام کا ذکر ہو تو) یہی (اسلام) تیرے رب کا (بتلایا ہوا) سیدھا راستہ ہو جس پر چلنے سے نجات ہوتی ہے، جس کا ذکر تم پر اللہ آن ہیڈینے میں ہے، اور اسی صراطِ مستقیم کی توضیح کے لئے، ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صفاتِ صاف بیان کر دیا ہے، جس سے وہ اس کے اعجاز سے اس کی تصدیق کریں اور پھر اس کے مضامین پر عمل کر کے نجات حاصل کریں، یہی تصدیق و عمل صراطِ مستقیمِ کامل ہے، بخلاف اُن کے جن کو نصیحت حاصل کرنے کی فکر نہیں اُن کے واسطے نہ یہ کافی نہ دوسرے دلائل کافی، آگے ان ماننے والوں کی جزا کا ذکر ہے، جیسا کہ ماننے والوں کی سزا اور پرکشی جہنم میں مذکور ہو پس ارشاد ہے کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس (بیچ کر) سلامتی (یعنی امن و بقا) کا گھر (یعنی جنت) ہے اور اللہ ان سے نجات رکھتا ہے۔ ان کے اعمال (حسنہ) کی وجہ سے اور وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے، جس روز اللہ تعالیٰ تمام خلایق کو جمع کریں گے اور ان میں سے بالخصوص کفار کو حاضر کر کے ان میں جو شیاطین الجن ہیں ان سے تو بیجا کہا جاوے گا کہ اے جماعتِ جنات کی تم نے انسانوں کے گمراہ کرنے میں بڑا حصہ لیا اور ان کو خوب بہکایا اسی طرح انسانوں سے پوچھا جاوے گا اَلَمْ نَعْمِدْكُمْ يٰ بَنِي آدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ اِنَّهُ غَرَضُ شَيْطَانٍ الْجَنُّ بھي اقرار کریں گے اور جو انسان ان شیاطین جن کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے وہ (بھی اقرار) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! آپ صحیح فرماتے ہیں واقعی ہم میں ایک نے دوسرے سے اس ضلال و اضلال کے باب میں نفسانی فائدہ حاصل کیا تھا (چنانچہ گمراہ انسانوں کو اپنے عقائد کفریہ و شرکیہ میں لذت آتی ہے اور گمراہ کنندہ شیاطین کو اس سے حظ ہوتا ہے کہ ہمارا کہنا چل گیا) اور (فی الحقیقت ہم ان کے بہکانے سے قیامت کے منکر تھے، لیکن وہ انکار غلط ثابت ہوا، چنانچہ) ہم اپنی اس معین میعاد تک آپہنچے جو آپ نے ہمارے لئے معین فرمائی، (یعنی قیامت آگئی) اللہ تعالیٰ (سب کفار جن و انس سے) فرما دیں گے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو گے، (کوئی نکلنے کی سبیل و تدبیر نہیں)

ہاں! اگر خدا ہی کو ذکر کرنا منظور ہو تو دوسری بات ہے (لیکن یہ یقینی ہے کہ خدا بھی نہیں چاہے گا اس کو ہمیشہ رہا کر دے) بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا اور بڑا علم والا ہے (علم سے سب کے جرائم معلوم کرتا ہو اور حکمت سے مناسب سزا دیتا ہے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا وَهَذَا صِرَاطٌ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا، یعنی راستہ تیرے رب کا ہے سیدھا۔ اس میں لفظ ہذا سے بقول ابن مسعود قرآن کی طرف اور بقول ابن عباس اسلام کی طرف اشارہ ہے (روح) معنی یہ ہیں کہ یہ قرآن یا شریعت اسلام جو آپ کو دی گئی ہے یہ راستہ آپ کے رب کا ہے، یعنی ایسا راستہ ہے جس کو آپ کے پروردگار نے اپنی حکمت بالغہ سے تجویز فرمایا اور اس کو پسند کیا ہے، اس میں راستہ کی اضافت و نسبت پروردگار کی طرف کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ قرآن اور اسلام کا جو دستور العمل آپ کو دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا کچھ اللہ تعالیٰ کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ عمل کرنے والوں کے فائدہ کے لئے شان پروردگاری کے تقاضہ کی بنا پر ہے اس کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت کرنا مقصود ہے جو اس کی دائمی فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔

پھر اس میں لفظ رب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے آپ پر ایک خاص لطف و عنایت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پروردگار نے یہ راستہ تجویز فرمایا ہے، اس نسبت کا لطف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک بندہ کو اپنے رب اور معبود کی طرف کوئی ادنیٰ نسبت حاصل ہو جانا بھی اس کے لئے انتہائی فخر کی چیز ہے، اور اگر رب الارباب اور معبود کائنات اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرے کہ میں تیرا ہوں تو اس کی قسمت کا کیا کہنا، حضرت حسن نظامیؒ اسی مقام سے فرماتے ہیں ۵

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بند تو ام و تو بزبان خود بگو کہ بندہ نواز کیستی

اس کے بعد اس قرآنی راستہ کا یہ حال لفظ مُسْتَقِيمًا سے بیان کیا گیا کہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے، اس میں بھی مستقیم کو صراط کی صفت کے طور پر لانے کے بجائے حال کے طریقے سے ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو راستہ پروردگار عالم کا تجویز کیا ہوا ہے، اس میں بجز مستقیم اور سیدھا ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا (روح و بحر)

اس کے بعد فرمایا قَدْ فَصَّلْنَا آيَاتِ لِقَوْمٍ يَكُونُ لَہُمْ نَصِیۡتٌ قَبُولُ كَرۡنَہِ وَالۡوَنۡ كَہِ دَاسۡطَہِ اَنۡ اَیۡتۡوَنۡ كَوَصَافۡ صَافۡ بَیۡاَنۡ كَرۡدِیۡا ہِے۔

فَصَلِّتُمْ تَفْصِيلًا سے بنا ہے، تفصیل کے اصلی معنی یہ ہیں کہ مضمون کا تجزیہ کر کے ایک ایک فصل کو الگ الگ بیان کیا جائے، اس طریقہ پر پورا مضمون ذہن نشین ہو جاتا ہے، اس لئے تفصیل کا حاصل صاف صاف بیان کرنا ہو گیا، مطلب یہ ہے کہ ہم نے بنیادی اور اصولی مسائل کو صاف صاف تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جس میں کوئی اجمال یا ابہام باقی نہیں چھوڑا، اس میں یَقُومُ بَيْنَ كُرُوحٍ فرما کر یہ بتلادیا کہ اگرچہ قرآنی ارشادات بالکل واضح اور صاف ہیں، لیکن اُن سے فائدہ اہنی لوگوں نے اٹھایا جو نصیحت حاصل کرنے کے قصد سے قرآن میں غور کرتے ہیں، ضد اور عناد یا آبائی رسوم کی تقلید جامد کے پردے ان کے درمیان حائل نہیں ہوتے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا اَلْهَمَّ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ، یعنی جن لوگوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قرآنی ہدایتوں کو خالی الذہن ہو کر نصیحت حاصل کرنے کے لئے دیکھتے اور سنتے ہیں، اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اُن ہدایتوں کو قبول کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اَلْهَمَّ دَارُ السَّلَامِ موجود اور محفوظ ہے، اس میں لفظ دار کے معنی گھر اور سلام کے معنی تمام آفتوں، مصیبتوں اور محنتوں سے سلامتی کے ہیں، اس لئے دار السلام اس گھر کو کہا جاسکتا ہے جس میں کسی تکلیف و مشقت اور بے دغم اور آفت و مصیبت کا گزرنہ ہو، اور وہ ظاہر ہے کہ جنت ہی ہو سکتی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سَلَامُ اللہ جل شانہ کا نام ہے، اور دار السلام کے معنی ہیں اللہ کا گھر اور ظاہر ہے کہ اللہ کا گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتی ہے، اس لئے حاصل معنی پھر بھی یہی ہو گئے کہ وہ گھر جس میں ہر طرح کا امن و سکون اور سلامتی و اطمینان ہو، جنت کو دار السلام فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت ہی صرف وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کی تکلیف، پریشانی اور اذیت اور ہر خلافت طبع چیز سے مکمل اور دائمی سلامتی حاصل ہوتی ہے جو دنیا میں نہ کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو کبھی حاصل ہوئی اور نہ بڑے سے بڑے نبی و رسول کو، کیونکہ دنیا سے فانی کا یہ علم ایسی مکمل اور دائمی راحت کا مقام ہی نہیں۔

اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان نیک بخت لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس دار السلام ہے، رب کے پاس ہونے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ دار السلام یہاں نقد نہیں ملتا بلکہ جب وہ قیامت کے روز اپنے رب کے پاس جائیں گے اس وقت ملے گا، اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ دار السلام کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا، رب کریم اس کا ضامن ہے وہ اس کے پاس محفوظ رکھتا اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دار السلام کی نعمتوں اور راحتوں کو آج کوئی قصور میں بھی نہیں لاسکتا، رب ہی جانتا ہے جس کے پاس یہ خزانہ محفوظ ہے۔

اور اس دوسرے معنی کی رو سے اس دار السلام کا ملنا قیامت اور آخرت پر موقوف نہیں

معلوم ہوتا، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رب کریم جسکو چاہیں اسی عالم میں دارالسلام نصیب کر سکتے ہیں، کہ تمام آفات اور مصائب سے امن نصیب فرمادیں، خواہ اس طرح کہ دنیا میں کوئی آفت و مصیبت ہی ان کو نہ پہنچے جیسا کہ انبیاء سابقین اور اولیاء اللہ میں اس کی بھی نظائر موجود ہیں، اور یا اس طرح کہ نعمائے آخرت کو ان کے سامنے مستحضر کر کے ان کی نگاہ کو ایسا حقیقت شناس بنادیا گیا جس سے دنیا کی چند روزہ تکلیف مصیبت ان کی نظروں میں حقیر ناقابل التفات چیز نظر آنے لگتی ہے، مصائب کے پہاڑ بھی ان کے سامنے پرکھ سے کم رہ جاتے ہیں۔

بچ راحت شد چو مطلب شد بزرگ و گردنگہ تو تیاے چشم گرگ
دنیا کی تکالیف کے بالمقابل جو انعامات ملنے والے ہیں وہ ان کے سامنے ایسے مستحضر ہو جاتے ہیں کہ یہ تکالیف بھی ان کو لذیذ معلوم ہونے لگتی ہیں، اور یہ کوئی مستبعد نہیں، دیکھو آخرت کی دائمی نعمتیں تو بڑی چیز ہیں، یہ دنیا کی فانی اور چند روزہ راحت کا تصور انسان کے لئے کیسی کیسی محنت و مشقت کو لذیذ بنا دیتا ہے، کہ سفارشیں اور رشوتیں پیش کر کے آزادی کی راحت کو قربان کرتا ہے، اور نیند و آرام کو ختم کرنے والی ملازمت و مزدوری کی محنت کو شوق سے طلب کرتا ہے، اور اس محنت کے مل جانے پر مسرور و شکر گزار ہوتا ہے، کیونکہ اس کے سامنے اکتیس دن پورے ہو جانے کے بعد حاصل ہونے والی تنخواہ کی لذت ہوتی ہے، وہ لذت اس ملازمت و مزدوری کی سبب بخیر کو لذیذ بنا دیتی ہے، قرآن کریم کی آیت وَلَسَنَ جَنَّاتٍ مَّقَامَ رَبِّہِ جَنَّاتٍ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو دو جنتیں ملیں گی، ایک آخرت میں دوسری دنیا میں، دنیا کی جنت یہی ہوتی ہے کہ اول تو اس کے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے، ہر کام آسان ہوتا نظر آتا ہے، اور کبھی چند روزہ تکلیف و مشقت یا ناکامی بھی ہوتی ہے تو نعمائے آخرت کے مقابلہ میں وہ بھی ان کو لذیذ نظر آتی ہے، جس سے یہ تکلیف بھی راحت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں نیک لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس دارالسلام ہونے کا جو ذکر ہے وہ دارالسلام آخرت میں تو یقینی اور متعین ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں بھی ان کو دارالسلام کا لطف دیدیا جائے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَهُوَ رَبُّہُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یعنی ان کے اعمال صالحہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کا متولی اور ناسر و مددگار ہو جاتا ہے، ان کی سبب مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔

تیسری آیت میں میدانِ حشر کے اندر تمام جنات اور انسانوں کو جمع کرنے کے بعد دونوں گروہوں کا ایک سوال و جواب کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین الجن کو خطاب کر کے ان کے جرم کا

اظهار اس طرح فرمائیں گے کہ تم نے انسانوں کی گمراہی میں بڑا حصہ لیا ہے، اس کے جواب میں جنات کیا کہیں گے قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا، ظاہر یہی ہو کہ علیم وخبیر کے سامنے اقرار کرنے کے سوا چارہ کیا ہے، مگر ان کا اقرار ذکر نہ کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس سوال پر وہ ایسے مبہوت ہو جائیں گے کہ جواب کیلئے زبان اٹھ سکے گی (روح) اس کے بعد شیاطین الانس یعنی وہ لوگ جو دنیا میں شیطانوں کے تابع رہے خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنتے رہے ان لوگوں کی طرف سے بارگاہِ حکم الحاکمین میں ایک جواب ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ سوال شیاطین الانس سے نہیں کیا گیا، مگر ضمنی طور پر گویا وہ بھی مخاطب تھے کیوں کہ انھوں نے بھی گمراہی پھیلانے کا وہی کام کیا تھا، جو شیاطین الجن کا کام تھا، اس ضمنی خطاب کی وجہ سے ان لوگوں نے جواب دیا، مگر ظاہر یہ ہو کہ خود انسان نما شیطانوں سے بھی سوال ہوگا، جس کا ذکر صراحتہً اگرچہ یہاں نہیں ہے، مگر سورۃ یسین کی اس آیت میں مذکور ہے: **اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ بِنِیّ اٰدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدُوْا الشَّیْطٰنَ**، یعنی اے بنی آدم کیا ہم نے تم سے رسولوں کے واسطے سے یہ نہ کہا تھا کہ شیطان کی پرستی کرنا جس سے معلوم ہوا کہ انسانی شیطانوں سے بھی اس موقع پر سوال ہوگا اور وہ جواب میں اقرار کریں گے کہ بیشک ہم سے یہ جرم سرزد ہوا کہ ہم نے شیطانوں کی بات مانی اور یہ کہیں گے کہ بیشک جنی شیاطین نے ہم سے اور ہم نے ان سے دوستانہ تعلقات رکھ کر ایک دوسرے سے نفع حاصل کیا، انسانی شیطانوں تو ان سے یہ فائدہ حاصل کیا کہ دنیا کی لذتیں حاصل کرنے کی راہیں سیکھیں، اور کہیں جنات شیاطین کی دہائی سے کر یا کسی دوسرے طریق سے ان سے امداد بھی حاصل کی، جیسے بت پرست ہندوؤں میں بلکہ بہت جاہل مسلمانوں میں بھی ایسے طریقے معروف ہیں جن کے ذریعہ شیاطین اور جنات سے بعض کاموں میں امداد لے سکتے ہیں، اور جنی شیطانوں نے انسانوں سے یہ فائدہ حاصل کیا کہ ان کی بات مانی گئی، اور یہ انسان کو اپنے تابع بنانے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ وہ موت اور آخرت کو بھول بیٹھے، اور اس وقت ان لوگوں نے اقرار کیا کہ جس موت اور آخرت کو ہم شیطان کے بہکانے سے بھول بیٹھے تھے اب سائز آگئی، اس پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: **اَلَا تَاْتُوْكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ طٰرِآتًا رَّبَّکُمْ حٰکِمِیْنَ عَلَیْہِمْ**، یعنی تم دونوں گروہوں کے جرم کی سزا اب یہ ہے کہ تمھارا ٹھکانا آگ ہے جس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اس سے کسی کو نکالنا چاہے، لیکن دوسری نصوص میں قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہوگا، اس لئے ہمیشہ ہی رہنا پڑے گا۔

وَکَذٰلِکَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا لِّمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝۲۹

اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گنہگاروں کو ایک دوسرے سے ان کے اعمال کے سبب

یَمَعُشَرِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْکُمْ یَقْضُوْنَ

اے جماعت جنوں کی اور انسانوں کی کیا نہیں پہنچے تھے تمھارے پاس رسول تم ہی میں کے کہ سناتے تھے

عَلَيْكُمْ آيَتِي وَيُنذِرُكُمْ لِقَاءِ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا شَهِدْنَا

تم کو میرے حکم اور ڈراتے تھے تم کو اس دن کے پیش آنے سے کہیں گے کہ ہم نے اقرار کر لیا

عَلَى أَنْفُسِنَا وَغَرَّبْنَاهُمْ حَيَاةَ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ

اپنے گناہ کا اور ان کو دھوکہ دیا دنیا کی زندگی نے اور قائل ہو گئے اپنے ادھر

أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿١٣٠﴾ ذَلِكَ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ

اس بات کے کہ وہ کافر تھے یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کر نہ لیا انہیں بستیوں کو

بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِّنَّا عَمَلٌ لَّوَّمًا

ان کے ظلم پر اور وہاں کے لوگ بے خبر ہوں اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے عمل کے اور

رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٢﴾

تیرا رب بے خبر نہیں اُن کے کام سے

خلاصہ تفسیر

اور جس طرح دنیا میں گمراہی کے لحاظ سے سب میں تعلق و قرب تھا، اسی طرح (دو بخ میں) بعض کفار کو بعض کے قریب (اور مجتمع) رکھیں گے ان کے اعمال (کفریہ) کے سبب (یہ خطاب مذکور توجہ و انس کو باعتبار اُن کے احوال متعلقہ باہم دگر کے تھا، آگے ہر ایک کو باعتبار احوال متعلقہ بذات خاص کے خطاب ہے کہ) اے جماعت جنات اور انسانوں کی (ہاں یہ تو بتلاؤ جو تم کفر و انکار کرتے رہو تو) کیا تمھارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم سے میرے احکام (متعلق عقائد و اعمال کے) بیان کیا کرتے تھے اور تم کو اس آج کے دن (کے وقوع) کی خبر دیا کرتے تھے (پھر کیا وجہ کہ تم کفر و انکار سے باز نہ آئے) وہ سب عرض کریں گے کہ ہم سب اپنے اوپر (جرم کا) اقرار کرتے ہیں (ہمارے پاس کوئی وجہ عذر اور برائت کی نہیں) آگے اللہ تعالیٰ ان کو اس مصیبت کے پیش آنے کا سبب بتلاتے ہیں، اور ان کو (یہاں) دنیوی زندگی نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ دنیوی لذات کو مقصودِ اعظم سمجھ رکھا ہے آخرت کی فکر ہی نہیں) اور (اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ وہاں) یہ لوگ مقرر ہوئے گے کہ وہ (یعنی ہم) کافر تھے (اور غلطی پر تھے) مگر وہاں کے اقرار سے کیا ہوتا ہے، اگر دنیا میں ذرا غفلت دور کر دیں تو اس روز بد کا کیوں سامنا ہو، آگے رسولوں کے بھیجنے میں جس کا اوپر ذکر تھا اپنی رحمت کا اظہار فرماتے ہیں کہ (یہ رسولوں کا بھیجنا) اس وجہ سے ہے کہ آپ سب کسی بستی والوں کو (ان کے) کفر کے سبب دنیا میں بھی) ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے (احکام)

آئیہ سے ہوجہ رسولوں کے نہ آنے کے، پیغمبر ہوں پس عذابِ آخرت کہ اشد ہر درجہ اولیٰ نہ ہوتا، اس لئے رسولوں کو بھیجتے ہیں تاکہ ان کو جرائم کی اطلاع ہو جاوے پھر جس کو عذاب ہو مستحق کی وجہ سے ہو، چنانچہ آگے فرماتے ہیں، اور (جب رسول آگئے اور اطلاع ہو گئی پھر جیسا جیسا کوئی کرے گا، ہر ایک کیلئے) جن و انس صالح و طالح میں سے جزاء و سزا کے دلیے ہی (دلچسپی میں گئے ان کے اعمال کے سبب اور آپ کا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں لفظ ثَوَاتٍ کے عربی لغت کے اعتبار سے دو ترجمے ہو سکتے ہیں، ایک ملا دینے اور قریب کر دینے کے اور دوسرے مسلط کر دینے کے، ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے بھی دونوں طرح کی روایات میں اس کی تفسیر منقول ہے۔

محشر میں لوگوں کی جماعتیں اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہونگی، دنیوی تعلقات کی بنیاد پر نہیں

حضرت سعید بن جبیرؓ اور قتادہؓ وغیرہ نے پہلا ترجمہ اختیار کر کے آیت کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ گئے یہاں اجتماعی وحدتیں یعنی لوگوں کی جماعتیں اور پارٹیاں نسلی یا وطنی یا رنگ و زبان کی بناء پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ہوں گی، اللہ تعالیٰ کافر مانبردار مسلمان جہاں کہیں ہوگا وہ مسلمانوں کا ساتھی ہوگا، اور مافردان کافر جہاں کہیں ہوگا وہ کافروں کا ساتھی ہوگا، خواہ ان کی نسل اور نسب میں وطن اور زبان میں رنگ اور معاشرت میں کتنا ہی بعد اور اختلاف ہو۔

پھر مسلمانوں میں بھی نیک، دیندار، دینداروں کے ساتھ ہوگا، اور گناہگار، بدکردار، بدکرداروں کے ساتھ لگا دیا جائے گا، سورہ کوثر میں جو ارشاد ہے وَإِذَا الْنُفُوسُ سُورِجَتْ، یعنی لوگوں کے جوڑ اور جماعتیں بنادی جائیں گی، اس کا یہی مطلب ہے کہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے اہل محشر مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایک قسم کے اعمال نیک یا بد کرداروں کے ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے، نیک آدمی نیکوں کے ساتھ جنت میں، اور بدکردار دوسرے بدکرداروں کے ساتھ جہنم میں پہنچا دیا جائے گا، اور اس مضمون کی توثیق کے لئے فاروق اعظمؓ نے قرآن کریم کی آیت اَحْشَرُوا الَّذِیْنَ نَكَهْتُمْ وَاٰرَآءُكُمْ مِنْهُمْ سے استدلال فرمایا، جس کا مضمون یہی ہے کہ قیامت کے دن حکم ہوگا کہ ظالموں کو اور ان کے مناسب عمل کرنے والوں کو جہنم میں لے جاؤ۔

خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں کا ساتھی بنا کر ایک جماعت کر دیں گے، اگرچہ نسلی اور وطنی اعتبار سے ان میں کتنی بھی دوری ہو۔

اور ایک دوسری آیت میں یہ بات بھی واضح طور پر بیان فرمادی ہے کہ محشر میں یہ دنیوی اور مکی اتحاد جو آج لوگوں میں نسل، وطن، رنگ، زبان وغیرہ کی بنیادوں پر قائم ہیں، یہ سب یکسر ٹوٹ جائیں گے،

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِئذٍ يَنفَرُ قَوْمٌ، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو جو لوگ آپس میں متحد اور متفق ہیں وہ متفرق ہو جائیں گے۔

دنیا میں بھی اعمال و اخلاق اور یہ موجودہ رشتوں، ناظروں اور رسمی تنظیموں کا کٹ جانا روز قیامت میں کا اجتماعی معاملات میں اثر تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آہی جائے گا، مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سامنہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے، انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے، اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لئے راستے کھلتے... نظر آتے ہیں اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بدکردار کو اپنے ہی جیسے بدکرداروں سے تعلق اور انس ہوتا ہے وہ انہیں میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کی صحبت سے اس کی بد عملی و بد خلقی میں روزنیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیک کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے بُرے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نیک و بد اعمال کی ایک جزاء سزا تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو رفقاءِ کار بھی نیک اور دیانتدار نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام کو چار چاند لگا دیتے ہیں، اور بُرے اور بدنیت آدمی کو اعضاء و جوارح اور رفقاءِ کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو اس کو اور بھی زیادہ گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ اور حاکم سے راضی ہوتا ہے تو اس کو اچھے وزیر اور اچھا عملہ دیدیتے ہیں جس سے اس کی حکومت کے سب کار و بار درست اور ترقی پذیر ہو جاتے ہیں، اور جب کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو اس کو عملہ اور رفقاءِ کار بُرے ملتے ہیں، بُرے افسروں سے پالا پڑتا ہے، وہ اگر کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس پر قابو نہیں پاتا۔

ایک ظالم کو دوسرے ظالم | آیت مذکورہ کا یہ مفہوم ترجمہ کے اعتبار سے ہے، اور حضرت عبداللہ کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے | ابن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، ابن زیدؓ، مالک بن دینار وغیرہ سے اس آیت کی تفسیر دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں پر مسلط کر دیتا ہے، اور اس طرح ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا دلوا دیتا ہے، یہ مضمون بھی اپنی جگہ صحیح و درست اور قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کے مطابق ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کَمَا تَكُونُونَ كَذَلِكَ يُكُونُ عَلَيْكُمْ یعنی

جیسے تم ہو گے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے، تم ظالم و بدکار ہو گے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے اور تم نیک عمل و نیک کردار ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے حکام نیک اور رحم دل منصف مزاج لوگوں کو بنادیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا بھلا چاہتے ہیں تو ان پر بہترین حکام و امرا کا تسلط فرماتے ہیں، اور جب کسی قوم کا بُرا چاہتے ہیں تو ان پر بدترین حکام و سلاطین کو مسلط کر دیتے ہیں (تفسیر بحر محیط)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب بعیت اور عوام اللہ تعالیٰ سے مخوف ہو کر ظلم و جور میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ظالم حکام مسلط کر کے ان کے ہاتھوں ان کو سزا دلواتے ہیں۔

اور ابن کثیرؒ نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ مَنْ آعَانَ ظَالِمًا سَلَطَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ۔ یعنی جو شخص کسی ظالم کے ظلم میں اس کی مدد کرتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس کے سنانے کے لئے اس پر مسلط کر دیتے ہیں، اور اسی کے ہاتھ سے اس کو سزا دلواتے ہیں۔

دوسری آیت میں ایک سوال و جواب کا ذکر ہے جو محشر میں جنات اور انسانوں کو مخاطب کر کے کیا جائے گا کہ تم جو کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے اس کا کیا سبب ہے؟ کیا تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں پہنچے جو تمہاری قوم میں سے تھے، جو میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کرتے آئے اور آج کے دن کی حاضری اور حساب سے ڈراتے تھے؟ اس کے جواب میں ان سب کی طرف سے رسولوں کے آنے اور پیغام حق سنانے کا اور اس کے باوجود کفر و نافرمانی میں مبتلا ہونے کا اقرار ذکر کیا گیا ہے، اور ان کی طرف سے کوئی وجہ اور سبب اس غلط کاری کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ حق تعالیٰ نے ہی اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ رَغَرْتُمْ عَنْ حَيَاةِ الدُّنْيَا، یعنی ان لوگوں کو دنیا کی زندگی اور لذتوں نے دھوکہ میں ڈال دیا، کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، جو درحقیقت کچھ نہ تھا، اور انجام و عاقبت سے غافل ہو گئے، بقول اکبر مروع ۵

تھی فقط غفلت ہی غفلت، عیش کا دن کچھ نہ تھا

ہم اسے سب کچھ سمجھتے تھے وہ لیکن کچھ نہ تھا

اس آیت میں ایک بات تو یہ قابل غور ہے کہ بعض دوسری آیات میں تو یہ مذکور ہے کہ مشرکین سے جب محشر میں ان کے کفر و شرک کے متعلق سوال ہوگا تو وہ اپنے جرم سے مُکر جائیں گے، اور رب الارباب کے دربار میں قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ، یعنی قسم

ہو جائے پروردگار اللہ تعالیٰ کی ہم مشرک ہو گئے تھے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک کا ندامت کے ساتھ اقرار کر لیں گے، ان دونوں میں بظاہر تعارض اور اختلاف معلوم ہوتا ہے، مگر دوسری آیات میں اس کی تشریح و توضیح اس طرح موجود ہے کہ ابتداء میں جب ان سے سوال ہو گا تو انکر جائیں گے، مگر اُس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ان کی زبانیں بند کر دیں گے، ہاتھوں پیروں اور دوسرے اعضاء سے گواہی لیں گے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے انکو گویائی عطا ہوگی، اور وہ صاف صاف اس کے سارے اعمال کا کچا چٹھا بیان کر دیں گے اور اس وقت جن وانس کو یہ معلوم ہو گا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں اور کان اور زبان سب قدرت کے کارخانہ کی خفیہ پولیس کے افراد تھے، جنہوں نے سارے معاملات اور حالات کی سچی اور صحیح شہادت دیدہی، تو اب ان کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی، اس وقت یہ سب لوگ صاف صاف اعتراف جرم کر لیں گے۔ کیا جنات میں بھی رسول ہوتے ہیں | دوسری بات اس جگہ قابل غور یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے جنات اور انسانوں کی دونوں جماعتوں کو خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ کیا ہمارے رسول تمہارے پاس نہیں پہنچے جو تمہاری ہی قوم سے تھے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے رسول انسان اور بشر بھیجے گئے ہیں اسی طرح جنات کے رسول جنات کی قوم سے بھیجے گئے ہیں۔

اس مسئلہ میں علماء تفسیر و حدیث کے اقوال مختلف ہیں، بعض کا کہنا یہ ہے کہ رسول اور نبی صرف انسان ہی ہوئے اور ہوتے چلے آئے ہیں، جنات کی قوم میں سے کوئی شخص رسول بلا واسطہ نہیں ہوا، بلکہ ایسا ہوا ہے کہ انسانی رسول اور پیغمبر کا کلام اپنی قوم کو پہنچانے کے لئے جنات کی قوم میں کچھ لوگ ہوئے ہیں جو درحقیقت رسولوں کے قاصد اور پیغامبر ہوتے تھے، مجازی طور پر ان کو بھی رسول کہہ دیا جاتا ہے، ان حضرات کا استدلال قرآن مجید کی ان آیات پر جن میں جنات کے ایسے اقوال مذکور ہیں کہ انہوں نے نبی کا کلام یا قرآن سن کر اپنی قوم کو پہنچایا، مثلاً: وَلَوْ اِتٰی قَوْمٌ مِّنْ رَّبِّیْنَ، اور سورۃ جن کی آیت فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدٰی سَبٰیِلَ الْوَسْطٰی قَامَتَابِہٖ، وغیرہ۔

لیکن ایک جماعت علماء اس آیت کے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس کی بھی قائل ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر گروہ کے رسول اسی گروہ میں سے ہوتے تھے، انسانوں کے مختلف طبقات میں انسانی رسول آتے تھے، اور جنات کے مختلف طبقات میں جنات ہی میں سے رسول ہوتے تھے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کو سارے عالم کے انسانوں اور جنات کا واحد رسول ہونا بھیجا گیا اور وہ بھی کسی ایک زمانہ کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن وانس آپ کی امت ہیں، اور آپ ہی سب کے رسول و پیغمبر ہیں۔

ہندوؤں کے دہا بھی عموماً جنات ہیں ان میں کسی رسول نبی ہونے کا احتمال | ائمہ تفسیر میں سے کئی اور مجاہد وغیرہ نے

اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر منظر ہی میں اسی قول کو اختیار فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے جنات کے رسول جنات ہی کی قوم سے ہوتے تھے، اور جبکہ یہ ثابت ہو کہ زمین پر انسانوں سے ہزاروں سال پہلے سے جنات آباد تھے اور وہ بھی انسانوں کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں، تو از روئے عقل و شرع ضروری ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے والے رسول و پیغمبر ہوں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہندوستان کے ہندو جو اپنی دنیا کی تاریخ ہزار ہا سال پہلے کی بتلاتے ہیں اور اپنے مقتدا و بزرگ جن کو وہ اوتار کہتے ہیں اسی زمانہ کے لوگوں کو بتاتے ہیں، کچھ بعید نہیں کہ وہ یہی جنات کے رسول و پیغمبر ہوں اور انہی کی لائی ہوئی ہدایات کسی کتاب کی صورت میں جمع کی گئی ہوں، ہندوؤں کے اوتاروں کی جو تصویریں اور مورتیاں مندرروں میں رکھی جاتی ہیں وہ بھی اسی انداز کی ہیں، کہ کسی کے کسی چہرے ہیں، کسی کے بہت سے ہاتھ پاؤں ہیں، کسی کے ہاتھ کی طرح سونڈ ہے، جو عام انسانی شکلوں سے بہت مختلف ہیں، اور جنات کا ایسی شکلوں میں متشکل ہونا کچھ مستبعد نہیں، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ ان کے اوتار جنات کی قوم میں آئے ہوئے رسول یا ان کے نائب ہوں اور ان کی کتاب بھی ان کی ہدایات کا مجموعہ ہو، پھر رفتہ رفتہ جیسے دوسری کتابوں میں تحریف ہو گئی، اس میں بھی تحریف کر کے شرک و بت پرستی داخل کر دی گئی۔

اور بہر حال اگر وہ اصل کتاب اور رسول جن کی صحیح ہدایات بھی موجود ہوتیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت عامہ کے بعد وہ بھی منسوخ اور ناقابل عمل ہی ہو جاتیں اور منسوخ و محرف ہونے کے بعد تو اس کا ناقابل عمل ہونا خود ہی واضح ہے۔

تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسانوں اور جنات میں رسول بھیجنا اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی قوم پر ویسے ہی عذاب نہیں بھیج دیتے جب تک ان کو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بیدار نہ کر دیا جائے اور ہدایت کی روشنی ان کے لئے نہ بھیج دی جائے، چوتھی آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں اور جنات میں ہر طبقہ کے لوگوں کے درجات مقرر ہیں، اور یہ درجات ان کے اعمال ہی کے مطابق رکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کی جزاء و سزا انہی اعمال کے پیمانہ کے مطابق ہوگی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ إِنَّ يَشَاءُ مِنْ هَبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ

اور تیرا رب بے پروا ہے رحمت والا اگر چاہے تو تم کو لے جائے اور تمہارے پیچھے قائم

مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿۱۳۳﴾

کر دے جسکو چاہے جیسا کہ تم کو پیدا کیا اور ان کی اولاد سے ،

إِنَّ مَا تُوْعَدُونَ لَأَتِيٌ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۱۳۶﴾ قُلْ لِّقَوْمٍ أَعْمَلُوا

جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہو وہ ضرور آتی ہو اور تم عاجز نہیں کر سکتے تو کہہ دو اے لوگو تم کام کرتے ہو

عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ تَكُونُ لَهُ

اپنی جگہ پر میں بھی کام کرتا ہوں سو عنقریب جان لو گے تم کہ کس کو ملتا ہے عاقبت

عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۳۷﴾ وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا

کا گھر بالیقین بھلا نہ ہو گا ظالموں کا اور بٹھراتے ہیں اللہ کا اس کی

ذَرَأٍ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ

پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشی میں ایک حصہ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال میں

وَهَذَا لِلشَّرِّ كَأَنَّا بَشَرًا كَانُوا لَشَرٍّ كَأَنَّهُمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ

اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے سو جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ تو نہیں پہنچتا اللہ کی طرف اور جو اللہ کا

لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شَرِّ كَأَنَّهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۱۳۸﴾

ہو وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کی طرف کیا ہی بُرا انصاف کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر

اور آپ کا رب رسولوں کو کچھ اس لئے نہیں بھیجتا کہ نعوذ باللہ وہ محتاج عبادت ہو وہ تو بالکل غنی ہے (بلکہ اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ رحمت والا رہے) ہے (اپنی رحمت سے رسولوں کو بھیجا تاکہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو منافع و مضار (نقصان دہنی دالی چیزیں) معلوم ہو جائیں، پھر منافع سے منتفع اور مضار سے محفوظ رہیں سو اس میں بندوں ہی کا فائدہ ہے، اور باقی ان کا غنا تو ایسا ہو کہ) اگر وہ چاہے تو تم سب کو (دنیا سے دفعہ) اٹھالیوے اور تمھارے بعد جس (مخلوق) کو چاہے تمھاری جگہ (دنیا میں) آباد کر دے جیسا اس کی نظیر پہلے سے موجود ہے کہ تم کو (جو کہ اب موجود ہو) ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے (کہ ان کا کہیں پتہ نہیں اور تم ان کی جگہ موجود ہو، اور اسی طرح یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے، لیکن یہ سلسلہ تدریجاً قائم ہے، اگر ہم چاہیں دفعہً بھی ایسا کر دیں، کیونکہ کسی کے ہونے نہ ہونے سے ہمارا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا، پس ارسالِ رسل ہمارے احتیاج کی وجہ سے نہیں تمھاری حسیاج کی وجہ سے ہے، تم کو چاہئے کہ ان کی تصدیق اور ان کا اتباع کر کے سعادت حاصل کرو اور کفر و انکار کے صر سے بچو کیونکہ جس چیز کا رسولوں کی معرفت تم سے

وعدہ کیا جاتا ہے (یعنی قیامت و عذاب) وہ بیشک آنے والی چیز ہے اور (اگر احتمال ہو کہ قیامت آوے مگر ہم کہیں بھاگ جائیں گے، ہاتھ نہ آئیں گے، جیسا دنیا میں حکام کا مجرم کبھی ایسا کر سکتا ہے، تو خوب سمجھ لو کہ) تم (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے کہ اس کے ہاتھ نہ آوے، اور اگر باوجود اقبال دلائل تعین حق کے کسی کو اس میں کلام ہو کہ کفر ہی کا طریقہ اچھا ہے اسلام کا بُرا ہے، پھر قیامت سے کیا اندیشہ تو ایسے لوگوں کے جواب میں) آپ (اثیر بات) یہ فرمادیں گے کہ اے میری قوم (تم جانو بہتر ہے) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں، سواب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم (کے اعمال) کا انجام کار کس کے لئے نافع ہوگا دہمارے لئے یا تمھارے لئے اور یہ یقینی بات ہے کہ حق تلفی کرنے والوں کو کبھی (انجام میں) فلاح نہ ہوگی اور سب سے بڑھ کر اللہ کی حق تلفی ہے، اور یہ امر دلائل صحیحہ میں محض غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ طریقہ اسلام حق تلفی ہے یا طریقہ کفر، اور جو دلائل میں بھی غور نہ کرے اس سے اتنا کہہ دینا بس ہے فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ، یعنی عنقریب تم اس عمل بد کا انجام جان لو گے) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی (وغیرہ) اور مویشی پیدا کئے ہیں ان (مشرک) لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ (کے نام) کا مقرر کیا اور کچھ بتوں کے نام کا مقرر کیا حالانکہ پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں) اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے (جو کہ مہانوں اور مساکین اور مسافر وغیرہ عام مصارف میں صرف ہوتا ہے) اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے (جس کے مصارف خاص ہیں) پھر جو چیز ان کے معبودوں (کے نام) کی ہوتی ہے وہ تو اللہ (نام کے حصہ) کی طرف نہیں پہنچتی (بلکہ اتفاقاً مل جانے سے بھی الگ نکال لی جاتی ہے) اور جو چیز اللہ (کے نام) کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں (کے نام کے حصہ) کی طرف پہنچ جاتی ہے، انھوں نے کیا بُری تجویز نکال رکھی ہے (کیونکہ اول تو اللہ کا پیدا کیا ہوا دوسرے کے نام کیوں جائے، دوسرے پھر جتنا اللہ کا حصہ نکالا ہو اس میں سے بھی گھٹ جائے، اور اگر غناء و احتیاج اس کا مبنی ہے تو محتاج مان کر معبود سمجھنا اور زیادہ حماقت ہے) :

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیت میں یہ مذکور تھا کہ اللہ جل شانہ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جن بشر کی ہر قوم میں اپنے رسول اور اپنی ہدایات بھیجی ہیں، اور جب تک رسولوں کے ذریعہ ان کو پوری طرح متنبہ نہیں کر دیا گیا اس وقت تک ان کے کفر و شرک اور محصیت و نافرمانی پر ان کو کبھی سزا نہیں دی۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ رسولوں اور آسمانی کتابوں کے تمام

مسئلے کچھ اس لئے نہیں تھے کہ رب العالمین کو ہماری عبادت اور اطاعت کی حاجت تھی، یا اس کا کوئی کام ہماری اطاعت پر موقوف تھا، نہیں وہ بالکل بے نیاز اور غنی ہے، مگر اس کے کامل استغناء اور بے نیازی کے ساتھ اس میں ایک صفت رحمت بھی ہو اور ساری عالم کے وجود میں لانے پھر باقی رکھنے اور ان کی ظاہری اور باطنی، موجودہ اور آئندہ تمام ضرورتوں کو بے مانگے پورا کرنے کا سبب بھی صفت رحمت ہے، ورنہ بیچارہ انسان اپنی ضروریات کو خود پیدا کرنے کے قابل تو کیا ہوتا اس کو تو اپنی تمام ضروریات کے مانگنے کا بھی سلیقہ نہیں، خصوصاً نعمتِ وجود جو عطا کی گئی ہے اس کا تو بے مانگے ملنا بالکل ہی واضح ہے کہ کسی انسان نے کہیں اپنے پیدا ہونے کی دعا نہیں مانگی، اور نہ وجود سے پہلے دعا مانگنے کا کوئی تصور ہو سکتا ہے، اسی طرح انسان کی تخلیق جن اعضا سے کی گئی ہے آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ کیا یہ چیزیں کسی انسان نے مانگی تھیں، یا کہیں اس کو مانگنے کا شعور و سلیقہ تھا؟ کچھ نہیں بلکہ ماں بودیم و تقاضا ما نبود و لطف تو ناگفتہ مامی مشنود

اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے بہر حال اس آیت میں رَبُّنَا الْغَنِيُّ کے الفاظ سے رب الارباب کی نیازی تخلیق کائنات صرف اسکی رحمت کا نتیجہ ہے بیان کرنے کے ساتھ ذوالرحمۃ کا اضافہ کر کے یہ بتلا دیا کہ وہ اگرچہ تم سب سے بلکہ ساری کائنات سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہو، لیکن بے نیازی کے ساتھ وہ ذوالرحمۃ یعنی رحمت والا بھی ہے۔

کسی انسان کو اللہ نے بے نیاز نہیں بنایا اس میں بڑی حکمت ہے اور یہ اسی ذات پاک کا کمال ہے ورنہ انسان کی عادت یہ ہو کہ اگر وہ دوسروں سے بے نیاز اور مستغنی ہو جائے تو اس کو دوسروں کے نفع ہو، انسان بے نیاز ہو جائے تو نقصان اور رنج و راحت کی کوئی پروا نہیں رہتی، بلکہ اسی حالت میں وہ دوسروں پر ظلم و جور کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، قرآن کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَافٍ ۖ اِسْتَعْنٰی، یعنی انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی پاتا ہے تو وہ سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسی لئے حق جل شانہ نے انسان کی ایسی ضروریات میں جکڑ دیا ہے جو دوسروں کی امداد کے بغیر پوری ہی نہیں ہو سکتی، بڑے سے بڑا بادشاہ اور حاکم نوکروں چاکروں اور چیراسیوں کا محتاج ہے، بڑے سے بڑا مالدار اور میل آنر مزدوروں کا محتاج ہے، صبح کو جس طرح ایک مزدور اور رکشا چلانے والا کچھ پیسے حاصل کر کے محتاجی دور کرنے کے لئے تلاش روزگار میں نکلتا ہے ٹھیک اسی طرح بڑے مالدار جن کو اغنیا کہا جاتا ہے وہ مزدور اور رکشا اور گاڑی سواری کی تلاش میں نکلتے ہیں، قدرت نے سب کو محتاجی کی ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے، کسی کا کسی پر احسان نہیں اور یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی مالدار کسی کو ایک پیسہ دیتا اور نہ کوئی مزدور کسی کا ذرا سا بوجھ اٹھاتا، یہ تو

صرف حق جل شانہ کی صفت کمال ہے کہ کامل استغناء اور بے نیازی کے باوجود وہ ذوالرحمتہ یعنی رحمت والا ہے، اس جگہ ذوالرحمتہ کے بجائے اگر رحمن یا رحیم کا لفظ لایا جاتا تب بھی مقصود کلام ادا ہو جاتا، لیکن غنی ہونے کے ساتھ صفت رحمت کے جوڑ کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عنوان ذوالرحمتہ کا اختیار فرمایا گیا، کہ وہ غنی اور مکمل بے نیاز ہونے کے باوجود صفت رحمت بھی مکمل رکھتا ہے، اور یہی صفت رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا اصل سبب ہے۔

اس کے بعد یہ بھی بتلادیا کہ جس طرح اس کی رحمت عام اور تمام ہے اسی طرح اس کی قدرت ہر چیز اور ہر کام پر حاوی ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو ایک آن میں فنا کر سکتا ہے، اور ساری مخلوق کے فنا کر دینے سے بھی اس کے کارخانہ قدرت میں ادنیٰ سا فرق نہیں آتا، پھر اگر وہ چاہے تو موجودہ ساری کائنات کو فنا کر کے ان کی جگہ دوسری مخلوق اسی طرح اسی آن میں پیدا کر کے کھڑی کر دے، جس کی ایک نظیر انسان کے ہر دور میں اس کے سامنے رہتی ہے، کہ آج جو کروڑوں انسان زمین کے چپہ چپہ پر آباد اور زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف کاروبار کو چلا رہے ہیں، اگر اب سے ایک سال پہلے کی طرف غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی یہ دنیا اسی طرح آباد تھی، اور سب کام چل رہے تھے، مگر موجودہ آباد کرنے والوں اور کام چلانے والوں میں سے کوئی نہ تھا، ایک دوسری قوم تھی جو آج زیر زمین ہے، اور جس کا آج نام و نشان بھی نہیں ملتا، اور موجودہ دنیا اس کی پہلی قوم کی نسل سے پیدا کی گئی ہے، ارشاد ہے:-

إِن يَشَاءُ يُدْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَتَّخَذَ كُفْرًا ذُرِّيَّةً قَوْمٍ آخَرِينَ، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سب کو لے جائیں، لے جانے سے مراد ایسا فنا کر دینا ہے کہ نام و نشان تک گم ہو جائے، اور اسی لئے یہاں ہلاک کرنے یا مار دینے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ لیجانا ارشاد فرمایا، جس میں فنا محض اور بے نام و نشان کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت میں اللہ جل شانہ کے غنی اور بے نیاز ہونے کا، پھر صاحب رحمت ہونے کا، اور پھر قدرت کاملہ کے مالک ہونے کا بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں نافرمانوں اور حکم نہ ماننے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ:-

إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جس عذاب کا ڈرایا ہے وہ ضرور آنے والا ہے، اور تم سب مل کر بھی خدائی عذاب کو نہیں ٹال سکتے۔

تیسری آیت میں پھر ان کو غفلت سے چونکانے کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کر کے ارشاد فرمایا: قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان

اہل مکہ سے کہہ دیجئے کہ اے میری قوم اگر تم میری بات نہیں مانتے تو تم میں خستہ سوار ہو نہ ملناؤ اور اپنی حالت پر اپنے عقیدہ اور عناد کے مطابق عمل کرتے رہو میں بھی اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرتا رہوں گا، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں، مگر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دار آخرت کی نجات اور فلاح کس کو حاصل ہوتی ہے، یہ خوب سمجھ لو کہ ظالم یعنی حق تلفی کرنے والے کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

اور امام تفسیر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس جگہ آیت میں مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ فرمایا ہے عَاقِبَةُ الدَّارِ اِذَا خَرَجْتَ مِنْهَا نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دار آخرت سے پہلے دار دنیا میں بھی انجام کار فلاح و کامیابی اللہ کے نیک بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ تھڑے ہی عرصہ میں تمام قوت و اقتدار والے مخالف ان کے سامنے ذلیل ہوئے، ان کے ملک ان کے ہاتھوں پر فتح ہوئے، خود عہد رسالت میں تمام جزیرہ عرب آپ کے زیر نگیں آگیا، یمن اور بحرین سے لیکر حد و رشام تک آپ کی حکومت پھیل گئی، پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ کرام کے ہاتھوں تقریباً پوری دنیا اسلام کے جھنڈے تلے آگئی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا کَتَبَ اللَّهُ لَآبِلَيْنَ آفَآذٍ وَسَلَاحٍ، یعنی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں غالب آؤں گا اور میرے رسول غالب آئیں گے اور دوسری آیت میں ارشاد ہوا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیْوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَُادُ، یعنی ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے، اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے، اس دنیا میں بھی اور اس دن میں بھی جب کہ اعمال کے حساب پر گواہی دینے والے گواہی پر کھڑے ہوں گے، یعنی قیامت کے دن۔

چوتھی آیت میں مشرکین عرب کی ایک خاص گمراہی اور غلط کاری پر تنبیہ فرمائی گئی ہے، عرب کی عادت یہ تھی کہ کھیتی اور باغات سے نیز تجارتوں سے جو کچھ پیداوار ہوتی تھی، اس میں سے ایک حصہ اللہ کے لئے اور ایک حصہ اپنے بتوں کے لئے نکالا کرتے تھے، اللہ کے نام کا حصہ غریب و فقراء و مساکین پر خرچ کرتے اور بتوں کے نام کا حصہ بیت خانہ کے پجاریوں اور نگہبانوں پر صرف کیا کرتے تھے۔

اول تو یہی ظلم کچھ کم نہ تھا کہ ساری چیزیں پیدا تو خدا تعالیٰ نے فرمائی اور ہر چیز کی پیداوار اس نے عطا فرمائی پھر اس کی دی ہوئی چیزوں میں بتوں کو شریک کر دیا، اس پر مزید ستم بر ستم یہ تھا کہ اگر کبھی پیداوار میں کچھ کمی آجائے تو اس کمی کو اللہ کے حصہ پر یہ کہہ کر ڈال دیتے کہ اللہ تعالیٰ تو مستغنی ہے وہ ہماری چیزوں کا محتاج نہیں، اور بتوں کا حصہ بھی پورا کر لیتے، اور خود اپنے استعمال کا حصہ بھی، اور کبھی ایسا ہوتا کہ بتوں کے حصہ میں سے یا اپنے حصہ میں سے کوئی چیز اللہ کے حصہ

میں پڑ جاتی تو اس کو حساب پورا کرنے کے لئے اس میں سے نکال لیتے تھے اور اگر کبھی معاملہ برعکس ہو جاتا کہ اللہ کے حصہ میں سے کوئی چیز اپنے حصہ یا بتوں کے حصہ میں پڑ جائے تو اس کو وہیں رہنے دیتے اور یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کے حصہ میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو حرج نہیں، قرآن کریم نے ان کی اس گمراہی اور غلط کاری کو ذکر کر کے فرمایا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ، یعنی ان لوگوں کا یہ فیصلہ کس قدر بُرا اور بھونڈا ہے کہ جس نے ان کو اور ان کی ساری چیزوں کو پیدا کیا، اول تو اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کر دیا، پھر اس کے حصہ کو بھی دوسری طرف مختلف بہانوں سے منتقل کر دیا۔

کافروں کی اس تنبیہ میں یہ تو مشرکین عرب کی ایک گمراہی اور غلط روش پر تنبیہ کی گئی ہے، اس کے مسلمانوں کے لئے عبرت ساتھ اس کے ضمن میں ان مسلمانوں کے لئے بھی ایک تازیانہ عبرت ہے جو

اللہ کی دی ہوئی زندگی اور اس کے بخشے ہوئے اعضاء و جوارح کی پوری توانائی کو مختلف حصوں میں بانٹتے ہیں، عمر اور وقت کا ایک حصہ اللہ اور اس کی عبادت کے لئے مخصوص کرتے ہیں، حالانکہ حق تو اس کا یہ تھا کہ عمر کے سارے اوقات اور لمحات اسی کی عبادت اور طاعت کے لئے وقف ہوتے، انسانی ضرورتوں اور محبوریوں کے لئے اس میں سے کوئی وقت اپنے لئے بھی نکال لیتے، اور حق تو یہ ہے کہ پھر بھی اس کا حق شکر ادا نہ ہوتا، مگر یہاں تو حالت ہماری یہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اگر ہم کوئی وقت اللہ کی یاد اور عبادت کے لئے مقرر بھی کر لیتے ہیں تو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے اس میں نہ اپنے کاروبار میں کوئی حرج ڈالا جاتا ہے، نہ آرام کے اوقات میں، سارا نذر اس وقت پر پڑتا ہے جو نماز، تلاوت یا عبادت کے لئے مقرر کیا تھا، کوئی کام پیش آوے، یا بیماری یا کوئی دوسری ضرورت تو سب سے پہلے اس کا اثر اُس وقت پر پڑتا ہے جو ہم نے ذکر اللہ یا عبادت کے لئے مخصوص کیا تھا، یہ کیسا غلط فیصلہ اور کتنی ناشکری اور حق تلفی ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔

وَكَذَلِكَ زَيْنٌ لِّكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادِهِمْ

اور اسی طرح مزین کر دیا بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کی اولاد کے قتل کو

شَرًّا كَمَا وَهَّمُوا لِيُورِدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ

اُن کے شریکوں نے تاکہ ان کو ہلاک کریں اور زلا ملا دیں ان پر ان کے دین کو اور

شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرَهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۰﴾ وَقَالُوا هَذِهِ

اللہ چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے سو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ اور کہتے ہیں کہ یہ

أَنعَامٌ وَحَرَّتْ حُجْرَتٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَّشَاءُ مِنْهُمْ

مواشی اور کھیتی ممنوع ہے اس کو کوئی نہ کھاوے مگر جب کوہم چاہیں ان کے خیال کے موافق

وَالنَّعَامُ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ أَلَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا

اور بعض مواضع کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کیا اور بعض مواضع کے ذبح کے وقت نام نہیں لیتے اللہ کا اللہ

افْتَرَاءٌ عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوا مَا فِي

پر بہتان باندھ کر عنقریب وہ سزا دیے گا ان کو اس جھوٹ کی اور کہتے ہیں جو بچہ ان ہوتی

بَطْنِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذِكُرِ نَاوٍ مُحَرَّمٍ عَلَى أَزْوَاجِنَا

کے پیٹ میں ہو اس کو تو خاص ہمارے مرد ہی کھادیں اور وہ حرام ہی ہماری عورتوں پر

وَأِنْ يَكُنْ مَيِّتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ

اور جو بچہ مردہ ہو تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں وہ سزا دیے گا ان کو ان کی تقریروں کی،

إِنَّهُمْ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا

وہ حکمت والا جاننے والا ہو بیشک خراب ہوئے جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو نادانی سے

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمَ مَوَارِثَهُمُ اللَّهُ افْتَرَاءً عَلَى اللَّهِ قَدْ

بغیر سمجھ اور حرام ٹھہرایا اس رزق کو جو اللہ نے ان کو دیا بہتان باندھ کر اللہ پر بیشک

ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۴۰﴾

وہ گمراہ ہوئے اور نہ آئے سیدھی راہ پر

وَاللَّهُ

رابط آیات پچھلی آیتوں میں مشرکین کے عقائد باطلہ مشرکیت کفریہ کا بیان تھا، ان آیات میں ان کی

عملی غلطیوں اور جاہلانہ رسموں کا ذکر ہے، جن رسوم جاہلیت کا ذکر ان آیات میں آیا ہو وہ

یہ ہیں ۱۔ اول غلہ اور پھل میں سے کچھ حصہ اللہ کے نام کا نکالتے ہیں اور کچھ بتوں اور جنات کے نام کا، پھر

اگر اتفاق سے اللہ کے حصہ میں سے کچھ حصہ بتوں کے حصہ میں مل جاتا تو اس کو اسی طرح ملا رہتی دیتے

تھے، اور معاملہ برعکس ہوتا تو اس کو نکال کر پھر بتوں کے حصہ کو پورا کر دیتے تھے اور یہاں یہ تھا کہ اللہ

تعالیٰ تو غنی ہے اس کا حصہ کم ہو جانے سے اس کا کوئی ضرر نہیں، اور شرکار محتاج ہیں، ان کا حصہ

نہ گھٹنا چاہیے، اس رسم بد کا بیان آیات مذکورہ سے پہلی آیت میں آچکا۔

دوسری رسم یہ تھی کہ بحیرہ، سائبہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑتے اور یہ کہتے تھے کہ

یہ کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہے، اس میں بھی بتوں کا حصہ یہ تھا کہ عبادت اُن کی تھی،

اور اللہ کا حصہ یہ ہوا کہ اس کو خوشنودی اللہ کی سمجھتے تھے۔

تیسری رسم اپنی دختر یا اولاد کو قتل کر ڈالنے کی تھی، چوتھی رسم کچھ کھیت بتوں کے نام

وقت کر دیتے اور کہتے کہ اس کا اصل مصرف فقط مرد ہیں، عورتوں کو اس میں سے کچھ دینا نہ دینا ہماری مرضی پر ہے، ان کو مطالبہ کا حق نہیں۔
پانچویں رسم، اسی طرح کا عمل مویشی جانوروں میں کرتے تھے کہ بعض کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے۔

چھٹی رسم، جن چوپایہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تو ان پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے۔
ساتویں رسم، بعض چوپایہ جانور مخصوص تھے جن پر کسی موقع میں بھی اللہ کا نام نہ لیتے تھے نہ دودھ نکالنے کے وقت نہ سوار ہوتے وقت، نہ ذبح کرنے کے وقت۔

آٹھویں رسم یہ تھی کہ جن جانوروں کا نام بحیرہ یا سائبہ رکھ کر بتوں کے نام پر چھوڑتے ان کے ذبح کے وقت اگر بچہ پیٹ سے زندہ نکلتا تو اس کو بھی ذبح کر لیتے، مگر اس کو صرف مردوں کے لئے حلال عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے اور اگر بچہ مردہ نکلتا تو وہ سب کے لئے حلال ہوتا تھا۔
نویں رسم، بعض جانوروں کا دودھ بھی مردوں کے لئے حلال عورتوں کیلئے حرام سمجھتے تھے۔
دسویں رسم، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی چار قسم کے جانوروں کی تعظیم کو عبادت سمجھتے تھے۔
یہ سب روایات درمنثور اور روح المعانی میں حضرت ابن عباس، مجاہد ابن زید اور سدی سے تخریج ابن منذر ابن ابی حاتم، ابن ابی شیبہ ابن حمید منقول ہیں، (از بیان لہستان)

خلاصہ تفسیر

اسی طرح بہت سے مشرکین کے خیال میں ان کے معبودوں (شیاطین) نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے (جیسا کہ جاہلیت میں لڑکیوں کو قتل یا زندہ درگور کرنے کی رسم تھی) تاکہ اس فعل قبیح کے ارتکاب سے وہ (شیاطین) ان (مشرکین) کو بوجہ تحقیق عذاب کے برباد کریں اور تاکہ ان کے طریقہ کو مخبط کر دیں کہ ہمیشہ غلطی میں پھنسے رہیں، اور آپؐ انکی ان حرکات شنیعہ سے معذور نہ ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو انکا بھلا منظور ہوتا تو یہ ایسا کام نہ کرتے، تو آپؐ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں (کہ ہمارا یہ فعل بہت اچھا ہے) یوں ہی رہنے دیجئے، (کچھ فکر نہ کیجئے ہم آپؐ سمجھ لیں گے) اور وہ اپنے خیال (باطل) پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ (مخصوص) مویشی ہیں، اور (مخصوص) کھیت ہیں جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں ان کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے ان کے جنکو ہم چاہیں (جیسا رسم چہارم و پنجم میں مذکور ہوا) اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ مخصوص) مویشی ہیں جن پر سواری یا بار برداری حرام کر دی گئی ہے (جیسا رسم ششم میں مذکور ہوا) اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ

مخصوص) مواشی میں جن پر اللہ کا نام نہیں لینا چاہئے، چنانچہ اسی اعتقاد کی وجہ سے ان پر یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے (جیسا رسم ہفتم میں مذکور ہوا، اور یہ سب بائیں) محض اللہ پر افتراء باندھنے کے طور پر کہتے ہیں، افتراء اس لئے کہ وہ ان امور کو موجب خوشنودی حق تعالیٰ سمجھتے تھے) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے افتراء کی سزا دیتا ہے (ابھی اس لئے کہا کہ قیامت جو کہ آنے والی ہے دور نہیں، اور کچھ کچھ سزا تو مرتے ہی شروع ہو جائے گی) اور وہ (یوں بھی) کہتے ہیں کہ جو چیز ان مواشی کے پیٹ میں (سے نکلتی) ہے (مثلاً دودھ یا بچہ) وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے (حلال) ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ (پیٹ کا بھلا ہوا بچہ) مردہ ہو تو اس (سے منقطع ہونے کے جواز) میں (مرد و عورت) سب برابر ہیں (جیسا رسم ہشتم و نہم میں مذکور ہوا) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کی (اس) غلط بیانی کی سزا دے دیتا ہے (غلط بیانی کی وہ ہی تقریر ہے جو افتراء کی گذری، اور اب تک جو سزا نہیں دی تو وجہ یہ ہے کہ) بلاشبہ وہ کھمت والا ہے (بعض حکمتوں سے ہمت دے رکھی ہے، اور ابھی سزا نہ دینے سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ ان کو خبر نہیں، کیونکہ) وہ بڑا علم والا ہے (اس کو سب خبر ہے، آگے بطور خلاصہ اور انجام کے فرماتے ہیں کہ) واقعی خرابی میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے ان افعال مذکورہ کو طریقہ بنالیا کہ اپنی اولاد کو محض براہِ حماقت بلا کسی (معقول و مقبول) شد کے قتل کر ڈالا اور جو (حلال) چیزیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کو دی تھیں ان کو (اعتقاداً یا عملاً) حرام کر لیا (جیسا اوپر کے رسوم اور رسم دہم میں کہ منشاء سب کا متحد ہے مذکور ہوا اور یہ مجموعہ) محض اللہ پر افتراء باندھنے کے طور پر (ہوا، جیسا کہ اوپر قتل اولاد میں یفترون اور تحریم انعام میں افتراء جدا جدا بھی آچکا ہے) بیشک یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے اور (یہ گمراہی جدید نہیں بلکہ قدیم ہے، کیونکہ پہلے بھی) کبھی راہ پر چلنے والے نہیں ہوئے (پس ضلوتیں خلاصہ طریق کا اور ماکاٹو میں اس کی تاکید اور خیر خواہی میں خلاصہ انجام بد کا کہ عذاب ہے ذکر کیا گیا)

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ

اور اسی نے پیدا کئے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور کچھ کے درخت

وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أَكْلُهُ وَالنَّارِثَاتِ وَالرَّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ

اور کھیتی کہ مختلف ہیں ان کے پھل اور پیدا کیا زیتون کو اور انار کو ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا

مُتَشَابِهٍ كُلُّوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ

جدا بھی کھاؤ ان کے پھل میں سے جس وقت پھل لادیں اور ادا کرو ان کا حق جس دن ان کو کھاؤ

وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۴۲﴾ وَمِنَ الْأَنْعَامِ

اور بیجا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنے والے اور پیدا کئے مویشی میں بوجھ

حَمُولَةٍ وَفَرَشَاتٍ كُلُوا مِن مَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اٹھائی والے اور زمین سے لگے ہوئے کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۴۳﴾

قدموں پر وہ تمہارا دشمن ہے صریح

خلاصہ تفسیر

اور وہی (اللہ پاک) ہے جس نے باغات پیدا کئے وہ بھی جو ٹیڑیوں پر چڑھائے جاتے ہیں (جیسے انگور) اور وہ بھی جو ٹیڑیوں پر نہیں چڑھائے جاتے (یا تو اس لئے کہ سیدھا درخت نہیں جیسے تنہ دار درخت، یا باوجود سیدھا ہونے کے عادت نہیں، جیسے خرپڑہ، تر بوڑ وغیرہ) اور کھجور کے درخت اور کھیتی (بھی اس نے پیدا کئے) جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی (حاصل) ہوتی ہیں اور زیتون اور انار (بھی اسی نے پیدا کئے) جو (انار انار) باہم (اور زیتون زیتون باہم رنگ و مزہ و شکل و مقدار میں سے بعض صفات میں کبھی) ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور کبھی (ایک دوسرے کے مشابہ نہیں بھی ہوتے) اور اللہ نے ان چیزوں کو پیدا کر کے اجازت دی ہے کہ ان سب کی پیداوار کھاؤ (خواہ اسی وقت سے ہی) جب وہ نکل آوے (اور پکنے بھی نہ پاوے) اور البتہ اس کے ساتھ اتنا ضرور ہو کہ اس میں جو حق (شرع سے) واجب ہو (یعنی خیر خیرات) وہ اس کے کاٹنے (توڑنے) کے دن (مسکینوں کو) دیا کر داور (اس دینے میں بھی) حد (اذن شرعی) سے مت گزرو، یقیناً وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) حد (اذن شرعی) سے گزرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں اور (جس طرح باغ اور کھیت اللہ نے پیدا کئے ہیں، اسی طرح حیوانات بھی چنانچہ مویشی میں اونچے قدر کے (بھی) اور چھوٹے قدر کے بھی اُسی نے پیدا کئے، اور ان کے بارہ میں بھی مثل باغ اور کھیت کے اجازت دی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے (اور شرع سے حلال کیا ہے اس کو) کھاؤ اور (اپنی طرف سے تحریم کے احکام تراش کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، بلا شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے (کہ تم کو باوجود وضوح دلائل حق کے گمراہ کر رہا ہے)

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں مشرکین مکہ کی اس گمراہی کا ذکر تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے جانوروں اور اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں میں ان ظالموں نے اپنے خود تراشیدہ بے جان بے شعور بتوں کو اللہ تعالیٰ کا سا جھگی فتراٹے کر جو چیز وہ بطور عبادت یا صدقہ خیرات کئے نکالتے ہیں ان میں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کا اور دوسرا حصہ بتوں کا رکھتے ہیں، پھر اللہ کے حصہ کو بھی مختلف حیلوں حوالوں سے بتوں کے حصہ میں ڈالتے ہیں، اسی طرح کی اور بہت سی جاہلانہ رسموں کو شرعی قانون کی حیثیت دے رکھی ہے۔

مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نباتات اور درختوں کی مختلف قسمیں اور ان کے فوائد و ثمرات کی تخلیق میں اپنی قدرت کاملہ کے حیرت انگیز کمالات کا ذکر فرمایا اور دوسری آیت میں اسی طرح جانوروں اور مویشی کی مختلف قسموں کی پیدائش کا ذکر فرمایا کہ ان کی گمراہی پر متنبہ فرمایا کہ ان بے بصیرت لوگوں نے کیسے قادر مطلق علیم وخبیر کے ساتھ کیسے بے خبر بے شعور بے جان اور بے حس چیزوں کو اس کا شریک دسا بھی بنا ڈالا ہے۔

اور پھر ان کو صراطِ مستقیم اور صحیح راہِ عمل کی طرف ہدایت فرمائی، کہ جب ان چیزوں کے پیدا کرنے اور تم کو عطا کرنے میں کوئی سہیم و شریک نہیں تو عبادت میں ان کو شریک ٹھہرانا انتہائی کفرانِ نعمت اور ظلم ہے، جس نے یہ چیزیں پیدا کر کے تم کو عطا فرمائیں اور تمھارے لئے ایسا مسخر کر دیا کہ جس طرح چاہو ان کو استعمال کر سکو، اور پھر ان سب چیزوں کو تمھارے لئے حلال کر دیا، تمھارا فرض ہے کہ اس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے وقت اس کے حقِ شکر کو یاد رکھو، اور اگر و شیطانی خیالات اور جاہلانہ رسموں کو اپنا دین نہ بناؤ۔

پہلی آیت میں اَنْشَا کے معنی پیدا کیا اور مَعْرُوشَاتُ، عرش سے بنا ہے، جس کے معنی اٹھانے کے اور بلند کرنے کے ہیں، مراد معروشَات سے درختوں کی وہ بیلئیں ہیں جو ٹیٹوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسے انگور اور بعض ترکاریاں، اور اس کے بالمقابل غَيْرَ مَعْرُوشَات میں وہ سب درخت شامل ہیں جن کی بیلئیں اوپر نہیں چڑھائی جاتیں، خواہ وہ تنہ دار درخت ہوں جن کی بیل ہی نہیں یا بیل دار ہوں مگر ان کی بیلئیں زمین ہی پر پھیلی ہیں اور نہیں چڑھائی جاتیں، جیسے تر بوڑا خرپڑہ وغیرہ، اور نَخْل کے معنی کھجور کا درخت، اور زُرْع ہر قسم کی کھیتی، اور زَيْتُون درخت زیتون کو بھی کہتے ہیں اس کے پھل کو بھی، اور رَمَان انار کو کہا جاتا ہے۔

ان آیات میں حق تعالیٰ نے اول تو باغات میں پیدا ہونے والے درختوں کی دو قسمیں بیان فرمائیں، ایک وہ جن کی بیلئیں اوپر چڑھائی جاتی ہیں دوسری وہ جن کی بیلئیں چڑھائی نہیں جاتیں

اس میں اپنی حکمت بالغہ اور رمز قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک ہی مٹی اور ایک ہی پانی اور ایک ہی ہوا فضاء سے کیسے کیسے مختلف انداز کے پودے پیدا فرمائے، پھر ان کے پھلوں کی تیاری اور سبزی و شادابی اور ان میں رکھے ہوئے ہزاروں خواص و آثار کی رعایت سے کسی درخت کا مزاج ایسا کر دیا کہ جب تک بیل اوپر نہ چڑھے اوّل تو پھل آتا ہی نہیں، اور آ بھی جائے تو بڑھتا اور باقی نہیں رہتا، جیسے انگور وغیرہ، اور کسی کا مزاج ایسا بنا دیا کہ اس کی بیل کو اوپر چڑھانا بھی چاہو تو نہ چڑھے، اور چڑھ بھی جائے تو اس کا پھل کمزور ہو جائے جیسے خرپوزہ تر بوز وغیرہ، اور بعض درختوں کو مضبوط تمزوں پر کھڑا کر کے اتنا اونچا لے گئے کہ آدمی کی صنعت خستیار سے اتنا اونچا لے جانا عادتاً ممکن نہ تھا۔ اور درختوں کی نیس رنگی محض اتفاقی نہیں بلکہ بڑی حکمت کے ساتھ ان کے پھلوں کے مزاج کی رعایت سے ہے، بعض پھل زمین اور مٹی ہی میں بڑھتے اور پکتے ہیں، اور بعض کو مٹی لگنا خراب کر دیتا ہے بعض کے لئے اونچی شاخوں پر لٹک کر مسلسل تازہ ہوا کھانا، آفتاب کی کرنوں اور ستاروں کی شعاعوں سے رنگ حاصل کرنا ضروری ہے، ہر ایک کے لئے قدرت نے اس کے مناسب انتظام فرما دیا، **فستبارک اللہ حسن الخالقین۔**

اس کے بعد خصوصی طور پر نخل اور زرع یعنی کھجور کے درخت اور کھیتی کا ذکر فرمایا، کھجور کا پھل عام طور پر قفر سجا کھایا جاتا ہے، اور بوقت ضرورت اس سے پوری غذا کا کام بھی لیا جاسکتا ہے، اور کھیتی میں پیدا ہونے والی اجناس عموماً انسانوں کی غذا اور جانوروں کا چارہ حاصل کیا جاتا ہے، ان دونوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا **مُخْتَلِفًا أَلْوَانًا** اس میں اَلْوَان کی ضمیر زرع کی طرح بھی راجع ہو سکتی ہو اور نخل کی طرح بھی، چہرے اور دونوں ہی میں جنی ہیں کہ کھجوروں میں مختلف قسمیں اور ہر قسم کا مختلف ذائقہ ہے، اور کھیتی میں تو سیکڑوں قسمیں اور ہر قسم کے ذائقے اور فوائد مختلف ہیں، ایک ہی آب و ہوا ایک ہی زمین سے نکلنے والے پھلوں میں اتنا عظیم الشان تفاوت اور پھر ہر قسم کے فوائد اور خواص کا حیرت انگیز اختلاف اور تنوع ایک ادنیٰ بصیرت رکھنے والے انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ان کو پیدا کرنے والی کوئی ایسی مافوق قیاس ہستی ہے جس کے علم و حکمت کا اندازہ بھی انسان نہیں لگا سکتا۔

اس کے بعد دو چیزیں اور ذکر فرمائیں، **الزُّيُونُ** اور **الرَّطَّانُ** یعنی انار، زیتون کا پھل پھل بھی ہے ترکاری بھی، اور اس کا تیل سب تیلوں سے زیادہ صاف، شفاف اور نفیس ہونے کے ساتھ بے شمار فوائد و خواص پر مشتمل ہے، ہزاروں امراض کا بہترین علاج ہے، اسی طرح انار کے بے شمار فوائد و خواص ہیں، جن کو سب عوام و خواص جانتے ہیں، ان دونوں پھلوں کا ذکر کر کے فرمایا **مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ**، یعنی ان میں سے ہر ایک کے پھل کچھ ایسے ہوتے ہیں جو رنگ اور ذائقہ کے اعتبار سے ملے جلے... ایک جیسے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں

جن کے رنگ اور ذائقے مختلف ہوتے ہیں، اور یہ بعض دانوں کا رنگ و مزہ اور مقداریں یکساں اور بعض کا مختلف ہونا ان میں بھی پایا جاتا ہے، زمینوں میں بھی۔

ان تمام اقسام کے درختوں اور پھلوں کا ذکر فرما کر اس آیت میں انسان کو دو حکم دیئے گئے، پہلا حکم تو خود انسان کی خواہش اور نفس کے تقاضے کو پورا کرنے والا ہو، فرمایا كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ، یعنی ان درختوں اور کھیتوں کے پھلوں کو کھاؤ جب وہ پھل دار ہو جائیں، اس میں اشارہ فرما دیا کہ ان تمام انواع و اقسام کے درختوں کو پیدا کرنے سے پیدا کرنے والے مالک کو اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا نہیں بلکہ تمھارے ہی فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے، سو تمھیں خستیاں نہ ہو ان کو کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ، إِذَا أَثْمَرَ فرما کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ درختوں کی شاخوں اور لکڑیوں میں سے پھل نکال لانا تمھارے تو بس کا کام نہیں، جب وہ پھل باذن اللہ نکل آئیں تو ان کے کھانے کا اختیار اسی وقت حاصل ہو گیا خواہ وہ ابھی پکے بھی نہ ہوں۔

زمین کا عشر | دوسرا حکم یہ دیا گیا وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ، آؤ اس کے معنی ہیں، "لاؤ" یا "ادا کرو" اور حصاد کہتے ہیں "کھیتی کٹنے یا پھلوں کے توڑنے کے وقت کو" اور حَقُّ کی ضمیر ہر اس کھانے کی چیز کی طرف عائد ہر جن کا ذکر اوپر آیا ہے، معنی یہ ہیں کہ ان سب چیزوں کو کھاؤ پیرا استعمال کرو، مگر ایک بات یاد رکھو کہ کھیتی کاٹنے یا پھل توڑنے کے وقت اس کا حق بھی ادا کیا کرو، حق سے مراد غرباء و مساکین پر صدقہ کرنا ہے، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں عام الفاظ سے ارشاد ہوا:

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ	یعنی نیک بندوں کے اموال میں معلوم حق
لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ،	ہوتا ہو مانگنے والے اور نہ مانگنے والے فقراء
	و مساکین کا

مراد اس صدقہ سے عام صدقہ خیرات ہے، یا وہ صدقہ جو زمین کی زکوٰۃ یا عشر کہلاتا ہو، اس میں ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین کے دو قول ہیں، بعض حضرات نے پہلے قول کو اختیار فرمایا اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور زکوٰۃ کا فرضینہ ہجرت مدینہ طیبہ کے دو سال بعد عائد ہوا ہے، اس لئے یہاں حق سے مراد حق زکوٰۃ الارض نہیں ہو سکتا، اور بعض حضرات نے اس آیت کو مدنی آیات میں شمار فرمایا، اور حق سے مراد زمین کی زکوٰۃ اور عشر کو قرار دیا۔

اور امام تفسیر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اور ابن عربی اندلسی نے احکام القرآن میں اس کا فیصلہ اس طرح فرمایا ہے کہ آیت خواہ مکی ہو یا مدنی، دونوں صورتوں میں اس آیت سے زمین کی زکوٰۃ یعنی عشر مراد ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کا اصل حکم مکہ میں نازل ہو چکا تھا سورۃ مزمل کی آیت زکوٰۃ کے حکم پر مشتمل ہے، جو باتفاق مکی ہے، البتہ مقدار زکوٰۃ اور نصاب

کاتعین وغیرہ ہجرت کے بعد ہوا، اور اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیداوار پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حق عائد کیا گیا ہے، اس کی مقدار کی تعیین اس میں مذکور نہیں، اس لئے بحقیقت مقدار یہ آیت مجمل ہے، اور مکہ معظمہ میں اس تعیین مقدار کی یہاں ضرورت بھی اس لئے نہ تھی کہ وہاں مسلمانوں کو بطریق حاصل نہ تھا کہ زمینوں اور باغوں کی پیداوار سہولت کے ساتھ حاصل کر سکیں، اس لئے اس زمانہ میں تو رواج وہی رہا جو پہلے سے نیک لوگوں میں چلا آتا تھا، کہ کھیتی کاٹنے یا مچھل توڑنے کے وقت جو غریب غریب وہاں جمع ہو جاتے ان کو کچھ دیدیتے تھے، کوئی خاص مقدار معین نہ تھی، اسلام سے پہلے دوسری امتوں میں بھی کھیتی اور مچھلوں میں اس طرح کا صدقہ دینے کا رواج قرآن کریم کی آیت **إِنَّا بَنَكُم مِّنْهُم كَمَا بَنَكُم مِّنَّا أَصْحَابُ الْجَنَّةِ** میں مذکور ہے، ہجرت کے دو سال بعد جس طرح دوسرے اموال کے نصاب اور مقدار زکوٰۃ کی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحی الہی بیان فرمائی، اسی طرح زمین کی زکوٰۃ کا بیان فرمایا، جو حضرت معاذ بن جبل اور ابن عمر اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے تمام کتب حدیث میں منقول ہے **مَا سَقَتِ الشَّجَرَةُ فَفِيهِ الْعَشْرُ وَمَا سَقَى بِالشَّائِبَةِ فَنِصْفُ الْعَشْرِ**، یعنی یارانی زمینوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی سامان نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے، ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا واجب ہے، اور جو زمینیں کنودوں سے سیراب کی جاتی ہیں ان کی پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔

قانون زکوٰۃ میں شریعت اسلام نے ہر قسم کی زکوٰۃ میں اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے، کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ اور جتنی محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جاتے، یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد یارانی زمین کا نمبر ہے، جس میں محنت اور خرچ کم ہو کم ہی اس کی زکوٰۃ پانچویں حصہ سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا، اس کے بعد وہ زمین ہے جس کو کنوئیں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوٰۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی، یعنی بیسواں حصہ، اس کے بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مال تجارت ہے، جن کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔

قرآن کی آیت مذکورہ میں اور حدیث کی روایت مذکورہ میں زمین کی پیداوار کے لئے کوئی

نصاب معسر نہیں فرمایا، اسی لئے امام عظیم ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مذہب یہ ہے کہ زمین کی پیداوار خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ، بہر حال اس کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہے، قرآن کی آیت سورۃ بقرہ جس میں زمین کی زکوٰۃ کا ذکر ہے وہاں بھی اس کے لئے کوئی نصاب مذکور نہیں، ارشاد ہے:

<p>”یعنی خرچ کرو اپنی حلال کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہے“</p>	<p>أَنْفَقُوا مِنْ حَتِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ</p>
---	---

تجارتی اموال اور مولشی کے لئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاب بیان فرمادیا، کہ سارے یا دن تو لہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں چالیس بکریوں پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں، لیکن پیداوار زمین کے متعلق جو بیان اوپر کی حدیث میں آیا ہے اس میں کوئی نصاب نہیں بتلایا گیا، اس لئے ہر قلیل و کثیر میں سے زمین کی زکوٰۃ یعنی دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَلَا تَسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ، یعنی حد سے زائد خرچ نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتے، یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بلکہ جان بھی خرچ کر دے تو اس کو اسراف نہیں کہا جاسکتا، بلکہ حق کی ادائیگی کہنا بھی مشکل ہے، پھر اس جگہ اسراف سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ کسی خاص شعبہ میں اسراف کا نتیجہ عادیہ دوسرے شعبوں میں قصور و کوتاہی ہوا کرتا ہے، جو شخص اپنی خواہشات میں بے دریغ حد سے زائد خرچ کرتا ہے وہ عموماً دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے، یہاں اسی کوتاہی سے روکا گیا ہے، یعنی ایک طرف کوئی آدمی اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں لٹا کر خالی ہو بیٹھے تو اہل وادلاء اور رشتہ واردوں بلکہ خود اپنے نفس کے حقوق کیسے ادا کرے گا، اس لئے ہدایت یہ کی گئی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال سے کام لے تاکہ سب حقوق ادا ہو سکیں۔

ثَلَاثِينَ أَنْزَلَ مِنْ الصَّانِ ثَلَاثِينَ وَمِنْ الْمَعْنِ ثَلَاثِينَ ط

پیدا کئے آٹھ ہزار مادہ بھیڑ میں سے دو اور بھری میں سے دو

قُلْ أَلَا كَرِهَ حَرَّمَ أَمِ الْأَنْتَيْنِ أَمَّا اشْتَمَلَتْ

پوچھ تو کہ دونوں نہ حرام تھے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل

عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأَنْتَيْنِ نَبِيٌّ بَعْلَمُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ط

میں بچہ دان دونوں مادہ کے بتلاؤ مجھ کو سند اگر تم سچے ہو

وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آلَّذَا كَرِهْتُمْ

اور پیدا کئے اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو پوچھ تو دونوں نہ حرام کہو

حَرَّمَ آمَ الْإِثْنَيْنِ أَمَا اسْتَمَلْتُمْ عَلَيْهِ أَرْحَامَ الْإِثْنَيْنِ

ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل ہیں بچہ دان دونوں مادہ کے

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ وَصَّيْنَاكُمْ بِالْحَبْلِ فَلَمَّا أَنْظَلْنَا

کیا تم حاضر تھے جس وقت ہم کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا پھر اس سے زیادہ ظالم کون

مَنْ أَفْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا لِيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ

جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بلا تحقیق بیشک

اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۴﴾

اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو

خلاصہ تفسیر

(اور یہ مواشی جن میں تحلیل و تحریم کر رہے ہو) آٹھ تر و مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (ایک نہ ایک مادہ) اور بکری میں دو قسم (ایک نہ اور ایک مادہ) آپ (ان سے) کہتے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان (دونوں جانور کے) دونوں نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نہ ہو یا مادہ یعنی تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا تحریم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے) تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر (اپنے دعوے میں) سچے ہو یہ تو چھوٹے قد والے کے متعلق بیان ہوا آگے بڑے قد والوں کا بیان ہے کہ بھیڑ بکری میں بھی تر و مادہ پیدا کیا، جیسا بیان ہوا، اور (اسی طرح) اونٹ میں دو قسم (ایک نہ اور ایک مادہ) اور گائے (اور بھینس) میں دو قسم (ایک نہ اور ایک مادہ پیدا کئے) آپ (ان سے) اس باب میں بھی کہتے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (جانور کے) نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نہ ہو یا مادہ) اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ تم جو مختلف صورتوں سے تحریم کے مدعی ہو تو کیا اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے؟ اس پر کوئی دلیل قائم کرنا چاہئے، جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی رسول و فرشتہ کے واسطے سے ہو، سو مسئلہ نبوت و وحی سے تو تم کو انکار ہی ہے، اس شق کو تو اختیار کر نہیں سکتے، پس دوسرا

طریق دعویٰ کرنے کے لئے متعین ہو گیا کہ خود خدا تعالیٰ نے بلا واسطہ تم کو یہ احکام دیئے ہوں تو کیا تم (اس وقت) حاضر تھے جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو اس زتحريم و تحلیل کا حکم دیا (اور ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ بھی نہیں ہو سکتا، پس ثابت ہو گیا کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں) تو (بعد ثبوت اس امر کے کہ اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں یقینی بات ہے کہ) اس سے زیادہ کون ظالم (اور کاذب) ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر بلا دلیل (تحلیل و تحریم کے باب میں) جھوٹا ہمت لگائے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے (یعنی یہ شخص بڑا ظالم ہو گا اور) یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو (جنت کا) رستہ (آخرت میں) نہ دکھلاوے گا (بلکہ دوزخ میں بھیجے گا، پس یہ لوگ بھی اس جرم کی سزا میں دوزخ میں جاویں گے)۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ

تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہو کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھائے،

إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ

مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سور کا کہ وہ

رَجْسٌ أَوْ فَسَقًا أَهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمِنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ

ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر نام پکارا جادے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بھوکے بے اختیار

وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۴۵ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا

ہو جاؤ نہ مافرمانی کرو اور زیادتی کرو تو تیرا رب بڑا مہربان مہربان اور یہود پر ہم نے حرام کیا

حَرَّمَ مَنَاكِلَ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمَ مَنَا عَلَيْهِمْ

تھا ہر ایک ناخن والا جانور اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی

شَحْرُ مَهْمًا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا

ان کی چربی مگر جو لگی ہو پشت پر یا انتڑیوں پر یا جو چربی کہ ملی ہوئی ہو

أَخْتَلَطَ بِعَظِيمٍ ذَلِكَ جَزَايُهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝۱۴۶

ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی ان کی شرارت پر اور ہم سچ کہتے ہیں

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ

پھر اگر تجھ کو جھٹلاویں تو کہہ دے کہ تمھارے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے اور نہیں ٹلے گا

عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝۱۴۷

اس کا عذاب گنہگار لوگوں سے

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ جن حیوانات میں کلام ہو رہا ہے ان کے متعلق جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھاؤ (خواہ مرد ہو یا عورت) مگر ان چیزوں کو البتہ حرام پاتا ہوں وہ (یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو، یعنی جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جائے) یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو کیونکہ وہ (خنزیر) بالکل ناپاک ہے (اسی لئے اس کے سبب اجزاء نجس اور حرام ہیں ایسا نجس نجس العین کہلاتا ہے) یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو (اس طرح) کہ (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (سویہ سب حرام ہیں) پھر (بھی اس میں اتنی آسانی رکھی ہو کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو کھانے میں) طالب لذت ہو اور نہ (قدر ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان حرام چیزوں سے کھانے میں بھی اس شخص کو کچھ گناہ نہیں ہوتا) واقعی آپ کا رب (اس شخص کے لئے) غفور رحیم ہے (کہ ایسے وقت میں رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیزیں گناہ اٹھا دیا) اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی چربیوں ان (یہود) پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ (چربی مستثنیٰ تھی) جو ان (دونوں) کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو (چربی) ہڈی سے ملی ہوئی ہو (باقی سب چربی حرام تھی) سو ان چیزوں کی تحریم فی نفسہ مقصود نہ تھی بلکہ ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی تھی، اور ہم یقیناً سچے ہیں، پھر (اس تحقیق مذکور کے بعد بھی) اگر یہ (مشرکین) آپ کو (نعوذ باللہ اس مضمون میں صرف اس وجہ سے) کاذب کہیں (کہ ان پر عذاب نہیں آتا) تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے، (بعض حکمتوں سے جلدی مواخذہ نہیں فرماتا) اور (اس سے یوں نہ سمجھو کہ ہمیشہ یوں ہی بچے رہیں جب وہ وقت معین آجاوے گا پھر اس وقت) اس کا عذاب مجرم لوگوں سے (کسی طرح) نہ ملے گا۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا

اب کہیں گے مشرک اگر اللہ چاہتا تو مشرک نہ کرتے ہم اور نہ ہمارے باپ دادے

وَلَا حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ ط كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

اور نہ ہم حرام کر لیتے کوئی چیز اس طرح جھٹلایا کرتے ان سے اگلے

حَتَّىٰ ذَاقُوا بَاسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَ كُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَاط

یہاں تک کہ انھوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہو تمھارے پاس کہ اس کو ہمارے آگے ظاہر کرو

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ

تم تو نرمی اٹکل پر چلتے ہو اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو، تو کہہ دے

فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳۹﴾ قُلْ

پس اللہ کا الزام پورا ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا تم سب کو، تو کہہ کہ

هَلْ مَشْهَدٌ أَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَذَا أَج

لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو،

وَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدُ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ

پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو بھی تو اعتبار نہ کر ان کا اور نہ چل اُن کی خوشی برحقوں نے

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُمْ

جھٹلایا ہمارے حکموں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ اپنے

بِرَبِّهِمْ يَعِدُونَ ﴿۱۴۰﴾

رب کے برابر کرتے ہیں اور وہ اپنے

خلاصہ تفسیر

یہ مشرکین یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو بطور رضا کے یہ امر منظور ہوتا کہ ہم شرک اور تحریم نہ کریں، یعنی اللہ تعالیٰ عدم شرک و عدم تحریم کو پسند کرتے اور شرک و تحریم کو ناپسند کرتے (تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے) اور نہ ہم رادر نہ ہمارے بزرگ کسی چیز کو (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس شرک و تحریم سے ناراض نہیں) اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ استدلال اس لئے باطل ہے کہ مستلزم تکذیب رسال کو ہے، پس یہ لوگ رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جس طرح یہ کر رہے ہیں (اسی طرح جو کافر) لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا (خواہ دنیا میں جیسا اکثر کفار سابقین پر نزول عذاب ہوا ہو) یا مرنے کے بعد تو ظاہر ہی ہے، اور یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ان لوگوں کے کفریات کے مقابلہ

میں صرف قوی جواب اور مناظرہ پر اکتفا نہ کیا جاوے گا، بلکہ مثل کفار سابقین علی سزا بھی دی جاوے گی، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں، آگے دوسرے جواب دینے کے لئے ارشاد ہوا کہ آپ (ان سے) کہئے کہ کیا تمھارے پاس (اس مقدمہ پر کہ صدور کی قدرت دینا مستلزم رضا ہی کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو (اصل یہ ہے کہ دلیل وغیرہ کچھ بھی نہیں) تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں کرتے ہو (اور دونوں جواب دے کر) آپ (ان سے) کہئے کہ پس (دونوں جوابوں سے معلوم ہوا کہ) پوری حجت اللہ ہی کی رہی (اور تمھاری حجت باطل ہو گئی) پھر (اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم سب راہ پر آجاتے مگر اس کی توفیق خدا ہی کی طرف سے ہے) اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ (راست) پر لے آتا (مگر حق تعالیٰ کی بہت سے حکمتیں ہیں) کسی کو توفیق دی کسی کو نہیں دی، البتہ اظہار حق اور اعطاء خستیاں و ارادہ سب کے لئے عام ہے، آگے دلیل عقلی کے مطالبہ کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ (ان سے) کہئے کہ اپنی دلیل عقلی کا حال تو تم کو معلوم ہوا اچھا اب کوئی صحیح دلیل نقلی پیش کرو مثلاً) اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر (باقاعدہ) شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ ان (مذکورہ) چیزوں کو حرام کر دیا ہے، (باقاعدہ شہادت وہ ہے جو مبتنی ہو مشاہدہ پر یا ایسی دلیل قطعی پر جو افادہ یقین میں برابر ہو مشاہدہ کے، جیسا کہ آم گُتْمُ شَہِدَ اَعَاذُ وَ صُکْمُ اس طرف مشیر ہے) پھر اگر (اتفاق سے کسی کو فرضی جھوٹے گواہ بنا کر لے آویں اور) وہ (گواہ اس کی) گواہی (بھی) دیدیں تو (چونکہ وہ شہادت یقیناً بے قاعدہ اور محض سخن سازی ہوگی، کیونکہ مشاہدہ بھی مفقود اور مشاہدہ کا مماثل بھی مفقود، اس لئے) آپ اس شہادت کی سماعت نہ فرمائیے اور (جب ان کا کذب ہونا جیسا کہ وَلَا حَرَمْنَا اور کَذٰلِکَ کَذٰبٌ الْخٰلِ دال ہے اور منکر آخرت ہونا جیسا کہ بہت سی آیات دال ہیں اور مشرک ہونا جیسا کہ اَشْرَکُ دال ہے، ثابت ہو گیا تو اے مخاطب، ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا (جن کا بطلان ابھی ثابت ہو چکا) اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اسی سبب سے نظر رہ کر حق کی تلاش نہیں کرتے) اور وہ (استحقاق معبودت میں) اپنے رب کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی شرک کرتے ہیں)۔

قُلْ تَعَالَوْا اَنْتُمْ وَاٰلُكُمْ عَلٰی مَا حَرَّمَ رَبِّيَ لَا تَشْرِكُوْا بِهٖ

تو کہہ تم آؤ میں سادوں جو حرام کیا ہے تم پر تمھارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے

شَيْءًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

ساتھ کسی چیز کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو

إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَزَرُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ

مفلسی سے ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطْنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ

کے جو ظاہر ہو اس میں سے اور جو پوشیدہ ہو اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا ہو اللہ نے

إِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا

مگر حق پر تم کو یہ حکم کیا ہو تاکہ تم سمجھو اور پاس نہ

تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ

جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ بہتر ہو یہاں تک کہ پہنچ جاؤ اپنی جوانی کو

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لَا تَكِلِفُ نَفْسًا إِلَّا

اور پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں

وَسَعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ قَاعِدِلْوَا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ وَبِعَهْدِ

جس کی اس کو طاقت ہو اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریب ہی ہو اور اللہ کا عہد

اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾ وَأَنْ

پورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو اور حکم کیا کہ

هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو اور ملت چلو اور رستوں پر

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ

کہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستے سے یہ حکم کر دیا ہے تم کو تاکہ

تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾

تم بچتے رہو

خلاصہ تفسیر

آپ (ان سے) کہتے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر

حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں کہ ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ

(دوسری شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے

بُری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب (جیسا کہ جاہلیت میں غالب عادت تھی) قتل مت کیا کرو (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو (دونوں کو) رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمھارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں، پھر کیوں قتل کرتے ہو، پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہوں اور خواہ پوشیدہ ہوں (وہ طریقے یہی ہیں) اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق شرعی پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص میں یا رجم میں، پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکید حکم دیا ہے تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو کہ (شرعاً) مستحسن ہو (مثلاً اس کے کام میں لگانا، اس کی حفاظت کرنا، اور بعض اولیاء اور اوصیاء کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے من بلوغ کو پہنچ جاوے (اس وقت تک ان تصرفات مذکورہ کی بھی اجازت ہے) اور پھر اس کا مال اس کو دیدیا جاوے گا بشرط سفیہ نہ ہونے کے، پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور (ساتویں یہ کہ) زاپ اور تول پڑی پوری کیا کرو، انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے، اور نہ آوے، پس اس میں دغا کرنا حرام ہوا) اور یہ احکام کچھ دشوار نہیں کیونکہ (ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف (بھی) نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کیوں کی جاوے) اور (آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق کوئی) بات کیا کرو تو اس میں (انصاف کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو تمھارا) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جو قسم یا نذر بشرط اس کے مشروع ہونے کے) اس کو پورا کیا کرو (پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) ان (سب) کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکید حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ (بھی) کہہ دیجئے کہ کچھ انہیں احکام کی تخصیص نہیں بلکہ یہ دین (اسلام اور اس کے تمام احکام) میرا رستہ ہے (جس کی طرف میں باذن الہی دعوت دیتا ہوں) جو کہ (بالکل) مستقیم (اور راست) ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے (جس کی طرف میں دعوت کرتا ہوں) جدا (اور دور) کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکید حکم دیا ہے تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو۔

معارف و مسائل

ان آیات سے پہلے تقریباً دو تین رکوع میں مسلسل یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ غافل اور جاہل انسان نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے حکم الحاکمین کا نازل کیا ہوا قانون چھوڑ کر آبائی اور من گھڑت رسوم کو اپنا دین بنالیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا انکو جائز سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا تھا ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا، اور بعض چیزوں کو مردوں کے لئے جائز عورتوں کے لئے حرام بعض کو عورتوں کے لئے حلال مردوں کے لئے حرام قرار دیدیا۔

ان تین آیتوں میں ان چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، تفصیلی بیان میں تو چیزوں کا ذکر ہے، اس کے بعد دسواں حکم اس طرح بیان فرمایا گیا کہ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ، یعنی یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے، اس پر چلو، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوئے اور بتلائے ہوئے دین و شریعت کی طرف اشارہ کر کے تمام حلال و حرام اور جائز و ناجائز، مکروہ و مستحب چیزوں کی تفصیلات کو اس کے حوالہ کر دیا کہ شریعت محمدیہ نے جس چیز کو حلال بتلایا اس کو حلال اور جس کو حرام قرار دیا اس کو حرام سمجھو، اپنی طرف سے حلال و حرام کے فیصلے نہ کرتے پھرو۔

پھر جن دس چیزوں کا تفصیلی بیان ان آیات میں آیا ہے ان میں اصل مقصد تو حرام چیزوں کا بیان کرنا ہے، جس کا مقتضی یہ تھا کہ ان سب کو بصیغہ ہنی ممانعت کرنے کے عنوان سے بیان کیا جاتا، لیکن قرآن کریم نے اپنے خاص حکیمانہ اسلوب کے ماتحت ان میں سے چند چیزوں کو ایجابی طور پر بصیغہ امر بیان فرمایا ہے، اور مراد یہ ہے کہ اس کے خلاف کرنا حرام ہے (کشاف) اس کی حکمت آگے معلوم ہو جائے گی، وہ دس چیزیں جن کی حرمت کا بیان ان آیات میں آیا ہے یہ ہیں:-

اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت و اطاعت میں کسی کو سا جھی ٹھہرانا، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا، فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا، بے حیائی کے کام کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا، ناپ تول میں کمی کرنا، شہادت یا فیصلہ یا دوسری کلام میں بے انصافی کرنا، اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا۔

آیات مذکورہ کی اہم خصوصیات | کعب احبار جو تورات کے ماہر عالم ہیں پہلے یہودی تھے، پھر

مسلمان ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ آیات جن میں دس حرام چیزوں کا بیان ہے، اللہ کی کتاب
تورات بسم اللہ کے بعد انہی آیات سے شروع ہوتی ہے (انتہی) اور کہا گیا ہے کہ یہی وہ دس
کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہی وہ آیات محکمات ہیں جن کا
ذکر سورۃ آل عمران میں آیا ہے کہ جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم
تک تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متفق رہی ہیں ان میں سے کوئی چیز کسی مذہب و ملت
اور کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئی (تفسیر بحر محیط)

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہو
علیہ وسلم کا وصیت نامہ ہیں

دیکھنا چاہیے جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہو تو وہ ان آیات کو پڑھ لے، ان میں وہ وصیت موجود ہے
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی اُمت کو دی ہے۔

اور حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا: ”کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے،“
پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ: ”جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا تو اس کا اجر
اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا۔“

اب ان دس چیزوں کا تفصیلی بیان اور تینوں آیتوں کی تفسیر دیکھئے؛ ان آیات کی ابتدا
اس طرح کی گئی ہے: قُلْ تَعَالَوْا أَقْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّي عَلَيْكُمْ، اس میں تَعَالَوْا کا ترجمہ
”آ جاؤ“ اور اصل میں یہ کلمہ ایسے وقت بولا جاتا ہے جبکہ کوئی بلانے والا بلند جگہ کھڑا ہو کر نیچے
والوں کو اپنے پاس بلائے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس دعوت کو قبول کرنے
میں ان لوگوں کے لئے برتری اور بلندی ہے، معنی یہ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
خطاب کر کے فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ آ جاؤ تاکہ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سنا دوں
جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہیں، یہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا پیغام ہے، اس میں
کسی کے ظن و تخمین یا قیاس کا دخل نہیں، تاکہ تم ان سے بچنے کا اہتمام کرو اور فضول اپنی طرف
سے اللہ کی حلال چیزوں کو حرام کرتے نہ پھرو۔

اس آیت کا خطاب اگرچہ بلا واسطہ مشرکین مکہ کی طرف ہے، مگر مضمون خطاب عام ہے،
اور تمام بنی نوع انسان کو شامل ہے خواہ مؤمن ہوں یا کافر، عرب ہوں یا عجم، اور موجودہ
حاضرین ہوں یا آئندہ آنے والی نسلیں (بحر محیط)

سب سے پہلا گناہ عظیم شرک ہو | اس اہتمام کے ساتھ خطاب کر کے محرمات و ممنوعات کی فہرست میں سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا **لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا**، یعنی سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور سا بھی نہ سمجھو، نہ مشرکین عرب کی طرح بتوں کو خدا بنادو، نہ یہود و نصاریٰ کی طرح انبیاء کو خدا یا خدا کا بیٹا کہو، نہ دوسروں کی طرح فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دو، نہ جاہل عوام کی طرح انبیاء و اولیاء کو صفتِ علم و قدرت میں اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراؤ، شرک کی تعریف اور | اور تفسیر منظری میں ہے کہ لفظ **شَيْئًا** کے معنی یہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کی قسمیں | شرک کی کسی قسم جلی یا خفی میں مبتلا نہ ہو، شرک جلی کو تو سب جانتے ہیں کہ کسی غیر اللہ کو عبارت اور اطاعت میں یا اس کی مخصوص صفات میں اللہ تعالیٰ کے برابر یا اس کا سا بھی قرار دینا ہے، اور شرک خفی یہ ہے کہ اپنے کاروبار اور... دینی دنیوی مقاصد میں اور نفع نقصان میں اگرچہ عقیدہ تو یہی ہو کہ کارساز اللہ تعالیٰ ہے، مگر عملاً دوسروں کو کارساز سمجھے اور ساری کوششیں دوسروں ہی سے وابستہ رکھے، یا عبادات میں ریاکاری کرے کہ دوسروں کو دکھانے کے لئے نماز وغیرہ کو درست کر کے پڑھے، یا صدقہ خیرات نام آوری کے خیال سے کرے، یا عملاً نفع نقصان کا مالک کسی غیر اللہ کو قرار دے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے :

دریں نوع از شرک پوشیدہ است ؛ کہ زیدم بہ بخشید و عمرم بخت
یعنی اس میں بھی ایک قسم کا شرک چھپا ہوا ہے کہ آدمی یوں سمجھے کہ مجھے زید نے کچھ بخش دیا اور عمر نے نقصان پہنچا دیا، بلکہ حقیقت اس کے سوا نہیں کہ بخشش یا نقصان جو کچھ ہے وہ قادرِ مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، زید اور عمر پر دے ہیں جن کے اندر سے بخشش یا نقصان کا ظہور ہوتا ہو ورنہ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اگر ساری دنیا کے جن و انس مل کر تم کو کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے مقدر نہیں فرمایا تو مجال نہیں کہ پہنچا سکیں، اسی طرح اگر ساری دنیا کے جن و انس مل کر تم کو کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا تو یہ بھی کسی سے ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شرک جلی اور خفی دونوں سے انتہائی پرہیز کرنا چاہئے، اور شرک میں جس طرح بتوں وغیرہ کی پوجا پاٹ داخل ہے، اسی طرح انبیاء و اولیاء کو علم و قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا بھی شرک میں داخل ہے، اگر خدا نخواستہ کسی کا عقیدہ ہی ایسا ہو تو شرک جلی ہی، اور عقیدہ نہ ہو مگر عمل اس طرح کا ہے تو شرک خفی کہلاتے گا، اس مقام میں سب سے پہلے شرک سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ شرک ایسا جرم ہے جس کے

متعلق قرآن کا فیصلہ ہو کہ اس کی معافی نہیں، اس کے سوا دوسرے گناہوں کی معافی مختلف اسباب سے ہو سکتی ہے، اسی لئے حدیث میں بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ و حضرت ابوالدرداءؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو سا بھی نہ قرار دو، اگرچہ تمھارے ٹکڑے کر دیے جائیں، یا تمھیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا تمھیں زندہ جلادیا جائے۔

دوسرا گناہ والدین اس کے بعد دوسری چیز یہ ارشاد فرمائی: **وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِحْسَانًا**، یعنی سے پسو کی ہے والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ اور اچھا برتاؤ کرو، مقصد تو اس جگہ یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرو، ان کو ایذا نہ پہنچاؤ، مگر حکیمانہ انداز سے بیان اس طرح کیا گیا کہ والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، اس میں اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ والدین کے حق میں صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ان کی نافرمانی نہ کرو اور ایذا نہ پہنچاؤ، بلکہ حسن سلوک اور نیاز مندانا برتاؤ کے ذریعہ ان کو راضی رکھنا اور خوش کرنا فرض ہے، جس کا بیان دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے: **وَإِنْ خِفْتُمْ لَهْمَا بَحْتًا مِّنَ الدُّنْيَا**، یعنی ان کے سامنے اپنے بازو دنیا زندانہ طور پر پست کرو۔

اس آیت میں والدین کو ایذا پہنچانے اور تکلیف دینے کو شرک کے بعد دوسرے غیر کا جرم قرار دیا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کی اطاعت اور راحت رسائی کو اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا ہے:

وَقَضَىٰ رَبِّيَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا
إِيَّاهُ وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِحْسَانًا

یعنی آپ کے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ
اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور
والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

إِنِ اشْكُرْتُمْ لِي وَلِوَالِدَيْكُمْ
إِلَى الْمَصِيدِ

یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا
پھر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل اور بہتر عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کو اس کے وقت (محب) میں پڑھنا، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک"۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا عمل ہے؟ فرمایا: اللہ کے رستہ میں جہاد۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے تین مرتبہ فرمایا رَحِمَہُ اَنْفُکَ رَحِمَہُ اَنْفُکَ رَحِمَہُ اَنْفُکَ، یعنی ذلیل ہو گیا، ذلیل ہو گیا، ذلیل ہو گیا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کون ذلیل ہو گیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانہ میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی ہے بڑا محروم و ذلیل ہے وہ شخص جس نے اتنی سستی جنت کو ہاتھ سے کھو دیا، سستی اس لئے کہ والدین جو اولاد پر طبعی طور سے خود ہی مہربان ہوتے ہیں وہ ذرا سی خدمت سے بہت خوش ہو جاتے ہیں، ان کا خوش رکھنا کسی بڑے عمل کا محتاج نہیں، اور بڑھاپے کی قید اس لئے کہ جس وقت والدین تندرست اور قوی ہیں، اور اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں بلکہ اولاد کی بھی مالی اور جانی امداد کر دیتے ہیں اُس وقت تو نہ خدمت کے وہ محتاج ہیں نہ اس خدمت کا کوئی خاص وزن ہے، قابل قدر خدمت اس وقت ہی ہو سکتی ہے جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہوں۔

تیسرا حرام قتل اولاد | تیسری چیز جس کا حرام ہونا ان آیات میں بیان ہوا ہے وہ قتل اولاد ہے، اور مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے ماں باپ کے حق کا بیان تھا جو اولاد کے ذمہ ہے اور اس میں اولاد کے حق کا بیان ہے جو ماں باپ کے ذمہ ہے اولاد کے ساتھ بدسلوکی کا بدترین معاملہ وہ تھا جو جاہلیت میں اس کو زندہ درگور کرنے یا قتل کرنے کا جاری تھا، اس آیت میں اس سے روکا گیا۔ ارشاد فرمایا وَلَا تَقْتُلُواْ اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ طَنَحْنُ نَرَسًا قُتِلَکُمْ وَاِیَّاهُمْ، یعنی افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کر دہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی۔

جاہلیت کے زمانہ میں بے رحمی اور سنگدلی کی یہ بدترین رسم چل پڑی تھی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو اس عار کے خوف سے کہ کسی کو داماد بنانا پڑے گا زندہ کو گڑھے میں دفن کر دیتے تھے، اور بعض اوقات اس خوف سے کہ اولاد کے لئے ضروریات زندگی اور کھانے پینے کا سامان جمع کرنے میں مشکلات پیش آئیں گی، یہ سنگدل لوگ اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے، قرآن کریم نے اس رسم کو مٹایا، اور چوارشاد اوپر مذکور ہوا، اس میں ان کے اس ذہنی مرض کا بھی علاج کر دیا، جس کے سبب وہ اس بدترین جرم کے مرتکب ہوتے تھے کہ بچوں کو کھانا کہاں سے کھلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلادیا کہ کھانا کھلانے اور رزق پہنچانے کے اصل ذمہ دار تم نہیں، یہ کام براہ راست حق تعالیٰ کا ہے، تم خود اپنے رزق اور کھانے میں بھی اسی کے محتاج ہو، وہ دیتا ہے تو تم بچوں کو بھی دیدیتے ہو، وہ اگر تمہیں نہ دے تو تمہاری کیا مجال ہے کہ ایک دانہ گیہوں یا چاول کا خود پیدا کر لو، زمین کے اندر سے بیج کو ایک کونسل کی صورت میں منوں مٹی کو چیر بھاڑ کر نکالنا پھر اس کو درخت کی صورت دینا، پھر اس پر پھول پھل لگانا کس کا کام ہو؟

کیا ماں باپ یہ کام کر سکتے ہیں؟ یہ تو سب قادر مطلق کی قدرت و حکمت کے کرشمے ہیں، انسان کے عمل کا اس میں کیا دخل ہو وہ تو صرف اتنا کر سکتا ہے کہ زمین کو نرم کر دے اور درخت نکلے تو پانی دیدے، اور اس کی حفاظت کر لے، مگر پھل پھل پیدا کرنے میں تو اس کا ادنیٰ دخل نہیں، معلوم ہوا کہ ماں باپ کا یہ تصور غلط ہے کہ ہم بچوں کو رزق دیتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے خزانہ غیب کے ماں باپ کو بھی ملتا ہے، اولاد کو بھی، اسی لئے اس جگہ ماں باپ کے ذکر کو مقدم کر کے فرمایا کہ ہم تم کو بھی رزق دیں گے اور ان کو بھی، اس تفسیر میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ تم کو رزق اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم بچوں کو پہنچاؤ، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **إِنَّمَا تُنَصَّرُونَ وَتُرْسَلُونَ بِضَعْفَاءٍ كَثْرٍ**، یعنی تمہارے کمزور لوگوں کے طفیل میں اللہ تعالیٰ تمہاری بھی مدد فرماتے ہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں سورۃ النمر میں بھی یہی مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے، مگر وہاں رزق کے معاملہ میں اولاد کو مقدم ذکر فرمایا **تَحْتَ مَرَسَاتِهِمْ**، یعنی ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور نعم کو بھی، اس میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ رزق دینے کے پہلے مستحق ہمارے نزدیک و ضعیف بچے ہیں جو خود کچھ نہیں کر سکتے، انہی کی خاطر تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔

اولاد کی تعلیمی و اخلاقی تربیت قبل اولاد کا جرم اور سخت گناہ ہونا جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے نہ کرنا اور بیدینی کے لئے آزاد چھوڑ دینا بھی ایک طرح قتل اولاد ہے۔ وہ ظاہری قتل کرنے اور مار ڈالنے کے لئے تو ظاہر ہی ہے، اور غور کیا جائے تو اولاد کو تعلیم و تربیت نہ دینا جس کے نتیجہ میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کی فکر سے غافل رہے، بد اخلاقیوں اور بے حیائیوں میں گرفتار ہو رہے ہیں قتل اولاد سے کم نہیں، قرآن کریم نے اس شخص کو مردہ قرار دیا ہے جو اللہ کو نہ پہچانے، اور اس کی اطاعت نہ کرے، آیت **أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ** میں اسی کا بیان ہے، جو لوگ اپنی اولاد کے اعمال و اخلاق کے درست کرنے پر توجہ نہیں دیتے ان کو آزاد چھوڑتے ہیں یا ایسی غلط تعلیم دلاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی اخلاق تباہ ہوں وہ بھی ایک حیثیت سے قتل اولاد کے مجرم ہیں، اور ظاہری قتل کا اثر تو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کو تباہ کرتا ہے، یہ قتل انسان کی اخروی اور دائمی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔

چوتھا حرام بے حیائی کا کام ہے | چوتھی چیز جس کے حرام ہونے کا ان آیات میں بیان ہوا ہے حیاتی کے کام میں، اس کے متعلق ارشاد فرمایا **لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ**، یعنی بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مست جاؤ خواہ وہ علانیہ ہو، یا پوشیدہ۔ **فَوَاحِشٌ**، فاحشہ کی جمع ہے، اور لفظ فحش، فحشاء اور فاحشہ سب مصدر ہیں جن کا اردو

میں ترجمہ بے حیائی سے کیا جاتا ہے، اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے بُرے کام کے لئے یہ لفظ بولے جاتے ہیں جس کی بُرائی اور فساد کے اثرات بُرے ہوں اور دور تک پہنچیں، ایم راغب نے ... مفردات القرآن میں اور ابن اثیر نے نہایہ میں یہی معنی بیان فرمائے ہیں، قرآن کریم میں جا بجا فحش اور فحشاء کی ممانعت وارد ہوئی ہے ایک آیت میں ارشاد ہے یَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، ایک جگہ ارشاد ہے حَرَّمَ رِبِّیَ الْفَوَاحِشَ وَغَیْرَہ۔

فحش اور فحشاء کے اس مفہوم عام میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ اقوال سے متعلق ہوں یا افعال سے اور ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن اور قلب سے، بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ بھی سب اس میں داخل ہیں، اسی لئے عام زبانوں پر یہ لفظ بدکاری کے معنی میں بولا جاتا ہے، قرآن کی اس آیت میں فواحش کے قریب جانے سے بھی روکا گیا ہے، اس کو اگر مفہوم عام میں لیا جائے تو تمام بُری خصلتیں اور گناہ خواہ زبان کے ہوں خواہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کے، اور خواہ دل سے متعلق ہوں، سبھی اس میں داخل ہو گئے، اور اگر مشہور عوام معنی بے حیائی کے لئے جاویں تو اس کے معنی بدکاری اور اس کے مقدمات اور اسباب مراد ہوں گے۔

پھر اسی آیت میں فواحش کی تفسیر میں یہ بھی فرمایا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، پہلی تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے تمام گناہ مراد ہوں گے، اور باطنی فواحش سے مراد وہ گناہ ہوں گے جو دل سے متعلق ہیں، جیسے حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ اور دوسری تفسیر کے مطابق ظاہری فواحش سے مراد وہ بے حیائی کے کام ہوں گے جن کو علانیہ کیا جاتا ہے، اور باطنی وہ جو چھپا کر کئے جاویں، کھلی بدکاری میں اس کے مقدمات و لوازمات سب داخل ہیں، بدنیتی سے کسی عورت کی طرف دیکھنا، ہاتھ وغیرہ سے چھونا، اس سے اس طرح کی باتیں کرنا سب اس میں داخل ہیں، اور باطنی بے حیائی میں وہ خیالات اور ارادے اور ان کو پورا کرنے کی خفیہ تدبیریں داخل ہیں جو کسی بے حیائی اور بدکاری کے سلسلہ میں عمل میں لائی جاتیں۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فواحش سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا بُرا ہونا عام طور پر مشہور و معلوم ہے اور سب جانتے ہیں، اور باطنی فواحش سے مراد وہ افعال ہیں جو اللہ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں، اگرچہ عام طور پر ان کو لوگ بُرا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، مثلاً بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑا یا کسی ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار سے تمام ظاہری اور

باطنی گناہوں کو اور مشہور عام مفہوم کے اعتبار سے بدکاری دے حیاتی کے جتنے طریقے کھلے یا چھپے ہوئے ہیں ان سب کو شامل ہے، اور حکم اس میں یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ، پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور ایسے مقامات سے بھی بچو جہاں جا کر اس کا خطرہ ہو کہ ہم گناہ میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ایسے کاموں سے بھی بچو جن سے ان گناہوں کا راستہ نکلتا ہو، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ حَامَ حَوْلَ حَيٍّ أَوْ شَيْءٍ أَنْ يَفْعَ رَفِيْدَهُ،
یعنی جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا
ہو تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہو جائے

اس لئے احتیاط کا مقتضی یہی ہے کہ جس جگہ کا داخل ممنوع ہے اس جگہ کے ارد گرد بھی نہ پھرے
پانچوں حرام قتل ناحق ہے | محرمات میں سے پانچوں چیز قتل ناحق ہے، اس کے متعلق ارشاد فرمایا
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، یعنی جس شخص کا خون اللہ نے حرام کر دیا ہے
اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر، اور اس حق کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث
میں بیان فرمائی ہے جو بروایت عبداللہ بن مسعود بخاری و مسلم نے نقل کی ہے وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ کسی
مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر تین چیزوں سے، ایک یہ کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری
میں مبتلا ہو جائے، دوسرے یہ کہ اس نے کسی کو ناحق قتل کر دیا ہو، اس کے قصاص میں مار جائے،
تیسرے یہ کہ اپنا دین حق چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہو۔

حضرت عثمان غنیؓ جس وقت باغیوں کے نزع میں محصور تھے، اوڑ لوگ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے
اس وقت بھی حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو یہ حدیث سنا کر کہا کہ بھلا اللہ میں ان تینوں چیزوں سے
بریں ہوں، میں نے زمانہ اسلام میں تو کیا زمانہ جاہلیت میں بھی بدکاری نہیں کی، اور نہ میں نے
کسی کو قتل کیا، اور نہ کبھی میرے دل میں یہ دوسوہ آیا کہ میں اپنے دین اسلام کو چھوڑ دوں، پھر تم مجھے
کس بنا پر قتل کرتے ہو؟

اور بے وجہ قتل کرنا چھپے مسلمان کا حرام ہے اسی طرح اس غیر مسلم کا قتل بھی ایسا ہی
حرام ہے جو کسی اسلامی ملک میں ملک کے قانون کا پابند ہو کر رہتا ہے، یا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو
ترمذی اور ابن ماجہ میں بروایت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے
کہ جو کسی ذمی غیر مسلم کو قتل کر دے اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا، اور جو شخص اللہ کے عہد کو
توڑ دے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔
اس ایک آیت میں دس میں سے پانچ حرام و ناجائز چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا
ذَلِكُمْ وَضَعَكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، یعنی ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکید حکم دیا ہے

تاکہ تم سمجھو۔

چھٹا حرام، یتیم کا مال
نا جائز طور پر کھانا

دوسری آیت میں چھٹا حکم یتیم کا مال نا جائز طور پر کھانے کی حرمت کے متعلق ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِاتِّبَاعِ حَسَنٍ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ۔

یعنی یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ اس میں یتیم نابالغ بچوں کے ولی اور پالنے والے کو خطاب ہے، کہ وہ ان کے مال کو ایک آگ سمجھیں اور نا جائز طور پر اس کے کھانے اور لینے کے پاس بھی نہ جائیں، جیسا کہ دوسری ایک آیت میں اپنی الفاظ کے ساتھ آیا ہے، کہ جو لوگ یتیموں کا مال نا جائز طور پر ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔

البتہ یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اور کسی ایسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر بڑھانا جس میں نقصان کا خطرہ عادتاً نہ ہو، یہ طریقہ مستحسن اور ضروری ہے، یتیموں کے ولی کو ایسا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد مال یتیم کی حفاظت کی ذمہ داری کی حد بتلا دی حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ، یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے تو ولی کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔ لفظ اشد کے اصل معنی قوت کے ہیں، اور اس کی ابتدا جمہور علماء کے نزدیک بالغ ہو جانے سے ہو جاتی ہے، جس وقت بچہ میں آثار بلوغ پائے جاتیں یا اس کی عمر پندرہ سال کی پوری ہو جائے، اس وقت اس کو شرعاً بالغ قرار دیا جائے گا۔

البتہ بالغ ہو جانے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں اپنے مال کی حفاظت اور صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو یا نہیں، اگر صلاحیت دیکھی جائے تو بالغ ہوتے ہی اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر یہ صلاحیت ابھی اس میں موجود نہیں تو پچیس سال کی عمر تک مال کی حفاظت ولی کے ذمہ ہے، اس درمیان میں جس وقت بھی اس کو مال کی حفاظت اور کاروبار کی لیاقت پیدا ہو جائے تو مال اس کو دیا جاسکتا ہے، اور اگر پچیس سال تک بھی اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو تو پھر امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا مال بہر حال اس کو دیدیا جائے، بشرطیکہ اس کی یہ عدم صلاحیت دیوانگی اور جنون کی حد تک نہ پہنچی ہو، اور بعض ائمہ کے نزدیک اس وقت بھی مال اس کو سپرد نہ کیا جائے، بلکہ قاضی شرعی اس کے مال کی حفاظت کسی ذمہ دار آدمی کے سپرد کر دے۔

یہ مضمون قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے ماخوذ ہے، جس میں فرمایا ہے: فَإِنِ انْتَهَبْتُمْ عَنْهُم مِّرْثَتَهُمْ فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ، یعنی یتیم بچوں میں بالغ ہونے کے بعد اگر تم یہ صلاحیت دیکھو کہ وہ اپنے مال کی خود حفاظت کر سکتے ہیں اور کسی کاروبار میں لگا سکتے ہیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو، اس آیت نے بتلایا کہ صرف بالغ ہونا مال سپرد کرنے کے لئے کافی

نہیں، بلکہ مال کی حفاظت اور کاروبار کی قابلیت شرط ہے۔

ساتواں حرام ناپ تول میں کمی | ساتواں حکم اس آیت میں ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرنے کا ہے
انصاف کا مطلب یہ ہے کہ دینے والا دوسرے فریق کے حق میں کوئی کمی نہ کرے اور لینے والا اپنے حق سے زیادہ نہ لے (روح المعانی)

چیزوں کے لین دین میں ناپ تول میں کمی زیادتی کو قرآن نے شدید حرام قرار دیا ہے، اور اس کے خلاف کرنے والوں کے لئے سورۃ مطففین میں سخت وعید آئی ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو تجارت میں ناپ تول کا کام کرتے ہیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ناپ اور تول یہ وہ کام ہیں جن میں بے انصافی کرنے کی وجہ سے تم سے پہلے کئی امتیں عذاب الہی کے ذریعے تباہ ہو چکی ہیں (تم اس میں پوری احتیاط سے کام لو) (تفسیر ابن کثیر)

افسروں، ملازموں، مزدوروں کا اپنی مقررہ ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنے کے حکم میں ہے

یاد رہے کہ ناپ تول کی کمی جسکو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ کسی کے ذمہ دوسرے کا جو حق ہے اس میں کمی کرنا بھی تطفیف میں داخل ہے جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تو نے تطفیف کر دی یعنی جو حق واجب تھا وہ ادا نہیں کیا، اس کو نقل کر کے امام مالکؒ فرماتے ہیں لَکِنَّ شَيْءًا وَقَاءَ وَتَطْفِيفٌ، یعنی حق کا پورا دینا اور کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے، صرف ناپ تول میں ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو ملازم اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کرتا، وقت چراتا ہے، یا کام میں کوتاہی کرتا ہے، وہ کوئی وزیر و امیر ہو یا معمولی ملازم، اور وہ کوئی دفتر میں کام کرنے والا ہو یا علمی اور دینی خدمت، جو حق اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی کرے تو وہ بھی مطففین میں داخل ہے، اسی طرح مزدور جو اپنی مقررہ خدمت میں کوتاہی کرے وہ بھی اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد فرمایا لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا، یعنی ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے، بعض روایات حدیث میں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے حق اختیار تک ناپ تول کا پورا پورا حق ادا کرے تو اگر اس کے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی معمولی کمی بیشی ہو جائے تو وہ معاف ہے، کیونکہ وہ اس کی قدرت و اختیار سے خارج ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس جملہ کا اضافہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ ارادے حق کے وقت احتیاط اس میں ہے کہ کچھ زیادہ دیدیا جائے، تاکہ کمی کا شبہ نہ رہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک ایسے ہی موقع پر وزن کرنے والے کو حکم دیا کہ **ذِقْ وَادْرِجْ**۔ یعنی تولو اور جھکتا ہوا تولو، (راحمہ اللہ) اور اود، ترمذی، بروایت سوید بن قیسؓ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہی تھی کہ جس کسی کا کوئی حق آپ کے ذمہ ہوتا، تو اس کے ادا کرنے کے وقت..... اس کے حق سے زائد ادا فرمانے کو پسند فرماتے تھے، اور بخاری کی ایک حدیث میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے، بلکہ کچھ معمولی کمی بھی ہوتی راضی ہو جائے،

مگر یہ حکم حسنلاقی ہے کہ دینے میں زیادہ دے اور لینے میں کم بھی ہو تو جھگڑا نہ کرے، قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر مجبور ہو، اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے، یعنی دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی جبری حکم نہیں، کیونکہ ہم لوگوں کو ایسا کرنا آسان نہیں آٹھواں حکم عدل و انصاف ہے | ارشاد فرمایا **وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ**، یعنی جب تم اس کے خلاف کرنا حرام ہے | بات کہو تو حق کی کہو، اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو، اس جگہ کسی خاص

بات کا ذکر نہیں، اسی لئے جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے، خواہ وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ یا آپس میں مختلف قسم کی گفتگو ان سب میں ارشاد قرآنی یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال بات کرتے ہوئے حق و انصاف کا خیال رہنا چاہئے، کسی مقدمہ کی گواہی یا فیصلہ میں حق و انصاف قائم رکھنے کے معنی ظاہر ہیں، کہ گواہ کو جو بات یقینی طور پر معلوم ہو وہ اپنی طرف سے کسی لفظ کی کمی بیشی کے بغیر جتنا معلوم ہے صاف صاف کہہ دے، اپنی انگلی اور گمان کو دخل نہ دے، اور اس کی فکر نہ کرے کہ اس سے کس کو فائدہ پہونچے گا، اور کس کو نقصان، اسی طرح کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے تو گواہوں کو شرعی اصول پر جانچنے کے بعد جو کچھ ان کی شہادت سے نیز دوسری قسم کے قرائن سے ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گواہی اور فیصلہ دونوں میں نہ کسی کی دوستی اور محبت حق بات کہنے سے مانع ہو، اور نہ کسی کی دشمنی اور مخالفت، اسی لئے اس جگہ یہ جملہ بڑھایا گیا **وَإِذَا قُرْبَىٰ**، یعنی اگرچہ وہ آدمی جس کے مقدمہ کی شہادت دینا یا فیصلہ کرنا ہے وہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو تب بھی حق و انصاف کو نہ گواہی میں ہاتھ سے جانے دو اور نہ فیصلہ میں۔

مقصود اس آیت میں جھوٹی گواہی اور حق کے خلاف فیصلہ سے روکنا ہے، جھوٹی گواہی کے

متعلق ابوداؤد اور ابن ماجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:
 ”جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے، تین مرتبہ فرمایا، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا
 الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ حَقًّا عَالِدًا غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ
 یعنی بت پرستی کے گندہ عقیدہ سے بچو اور جھوٹ بولنے سے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک
 نہ بناتے ہوئے“

اسی طرح حق کے خلاف فیصلہ کرنے کے بارے میں ابوداؤد نے بروایت حضرت بریدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ
 کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

”قاضی یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے (تین قسم کے ہیں، ان میں سے ایک جنت
 میں جائے گا، اور دو جہنم میں جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کر کے حق کو
 پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کر کے حق بات کو جان
 تو لیا، مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے، اور اسی طرح وہ
 قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور فکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دیدیا وہ بھی
 جہنم میں جائے گا“

قرآن مجید کی دوسری آیات میں اسی مضمون کو اور بھی زیادہ وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا گیا کہ
 کہ شہادت یا فیصلہ میں کسی کی دوستی، قرابت اور تعلق کا یا دشمنی اور مخالفت کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے،
 جیسے ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوَالِدَا الدِّينِ وَالْآقَرَبِينَ، یعنی حق بات اگرچہ
 خود تمہارے خلاف ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف ہو اس کے کہنے میں رکاوٹ
 نہ ہونی چاہئے“

اسی طرح ایک دوسری آیت میں حکم ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ آلَآءِ
 تَحْنِ لَوْا، یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کے خلاف گواہی دینے یا فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ کر دو
 اور گواہی اور فیصلہ کے علاوہ آپس کی گفتگوؤں میں حق و انصاف قائم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں
 جھوٹ نہ بولے، کسی کی غیبت نہ کرے، ایسی بات نہ بولے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے، یا کسی کو جانی
 یا مالی نقصان پہنچے۔

نواں حکم اللہ کے عہد کو پورا کرنا، نواں حکم اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنے اور عہد شکنی
 یعنی عہد شکنی کا حرام ہونا سے بچنے کا ہے، ارشاد فرمایا: وَيَعْهَدِينَ اللّٰهَ اَوْ فَوْا، یعنی اللہ
 تعالیٰ کے عہد کو پورا کر دو، اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہو سکتا ہے جو ازل میں ہر انسان سے لیا گیا
 جس میں سب انسانوں سے کہا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں“

سب نے جواب دیا بلی، یعنی بلاشبہ آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس عہد کا مقتضی یہی ہو کہ پروردگار کے کسی حکم کی سرطانی نہ کریں، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو سارے کاموں سے مقدم اور اہم جانیں، اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کے پاس بھی نہ جائیں، اور ان کے شبہات سے بھی بچتے رہیں، خلاصہ اس عہد کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کریں۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص خاص عہد جن کا ذکر قرآن کے مختلف مواقع میں فرمایا گیا ہے مراد ہوں، اور انہی میں سے یہ تین آیتیں بھی ہیں جن کی تفسیر آپ دیکھ رہے ہیں (جن میں دنیٰ احکام تاکید کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں)۔

علماء نے فرمایا کہ اس عہد میں نذر اور مشقت کا پورا کرنا بھی داخل ہے جو ایک انسان اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا، (قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں اس کو صراحت بھی ذکر فرمایا ہے یُوَفُّونَ بِالنَّذْرِ، یعنی اللہ کے نیک بند اپنی منتوں کو پورا کیا کرتے ہیں)۔

(خلاصہ یہ ہے کہ یہ نواں حکم شمار میں تو نواں حکم ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے تمام احکام شرعیہ واجبات اور ممنوعات سب پر حاوی ہے)۔

اس دوسری آیت کے آخر میں فرمایا اذِ لَكُمْ وَحُكْمٌ بِهِ تَعْلَمُونَ تَذَكَّرُونَ، ”یہ ان کاموں کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکید کر دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو“

تیسری آیت میں رسواں حکم مذکور ہے وَ اَنْ هُنَّ اِصْرًا طِيًّا مَسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ۔ یعنی یہ دین محمدی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اس راہ پر چلو، اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔

اس میں لفظ نذرا کا اشارہ دین اسلام یا قرآن کی طرف ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورۃ النعام کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس میں بھی پورے اصول اسلام، توحید، رسالت اور اصول احکام شرعیہ مذکور ہیں (اور مستقیم، دین کے اس راستہ کی صفت ہے جس کو بخوبی ترکیب میں بصورت حال ذکر کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دین اسلام کے لئے مستقیم ہونا لازمی وصف ہے اس کے بعد فرمایا فَاتَّبِعُوهُ یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ دین اسلام میرا راستہ ہے اور وہی مستقیم اور سیدھا راستہ ہے تو اب منزل مقصود کا سیدھا راستہ ہاتھ آگیا، اس لئے صرف اسی راستہ پر چلو)۔

پھر فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ، ”سبل، سبیل کی جمع ہے، اس کے معنی بھی راستہ کے ہیں، مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے، لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، تم ان

راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو، کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے نہیں ہیں، اس لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دُور جا پڑے گا۔

تفسیر منظری میں فرمایا ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات اور اپنے ارادوں اور تجویزوں کو قرآن و سنت کے تابع کریں، اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچے میں ڈھالیں، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن و سنت کو اپنے خیالات اور تجویزات کے سانچے میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے منشاء کے خلاف نظر آئی اس کو تاویل میں کر کے اپنی خواہش کے مطابق بنالی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں، جو بدعات اور شبہات کی راہیں ہیں، انھی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔

مسند دارمی میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ سُبُل ہیں، (یعنی وہ راستے جن پر چلنے سے اس آیت میں منع فرمایا ہے) اور فرمایا کہ ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے، جو لوگوں کو سیدھے راستہ سے ہٹا کر اس طرف بلاتا ہے اور اس کے بعد آپ نے استدلال کے طور پر اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا ذِكْمٌ وَصُكْمٌ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا تم کو تاکید حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔

تینوں آیتوں کی تفسیر اور ان میں بیان کئے ہوئے دس اصول محرمات کا بیان پورا ہو گیا، آخر میں قرآن کریم کے اس اسلوب بیان پر بھی ایک نظر ڈالئے، کہ اس جگہ دس احکام بیان کئے تھے، ان کو آجکل کی کتب قانون کی طرح دس دفعات میں نہیں لکھ دیا، بلکہ پہلے پانچ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا ذِكْمٌ وَصُكْمٌ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، اور پھر اور چار حکم بیان فرمانے کے بعد پھر اسی جملہ کو دوبارہ اس فرق کے ساتھ ذکر کیا کہ تَحَقُّوْنَ کے بجائے تَنْ كَرُّوْنَ فرمایا اور پھر آخری حکم ایک مستقل آیت میں بیان فرما کر پھر اسی جملہ کا اعادہ اس فرق کے ساتھ کیا کہ تَنْ كَرُّوْنَ کے بجائے تَتَّقُونَ فرمایا۔

قرآن کریم کے اس حکیمانہ اسلوب بیان میں بہت سی محبتیں ہیں۔

اُدُل یہ کہ قرآن کریم عام دنیا کے قوانین کی طرح محض حاکمانہ قانون نہیں، بلکہ مرتباً قانون ہے، اسی لئے ہر قانون کے ساتھ اس کو آسان کرنے کی تدبیر بھی بتلائی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو قانون کی پابندی پر خلوتِ جلوت

میں مجبور کرنے والی ہے، اسی لئے تینوں آیتوں کے آخر میں ایسے کلمات لائے گئے جن سے انسان کا رخ مادی دنیا سے پھر کر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف ہو جائے۔

پہلی آیت میں جو پانچ احکام بیان کئے گئے ہیں شرک سے بچنا، والدین کی نافرمانی سے بچنا، قتلِ اولاد سے بچنا، بے حیائی کے کاموں سے بچنا، کسی کا ناحق خون کرنے سے بچنا، ان کے آخر میں تو لفظ تَعْقُلُونَ استعمال فرمایا، کیونکہ زمانہ جاہلیت والے ان چیزوں کو کوئی عیب ہی نہ جانتے تھے، اس لئے اشارہ کیا گیا کہ آبائی رسوم اور خیالوں کو چھوڑ کر عقل سے کام لو۔

دوسری آیت میں چار احکام بیان ہوئے، یعنی مالِ یتیم کو ناحق نہ کھانا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، بات کہنے میں حق اور صدق کا لحاظ رکھنا اور اللہ کے عہد کو پورا کرنا۔

یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ضروری ہونے کو تو یہ جاہل بھی جانتے تھے، اور ان میں کچھ لوگ عمل بھی کرتے تھے، مگر اکثر ان میں غفلت برتی جاتی تھی، اور غفلت کا علاج ہے تَذْکِرَہ، یعنی خدا و آخرت کی یاد، اس لئے اس آیت کے آخر میں لفظ تَذْکِرُونَ فرمایا۔

تیسری آیت میں صراطِ مستقیم کو خستیا کرنے اور اس کے خلاف دوسری راہوں سے بچنے کی ہدایت ہے، اور صرف خوفِ خدا ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے خیالات و خواہشات سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ ہو سکتی ہے، اس لئے اس کے آخر میں لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ارشاد فرمایا۔

اور تینوں جگہ لفظ وصیت کا لایا گیا، جو تاکید کی حکم کو کہا جاتا ہے، اس لئے بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہر کیا ہو اور وصیت نامہ دیکھنا چاہے وہ یہ تین آیتیں پڑھ لے۔

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے نیک کام والوں پر اور واسطے

تَمَامًا شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۵۸﴾

تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور رحمت کے لئے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں،

وَهَذَا كِتَابُنَا أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر

تُرْحَمُونَ ﴿۱۵۹﴾ أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَنْزَلَ الْكِتَابَ عَلَى طَائِفَتَيْنِ

رحمت ہو اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتاری تھی سواہنی دو فرقوں پر

مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَفِلِينَ ﴿۱۵۶﴾ أَوْ تَقُولُوا

جو ہم سے پہلے تھے اور ہم کو تو ان کے پڑھنے پڑھانے کی خبر ہی نہ تھی ، یا کہنے لگو کہ

لَوْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ فَقَدْ جَاءَكُمْ

اگر ہم پر اترتی کتاب تو ہم تو راہ پر چلتے ان سے بہتر، سو آچکی ہمتا کہ پاس

بَيِّنَاتٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن

جست سمجھائے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت اب اس سے زیادہ ظالم کون جو

كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا سَنَجْزِي الَّذِينَ

جھٹلائے اللہ کی آیتوں کو اور ان سے کتراوے ہم سزا دیں گے ان کو جو ہماری

يَصْدِفُونَ عَنِ الْيَتِيمَ سَوْءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُصْدِفُونَ ﴿۱۵۷﴾

آیتوں سے کتراتے ہیں بُرا عذاب پہلے میں اس کترانے کے

خلاصہ تفسیر

پھر مضمون ابطال شرک کے بعد ہم مسئلہ نبوت میں کلام کرتے ہیں کہ ہم نے صرف آپ کو اکیلا نبی نہیں بنایا جس پر یہ لوگ اس قدر شور و غل مچا رہے ہیں، بلکہ آپ کے قبل ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر کتاب (توراة) دی تھی جس سے ابھی طرح عمل کرنے والوں پر ہماری نعمت پوری ہو کر عمل کر کے ثواب کامل حاصل کریں اور سب (ضروری) احکام کی (اس کے ذریعہ سے) تفصیل ہو جائے اور اس کے ذریعہ سے سب کو رہنمائی ہو اور (ماننے والوں کیلئے) رحمت ہو (ہم نے اس صفت کی کتاب اس لئے دی) تاکہ وہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) اپنے رب کے لئے پر قین لادیں اور اعتقادِ قیامت سے سب احکام کو بجا لادیں اور جب اس کا اور اس کے تتمہ انجیل کا دورہ ختم ہو چکا اس کے بعد یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے (آپ کے پاس) بھیجا بڑی خیر و برکت والی سودا (اب) اس کا اتباع کرو، اور (اس سے خلاص کرنے کے باب میں خدا سے) ڈرو تاکہ تم پر (اللہ تعالیٰ کی) رحمت ہو اور ہم نے یہ قرآن اس لئے بھی نازل کیا کہ (کبھی تم لوگ قیامت میں در صورت اس کے نازل نہ ہونے کے کفر و شرک پر عذاب کے وقت) یوں کہنے لگتے کہ کتاب (آسمانی) تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے (یہودی عیسائی) تھے ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے (اس لئے ہم کو توحید کی تحقیق نہ ہوئی) یا اور مؤمنین سابقین کو ثواب ملنے کے وقت یوں کہتے کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان (مؤمنین سابقین) سے بھی زیادہ راہ پر ہوتے اور عقائد و اعمال میں ان سے زیادہ

کمال حاصل کر کے ثواب کے مستحق ہوتے (سو یاد رکھو کہ) اب (تمہارے پاس کوئی عذر نہیں) تمہارے پاس (بھی) تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب (جس کے احکام) واضح ہیں) اور (جو) رہنمائی کا ذریعہ (ہے) اور (خدا کی) رحمت (ہے) آچکی ہے سو (ایسی کافی شافی کتاب آنے کے بعد) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلا دے (اور دوسروں کو بھی) اس سے روکے ہم ابھی (آخرت میں) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کو اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے (یہ سختی اس روکنے سے بڑھی ورنہ صرف تکذیب بھی موجب سزا ہے)۔

معارف و مسائل

وجہ غفلت یہ نہیں کہ توراۃ و انجیل لغت عرب میں نہ تھی، کیونکہ ترجمہ کے ذریعہ سے مضامین کی اطلاع ممکن ہی، بلکہ واقع ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے اہل عرب کی تعلیم و توحید کا کبھی اہتمام نہیں کیا، اور اتفاقاً کان میں کوئی مضمون پڑ جانا عادت تنبیہ میں کم موثر ہے، گو اس قدر تنبیہ پر طلب اور تامل واجب ہو جاتا ہے، اور اسی بناء پر ترک توحید پر عذاب ممکن تھا، اور اس سے عموم لعنت موسویہ و عیسویہ کا اشکال لازم نہیں آتا، کیونکہ اختصاص اس عموم کا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باعتبار مجموعہ اصول و فروع کے ہے، ورنہ اصول میں سب انبیاء کا اتباع سب خلافت پر واجب ہے، پس اس بناء پر عذاب صحیح ہوتا، لیکن یہ عذر بادی النظر میں پیش کیا جاسکتا تھا، اب اس کی بھی گنجائش نہ رہی اور حجۃ اللہ تام ہو گئی۔

اور دوسرا قول کو اَنَا اَنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابَ مَكِّنًا اَهْدٰی مِنْهُمْ کے متعلق ایک سوال وجواب باعتبار ناجین اہل فرت کے سورۃ مائدہ کے رکوع سوم کے آخر میں گذر چکا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ السَّلَٰكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ

کا ہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب

أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا

یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی جس دن آئے گی نشانی تیرے رب کی، کام نہ

يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ أَمِنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ

آئے گا کسی کے اس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان

فِي إِيْمَانِهَا خَيْرًا قُلِ اُنْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ﴿۱۵۸﴾

میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو کہہ دے تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ جو کہ بعد نزول کتاب بینات و وضوح حق کے بھی ایمان نہیں لاتے اپنے ایمان لانے کے لئے صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے ہیں) یعنی ایسا توقف کر رہے ہیں جیسے کوئی انتظار کر رہا ہو کہ ان کے پاس فرشتے آویں یا ان کے پاس آپ کا رب آوے (جیسا قیامت میں حساب کے وقت واقع ہوگا) یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی (منجملہ قیامت کی نشانیوں کے) آوے (مراد اس بڑی نشانی سے آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے) مطلب یہ ہوا کہ کیا ایمان لانے میں قیامت کے وقوع یا قرب کا انتظار ہو سو اس کے متعلق سن رکھیں کہ جس روز آپ کے رب کی (یہ) بڑی نشانی (مذکور) آپہنچے گی (اس روز) کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آوے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہو (بلکہ اسی روز ایمان لایا ہو) یا ایمان تو پہلے سے بھی رکھتا ہو (لیکن) اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو (بلکہ اعمالِ بد اور گناہوں میں مبتلا ہو) اور اس روز ان سے توبہ کر کے اعمالِ نیک شروع کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی، اور اس سے قبل اگر معاصی سے توبہ کرتا تو مؤمن ہونے کی برکت سے توبہ قبول ہو جاتی، تو قبول توبہ منجملہ منافع ایمان کے ہے، اس وقت ایمان نے یہ خاص نفع نہ دیا اور جب علامت قیامت مانع ہو گئی قبول ایمان و توبہ سے تو خاص وقوع قیامت تو بدرجہ اولیٰ مانع ہوگا، پھر انتظار کا ہے کا، اور اگر اس توبہ پر بھی ایمان نہ لاویں تو آپ (تہدید مزید کے طور پر) فرما دیجئے کہ (خیر بہتر) تم (ان امور کے) منتظر رہو (اور مسلمان نہیں ہوتے تو مت ہو) ہم بھی (ان امور کے) منتظر ہیں (اُس وقت تم پر مصیبت پڑے گی، اور ہم مؤمن النصار اللہ تعالیٰ ناجی ہوں گے)۔

معارف و مسائل

سورۃ النعام کا اکثر حصہ اہل مکہ اور مشرکین عرب کے عقائد اور اعمال کی اصلاح اور ان کے شبہات اور سوالات کے جواب میں نازل ہوا ہے۔

اس تمام سورۃ اور خصوصاً پہلی آیات میں مکہ اور عرب کے باشندوں پر واضح کر دیا گیا کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات و بینات دیکھ چکے، پہلی کتابوں اور پہلے انبیاء کی پیشینگوئیاں آپ کے متعلق سن چکے، پھر ایک اُمّی محض کی زبان سے قرآن کی آیات بینات سن چکے جو ایک مستقل معجزہ بن کر آیا، اب حق و صدق کی راہیں تمھارے سامنے کھل چکیں، اور خدا تعالیٰ کی حجت تم پر تمام ہو چکی، اب ایمان لانے میں کس چیز کا انتظار ہے۔

اس مضمون کو اس آیت مذکورہ میں نہایت بلیغ پیرایہ میں اس طرح بیان فرمایا:

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ، یعنی یہ لوگ کیا ایمان لانے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کے فرشتے ان کے پاس پہنچ جائیں، یا میدانِ حشر کا انتظار کر رہے ہیں کہ جس میں جزاء و سزا کے فیصلہ کے لئے اللہ تعالیٰ آئے گا، یا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ قیامت کی بعض آخری نشانیاں دیکھ لیں، ربِّ کریم کا میدانِ قیامت میں فیصلہ کے لئے تشریف فرما ہونا قرآن مجید کی کئی آیتوں میں بیان ہوا ہے، سورہ بقرہ میں اسی مضمون کی آیت اس طرح آتی ہے:

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلَائِكَةُ وَ قُضِيَ الْأَمْرُ	یعنی کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آجائے اور فرشتے آجائیں لوگوں کے لئے جنت و دوزخ کا جو فیصلہ ہونا چاہیے ہو جائے
--	--

اللہ تعالیٰ کا میدانِ قیامت میں تشریف فرما ہونا کس شان کس کیفیت کے ساتھ ہوگا اس کا عقلِ انسانی احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے صحابہ کرام اور اسلافِ امت کا مسلک اس قسم کی آیات کے متعلق یہ ہے کہ جو قرآن میں ذکر کیا گیا، اس پر ایمان لایا جائے اور یقین کیا جائے اور اس کی کیفیات کو علمِ الہی کے حوالہ کیا جائے، مثلاً اس آیت میں یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ میدانِ قیامت میں فیصلہ جزاء و سزا کے لئے تشریف فرما ہوں گے، اور اس میں بحث اور فکر نہ کی جائے کہ کس کیفیت اور کس جہت میں ہوں گے۔

اس آیت میں آگے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اٰيٰمِهَا خَيْرًا ط اس میں متنبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض نشانیاں سامنے آجانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا اب ایمان لائے گا تو قبول نہیں ہوگا، اور جو شخص ایمان تو لایا تھا مگر عمل نیک نہیں کئے تھے وہ اب توبہ کر کے آمندہ نیک عمل کا ارادہ کرے گا تو اس کی بھی توبہ قبول نہ ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ کافر اپنے کفر سے یا فاسق اپنے فسق و معصیت سے اگر اس وقت توبہ کرنا چاہے گا تو وہ توبہ قبول نہ ہوگی۔

سبب یہ ہے کہ ایمان اور توبہ صرف اُس وقت تک قبول ہو سکتی ہے جب تک انسان کے اختیار میں ہے، اور جب عذابِ الہی کا اور حقائقِ آخرت کا مشاہدہ ہو گیا تو ہر انسان ایمان لانے میں اور گناہ سے باز آنے پر خود بخود مجبور ہو گیا، مجبور ہی کا ایمان اور توبہ قابلِ قبول نہیں،

قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مذکور ہے کہ اہل دوزخ دوزخ میں پہنچ کر فریاد کریں گے، اور بڑے بڑے وعدے کریں گے کہ اگر ہمیں اب دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان اور عمل صالح کے سوا کچھ نہ کریں گے، مگر سب کا جواب یہی ہوگا کہ ایمان و عمل کا وقت ختم ہو چکا، اور اب جو کچھ کہہ رہے ہو مجبور ہو کر کہہ رہے ہو اس کا اعتبار نہیں۔

اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، اور اس کو دیکھتے ہی سارے جہان کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمان بردار بن جائیں گے، لیکن اس وقت کا ایمان اور توبہ قابل قبول نہ ہوگا (بخاری بسندہ عن ابی ہریرۃ)

اس آیت میں اتنی بات تو قرآنی تصریح سے معلوم ہوگئی کہ بعض نشانیاں ایسی واقع ہوں گی، جن کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، کسی کافر یا فاسق کی توبہ قبول نہ ہوگی، لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی، کہ وہ کونسی نشانی ہے۔ صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں بروایت ابو ہریرۃ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آجائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو، جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، یہی وہ وقت ہوگا جس کے لئے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت کسی نفس کو ایمان لانا نفع نہیں دے گا۔“

اسکی تفصیل صحیح مسلم میں بروایت حذیفہ ابن اُسیدؓ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام علامات قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اس وقت آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دن کی نشانیاں نہ دیکھ لو، آفتاب کا جانب مغرب سے نکلنا، اور ایک خاص قسم کا دھواں، اور دابة الارض اور یاجوج ماجوج کا نکلنا، عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا، دجال کا نکلنا، اور تین جگہوں پر زمین کا دھنس جانا، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں، ایک جزیرۃ العرب میں، اور ایک آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کر لے چلے گی۔

اور مسند احمد میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان آیات میں سب سے پہلے مغرب کی طرف سے طلوع آفتاب اور دابة الارض کا نکلنا واقع ہوگا۔

امام قرطبی نے تذکرہ میں اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس واقعہ یعنی مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال تک دنیا قائم رہے گی (روح المعانی)

اس تفصیل کے بعد یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو روایات صحیحہ کے موافق آپ لوگوں کو ایمان کی دعوت دیں گے، اور لوگ ایمان قبول کریں گے، اور پوری دنیا میں نظام اسلام رائج ہوگا، ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو تو یہ دعوت اور لوگوں کا اسلام میں داخلہ سب غلط ہو جاتا ہے۔

تفسیر روح المعانی میں تو اس کا یہ جواب اختیار کیا ہے کہ مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے کے کافی زمانہ بعد میں ہوگا، اور اسی وقت دروازہ توبہ کا بند ہوگا۔

اور علامہ بلقینی وغیرہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایمان اور توبہ قبول نہ ہونے کا یہ حکم جو آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے وقت ہوگا آخر زمانہ تک باقی نہ رہے، بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ حکم بدل جائے اور ایمان و توبہ قبول ہونے لگے۔

(روح المعانی) واللہ اعلم

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں اگرچہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ جس نشانی کے ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی وہ کونسی نشانی ہے، مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے واضح ہو گیا کہ اس سے مراد آفتاب کا جانب مغرب سے طلوع ہے۔

اور قرآن کریم نے خود کیوں اس کی وضاحت نہ کر دی؟ تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس جگہ قرآن کا ابہام ہی غافل انسان کو چونکانے میں زیادہ مفید ہے کہ اس کو ہر نئے پیش آنے والے واقعہ سے اس پر تنبیہ ہوتی ہے اور توبہ میں جلدی کرے۔

اس کے علاوہ اس ابہام اور اجمال سے ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ جس طرح پورے عالم کے لئے مغرب سے آفتاب طلوع ہونے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائیگا اسی طرح اس کا ایک نمونہ ہر انسان کے لئے شخصی طور پر توبہ کے منقطع ہو جانے کا اس کی موت کے وقت پیش آتا ہے۔

قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو واضح طور پر بھی بیان فرما دیا ہے :

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ	یعنی اُن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب
--	--

الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ
الْغَنَ

اُن میں سے کسی کی موت آجائے تو کہتا ہو کہ
میں اب توبہ کرتا ہوں ۝

اور اسی کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ تَوْبَةَ الْعَبْدِ تُقْبَلُ مَا
لَمْ يَخْرُغْ

یعنی بندہ کی توبہ اُس وقت تک قبول
ہوتی رہتی ہے جب تک اس کی رُوح حلق
میں آکر غرغرة موت کی صورت پیدا نہ ہو جائے

اس سے معلوم ہوا کہ نزع رُوح کے وقت جب سانس آخری ہو اُس وقت بھی چونکہ فرشتہ
موت کے سامنے آجاتے ہیں اُس وقت بھی توبہ قبول نہیں ہوتی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ صورت
حال بھی اللہ کی طرف سے ایک اہم نشانی ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ میں یہ
موت کا وقت بھی داخل ہے، جیسا کہ تفسیر سحر محیط میں بعض علماء کا یہ قول نقل بھی کیا ہے، اور
بعض بزرگوں نے فرمایا ہے: مَتَى مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ۔ یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت
تو اسی وقت قائم ہو گئی، کیونکہ دارالعمل ختم ہوا اور جزائے اعمال کا کچھ نمونہ قبر ہی سے شروع
ہو گیا، صائب نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے ۵

توبہ ہارا نفس باز پس دست زدست ۝ بخبر دیر رسیدی در محفل بستند

یہاں عربی زبان کے اعتبار سے یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں پہلے فرمایا
أَوْ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ اور پھر اسی جملہ کا اعادہ کر کے فرمایا يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ
رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا، اس میں ضمیر سے کام لے کر کلام کو مختصر نہیں کیا گیا، اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کلمہ میں جو بَعْضُ آيَاتِ مذکور ہیں وہ اور ہیں، اور دوسرے کلمہ کی بَعْضُ آيَاتِ
اس سے مختلف ہیں، اس سے اس تفصیل کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو ابھی آپ نے بروایت
حذیفہ ابن اُسیدؓ پڑھی ہے کہ قیامت کی دس نشانیاں بہت اہم ہیں، ان میں سے آخری نشانی
مغربی طلوع آفتاب ہو جو انقطاع توبہ کی علامت ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: قُلِ أَنْتُمْ تُنْتَظَرُونَ، اس میں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کو خطاب ہے، کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اللہ کی ساری جہتیں پوری ہو جانے
کے بعد بھی اگر تمہیں موت یا قیامت کا انتظار ہے تو یہ انتظار کرتے رہو، ہم بھی اسی کا انتظار
کریں گے کہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کا کیا معاملہ ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَنتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ

جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ

شئیٰ (۱۵۹) اِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُدَبِّعُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ

سرور کا نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی جتلا دیگا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے،

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرٌ مِّثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ

جو کوئی لاتا ہو ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے

بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلُهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۰)

ایک بُرائی سو سزا پائے گا اسی کے برابر اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو (جن کے وہ مکلف ہیں) جدا کر دیا (یعنی دین حق کو تمام قبول نہ کیا، خواہ سب کو چھوڑ دیا یا بعض کو اور طریقے مشرک و کفر و بدعت کے اختیار کر لیں) اور (مختلف) گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (یعنی آپ ان سے بری ہیں، آپ پر کوئی الزام نہیں) بس (وہ خود اپنے نیک بُد کے ذمہ دار ہیں، اور) ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے (وہ دیکھ بھال رہے ہیں) پھر (قیامت میں) ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے (اور حجت قائم کر کے استحقاق عذاب ظاہر کر دیں گے) جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے (یعنی ایسا سمجھا جاوے گا کہ گویا وہ نیکی دس بار کی اور نیز ایک نیکی پر جس قدر ثواب ملتا اب دس حصے ویسے ثواب کے ملیں گے) اور جو شخص بُرا کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی (زیادہ نہ ملے گی) اور ان لوگوں پر (ظاہراً بھی) ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیکی درج نہ ہو یا کوئی بدی زیادہ کر کے لکھ لی جاوے)۔

معارف و مسائل

سورۃ النعام کا بیشتر حصہ مشرکین مکہ کے خطاب اور ان کے سوال و جواب کے متعلق آیا ہے جس میں ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ صرف قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر ہے، جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کے زمانہ میں ان کا اور ان کی کتاب و شریعت کا اتباع مدارِ نجات تھا، آج صرف آپ کی اور آپ کی شریعت

کی سپردی مدارِ نجات ہے، عقل سے کام لو اور اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں کے غلط راستوں کو اختیار نہ کرو، ورنہ وہ راستے تمہیں خدا تعالیٰ سے دور کر دیں گے۔

مذکورہ آیات سے پہلی آیت میں ایک عام خطاب ہے، جس میں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب داخل ہیں، ان سب کو مخاطب کر کے اللہ کے سیدھے راستے سے منحرف ہونے والوں کا انجام بد بیان کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کا ان غلط راستوں پر چلنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، پھر ان میں غلط راستے وہ بھی ہیں جو صراطِ مستقیم سے بالکل مخالف جانب لے جانے والے ہیں، جیسے مشرکین اور اہل کتاب کے راستے، اور وہ راستے بھی ہیں جو مخالف جانب میں تو نہیں مگر سیدھے راستے سے ہٹا کر دائیں بائیں لے جانے والے ہیں، وہ شبہات اور بدعات کے راستے ہیں، وہ بھی انسان کو گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ قَرَّ قَوْلًا دِیْنَهُمْ وَكَانُوا اَشِیْعًا تَسَتْ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اَنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلٰی اللّٰهِ ثُمَّ یَنْبِیْهُهُمْ بِمَا كَانُوا یَفْعَلُوْنَ، یعنی وہ لوگ جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے بہت سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ کے حوالے ہے، پھر وہ جتلائے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے۔

اس آیت میں غلط راستوں پر پڑنے والوں کے متعلق اوّل تو یہ بتلادیا کہ اللہ کا رسول ان سے بری ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، پھر ان کو یہ وعید شدید سنائی کہ ان کا معاملہ بس خدا تعالیٰ کے حوالے ہے وہی ان کو قیامت کے روز سزا دیں گے۔ دین میں تفسیق ڈالنا اور فرقے بن جانا جو اس آیت میں مذکور ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اصولِ دین کے اتباع کو چھوڑ کر اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق یا شیطانی مکر و تلبیس میں مبتلا ہو کر دین میں کچھ نئی چیزیں بڑھا دے یا بعض چیزوں کو چھوڑ دے۔

دین میں بدعت ایجاد تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں، جنہوں نے اپنے اصولِ دین کو ترک کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملا دی تھیں اور اس امت کے اہل بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہے ہیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:-

”میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے ہیں طرح کی بد اعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری امت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے، صحابہ کرام نے

عرض کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے، فرمایا مَا آفَاكَ عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي،
یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائیگی
اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے،

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ
سے فرمایا کہ اس آیت میں جن مشرقیوں کا ذکر ہے وہ اہل بدعت اور اپنی خواہشات و خیالات کے تابع
نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں، یہی مضمون حضرت ابوتریہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے،
اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی
تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ بروایت عریض بن ساریہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلافات دیکھیں گے،
اس لئے (میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ) تم میری سنت اور خلفائے راشدین
کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو، نئے نئے
طریقوں سے بچتے رہو، کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی ہر چیز بدعت ہے اور ہر
بدعت گمراہی ہے“

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر جدا ہو گیا اس نے اسلام
کا قلادہ اپنی گردن سے نکال دیا (رداء ابوداؤد واحد)

تفسیر منطہری میں ہے کہ جماعت سے مراد اس حدیث میں جماعت صحابہ ہے، وجہ یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو قرآن
عطا فرمایا، اور قرآن کے علاوہ دوسری وحی عطا فرمائی، جس کو حدیث یا سنت کہا جاتا ہے، پھر
قرآن میں بہت سی آیات مشکل یا مجمل یا مبہم ہیں، ان کی تفسیر و بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ
کے ذریعہ بیان کرنے کا وعدہ فرمایا، ثُمَّ إِنِّي عَلَيَّمَا بَيَانَهُ كَمَا هِيَ مَطْلُوبُہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنت کی
تفصیلات ... اپنے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سکھلائی، اس
لئے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعت الہیہ کا بیان و تفسیر ہے۔

اس لئے مسلمان کی سعادت اسی میں ہے کہ ہر کام میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے، اور جس آیت یا حدیث کی مراد میں اشتباہ ہو اس میں اس کو

اختیار کرے جس کو چہرہ صحابہ کرام نے اختیار فرمایا ہو۔

اسی مقدس اصول کو نظر انداز کر دینے سے اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے کہ تعامل صحابہ اور تفسیرات صحابہ کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے جو جی میں آیا اس کو قرآن و سنت کا مفہوم قرار دیدیا، یہی وہ گمراہی کے راستے ہیں جن سے قرآن کریم نے بار بار روکا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا، اور اس کے خلاف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی اُن پر لعنت کرے، ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھا دیئے یا معنی میں ایسی زیادتی کر دی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے، دوسرے وہ شخص جو تقدیر الہی کا منکر ہو گیا، تیسرے وہ شخص جو اُمت پر زبردستی مسلط ہو جائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور ذلت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے، چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا، یعنی حرم مکہ میں قتل و قتال کیا، یا شکار کھیلا، یا پنجوش وہ شخص جس نے میری عورت و اولاد کی بے حرمتی کی، چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَالِهَاتٍ وَمَنْ

جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

پچھلی آیت میں اس کا بیان تھا کہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے والوں کو روزِ قیامت میں اللہ تعالیٰ ہی ان کے اعمال کی سزا دیں گے۔

اس آیت میں آخرت کی جزاء و سزا کا کریمانہ ضابطہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیک کام کرے گا اس کو دس گنا بدلہ دیا جائے گا، اور جو ایک گناہ کرے گا اس کا بدلہ صرف ایک گناہ کی برابر دیا جائے گا۔

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب عزوجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لئے ایک نیکی لکھی جاتی ہے، خواہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کرے، تو دس نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو و کرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دیار میں وہی شخص ہلاک ہو سکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے (ابن کثیر)

ایک حدیث قدسی میں بروایت ابوذرؓ ارشاد ہے :

”شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ اور جو شخص ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا صرف ایک ہی گناہ کی برابر ملے گی، یا میں اس کو بھی معاف کر دوں گا اور جو شخص اتنے گناہ کر کے میرے پاس آئے جن سے ساری زمین بھر جائے اور مغفرت کا طالب ہو تو میں اتنی ہی مغفرت سے اس کے ساتھ معاملہ کروں گا، اور جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں، اور جو شخص ایک ہاتھ میری طرف آتا ہے میں اس کی طرف بقدر ایک باغ کے آتا ہوں (باغ کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کو) اور جو شخص میری طرف جھپٹ کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔“

ان روایات حدیث سے معلوم ہوا کہ نیکی کی جزا میں دنش تک کی زیادتی جو اس آیت میں مذکور ہے ادنیٰ حد کا بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے اور دیں گے، جیسا کہ دوسری روایات سے ستر گنا یا سات سو گنا تک ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں لفظ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فرمایا کہ عَمِلَ بِالْحَسَنَةِ نہیں فرمایا، تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ محض کسی نیک یا بد کام کر لینے پر یہ جزا و سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ جزا و سزا کے لمحو موت کے وقت تک اس عمل نیک یا بد عمل کا قائم رہنا شرط ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نیک عمل کیا، لیکن پھر اس کے کسی گناہ کی شامت سے وہ عمل ضبط اور ضائع ہو گیا تو وہ اس عمل پر جزا مستحق نہیں رہا، جیسے معاذ اللہ کفر و شرک تو سارے ہی اعمال صالحہ کو برباد کر دیتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہ ایسے ہیں جو بعض اعمال صالحہ کو باطل اور بے اثر کر دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى، یعنی تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر باطل اور ضائع نہ کرو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذا پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمال صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے کئے ہیں وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بُرے اعمال سے اگر توبہ کر لی تو وہ گناہ نامہ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے، موت کے وقت تک باقی نہیں رہتا، اس لئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ کوئی عمل کرے نیک یا بد تو اس کو جزا یا سزا ملے گی، بلکہ یوں فرمایا کہ جو شخص ہمارے پاس لائے گا نیک عمل تو دنش گنا

ثواب پائیگا اور ہمارے پاس لائے گا بُرا عمل تو ایک ہی عمل کی سزا پائے گا، اللہ تعالیٰ کے پاس لانا اسی وقت ہوگا جب یہ عمل آخر تک قائم اور باقی رہے، نیک عمل کو ضائع کرنے والی کوئی چیز پیش نہ آوے اور بُرے عمل سے توبہ و استغفار نہ کرے۔

آخر آیت میں فرمایا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ، یعنی اس عدالتِ عالیہ میں اس کا امکان نہیں کہ کسی پر ظلم ہو سکے، نہ کسی کے نیک عمل کے بدلے میں کمی کا امکان ہے، نہ کسی کے بُرے عمل میں اس سے زائد سزا کا احتمال ہے۔

قُلْ إِنِّي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيمًا مِّلَّةَ

تو کہہ دے مجھ کو سچائی میرے رب نے راہِ سیدھی دینِ صحیح ملتِ ابراہیم

إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٦١﴾ قُلْ إِنْ

کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں، تو کہہ میری

صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾

نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لئے ہو جو پالنے والا سارے جہان کا ہو

لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾

کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں،

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغَىٰ رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ

تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہر رب ہر چیز کا اور جو کوئی گناہ کرتا ہو

كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ

سودہ اس کے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا بھروسہ

إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾

تمہارے رب کے پاس ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے سو وہ جتلا دیگا جس بات میں تم جھگڑتے تھے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ

اور اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک

بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم ۚ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ

کے ایک پر تاکہ آزمائے تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں، تیرا رب جلد

۲۰
الحق

الْعِقَابُ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۶۵﴾

عذاب کرنے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ (وحی کے ذریعہ سے) بتلادیا ہے کہ وہ ایک دین ہے (جو بوجہ ثبوت بدلائل کے مستحکم ہے) جو طریقہ ہے ابراہیم (علیہ السلام) کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ (ابراہیم) شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (اور) آپ (اس دین مذکور کی قدسے تفصیل کے لئے) فرمادیجئے کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو مالک ہو سارے جہان کا، اس کا (استحقاق عبادت یا تصرفات ربوبیت میں) کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی (دین مذکور) پر رہنے کا حکم ہوا ہے اور (حکم کے موافق) میں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا (ماننے والا) ہوں، آپ (ان باطل کی طرف بلانے والوں سے) فرمادیجئے کہ کیا بعد وضوح حقیقت توحید و اسلام کے تمھارے کہنے سے) میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں (یعنی نفوذ باللہ شرک خستیاں کر لوں) حالانکہ وہ مالک ہو ہر چیز کا (اور سب چیزیں اس کی ملک ہیں اور مملوک شریک مالک نہیں ہو سکتا) اور (تم جو کہتے ہو کہ تمھارا گناہ ہمارے سرسویہ محض لغو بات ہے کہ کرنے والا پاک صاف رہا اور صرف دوسرا گنہگار ہو جاوے، بلکہ بتا یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے، اور کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھاوے گا (بلکہ سب اپنی اپنی بھگتیں گے) پھر (سب کے عمل کر چکنے کے بعد) تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے کہ کوئی کسی دین کو حق بتلاتا تھا اور کوئی کسی کو، وہاں عملی اطلاع سے فیصلہ کر دیا جاوے گا، کہ اہل حق کو نجات اور اہل باطل کو سزا ہوگی، اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا (اس نعمت میں تو شامل ہے) اور ایک کا دوسرے پر (مختلف چیزوں میں) رتبہ بڑھایا، اس نعمت میں تفاضل ہے تاکہ (ان نعمتوں سے) تم کو (ظاہراً) آزماوے ان چیزوں میں جو کہ (نعم مذکورہ سے) تم کو دی ہیں (آزمائے یہ کہ کون ان نعمتوں کی قدر کر کے منعم کی اطاعت کرتا ہے اور کون بے قدری کر کے اطاعت نہیں کرتا، پس بعضے مطیع ہوتے، بعضے نافرمان ہوئے اور دونوں کے ساتھ مناسب معاملہ کیا جاوے گا، کیونکہ) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے، اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا مہربانی کرنے والا (بھی) ہے،

اپس نافرمانوں کے لئے عقاب ہو اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہو، اور نافرمانی سے فرمانبرداری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے، پس مکلفین پر ضرور ہوا کہ دین حق کے موافق اطاعت اختیار کریں، اور باطل اور مخالفت حق سے باز آویں) ۛ

معارف و مسائل

یہ سورۃ انعام کی آخری آیتیں ہیں جن لوگوں نے دین حق میں افراط و تفریط اور کمی بیشی کر کے مختلف دین بنائے تھے، اور خود مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے، ان کے مقابلہ پر ان میں سے پہلی تین آیتوں میں دین حق کی صحیح تصویر اس کے بنیادی اصول اور بعض اہم فروع و جزئیات بیان کئے گئے ہیں، پہلی دو آیتوں میں اصول کا بیان ہے اور تیسری آیت میں ان کے اہم فروع کا ذکر ہے، اور دونوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کو یہ بات پہنچادیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے، قُلْ اِنِّیْ هَلْ یُنِّیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے، اس میں اشارہ فرما دیا کہ میں نے تمہاری طرح اپنے خیالات یا آبائی رسوم کے تابع یہ راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ میرے رب نے مجھے یہ راستہ بتا دیا ہے، اور لفظ ”رب“ سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس کی شان ربوبیت کا تقاضا ہو کہ وہ صحیح راستہ بتائے، تم بھی اگر چاہو تو اس کی طرف ہدایت کے سامان تمہارے لئے بھی موجود ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا دُنِّیَا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اس میں لفظ ”قیم“ مصدر ہے، قیام کے معنی میں، اور مراد اس سے قائم رہنے والا استحکم ہے، یعنی یہ دین تحکم ہے، جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، کسی کے شخصی خیالات نہیں، اور کوئی بنیادین و مذہب بھی نہیں جس میں کسی کو شبہ ہو سکے، بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی دین ہے، خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اس لئے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر مذہب والے ان کی عظمت و امامت کے قائل ہیں، موجودہ فرقوں میں سے یہود، نصاریٰ، مشرکین عرب آپس میں کتنے ہی مختلف ہوں مگر ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی و امامت پر سب ہی متفق ہیں، یہی وہ مقام امامت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو دیا ہے اِنِّیْ جَعَلْتُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط پھر ان میں سے ہر فرقہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم دین ابراہیم ہی پر قائم ہیں، اور ہمارا مذہب ہی ملت ابراہیم ہے، ان کے اس مخالطہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام تو غیر اللہ کی عبادت سے پرہیز کرنے والے اور شرک سے نفرت کرنے والے

تھے، اور یہی ان کا سب سے بڑا شاہکار ہے، تم لوگ جبکہ شرک میں مبتلا ہو گئے تو یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور مشرکین عرب نے ہزاروں پتھروں کو خدائی کا شریک مان لیا، تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ وہ ملتِ ابراہیمی کا پابند ہے، ہاں یہ حق صرف مسلمان کو پہنچتا ہے جو شرک و کفر سے بیزار ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا قُلْ إِنِّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس میں لفظ ”نُسُك“ کے معنی قربانی کے بھی آتے ہیں، اور حج کے ہر فعل کو بھی نُسُك کہتے ہیں، اعمالِ حج کو نُسُك کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ مطلق عبادت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، اسی لئے نُسُك بمعنی عابد بولا جاتا ہے، اس جگہ ان میں سے ہر ایک معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، اور مفسرین صحابہ و تابعین سے یہ سب تفسیریں منقول بھی ہیں، مگر مطلق عبادت کے معنی اس جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ تیری نماز اور میری تمام عبادات اور میری پوری زندگی اور پھر موت یہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اس میں فروعِ اعمال میں سے اول نماز کا ذکر کیا، کیونکہ وہ تمام اعمالِ صالحہ کی رُوح اور دین کا عمود ہے، اس کے بعد تمام اعمال و عبادات کا اجمالی ذکر فرمایا، اور پھر اس سے ترقی کر کے پوری زندگی کے اعمال و احوال کا ذکر کیا، اور آخر میں موت کا، ان سب کا ذکر کر کے فرمایا کہ ہماری یہ سب چیزیں صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں، اور یہی ایمانِ کامل اور اخلاصِ کامل کا نتیجہ ہے، کہ انسان اپنی زندگی ہر حال میں اور ہر کام میں اس کو پیشِ نظر رکھے کہ میرا اور تمام جہان کا ایک رب ہو، میں اس کا بندہ اور ہر وقت اس کی نظریں ہوں، میرا قلب، دماغ، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پیر، قلم اور قدم اس کی مرضی کے خلاف نہ اٹھنا چاہئے، یہ وہ مراقبہ ہو کہ اگر انسان اس کو اپنے دل و دماغ میں مستحضر کر لے تو صحیح معنی میں انسان اور کامل انسان ہو جائے، اور گناہ و معصیت اور جرائم کا اس کے آس پاس بھی گزر نہ ہو۔

تفسیر درمنثور میں اسی آیت کے تحت میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہء زندگی بنالے۔

اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرک یا ریا یا کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہونا مراد ہے، اور زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری موت و حیات ہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے، تو پھر زندگی کے اعمال و عبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے

والبستیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں، جیسے نماز روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق و فرائض وغیرہ اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں یعنی وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چاہتا اور سوچتا ہو، وہ سب الشریب العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے۔

پھر فرمایا وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ، یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قول و قرار اور اخلاص کا مل کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار مسلمان ہوں، مراد یہ ہو کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں، کیونکہ ہر امت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحی شریعت نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان و زمین اور مخلوقات وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے، أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ تَعَالَى نُورِي (روح المعانی)

کسی کے گناہ کا بار دوسرا چوتھی آیت میں مشرکین مکہ ولید بن مغیرہ وغیرہ کی اس بات کا جواب ہے کہ ہمیں اٹھا سکتا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے کہا کرتے تھے

کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، تو تمھارے سارے گناہوں کا بار ہم اٹھالیں گے، اس پر فرمایا قُلْ اَغْنِيَنَّ اللَّهُ رَبِّيَ رَبِّيَ اَوْ رَّبِّيَ اَوْ رَّبِّيَ شَيْءٌ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہو کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ تمھاری طرح میں بھی اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کر لوں، حالانکہ وہی سارے جہان اور ساری کائنات کا رب ہے، اس گمراہی کی مجھ سے کوئی امید نہ رکھو، باقی تمھارا یہ کہنا کہ ہم تمھارے گناہوں کا بار اٹھالیں گے یہ خود ایک حماقت ہے، گناہ تو جو شخص کرے گا اسی کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، اور وہی اس کی سزا کا مستحق ہوگا، تمھارے اس کہنے سے وہ گناہ تمھاری طرف کیسے منتقل ہو سکتا ہے، اور اگر یہ ال ہو کہ حساب اور نامہ اعمال میں تواہنی کے رہو گا لیکن میدانِ حشر میں اس پر جو سزا مرتب ہوگی وہ سزا ہم بھگت لیں گے، تو اس خیال کو بھی اس آیت کے اگلے جملہ نے رد کر دیا، فرمایا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى، یعنی قیامت کے روز کوئی شخص دوسرے کا بار گناہ نہیں اٹھائے گا۔

اس آیت نے مشرکین کے یہودہ قول کا جواب تو دیا ہی ہے، عام مسلمانوں کو یہ ضابطہ بھی بتلادیا کہ قیامت کے معاملہ کو دنیا پر قیاس نہ کرو کہ یہاں کوئی شخص جرم کر کے کسی دوسرے کے سر ڈال سکتا ہے، خصوصاً جبکہ دوسرا خود رضا مند بھی ہو، مگر عدالتِ الہیہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، وہاں ایک کے گناہ میں دوسرا ہرگز نہیں پکڑا جا سکتا، اسی آیت سے استدلال ضرر کر

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولد الزنا پر والدین کے جرم کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ حدیث حاکم نے بسند صحیح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔

اور ایک میت کے جنازہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، ابن ابی نیکہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول حضرت عائشہؓ کے سامنے نقل کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص کا یہ قول نقل کر رہے ہو جو نہ کبھی جھوٹ بولتا ہی اور نہ اُن کی ثقاہت میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے، مگر کبھی سننے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، اس معاملہ میں تو قرآن کا ناطق فیصلہ تمہارے لئے کافی ہے **وَلَا تَزِرُ وَازِرَكَ وِزْرًا** یعنی ایک گناہ دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، تو کسی زندہ آدمی کے رونے سے مردہ بے قصور کس طرح عذاب میں ہو سکتا ہے (درمنثور)۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ پھر تم سب کو بالآخر اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے، جہاں تمہارے سارے اختلاف کا فیصلہ سنا دیا جائے گا، مطلب یہ ہے کہ زبان آدمی اور کج بختی سے باز آؤ، اپنے انجام کی فکر کرو۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ایک جامع نصیحت پر سورۃ النعام کو ختم کیا گیا ہے، اور وہ عہد ماضی کی تاریخ اور پچھلی قوموں کی سرگذشت کو ان کے سامنے لا کر اپنے مستقبل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے: **وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْخَلِيفَةَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ** اس میں لفظ خلافت، خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا قائم مقام اور گدی نشین، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تم سے پہلی قوموں کی جگہ پر آباد کیا ہے، کوئی مکان زمین جس کو آج تم اپنی ملکیت کہتے ہو اور سمجھتے ہو ایسا نہیں جو کل تمہیں جیسے دوسرے انسانوں کی ملکیت میں نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہٹا کر تمہیں ان کی جگہ بٹھایا ہے، اور پھر یہ بات بھی ہر وقت قابل غور ہے کہ تم میں بھی سب آدمی یکساں نہیں، کوئی مفلس ہے کوئی مال دار، کوئی ذلیل ہے کوئی عزت دار، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مال داری اور عزت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کونسا انسان مفلس اور ذلت کو اختیار کرتا، یہ درجات کا تفاوت بھی تمہیں اس کی خبر دے رہا ہے کہ اختیار کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسکو چاہے مفلس کر دے جسکو چاہے مال دار، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت۔

آخر آیت میں فرمایا **لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ**، یعنی تمہیں دوسرے لوگوں کی جگہ بٹھانے اور ان کے مال جائداد کا مالک بن جانے اور پھر عزت و دولت کے اعتبار سے مختلف درجات میں رکھنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ تمہاری آنکھیں کھلیں اور اس کا امتحان ہو کہ جو نعمتیں پچھلے لوگوں کو ہٹا کر

تمہارے سپرد کی گئی ہیں، ان میں تمہارا عمل کیا ہوتا ہے، شکر گزاری اور فرمانبرداری کا یا ناشکری اور نافرمانی کا؟

چھٹی آیت میں ان دونوں حالتوں کا انجام اس طرح بتلادیا: **إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ** **وَأَنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ** یعنی آپ کا رب نافرمانوں پر جلد عذاب بھیجنے والا ہے، اور فرمانبرداروں کے لئے غفور و رحیم ہے۔

سورۃ النعام کا شروع حمد سے ہوا اور ختم مغفرت پر، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حمد کی توفیق اور مغفرت سے سرفراز فرمادیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ النعام مکمل ایک ہی دفعہ نازل ہوئی، اور اس شان کے ساتھ نازل ہوئی کہ نثر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ سورۃ النعام قرآن کریم کی افضل و اعلیٰ سورتوں میں سے ہے۔

بعض روایات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کو شفا دیتے ہیں۔

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ مِّنَ الْأُولَىٰ نَحْمَدُكَ اللَّهُ رَبَّ الْعَالَمِينَ

—————

سُوءُ الْأَعْرَافِ

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

سُورَةُ الْأَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ بِمِائَتَيْنِ سِتِّينَ آيَاتٍ وَارْبَعَةٌ وَعِشْرُونَ رُكُوعًا

سورۃ اعراف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دس چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بحد مہربان نہایت رحم والا ہے،

الْقَصَصُ ① كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ

یہ کتاب اُتری ہے تجھ پر سوچا ہے کہ تیرا جی تنگ نہ ہو اس کے پہنچانے

مِّنْهُ لِنَذِيرٍ لَهُ وَذِكْرٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ② اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ

ہے تاکہ ڈرائے اس سے اور نصیحت ہو ایمان والوں کو، چلو اسی پر جو اترا تم پر

إِلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا

تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے تم بہت

مَّا تَذَكَّرُونَ ③ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهَكُنَّهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا

کم دھیان کرتے ہو، اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب

بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ④ فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ

راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے، پھر یہی تھی اُن کی پکار جس وقت کہ پہنچا ان پر

بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ⑤ فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ

ہمارا عذاب کہ کہنے لگے کہ بیشک ہم ہی تھے گنہگار، سو ہم کو ضرور پوچھنا، ان سے

أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ⑥ فَلَنَقْصُصَ

جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے، اور ہم کو ضرور پوچھنا، رسولوں سے، پھر ہم اُن کو احوال

عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ⑦

سنا دیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے

خلاصہ مضامین سورۃ

تمام سورۃ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر مضامین معاد (آخرت) اور رسالت سے متعلق ہیں، اور پہلی ہی آیت کِشْبُ اُنْزِلَیْ میں نبوت کا اور آیت نمبر ۱ میں فَلَکُنَّ عَلَمًا میں معاد و آخرت کی تحقیق کا مضمون ہے، اور رکوع چہارم کے نصف سے رکوع ہشتم کے ختم تک بالکل آخرت کی بحث ہے، پھر رکوع ہشتم سے اکیسویں رکوع تک وہ معاملات مذکور ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے ہوئے ہیں، یہ سب مسئلے رسالت سے متعلق ہیں اور ان قصص میں ساتھ ساتھ منکرین رسالت کی سزاؤں کا بھی ذکر چلا آیا ہے، تاکہ منکرین موجودین کو عبرت حاصل ہو، اور رکوع بائیس کے نصف سے تیس کے ختم تک پھر معاد کی بحث ہے، صرف ساتویں اور بائیسویں رکوع کے شروع میں اور آخری رکوع چوبیس کے اکثر حصہ میں توحید پر خاص بحث ہے، باقی بہت کم حصہ سورۃ کا ایسا ہے جس میں جزوی فردی احکام بہ نسبت مقام مذکور ہیں (بنا القرآن)

خلاصہ تفسیر

المصّٰی، اس کے معنی تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے، جس پر امت کو اطلاع نہیں دی گئی بلکہ اس کی جستجو کو بھی منع کیا گیا، کِشْبُ اُنْزِلَیْ اَیْکَ الْحَمْدُ یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو اللہ کی جانب سے آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ (لوگوں کو سزا سے نافرمانی سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں (کسی کے نہ ماننے سے) بالکل تشکی نہ ہونی چاہئے کیونکہ کسی کے نہ ماننے سے آپ کے اصل مقصد بعثت میں جو کہ حق بات پہنچانے کا ہے کوئی خلل نہیں آتا، پھر آپ کیوں دل تنگ ہوں) اور یہ (قرآن خصوصیت کے ساتھ نصیحت ہر ایمان والوں کے لئے آگے عام امت کو خطاب ہے کہ جب قرآن کا منزل من اللہ ہوتا ثابت ہو گیا تو) تم لوگ اس کتاب کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (اتباع کتاب یہ ہے کہ اس کی دل سے تصدیق بھی کرو اور اس پر عمل بھی) اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر جس نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا) دوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو، (جو تم کو گمراہ کرتے ہیں پھر شیاطین الجن والانس مگر باوجود اس مشفقانہ فہمائش کے) تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو، اور کتنی ہی بے بسیاں ہیں کہ ان کو (یعنی ان کے رہنے والوں کو ان کے کفر و تکذیب کی بناء پر ہم نے) تباہ و برباد کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب (یا تو) رات کے وقت پہنچا (جو سونے اور آرام کرنے کا

وقت ہی) یا ایسی حالت میں رہو (نچا) کہ وہ دو پہر کے وقت آرام میں تھے (یعنی کسی کو کسی وقت کسی کو کسی وقت) سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم (اور خطا دار) تھے (یعنی ایسے وقت اقرار کیا جب کہ اقرار کا وقت گزر چکا تھا، یہ تو دنیوی عذاب ہوا) پھر (اس کے بعد آخرت کے عذاب کا سامان ہو گا کہ قیامت میں) ہم ان لوگوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے کہ تم نے پیغمبروں کا کہنا مانا یا نہیں، اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے کہ تمہاری امتوں نے تمہارا کہنا مانا یا نہیں؟ **يَوْمَ يَخْرُجُ الشُّرُكُومُ لِيَقُولَ مَاذَا أَجَبْتُمُ**، اور دونوں سوالوں سے مقصود کفار کو زجر و تنبیہ ہوگی) پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے ہیں خود ہی (سب کے رد و اُن کے اعمال کو) بیان کر دیں گے، اور ہم (عمل کے وقت اور جگہ سے) غائب تو نہ تھے۔

معارف و مسائل

پوری سورۃ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین زیادہ تر معاد، یعنی آخرت اور نبوت و رسالت کے متعلق ہیں، چنانچہ ابتداء سورۃ سے چھٹے رکوع تک تقریباً مضمون معاد و آخرت کا بیان ہوا ہے، پھر آٹھویں رکوع سے اکیسویں رکوع تک انبیاء سابقین کے حالات اور ان کی امتوں کے واقعات، ان کی جزاء و سزا اور ان پر آنے والے عذابوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَزَنٌ، پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطا فرما کر یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی گئی ہے، آپ کو اس کی وجہ سے دل تنگی نہ ہونی چاہئے، دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اور اس کے احکام کی تبلیغ میں آپ کو کسی کا خوف مانع نہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس کو جھٹلا دیں گے اور آپ کو ایذا دیں گے، (کذا ردی عن ابی العالیۃ منطہری)

اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جس نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے اُس نے آپ کی امداد و حفاظت کا بھی انتظام کر دیا ہے، اس لئے آپ کیوں دل تنگ ہوں، اور نبی حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دل تنگی سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور احکام اسلام سن کر بھی جو لوگ مسلمان نہ ہوتے تھے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بوجہ شفقت کے شاق ہوتا تھا، اسی کو دل تنگی سے تعبیر کیا گیا، اور یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ کا فرض منصبی صرف تبلیغ و دعوت کا ہے، جب آپ نے یہ کام کر لیا تو اب یہ ذمہ داری آپ کی نہیں کہ کون مسلمان ہوا کون

نہیں ہوا، پھر آپ کیوں بلاوجہ دل تنگ ہوں۔

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ، یعنی قیامت کے روز عوام الناس سے سوال کیا جائے گا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنے رسول اور کتابیں بھیجی تھیں، تم نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور رسولوں سے پوچھا جائے گا کہ جو پیغام رسالت اور احکام الہیہ دے کر ہم نے آپ کو بھیجا تھا وہ آپ حضرات نے اپنی اپنی امتوں کو پہنچا دیے یا نہیں (آخر جبریل علیہ السلام نے حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں لوگوں سے سوال کیا کہ قیامت کے

روز تم لوگوں سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟ فَمَا آفَئْتُكُمْ قَائِلُونَ، یعنی اُس وقت تم اس کے جواب میں کیا کہو گے؟ سب صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا، اور امانت خداوندی کا حق ادا کر دیا، اور امت کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کیا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَللّٰهُمَّ اَشْهَدْ۔ یعنی یا اللہ آپ گواہ رہیں۔

اور سند احمد کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے دریافت فرماویں گے کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں کو پہنچا دیا، اور میں جواب میں عرض کروں گا کہ میں نے پہنچا دیا ہے، اس لئے اب تم سب اس کا اہتمام کرو کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبین تک میرا پیغام پہنچا دیں (منظری)

غائبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے مگر اس مجلس میں حاضر نہ تھے، اور وہ نسلیں بھی جو بعد میں پیدا ہوں گی، ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ آنے والی نسل کو اس پیغام کے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھیں، تاکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام بنی آدم کو یہ پیغام پہنچ جائے۔

وَالْوِزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۖ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ

اور تول اس دن ٹھیک ہوگی پھر جس کی تولیں بھاری ہوں گی سودہی ہیں

هُمُ السَّافِلُونَ ۝۹ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ

نجات پانے والے، اور جس کی تولیں ہلکی ہوں گی سودہی ہیں

الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝۱۰

جنہوں نے اپنا نقصان کیا، اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط

اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں اور مستقر کر دیں اس میں تمھارے لئے روزیاں

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۱۰﴾

تم بہت کم شکر کرتے ہو

خلاصہ تفسیر

اور اس روز (یعنی قیامت کے دن اعمال و عقائد کا) وزن واقع ہونے والا ہے تاکہ عام طور پر ہر ایک کی حالت ظاہر ہو جائے (پھر وزن کے بعد) جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مؤمن ہوگا) سو ایسے لوگ (تو) کامیاب ہوں گے (یعنی نجات پائیں گے) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) تو یہ لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کر لیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کی حق تلفی کیا کرتے تھے، اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی، اور ہم نے تمھارے لئے اس (زمین) میں سامان زندگی پیدا کیا (جس کا نقصان یہ تمھارا کہ تم اس کے شکریہ میں فرمانبرداری و اطاعت شعار ہوتے، لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (مراد اس سے اطاعت ہو اور کم اس لئے فرمایا کہ تمھارا بہت نیک کام تو اکثر لوگ کر ہی لیتے ہیں، لیکن بوجہ ایمان نہ ہونے کے وہ قابل اعتبار نہیں)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں ارشاد ہے وَالْوِزْنَ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ، یعنی بھلے برے اعمال کا وزن ہونا اس دن حق و صحیح ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکا نہ کھائیں کہ وزن اور تول تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جن میں کوئی بوجھ اور ثقل ہو، انسان کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے ان کا کوئی جسم اور جرم ہی نہیں جس کا تول ہو سکے، پھر اعمال کا وزن کیسے ہوگا، کیونکہ اول تو مالک الملک قادر مطلق ہر چیز پر قادر ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم نہ تول سکیں حق تعالیٰ بھی نہ تول سکیں، اس کے علاوہ آج کل تو دنیا میں وزن تولنے کے لئے نئے نئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن میں نہ ترازو کی ضرورت ہے نہ اس کے پلوں کی اور نہ ڈنڈی کی اور کانٹے کی، آج تو ان نئے آلات کے ذریعہ وہ چیزیں بھی تولی جاتی ہیں جن کے تولنے کا آج سے پہلے کسی کو تصور بھی نہ تھا، ہوا تولی جاتی ہے، برقی رو تولی جاتی

ہر سردی گرمی تولی جاتی ہے، اٹھائی ہوئی تیز زد ہوتی ہے اگر حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے انسانی اعمال کا وزن کر لیں تو اس میں کیا استبعاد ہے، اس کے علاوہ خالق کائنات کو اس پر بھی قدرت ہے کہ ہمارے اعمال کو کسی وقت جوہری وجود اور کوئی شکل و صورت عطا فرمادیں، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی روایات اس پر شاہد بھی ہیں کہ برزخ اور حشر میں انسانی اعمال خاص خاص شکلوں اور صورتوں میں آئیں گے قبر میں انسان کے اعمال صالحہ ایک حسین صورت میں اُس کے موٹس بنیں گے، اور بُرے اعمال ناپ بچھو بن کر لپٹیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کی وہ مال ایک نہ ہریلے سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا، اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں اسی طرح معتبر احادیث میں ہے کہ میدان حشر میں انسان کے اعمال صالحہ اس کی سواری بن جائیں گے، اور بُرے اعمال بوجھ بکر اس کے سر پر لا دے جائیں گے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ فترآن مجید کی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میدان حشر میں دو گہرے بادلوں کی شکل میں آکر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے۔ اسی طرح کی بے شمار روایات حدیث مستند اور معتبر طریقوں سے منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان سے گذر جانے کے بعد ہمارے یہ سارے اعمال نیک و بد خاص خاص شکلوں اور صورتیں اختیار کر لیں گے، اور ایک جوہری وجود کے ساتھ میدان حشر میں موجود ہوں گے۔

قرآن مجید کے بھی بہت سے ارشادات سے اس کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے: **وَوَجَّهْنَا مَاعْمَلُوْا اَحَآصِرًا**، یعنی لوگوں نے دنیا میں جو کچھ عمل کیا تھا اس کو وہاں حاضر و موجود پائیں گے، ایک آیت میں فرمایا **مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ** وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ، یعنی جو شخص ایک ذرہ کی برابر بھی کوئی نیکی کرے گا تو قیامت میں اس کو دیکھے گا، اور ایک ذرہ کی برابر بھی بُرائی کرے گا تو قیامت میں اس کو بھی دیکھے گا، ظاہر ان حالات سے یہی ہے کہ انسان کا عمل جوہری وجود کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا، ان میں بھی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں کہ اعمال کی جزاء کو موجود پائے گا اور دیکھے گا۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ ان اعمال کا تولا جانا کوئی بعید یا مشکل امر نہیں رہتا، مگر چونکہ تھوڑی سی عقل و فہم کا مالک انسان اس کا عادی ہے کہ سارے امور کو اپنی موجودہ حالت اور کیفیت ظاہری پر قیاس کرتا ہے، اور سب چیزوں کو اسی کے پیمانہ سے جانچتا ہے، قرآن کریم نے اس کے اسی حال کو اس طرح بیان فرمایا ہے: **يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا** اَمِّنَ الْجَوَارِثِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَفْلُوْنَ، یعنی یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ایک ظاہری پہلو کو جانتے ہیں وہ بھی پورا نہیں، اور آخرت سے بالکل غافل ہیں، ظاہر حیات دنیا میں تو زمین

آسمان کے قلابے ملاتے ہیں، مگر حقائقِ اشیا سے جن کا صحیح انکشافِ آخرت میں ہونے والا ہے، یہ لوگ بالکل بے خبر ہیں۔

آیت مذکورہ میں اسی لئے اہتمام کر کے یہ فرمایا گیا **وَالْوَسْنَىٰ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ**، تاکہ یہ ظاہر انسانِ آخرت میں وزنِ اعمال سے انکار نہ کر بیٹھے، جو قرآن کریم سے ثابت اور پوری امتِ مسلمہ کا عقیدہ ہے۔

قرآن مجید میں بروز قیامت وزنِ اعمال ہونے کا مسئلہ بہت سی آیات میں مختلف عنوانوں سے آیا ہے اور روایاتِ حدیث ... اس کی تفصیلات میں بے شمار ہیں۔

وزنِ اعمال کے متعلق | وزنِ اعمال کے متعلق جو تفصیلی بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں آیا ہے اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ متعدد روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ محشر کی میزانِ عدل میں سب سے بڑا وزن کلمہ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ** کا ہوگا، جس ... پتلے میں یہ کلمہ ہوگا وہ سب پر بھاری رہے گا۔

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے نشانوں سے نامہ اعمال لائے جاویں گے، اور ان میں سے ہر نامہ اعمال اتنا طویل ہوگا کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے، اور یہ سب نامہ اعمال بُرائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے، اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامہ اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے یا نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کچھ ظلم کیا ہے اور خلافِ واقعہ کوئی بات لکھ دی ہے؟ وہ اقرار کرے گا کہ اے میرے پروردگار! جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے، اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا، ان تمام گناہوں کے مقابلہ میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے، جس میں تمہارا کلمہ **أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ** لکھا ہوا ہے، وہ عوض کرے گا کہ اے پروردگار! اتنے بڑے سیاہ نامہ اعمال کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا، اُس وقت ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا، اور ایک پلہ میں وہ سب گناہوں سے بھرے ہوئے نامہ اعمال رکھے جائیں گے، دوسرے میں یہ کلمہ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا تو اس کلمہ کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا، اس واقعہ کو بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔ (منظہری)

اور سند بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور زمین ایک پلہ میں اور کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دوسرے پلہ میں رکھ دیا جائے تو کلمہ کا پلہ ہی بھاری رہے گا، اسی مضمون کی روایات حدیث حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے معتبر سندوں کے ساتھ کتب حدیث میں منقول ہیں۔ (منظری)

ان روایات کا مقتضا تو یہ ہے کہ مومن کا پلہ ہمیشہ بھاری ہی رہے گا، خواہ وہ کتنے بھی گناہ کرے، لیکن شران مجید کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی حسنات اور سیئات کو تو لا جائے گا کسی کی حسنات کا پلہ بھاری ہوگا، کسی کے گناہوں کا، جس کی حسنات کا پلہ بھاری رہے گا وہ نجات پائے گا، جس کی سیئات اور گناہوں کا پلہ بھاری ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔

مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت میں ہے :-

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا
وَأِنْ كَانَ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا
حَاسِبِينَ ۝

یعنی ہم قیامت کے دن انصاف کی
ترازو قائم کریں گے اس لئے کسی شخص پر ادنیٰ
ظلم نہیں ہوگا جو بھلائی یا بُرائی ایک
رائی کے دانے کے برابر بھی کسی نے کی ہو
وہ سب میزانِ عمل میں رکھی جائے گی، اور
ہم حساب کے لئے کافی ہیں ۝

اور سورۃ قارعہ میں ہے :-

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاغِبَةٍ
وَأَمَّا
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ
هَارِبَةٌ ۝

یعنی جس کا میکیوں کا پلہ بھاری ہوگا
وہ عمرہ عیش میں رہے گا، اور جس کا پلہ نیکی
کا ہلکا ہوگا اس کا مقام دوزخ ہوگا،

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مومن کا پلہ حسنات کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، منظری)
اور ابوداؤد میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ اگر کسی بندہ کے فرائض میں

کوئی کمی پائی جائے گی تو رب العالمین کا ارشاد ہوگا کہ دیکھو اس بندہ کے کچھ نوافل بھی ہیں یا نہیں، اگر نوافل موجود ہیں تو فرضوں کی کمی کو نفلوں سے پورا کر دیا جائے گا۔ (منظری)

ان تمام آیات و روایات کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن مسلمان کا پلہ بھی کبھی بھاری کبھی ہلکا ہوگا، اس لئے بعض علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا، اول کفر و ایمان کا وزن ہوگا، جس کے ذریعہ مؤمن، کافر کا مستیاز کیا جائے گا، اس وزن میں جس کے نامہ اعمال میں مقرر کلمہ ایمان بھی ہو اس کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کر دیا جائے گا، پھر دوسرا وزن نیک و بد اعمال کا ہوگا، اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی بُرائیاں بھاری ہوں گی، اور اسی کے مطابق اس کو جزاء و سزا ملے گی، اس طرح تمام آیات اور روایات کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہو جاتا ہے (بیان ہستیان)

وزن اعمال کس طرح ہوگا | بخاری و مسلم میں ہر روایت ابو ہریرہؓ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کی برابر بھی نہ ہوگا، اور اس کی شہادت میں آپؐ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی، فَلَا تُقِيمُ تَعْمَمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَرَخَّاطُ لِحْنِ قِيَامَتِ كَيْ دَنَ هَمَّ اَن كَا كَوْنِي وَزَن قرار نہ دیں گے (منظری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں ظاہر میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزانِ عدل میں ان کا وزن اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو کھلے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزانِ عمل میں بہت بھاری ہیں، اور اللہ کے نزدیک محبوب ہیں، اور وہ کھلے یہ ہیں: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے،

کہ سُبْحَانَ اللَّهِ کہنے سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، اور الحمد للہ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے اور ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کیا ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حُسنِ خلق کی برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا اور حضرت ابو ذر غفاریؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں ایسے دو کام

بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کے لئے کچھ بھاری نہیں، اور میزانِ عمل میں وہ سب زیادہ بھاری ہوں گے، ایک حُسنِ خلق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا، یعنی بلا ضرورت کلام نہ کرنا۔

اور امام احمد نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ جبریل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوفِ خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا، تو جبریل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا تو وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولانا جائے گا، بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے گا (منظری) ایک حدیث میں ہے کہ میدانِ حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا، جب اُس کا نامہ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پا کر گھبرائے گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اُٹھ کر آئیگی اور اس کے نیک اعمال کے پتے میں گر جائے گی، اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام و مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا، اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا اُن سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگایا گیا (منظری عن ابن المبارک) طبرانی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے اس کی میزانِ عمل میں دو قیراط رکھ دی جائیں گی، اور دوسری روایات میں ہے کہ اس قیراط کا وزن اُحد مہار کی برابر ہوگا۔

طبرانی نے بروایت جابرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی میزانِ عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے اور انکی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

اور امام ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انھوں نے علم دین اور احکام دین سکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولایا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

اس طرح کی روایات حدیث قیامت کے وزنِ اعمال کے سلسلہ میں بہت ہیں، یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص اعمال کی فضیلت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے ان تمام روایات حدیث سے وزنِ اعمال کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے... انسان تو لے جائیں گے، وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامہ اعمال تو لے جائیں گے، اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اعمال محترم ہو جائیں گے وہ تو لے جائیں گے، امام تفسیر ابن کثیرؒ نے یہ سب روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملات کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور عمل کرنے کے لئے

اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں، صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے اعمال کا وزن ہوگا، نیک اعمال کا پتہ ملے گا تو عذاب کے مستحق ہوں گے، یہ دوسری بات ہو کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل و کرم سے یا کسی نبی یا ولی کی شفاعت سے معاف فرمادیں اور عذاب سے نجات ہو جائے۔

جن روایات میں یہ مذکور ہو کہ بعض لوگوں کو صرف کلمہ ایمان کی بدولت نجات ہو جائے گی اور سب گناہ اس کے مقابلہ میں معاف ہو جائیں گے، یہ اسی استثنائی صورت سے متعلق ہیں جو عام ضابطہ سے الگ مخصوص فضل و کرم کا مظہر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جن کی تفسیر ابھی بیان ہوئی، گناہ نگاروں کو میدانِ حشر کی رسوائی اور عذابِ الہی سے ڈرایا گیا تھا، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر فرما کر حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب اس طرح دی گئی کہ ہم نے تم کو زمین پر پوری قدرت اور تصرف مالاکنا عطا کیا، اور پھر اس میں تمہارے لئے سامانِ عیش حاصل کرنے کے ہزاروں راستے کھول دیئے، گویا رب العالمین نے زمین کو انسان کی تمام ضروریات سے لے کر تفریحی سامان تک کا عظیم الشان گودام بنا دیا ہے، اور تمام انسانی ضروریات کو اس کے اندر پیدا فرما دیا ہے، اب انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ اس گودام سے اپنی ضروریات کو نکالنے اور ان کے استعمال کرنے کے طریقوں کو سیکھ لے، انسان کے ہر علم و فن اور سائنس کی نئی سے نئی ایجاد کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ خالق کائنات کی پیدا کی ہوئی چیزیں جو زمین کے گودام میں محفوظ ہیں، ان کو سلیقہ کے ساتھ نکالے اور صحیح طریقہ سے استعمال کرے، بیوقوف اور بد سلیقہ آدمی جو اس گودام سے نکالنے کا طریقہ نہیں جانتا، یا پھر نکال کر اس کے استعمال کا طریقہ نہیں سمجھتا وہ ان کے منافع سے محروم رہتا ہے، سمجھدار انسان دونوں چیزوں کو سمجھ کر ان سے نفع اٹھاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہو کہ ساری ضروریات انسانی حق تعالیٰ نے زمین میں ودیعت رکھ دی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر گزار ہو مگر وہ غفلت میں پڑ کر اپنے خالق مالک کے احسانات کو بھول جاتا ہے، اور اپنی اشیاء میں الجھ کر رہ جاتا ہے، اسی لئے آخر آیت میں بطور شکایت کے ارشاد فرمایا: قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ، یعنی تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا

اور ہم نے معن کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری پھر حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو

لَادَمَ ۖ فَسَجَدَ ۖ إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝

آدم کو پس سجدہ کیا سب نے مگر ابلیس نہ تھا سجدہ والوں میں ،

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذَا اَمَرْتُكَ ط قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْكَ ج

کہا تجھ کو کیا مانع تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے حکم دیا بولا میں اس سے بہتر ہوں ،

خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَ مِنْ طِينٍ ۝۱۳ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا

مجھ کو تو نے بنایا آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے ، کہا تو اتر یہاں سے

فَمَا يَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصَّغِيْرِيْنَ ۝۱۴

تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں پس باہر نکل تو ذلیل ہے ،

قَالَ اَنْظِرْنِيْ اِلٰى يَوْمٍ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۵ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۶

بولا کہ مجھے مہلت دے اُس دن تک کہ لوگ قبروں کا اٹھاؤ جائیں ، فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی ،

قَالَ فَبِمَا اَغْوَيْتَنِيْ لَاقَعْدَنْ لَهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۱۷

بولا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہر میں بھی ضرور بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر ،

ثُمَّ لَا تَبۡرَأُ مِنْۢ بَيْنِ اَيۡدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اٰمَائِهِمْ

پھر اُن پر آؤں گا اُن کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے

وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ط وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۸ قَالَ

اور بائیں سے ، اور نہ پادے گا اکثروں کو ان میں شکر گزار ، کہا

اَخْرُجْ مِنْهَا مَذۡمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط لِمَنِ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَلَمْ لَكُنْ

نکل یہاں سے بُرے حال سے مردود ہو کر ، جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں

جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۹

ضرور بھڑوں گا دوزخ کو تم سب سے

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے تم کو پیدا کرنے کا سامان شروع کیا (یعنی آدم علیہ السلام کا مادہ بنایا، اسی مادے سے تم سب لوگ ہو) پھر (مادہ بنا کر) ہم نے تمہاری صورت بنائی (یعنی اس مادے میں آدم علیہ السلام کی صورت بنائی، پھر وہی صورت ان کی اولاد میں چلی آرہی ہے، یہ نعمت ایجاد ہوئی) پھر (جب آدم علیہ السلام بن گئے اور علوم اسماء سے مشرف ہوئے تو) ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو (اب سجدہ کرو) یہ نعمت اکرام ہوئی (تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ وہ

سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کوئی ناسام مانع ہے، جب کہ میں (خود) تجھ کو سجدہ کا حکم دے چکا، کہنے لگا (وہ امر مانع یہ ہے کہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے (یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے، اور دوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے، تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہو، چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا سجدہ کرنا غیر افضل کو نامناسب ہے، ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں اس لئے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا، مگر پہلے مقدمہ کے سوا سارے ہی مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں جزو غالب مٹی کا ہے، باقی مقدمات دلیل کا غلط ہونا کھلا ہوا ہے، کیونکہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہو سکتی ہے، کلی طور پر اس کو افضل کہنا دعویٰ بے دلیل ہے، اسی طرح افضل کی فرع اور اولاد کا افضل ہونا بھی مشکوک ہے، ہزاروں واقعات اس کے خلاف سامنے آئے ہیں، کہ نیک کی اولاد بد اور بد کی اولاد نیک ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے، کہ افضل کو مفضل کے لئے سجدہ نامناسب ہے، بعض اوقات مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہونا مشاہدہ ہے)

حق تعالیٰ نے فرمایا (جب تو ایسا نافرمان ہے) تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے، (خاص کر) آسمان میں رہ کر (جہاں سب فرمانبرداروں ہی کا مقام ہے) تو (یہاں سے) نکل (دور ہو) بے شک تو (اس تکبر کی وجہ سے) ذیلیوں میں شمار ہونے لگا، وہ کہنے لگا مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی، وہ کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (بحکم تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان دسے یعنی آدم اور اولاد آدم کی رہزنی کرنے کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر (جو کہ دین حق ہو جا کر) بیٹھ جاؤں گا پھر ان پر (ہر چار طرف سے) حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی (یعنی ان کے بہکانے میں کوشش کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑوں گا تاکہ وہ آپ کی عبادت نہ کرنے پاویں) اور (میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، چنانچہ) آپ ان میں سے اکثروں کو (آپ کی نعمتوں کا) احسان ماننے والا نہ پاویں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں (آسمان) سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا (اور تو جو اولاد آدم کو بہکانے کو کہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے کر لے میں سب سے بے نیاز ہوں نہ کسی کے راہ راست پر آنے سے میرا کوئی فائدہ ہو نہ گمراہ ہونے سے کوئی نقصان) جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سے (یعنی اہلین)

اور اس کی بات ماننے والوں سے) بہنم کو بھردوں گا۔

معارف و مسائل

حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کا یہ واقعہ جو یہاں مذکور ہے اس سے پہلے سورۃ بقرہ کے چوتھے رکوع میں بیان ہو چکا ہے، اس کے متعلقہ بہت سے تحقیق طلب امور کا بیان وہاں ہوا ہے، یہاں چند امور تحقیق طلب کا جواب لکھا جاتا ہے۔

ابلیس کی دعا، قیامت تک زندگی کی قبول ہوئی یا نہیں، بصورت قبول دو آیتوں کے متعاضد الفاظ کی تطبیق سے ایک دعا مانگی، اور وہ بھی عجیب دعا کہ حشر تک کی زندگی کی مہلت عطا فرمادے، اس کے جواب میں جو ارشاد حق تعالیٰ نے فرمایا

اس کے الفاظ اس جگہ مذکورہ آیت میں تو صرف یہ ہیں اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ، یعنی تجھ کو مہلت دی گئی، ان الفاظ سے بہترین دعا و سوال یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ مہلت حشر تک کی دی گئی، جیسا کہ اس نے سوال کیا تھا، مگر اس کی تفسیر اس آیت میں نہیں ہے، کہ جس مہلت دینے کا ذکر یہاں فرمایا ہے وہ ابلیس کے کہنے کے مطابق حشر تک ہر یا کسی اور میعاد تک، لیکن دوسری آیت میں اس جگہ اِلٰی يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ کے الفاظ بھی آئے ہیں، جن کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کی مانگی ہوئی مہلت قیامت تک نہیں دی گئی، بلکہ کسی خاص مدت تک دی گئی ہے جو علم الہی میں محفوظ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ ابلیس کی یہ دعا قبول تو ہوئی، مگر ناتمام کہ بجائے روز قیامت کے ایک خاص مدت تک کی مہلت دیدی گئی۔

تفسیر ابن جریر میں ایک روایت سدی سے منقول ہے اس سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

فلم ينظره الى يوم البعث و	اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو یوم بعث تک
لكن انظره الى يوم الوقت المعلوم	مہلت نہیں دی بلکہ ایک معین دن تک
وهو يوم ينفخ في الصور النفخة	مہلت دی ہے اور وہ دن ہے جس میں پہلا
الاولى تصعق من في السموات	صور پھونکا جائے گا جس سے آسمان زمین
ومن في الارض خسأت، الخ	والے سب بہوش ہو جائیں گے اور مر جائیں گے

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ شیطان نے تو اپنی دعا میں اس وقت تک کی مہلت مانگی تھی، جبکہ دوسرا صور پھونکنے تک تمام مردوں کو زندہ کیا جائے گا، اسی کا نام یوم البعث ہے، اگر یہ دعا بعینہ قبول ہوتی تو جس وقت ایک ذات حی و قیوم کے سوا کوئی زندہ نہ رہے گا، اور

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهٌ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ کا ظہور ہوگا، اس دعا کی بناء پر ابلیس اس وقت بھی زندہ رہتا، اس لئے اس کی ایک دعا کو یوم البعث تک کی مہلت کے یَوْمُ يُفْخِ فِي الصُّورِ تک کی مہلت سے تبدیل کر کے قبول کیا گیا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ جس وقت سارے عالم پر موت طاری ہوگی، اس وقت ابلیس کو بھی موت آئے گی، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو وہ بھی زندہ ہو جائے گا۔

اس تحقیق سے وہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو آیت کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سے اس دعا کے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر دونوں میں تعارض ہو گیا۔

لیکن حاصل اس تحقیق کا یہ ہے کہ یوم البعث اور یوم الوقت المعلوم دو الگ الگ دن ہیں ابلیس نے یوم البعث تک کی مہلت مانگی تھی وہ پوری قبول نہ ہوئی، اس کو بدل کر یوم الوقت المعلوم تک کی مہلت دی گئی، سیدی حضرت حکیم الامتہ تمھانوی نے بیان القرآن میں ترجیح اس کو دی ہے کہ درحقیقت یہ دونوں الگ الگ دن ہیں، بلکہ نفخہ اولیٰ کے وقت سے دخول جنت و نار تک ایک طویل دن ہوگا، اس کے مختلف حصوں میں مختلف واقعات ہوں گے، انہی واقعات مختلف کی بناء پر اس دن کی ہر واقعہ کی طرف نسبت کر سکتے ہیں، مثلاً اس کو یوم نفخ صور و یوم فناء بھی کہہ سکتے ہیں، اور یوم البعث اور یوم جزاء بھی، اس سے سب اشکالات رفع ہو گئے، فللہ الحمد کیا کافر کی دعا بھی یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ آیات قرآن وَمَا عَنِ الْكٰفِرِيْنَ قبول ہو سکتی ہے [إِلَّا فِي ضَلٰلٍ] سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی، مگر اس واقعہ ابلیس اور آیت مذکورہ سے قبولیت دعا کا اشکال ظاہر ہے، جواب یہ ہے کہ دنیا میں تو کافر کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ ابلیس جیسے کفر کی دعا بھی قبول ہو گئی، مگر آخرت میں کافر کی دعا قبول نہ ہوگی، اور آیت مذکورہ وَمَا عَنِ الْكٰفِرِيْنَ آخرت کے متعلق ہے دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

واقعہ آدم و ابلیس | قرآن مجید میں یہ قصہ کئی جگہ آیا ہے، اور ہر جگہ اس سوال و جواب کے الفاظ کے مختلف الفاظ مختلف ہیں، حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے، درجہ یہ ہے کہ اصل واقعہ میں تو سب جگہ ایک ہی مضمون ہے اور نقل الفاظ ہر جگہ بعینہ ضروری نہیں، روایت بالمعنی بھی ہو سکتی ہے، اتحاد مضمون و مفہوم کے بعد اختلاف الفاظ قابل نظر نہیں۔

ابلیس کو یہ جرأت کیسے ہوئی | رب العزت جل شانہ کی بارگاہ قدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی کہ بارگاہ عزت و جلال میں ہیبت و جلال کی بناء پر مجال دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہو گئی، علمائے فرمایا کہ یہ قہر آبی کا انتہائی سخت منظر

ہو کہ ابلیس کے مردود ہو جانے کے باعث ایک ایسا حجاب حائل ہو گیا جس نے اس پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کو مستور کر دیا اور بے حیائی اس پر مسلط کر دی (بیان لغز آن ملخصاً و موضحاً)

شیطان کا حملہ انسان پر قرآن عزیز کی مذکورہ آیت میں یہ مذکور ہے کہ ابلیس نے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے لئے چار طرف میں محدود نہیں کیا ہے، آگے پیچھے، دائیں بائیں، لیکن یہاں درحقیقت کوئی تحدید مقصود نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر سمت سے

اور ہر پہلو سے، اس لئے اوپر کی جانب یا پاؤں تلے سے گمراہ کرنے کا احتمال اس کے منافی نہیں، اسی طرح حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ شیطان انسان کے بدن میں داخل ہو کر خون کی رگوں کے ذریعہ پورے بدن انسان پر تصرف کرتا ہے، یہ بھی اس کے منافی نہیں۔

آیات مذکورہ میں شیطان کو آسمان سے نکل جانے کا حکم دوسرے ذکر کیا گیا ہے، پہلے **فَاخْرِجْهُ اِنَّكَ مِنَ الصَّغِيرِينَ** میں دوسرا قال **اَخْرِجْهُ مِنْهَا** و **وَمَا فِيهَا** غالباً پہلا کلام ایک تجویز ہے اور دوسرے میں اس کی تنفیذ (بیان القرآن ملخصاً)

وَيَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ

اور اے آدم رہ تو اور تیری عورت جنت میں پھر کھاؤ جہاں سے

تَشْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِيْنَ (۱۹)

چاہو اور پاس نہ جاؤ اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے گناہگار،

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وَّرِى عَنْهُمَا

پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھی،

مِنْ سَوَآئِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ

ان کی شرمگاہوں سے اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس درخت سے

اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (۲۰) و

مگر اسی لئے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے، اور

قَالَ سَمِعَآئِیْ لَكُمْ اَلِیْسَ النَّصِيْحَیْنِ (۲۱) **فَدَلَّٰهُمَا بِخُرُوْدٍ**

ان کے آگے قسم کھائی کہ میں البتہ تمہارا دوست ہوں، پھر مائل کر لیا ان کو فریب کے

فَلَمَّآ ذَا قَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآَتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ

پھر جب چکھا ان دونوں نے درخت کو تو کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی اور لگے جوڑنے

النص

عَلَيْهِمَا مِنْ ذَرِّقِ الْجَنَّةِ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ آتَاكُمَا عَنْ

اپنے اوپر بہشت کے پتے اور پکارا ان کو ان کے رب نے کہا میں نے منع نہ کیا تھا

تِلْكَمَا الشَّجَرَةَ وَقُلْ لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۲۲﴾

تم کو اس درخت سے اور نہ کہہ دیا تھا تم کو کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے

قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

بولے وہ دونوں اے رب ہمارے ظلم کیا ہم نے اپنی جان پر، اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور

مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ

ہو جائیں گے تباہ، فرمایا تم اتر دو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمہارے واسطے

فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَ

زمین میں ٹھکانا اور رفع اٹھانا ہے ایک وقت تک، فرمایا اسی میں تم زندہ رہو گے اور

فِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تَخْرَجُونَ ﴿۲۵﴾

اسی میں تم مر گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (آدم علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بی بی (حواء) جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو (اور جس چیز کو چاہو) دونوں آدمی کھاؤ اور راتنا خیال رہے کہ اس (خاص) درخت کے پاس (بھی) مت جاؤ یعنی اس کا پھل نہ کھاؤ، کبھی ان لوگوں کے شمار میں آ جاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتے ہیں، پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ (ان کو وہ ممنوع درخت کھلا کر) ان کا مستور بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے (کیونکہ اس درخت کے کھانے کی یہی تاثیر ہے خواہ بالذات یا بوجہ ممانعت کے) اور (وہ وسوسہ یہ تھا کہ دونوں سے) کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں (اس کو کھا کر) کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ (حاصل وسوسہ کا یہ تھا کہ اس درخت کے کھانے سے قوت ملکیت اور دائمی زندگی کی پیدا ہو جاتی ہے، مگر شروع میں آپ کا وجود اس طاقتور غذا کا تحمل نہ تھا، اس لئے منع کر دیا گیا تھا، اب آپ کی حالت اور قوت میں ترقی ہو گئی، اور آپ کے قومی میں اس کا تحمل ہو گیا

تو اب وہ ممانعت باقی نہ رہی) اور ان دونوں کے رویہ و اس بات پر (قسم کھالی کہ یقین جانے میں آپ دونوں کا (دل سے) خیر خواہ ہوں تو) ایسی باتیں بنا کر ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا، نیچے لانا باعتبار حالت اور رائے کے بھی تھا کہ اپنی رائے عالی کو چھوڑ کر اس دشمن کی رائے پر مائل ہو گئے، اور مقام کے اعتبار سے بھی کہ جنت سے اسفل کی طرف اتارے گئے، پس ان دونوں نے جو درخت کو چکھا (فوراً) دونوں کا مستور بدن ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا، (یعنی جنت کا لباس اُتر پڑا اور دونوں شرمائے گئے) اور (بدن چھپانے کے لئے) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور (اس وقت) اُن کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے سے) ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ بتلا چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، اس کے بہکانے سے بچتے رہنا، دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ پوری حسیا ط اور تامل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے، حق تعالیٰ نے (آدم و حواء علیہما السلام سے) فرمایا کہ (جنت سے) نیچے (زمین پر) ایسی حالت میں جاؤ کہ تم (یعنی تمہاری اولاد) باہم بعضے بعض کے دشمن رہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ (تجویز کی گئی) ہے اور (اسبابِ معیشت سے) نفع حاصل کرنا (تجویز ہوا ہے) ایک وقت (خاص تک) (یعنی موت کے وقت تک) اور یہ بھی (فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنے سے اور اسی میں سے (قیامت کے روز) پھر زندہ ہو کر نکلتا ہے۔

معارف و مسائل

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ آیات مذکورہ میں آیا ہے بعینہ یہ سب واقعہ سورۃ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پوری تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اور اس کے متعلق جس قدر سوالات و شبہات ہو سکتے ہیں ان سب کا تفصیلی جواب اور پوری تشریح مع دیگر فوائد کے سورۃ بقرہ کی تفسیر میں صفحہ ۱۱۸ سے صفحہ ۱۴۴ تک لکھ دیا گیا ہے، ضرورت ہو تو وہاں دیکھ لیا جائے

يٰۤاِبْنِ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْآتِكَ

اے اولاد آدم کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے

وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ

آرائش کے کپڑے اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے، یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی

لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ﴿۳۱﴾ يَلْبَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا

تاکہ وہ لوگ غور کریں، اے اولادِ آدم کی نہ بہکاوے تم کو شیطان جیسا کہ

أَخْرَجَ أَبْوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسًا لِّئَلَّا يَرِيَهُمَا

اس نے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے، اُتروائے ان سے اُن کے کپڑے تاکہ دیکھ لے

سَوَآتِهِمَا إِنَّهُ يَرِيكُمْ هُنَا وَقَبِيلُهُ مَن حَيْثُ لَا تَرَوْهُمْ ط

ان کو شرمگاہیں ان کی وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کی قوم جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے،

إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۲﴾

ہم نے کر دیا شیطانوں کو رشتیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے

خلاصہ تفسیر

اے اولادِ آدم (ایک ہمارا انعام یہ ہے کہ) ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے ستر (یعنی پردہ والے بدن) کو بھی چھپاتا ہے اور (تمہارے بدن کے لئے) موجبِ زینت بھی (ہوتا) ہے، اور اس ظاہری لباس کے علاوہ ایک معنوی لباس بھی تمہارے لئے تجویز کیا ہے جو (تقویٰ) یعنی دینداری کا لباس (ہے) یہ اُس (لباس ظاہری) سے بڑھ کر (ضروری) ہے (کیونکہ اس ظاہری لباس کا مطلوب شرعی ہونا اسی تقویٰ یعنی دینداری کی ایک فرع ہے، اصل مقصود ہر حالت میں لباسِ تقویٰ ہی ہے) یہ (لباس پیدا کرنا) اللہ تعالیٰ کے (فضل و کرم) کی نشانیوں میں سے ہوتا ہے، تاکہ یہ لوگ (اس نعمت کو) یاد رکھیں (اور یاد رکھ کر اپنے منعم اور محسن کا حق اطاعت ادا کریں اور وہ حق اطاعت وہی ہے جس کو لباسِ تقویٰ فرمایا ہے) اے اولادِ آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے (کہ خلافِ دین و تقویٰ تم سے کوئی کام کراوے) جیسا اس نے تمہارے دادا دادی (یعنی آدم و حوا علیہما السلام) کو جنت سے باہر کرا دیا (یعنی ان سے ایسا کام کرا دیا کہ اس کے نتیجہ میں وہ جنت سے باہر ہو گئے، اور باہر بھی) ایسی حالت سے (کرایا) کہ اُن کا لباس بھی ان (کے بدن) سے اُتر وادیا، تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کے پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے (جو شریف انسان کیلئے بڑی شرم و رسوائی ہے، غرض شیطان تمہارا قدیم دشمن ہے، اس سے بہت ہوشیار رہو اور زیادہ احتیاط اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ) وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو (عادتاً) نہیں دیکھتے ہو (ظاہر ہے کہ ایسا دشمن بہت خطرناک ہے، اس سے بچنے کا پورا اہتمام چاہئے، اور یہ اہتمام ایمان کامل اور تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے وہ اختیار کر لو تو بچاؤ کا

سامان ہو جائے گا، کیونکہ ہم شیطانوں کو انہی کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے (اگر بالکل ایمان نہیں تو پوری طرح شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور اگر ایمان تو ہے مگر کامل نہیں تو اس سے کم درجہ کا تسلط ہوتا ہے، بخلاف مؤمن کامل کے کہ اس پر شیطان کا بالکل قابو نہیں چلتا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے: **إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ**،

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان رحیم کا واقعہ بیان فرمایا گیا تھا، جس میں شیطانی اغوار کا پہلا اثر یہ ہوا تھا کہ آدم و حوا علیہما السلام کا جتنی لباس اتر گیا اور وہ ننگے رہ گئے، اور پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔

متذکرہ آیات میں سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے تمام اولادِ آدم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تمہارا لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی قدر کرو، یہاں خطاب صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ پوری اولادِ آدم کو ہے، اس میں اشارہ ہے بہتر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور ضرورت ہے، بغیر امتیاز کسی مذہب و ملت کے سب ہی اس کے پابند ہیں، پھر اس کی تفصیل میں تین قسم کے لباسوں کا ذکر فرمایا:

اول: **لِبَاسًا يُّوَارِي سَوْآتِكُمْ**، اس میں یواری، موارات سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں چھپانے کے، اور سواۃ، سورۃ کی جمع ہے، ان اعضاءِ انسانی کو سورۃ کہا جاتا ہے جن کے کھلنے کو انسان فطرۃً برا اور قابلِ شرم سمجھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہاری صلاح و فلاح کے لئے ایک ایسا لباس اُتارا ہے، جس سے تم اپنے قابلِ شرم اعضاء کو چھپا سکو۔

اس کے بعد فرمایا **وَرِيشًا**، ریش اس لباس کو کہا جاتا ہے جو آدمی زینت و جمال کے لئے استعمال کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ صرف ستر چھپانے کے لئے تو مختصر سا لباس کافی ہوتا ہے، مگر ہم نے تمہیں اس سے زیادہ لباس اس لئے عطا کیا کہ تم اس کے ذریعہ زینت و جمال حاصل کر سکو، اور اپنی ہیئت کو شائستہ بنا سکو۔

اس جگہ قرآن کریم نے **أَنزَلْنَا** یعنی اتارنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے، مراد اس سے عطا کرنا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آسمان سے بنا بنایا اُترا ہو، جیسے دوسری جگہ **أَنزَلْنَا الْحَدِيدَ** کا لفظ آیا ہے، یعنی ہم نے لوہا اُتارا، جو سب کے سامنے زمین سے نکلتا ہے، البتہ دونوں جگہ لفظ **أَنزَلْنَا** فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس طرح آسمان سے اُترنے والی چیزوں میں کسی انسانی تدبیر اور صنعت کو دخل نہیں ہوتا، اسی طرح لباس کا اصل مادہ جو روئی یا اُون وغیرہ ہے اس میں کسی انسانی

تدبیر کو ذرہ برابر دخل نہیں، وہ محض قدرت حق تعالیٰ کا عطیہ ہی، البتہ ان چیتروں سے اپنی رحمت و آرام اور مزاج کے مناسب سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس بنالینے میں انسانی صنعت گری کام کرتی ہے، اور وہ صنعت بھی حق تعالیٰ ہی کی بتلائی اور سکھائی ہوئی ہے، اس لئے حقیقت شناس نگاہ میں یہ سب حق تعالیٰ ہی کا ایسا عطیہ ہی جیسے آسمان سے اتارا گیا ہو۔

لباس کے دو فائدے | اس میں لباس کے دو فائدے بتلائے گئے، ایک ستر پوشی، دوسرے سردی گرمی سے حفاظت اور آرائش بدن، اور پہلے فائدہ کو مقدم کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسانی لباس کا اصل مقصد ستر پوشی ہے، اور یہی اس کا عام جانوروں سے امتیاز ہے، کہ جانوروں کا لباس جو قدرتی طور پر ان کے بدن کا جزء بنادیا گیا ہے اس کا کام صرف سردی گرمی سے حفاظت یا زینت ہے، ستر پوشی کا اس میں اتنا اہتمام نہیں، البتہ اعضائے مخصوصہ کی وضع ان کے بدن میں اس طرح رکھ دی ہے کہ بالکل کھلے نہ رہیں، کہیں ان پر دم کا پردہ کہیں دوسری طرح کا۔

اور حضرت آدم و حوٰار اور اغوار شیطانی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لباس کے ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لئے ننگا اور قابل شرم اعضاء کا دوسروں کے سامنے کھلنا انتہائی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کی علامت اور طرح طرح کے شر و فساد کا مقدمہ ہے۔

انسان پر شیطان کا پہلا حملہ | اور یہی وجہ ہے کہ شیطان کا سب سے پہلا حملہ انسان کے خلاف اسی راہ سے ہوا کہ اس کا لباس اُتر گیا، اور آج بھی شیطان اپنے شاگردوں کے ذریعے آج بھی نئی شیطانی تہذیب انسان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو تہذیب و شائستگی کا نام لیکر سب سے پہلے اس کو برہنہ یا نیم برہنہ کر کے عام سڑکوں اور گلیوں میں کھڑا کر دیتا ہے اور شیطان نے جس کا نام ترقی رکھ دیا ہے وہ تو عورت کو شرم و حیا سے محروم کر کے منظر عام پر نیم برہنہ حالت میں لے آنے کے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔

ایمان کے بعد سب سے پہلا | شیطان نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپ کر پہلا حملہ انسان کی ستر پوشی فرض ستر پوشی ہے پر کیا، تو شریعت اسلام جو انسان کی ہر صلاح و فلاح کی کفیل ہے، اس نے ستر پوشی کا اہتمام اتنا کیا کہ ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض ستر پوشی کو قرار دیا، نماز، روزہ وغیرہ سب اس کے بعد ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نیا لباس پہنے تو اس کو چاہئے کہ لباس پہننے کے وقت یہ دعا پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسٰہِیْ | یعنی شکر اس ذات کا جس نے مجھے لباس دیا

مَا أَرَىٰ بِهِ عِوَارِيٍّ وَأَنْتَ جَمَلٌ بِهِ
فِي حَيَاتِي

جس کے ذریعہ میں اپنے ستر کا پردہ کروں
اور زینت حاصل کروں۔

نیا لباس بنانے کے وقت ہرنے لباس اور فرمایا کہ جو شخص نیا لباس پہننے کے بعد پرانے لباس کو غریب و
مکرمہ کر دینے کا ثواب عظیم مسکین پر صدقہ کر دے تو وہ اپنی موت و حیات کے ہر حال میں
اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور پناہ میں آگیا۔ (ابن کثیر عن مسند احمد)

اس حدیث میں بھی انسان کو لباس پہننے کے وقت اپنی دونوں مصلحتوں کو یاد دلایا گیا ہے
جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی لباس پیدا فرمایا ہے۔

ستر پوشی ابتداءً آفرینش سے انسان کا فطری آدم علیہ السلام کے واقعہ اور قرآن کریم کے اس ارشاد سے
عمل ہو، ارتقاء کا جدید فلسفہ باطل ہے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری

خواہش اور پیدائشی ضرورت ہے، جو اول دن سے اس کے ساتھ ہے، اور آجکل کے بعض فلاسفوں کا
یہ قول سراسر غلط اور بے اصل ہے کہ انسان اول ننگا پھرا کرتا تھا، پھر ارتقائی منزلیں طے کرنے کے
بعد اس نے لباس ایجاد کیا۔

لباس کی ایک تیسری قسم | ستر پوشی اور راحت و زینت کے لئے دو قسم کے لباسوں کا ذکر فرمانے
کے بعد قرآن کریم نے ایک تیسرے لباس کا ذکر اس طرح فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ
بعض قرار توں میں فتح یعنی زہر کے ساتھ لِبَاسُ التَّقْوَىٰ پڑھا گیا ہے، تو أَنْزَلْنَاكَ تَحْتَ میں
داخل ہو کر معنی یہ ہوئے کہ ہم نے ایک تیسرا لباس تقویٰ کا اہمارا ہے، اور مشہور قرأت کی رو سے
معنی یہ ہیں کہ یہ دو لباس تو سب جانتے ہیں، ایک تیسرا لباس تقویٰ کا ہی، اور وہ سب لباسوں
سے زیادہ بہتر ہے، لباس تقویٰ سے مراد حضرت ابن عباس اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے
مطابق عمل صالح اور خوفِ خدا ہے۔ (روح)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ظاہری لباس انسان کے قابلِ شرم اعضاء کے لئے پردہ اور
سردی گرمی سے بچنے اور زینت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح ایک معنوی لباس صالح
اور خوفِ خدا تعالیٰ کا ہے جو انسان کے اخلاقی عیوب اور کمزوریوں کا پردہ ہے، اور دائمی تکمیل
اور مصیبتوں سے نجات کا ذریعہ ہے اسی لئے وہ سب سے بہتر لباس ہے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک بدکار آدمی جس میں خوفِ خدا نہ ہو اور وہ عمل
صالح کا پابند نہ ہو وہ کتنے ہی پردوں میں چھپے مگر انجام کار رسوا اور ذلیل ہو کر رہتا ہے، جیسا
کہ ابن جریر نے بروایت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے جو شخص کوئی بھی عمل لوگوں کی نظروں

سے چھپا کر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس عمل کی چادر اڑھاکر اعلان کر دیتے ہیں، نیک عمل ہو تو نیکی کا اور بُرا عمل ہو تو بُرائی کا، چادر اڑھانے سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بدن پر اوڑھی ہوئی چادر سب کے سامنے ہوتی ہے، انسان کا عمل کتنا ہی پوشیدہ ہو اس کے ثمرات و آثار اس کے چہرے اور بدن پر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتے ہیں، اور اس ارشاد کی سند میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، وَرِيثًا، وَلِبَاسٍ التَّقْوَىٰ، ذَلِكُمْ خَيْرٌ، ذَلِكُمْ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ

ظاہری لباس کا بھی اصل | لباس التقویٰ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہو | ظاہری لباس کے ذریعہ ستر پوشی اور زینت و تجمل سب کا اصل

مقصد تقویٰ اور خوفِ خدا تعالیٰ ہے، جس کا ظہور اس کے لباس میں بھی اس طرح ہونا چاہئے کہ اس میں پوری ستر پوشی ہو، کہ قابلِ مشرم اعضاء کا پورا پردہ ہو، وہ تنگے بھی نہ رہیں، اور لباس بدن پر ایسا چست بھی نہ ہو جس میں یہ اعضاء مثل تنگے کے نظر آئیں، نیز اس لباس میں فخر و غرور کا انداز بھی نہ ہو بلکہ تواضع کے آثار ہوں، اسرافِ بیجا بھی نہ ہو، ضرورت کے موافق کپڑا استعمال کیا جائے، عورتوں کے لئے مردانہ اور مردوں کے لئے زنانہ لباس بھی نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض و مکروہ ہو، لباس میں کسی دوسری قوم کی نقائی بھی نہ ہو جو اپنی قوم و ملت سے غداری اور اعراض کی علامت ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاق و اعمال کی درستی بھی ہو جو لباس کا اصل مقصد ہے۔ آخر آیت میں ارشاد

فَرَمَا ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ، یعنی انسان کو لباس کی یہ تینوں قسمیں عطا فرمانا اللہ جل شانہ کی آیات قدرت میں سے ہے تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

دوسری آیت میں پھر تمام اولادِ آدم کو خطاب کر کے تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنے ہر حال اور ہر کام میں مکرِ شیطانی سے بچتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو پھر کسی فتنہ میں مبتلا کر دے، جیسا تمھارے ماں باپ حضرت آدم و حوا کو اس نے جنت سے نکلوایا، اور ان کا لباس اُتار کر ان کے ستر کھولنے کا سبب بنا، وہ تمھارا قدیم دشمن ہے، اس کی دشمنی کا ہمیشہ ہر وقت خیال رکھو۔

آخر آیت میں فرمایا اِنَّهٗ يَرِيْكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُكُمْ مِنْ حَيْثُ لَا تَحْتَرُوْهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِيْنَ اَوْلِيَاَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ، اس میں لفظ قبیل کے معنی جماعت اور جتھے کے ہیں، جو جماعت ایک خاندان کی شریک ہو اس کو قبیلہ کہتے ہیں، اور عام جماعتوں کو قبیل کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ شیطان تمھارا ایسا دشمن ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی تو تم کو دیکھتے ہیں، تم ان کو نہیں دیکھتے، اس لئے ان کا مکر و فریب تم پر چل جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔

لیکن دوسری آیات میں یہ بھی بتلادیا گیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے اور مکرِ شیطانی سے ہوشیار رہنے والے ہیں، ان کے لئے شیطان کا جال نہایت کمزور ہے۔

اور اس آیت کے آخر میں بھی جو یہ فرمایا کہ ہم نے شیطانوں کو ان کا سر پرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہو کہ ایمان والوں کے لئے اس کے جال سے بچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

بعض حضرات سلف نے فرمایا کہ یہ دشمن جو ہمیں دیکھتا ہے اور ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے اس کا علاج ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیں، جو ان شیطانوں کو اور ان کی نقل و حرکت کو دیکھتا ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اور یہ ارشاد کہ انسان شیاطین کو نہیں دیکھ سکتا عام حالات اور عام عادت کے اعتبار سے ہے، خرق عادت کے طور پر کوئی انسان کبھی ان کو دیکھ لے یہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کا آنا اور سوالات کرنا اور اسلام قبول کرنا وغیرہ صحیح روایات حدیث میں مذکور ہے (روح)

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا

اور جب کرتے ہیں کوئی بُرا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اس طرح کرتے اپنی باپ دادوں کو اور اللہ نے

بھما مَقُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا

بھی ہم کو یہ حکم کیا ہے، تو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا بُرے کام کا کیوں لگاتے ہو اللہ کے ذمہ وہ باتیں

لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ

جو تم کو معلوم نہیں، تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم دیا ہر انصاف کا، اور سیدھے کرو اپنے منہ

عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ

ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو خالص اس کے فرمانبردار ہو کر، جیسا تم کو پہلے پیدا کیا

تَعَوِّدُونَ ﴿۲۹﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۚ

دوسری بار بھی پیدا ہو گئے، ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی،

إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ يُحِبُّونَ

انہوں نے بنایا شیطانوں کو رشتہ اللہ کو چھوڑ کر اور سمجھتے ہیں کہ

أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۳۰﴾ يَلْبِسُ آدَمَ خُذْ وَازِيَّتَكَمُ عِنْدَ كُلِّ

وہ ہدایت پر ہیں، اے اولاد آدم کی! لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے

مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۳۱﴾

وقت اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بجا خرچ کرنے والے

خلاصہ تفسیر

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں (یعنی ایسا کام جسکی بُرائی کھلی ہوئی ہو اور انسانی فطرت اس کو بُرا سمجھتی ہو) جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور (نعم باللہ اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی بتلایا ہے) اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جاہلانہ استدلال کے جواب میں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش کام کی کبھی تعلیم نہیں دیتا، کیا (تم ایسا دعویٰ کر کے) خدا کے ذمہ ایسی باتیں لگاتے ہو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم نے جن فحش اور غلط کاموں کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے وہ تو غلط ہی، اب وہ بات سنو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے واقعی طور پر دیا ہے وہ یہ ہے کہ) میرے رب نے تو حکم دیا ہے انصاف کرنے کا، اور یہ کہ تم ہر سجدہ (یعنی عبادت) کے وقت اپنا رخ سیدھا (اللہ کی طرف) رکھا کرو (یعنی کسی مخلوق کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو) اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو اس مختصر جملہ میں تمام مامورات شرعیہ اجمالاً آگئے، قسط میں حقوق العباد، اقیموں میں اعمال و طاعت، مخلصین میں عقائد، تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم (ایک وقت) پھر دوبارہ پیدا ہو گے بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا میں) ہدایت کی ہے، ان کو اس وقت جزا ملے گی، اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے ان کو سزا ملے گی، ان لوگوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور (جادو اس کے پھر اپنی نسبت) خیال رکھتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر ہیں، اے اولادِ آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت (نماز کے لئے ہو یا طواف کے لئے) اپنا لباس پہن لیا کرو اور (جس طرح ترکِ لباس گناہ تھا، ایسے ہی حلال چیزوں کے کھانے پینے کو ناجائز سمجھنا بھی بڑا گناہ ہے، اس لئے حلال چیزوں کو) خوب کھاؤ اور پیو اور حدِ شرعی سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو۔

معارف و مسائل

اسلام سے پہلے جاہلیتِ عرب کے زمانہ میں شیطان نے لوگوں کو جن شرمناک اور بیہودہ رسموں میں مبتلا کر رکھا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قریش کے سوا کوئی شخص بیت اللہ کا طواف اپنے کپڑوں میں نہیں کر سکتا تھا، بلکہ یا وہ کسی تشریشی سے اس کا لباس عاریت کے طور پر مانگے یا پھر ننگا طواف کرے۔

اور ظاہر ہے کہ سارے عرب کے لوگوں کو قریش کے لوگ کہاں تک کپڑے دے سکتے تھے، اس کو ہوتا ہی تھا کہ یہ لوگ اکثر ننگے ہی طواف کرتے تھے، مرد بھی عورتیں بھی، اور عورتیں عموماً رات کے اندھیرے میں طواف کرتی تھیں، اور اپنے اس فعل کی شیطانی حکمت یہ بیان کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں انہی کپڑوں میں بیت اللہ کے گرد طواف کرنا خلاف ادب ہو (اور یہ عقل کے اندھے یہ نہ سمجھتے تھے کہ ننگے طواف کرنا اس سے زیادہ خلاف ادب اور خلاف انسانیت ہو) صرف قریش کا قبیلہ بوجہ خدایم حرم ہونے کے اس عریانی کے قانون سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا،

آیات مذکورہ میں پہلی آیت اسی بیہودہ رسم کو مٹانے اور اس کی خرابی کو بتلانے کے لئے نازل ہوئی ہے، اس آیت میں فرمایا کہ جب یہ لوگ کوئی فحش کام کرتے تھے تو جو لوگ ان کو اس فحش کام سے منع کرتے تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہمارے باپ دادا اور بڑے بوڑھے یونہی کرتے آئے ہیں، ان کے طریقہ کو چھوڑنا عار اور شرم کی بات ہو، اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ (ابن کثیر)

اس آیت میں فحش کام سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک یہی ننگا طواف ہو، اور اصل میں فحش، فحشاء، فاحشہ ہر ایسے بُرے کام کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی انتہا کو پہنچتی ہوئی ہو، اور عقل و فہم اور فطرت سلیمہ کے نزدیک بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہو (منظری) اور اس درجہ میں حسن و قبح کا عقلی ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے (روح)

پھر ان لوگوں نے اس بیہودہ رسم کے جواز کے لئے دو دلیلیں پیش کیں، ایک تقلیدِ آبائی کہ باپ دادوں کے طریقہ کو قائم رکھنا ہی خیر اور بھلائی ہے، اس کا جواب تو بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا کہ جاہل باپ دادوں کا اتباع کوئی معقول چیز نہیں، ذرا سی عقل و ہوش رکھنے والا انسان بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، کہ کسی طریقہ کے جواز کی یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ باپ دادا ایسا کرتے تھے، کیونکہ اگر کسی طریقہ اور کسی عمل کی صحت اور جواز کے لئے باپ دادوں کا طریقہ ہونا کافی سمجھا جاوے تو دنیا میں مختلف لوگوں کے باپ دادا مختلف اور متضاد طریقوں پر عمل کیا کرتے تھے اس دلیل سے تو دنیا بھر کے سارے گمراہ کن طریقے جائز اور صحیح قرار پاتے ہیں، غرض ان جاہلوں کی یہ دلیل کچھ قابلِ توجہ بھی، اس لئے یہاں قرآن کریم نے اس کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور دوسری روایات میں اس کا بھی جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر باپ دادا کوئی چالاکت کا کام کریں تو وہ کس طرح قابلِ تقلید و اتباع ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل ان لوگوں نے اپنے ننگے طواف کے جواز پر یہ پیش کی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہی ایسا حکم دیا ہے، یہ سراسر بہتان اور حق تعالیٰ کے حکم کے خلاف اس کی طرف ایک غلط

حکم کو منسوب کرنا ہے، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا: قُلْ إِنْ أَلَّ اللَّهُ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ، یعنی آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی فحش کام کا حکم نہیں دیا کرتے، کیونکہ ایسا حکم دینا ہیئت اور شان قدوسی کے خلاف ہے، پھر ان لوگوں کے اس بہتان و افتراء علی اللہ اور باطل خیال کو پوری طرح ادا کرنے کے لئے ان لوگوں کو اس طرح تنبیہ کی گئی، أَتَقْوُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ، یعنی کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی چیزوں کو منسوب کرتے ہو جس کا تم کو علم نہیں، یعنی جس کے یقین کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی حجت نہیں، اور ظاہر ہو کہ بلا تحقیق کسی شخص کی طرف بھی کسی کام کو منسوب کرنا انتہائی دلیری اور ظلم ہے تو اللہ جل شانہ کی طرف کسی نقل کی ایسی غلط نسبت کرنا کتنا بڑا جرم اور ظلم ہوگا، حضرات مجتہدین آیات قرآنی سے بذریعہ اجتہاد جو احکام نکالتے اور بیان کرتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ ان کا استخراج قرآن کے الفاظ و ارشادات سے ایک حجت کے ماتحت ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ننگے طواف کے جائز کرنے کی غلط نسبت کرنے والے جاہلوں سے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ قسط کا حکم دیا کرتے ہیں، قسط کے اصل معنی انصاف و اعتدال کے ہیں، اور اس جگہ قسط سے مراد وہ عمل ہے جو افراط و تفریط سے خالی ہو یعنی نہ اس میں کوتاہی ہو اور نہ مقررہ حد سے تجاوز ہو، جیسا کہ تمام احکام شرعیہ کا یہی حال ہے، اس لئے لفظ قسط کے مفہوم میں تمام عبادات اور طاعات اور عام احکام شرعیہ داخل ہیں (روح المعانی)

اس آیت میں قسط یعنی انصاف و اعتدال کا حکم بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی گمراہی اور بے راہی کے مناسب احکام شرعیہ سے دو حکم خصوصیت کے ساتھ بیان فرمائے گئے، ایک أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِئًا مِّنْ مَّسْجِدٍ، اور دوسرا أَذْهَبْ عَنكَ مَخْلَصِينَ لَهُ الدِّينَ پہلا حکم انسان کے ظاہری افعال سے متعلق ہے، اور دوسرا اس کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتا ہے، پہلے حکم میں لفظ مسجد اکثر مفسرین کے نزدیک بمعنی سجدہ و عبادت آیا ہے، اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت و نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کر دو، اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ نماز کے وقت اپنا رخ سیدھا ٹھیک قبلہ کی طرف کرنے کا اہتمام کر دو، اور رخ سیدھا کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر عمل میں اپنا رخ اپنے رب کے حکم کے تابع رکھو، اس سے ادھر ادھر نہ ہونے پاوے، اس معنی کے لحاظ سے یہ حکم صرف نماز کے لئے خاص نہیں، بلکہ تمام عبادات و معاملات پر حاوی ہے۔

اور دوسرے حکم کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح پکارو کہ عبادت خالص اسی کی ہو

اس میں کسی دوسرے کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو، یہاں تک کہ شرک خفی یعنی ریا و نمود سے بھی پاک ہو۔ ان دونوں حکموں کو ساتھ ذکر کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو احکام شریعت کے مطابق درست کرے، نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کے کافی ہے، اور نہ محض حلاص باطنی بغیر ظاہری اتباع شریعت کے کافی ہو سکتا ہے، بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق درست کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالص رکھے، اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوتی ہے جو شریعت و طریقت کو مختلف طریقے سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے گو شریعت کے خلاف کرتے رہیں یہ کھلی گمراہی ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کَمَا بَدَأَ آکُمْ تَعُوذُونَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہیں اول پیدا فرمایا تھا اسی طرح قیامت کے روز دوبارہ تمہیں زندہ کر کے کھڑا کر دیں گے، اس کی قدرت کاملہ کے آگے یہ کوئی مشکل چیز نہیں، اور شاید اسی آسانی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یُعِیدُکُمْ کے بجائے تَعُوذُونَ فرمایا کہ دوبارہ پیدا ہونے کے لئے کسی خاص عمل و سعی کی ضرورت نہیں (روح)

اس جملہ کو اس جگہ لانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ احکام شرعیہ پر پوری طرح قائم رہنا انسان کے لئے آسان ہو جائے، کیونکہ عالم آخرت اور قیامت اور اس میں اچھے برے اعمال کی جزاء و سزا کا تصور ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے ہر مشکل کو آسان اور ہر تکلیف کو راحت بنا سکتی ہے، اور تجربہ شاید ہے کہ جب تک انسان پر یہ خوف مسلط نہ ہو نہ کوئی وعظ و پند اس کو سیدھا کر سکتا ہے، اور نہ کسی قانون کی پابندی اس کو جبراً تم سے روک سکتی ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ بعض لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے، کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق اور دوست بنالیا، اور یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ راہ پر ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ اللہ جل شانہ کی ہدایت عام تھی مگر ان لوگوں نے اس ہدایت سے منہ موڑا اور شیطانوں کا اتباع کرنے لگے، اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ اپنی بیماری ہی کو صحت اور گمراہی کو ہدایت خیال کرنے لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ سے جہل اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں، ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کر لے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش و حواس اور عقل و دانش اسی لئے دی ہے کہ وہ اس سے

کام لے کر کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کو پہچانے، پھر اس کو صرف اس کی عقل و دانش پر نہیں چھوڑا اپنے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعے صحیح و غلط اور حق و باطل کو خوب کھول کر واضح کر دیا۔ اگر کسی شخص کو اس پر شبہ ہو کہ ایک شخص جو واقع میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہو گو غلطی پر ہو پھر اس پر کیا الزام ہے، وہ معذور ہونا چاہئے، کیونکہ اس کو اپنی غلطی کی اطلاع ہی نہیں، جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو عقل و ہوش پھر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم عطا فرمادی ہیں، جن کے ذریعے کم از کم اس کو اپنے اختیار کئے ہوئے طریقہ کے خلاف کا احتمال اور تردد ضرور ہو جانا چاہئے، اب اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، اور جس غلط طریقہ کو اختیار کر لیا تھا اس پر چمار ہا۔

البتہ جو شخص طلب حق میں اپنی پوری کوشش خرچ کر چکا، اور پھر بھی اس کی نظر صحیح راستہ اور حق بات کی طرف نہ پہنچی وہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور ہو، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب التفرقة بین الاسلام والزندقة میں فرمایا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا: ”اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے“ زمانہ جاہلیت کے عرب جیسا کہ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرنے کو صحیح عبادت اور بیت اللہ کا احترام سمجھتے تھے اسی طرح ان میں یہ رسم بھی تھی کہ ایام حج میں کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، صرف اتنا کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے، خصوصاً گھی، دودھ اور پاکیزہ غذاؤں سے بالکل جہتنباب کرتے تھے (ابن جریر)۔

ان کے اس بیہودہ طریقہ کار کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی، جس نے بتلایا کہ ننگے ہو کر طواف کرنا بے حیائی اور سخت بے ادبی ہے، اس سے اجتناب کریں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دسی ہوئی پاکیزہ غذاؤں سے بلاوجہ جہتنباب کرنا بھی کوئی دین کی بات نہیں بلکہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام ٹھہرانا گستاخی اور عبادت میں حد سے تجاوز کرنا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، اس لئے ایام حج میں خوب کھاؤ پیو، ہاں اسراف نہ کرو، حلال غذاؤں سے بالکل جہتنباب کرنا بھی اسراف میں داخل ہے، اور حج کے اصل مقاصد اور ذکر اللہ سے غافل ہو کر کھانے پینے ہی میں مشغول رہنا بھی اسراف میں داخل ہے۔

یہ آیت اگرچہ جاہلیت عرب کی ایک خاص رسم عربیائی کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی ہے جس کو وہ طواف کے وقت بیت اللہ کی تعظیم کے نام پر کیا کرتے تھے، لیکن ائمہ تفسیر اور

فقہاء ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی حکم کے کسی خاص واقعہ میں نازل ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ خاص ہو، بلکہ عتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے جو جو چیزیں ان الفاظ کے عموم میں شامل ہوتی ہیں سب پر یہی حکم عائد ہوتا ہے۔

نماز میں ستر پوشی فرض ہو | اسی لئے اس آیت سے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے کسی احکام نکالنے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی | ہیں، اول یہ کہ اس میں جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے، اسی طرح ننگے

نماز پڑھنا بھی حرام اور باطل ہے، کیونکہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-
الطَّوَّافُ بِالْبَيَّتِ صَلَوَةٌ، اس کے علاوہ خود اسی آیت میں جبکہ لفظ مسجد سے جمہور مفسرین کے نزدیک مراد مسجد ہے، تو بحالت سجدہ عریانی کی ممانعت خود آیت میں صراحت سے آجاتی ہے اور جب سجدہ میں ممنوع ہوتی تو رکوع اور قیام و قعود اور نماز کے تمام افعال میں اس کا لازم ہونا ظاہر ہے پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نے اس کو اور بھی واضح کر دیا، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں (ترمذی)

اور نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں بھی ستر پوشی کا فرض ہونا دوسری آیات و روایات سے ثابت ہے جن میں سے ایک آیت اسی سورت میں گزر چکی ہے، يٰۤاٰدَمُ قَدْ اَنْزَلْنٰكَ عَلٰىكُمْ لِبَاسًا مِّنْ اَرْثِ مَوَدَّاتِكُمْ

خلاصہ یہ ہے کہ ستر پوشی انسان کے لئے پہلا انسانی اور اسلامی فرض جو ہر حالت میں اس پر لازم ہے نماز اور طواف میں بدرجہ اولیٰ فرض ہے۔

نماز کے لئے اچھا لباس | دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ہے کہ لباس کو لفظ زینت سے تعبیر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ نماز میں فضل و اولیٰ یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر کفایت نہ کی جائے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق لباس زینت اختیار کیا جائے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-
خُذْ وَاٰزِيْنَتَكَ مَعَكَ حَيْثُ مَسَّجِدٍ

معلوم ہوا کہ اس آیت سے جیسا کہ نماز میں ستر پوشی کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح بفتہ دستطاعت صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت اور استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔ نماز میں لباس کے | تیسرا مسئلہ اس جگہ یہ ہے کہ ستر جس کا چھپانا انسان پر ہر حال میں اور خصوصاً متعلق چند مسائل | نماز و طواف میں فرض ہے، اس کی حد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اجمالاً ستر پوشی کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کیا، آپ نے تفصیل کے

ساتھ ارشاد فرمایا کہ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک اور عورت کا ستر سارا بدن صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں اور قدم مستثنیٰ ہیں۔

روایات حدیث میں یہ سب تفصیل مذکور ہے، مرد کے لئے ناف سے نیچے کا بدن یا گھٹنے کھلے ہوں تو ایسا لباس خود بھی گناہ ہے اور نماز بھی اس میں ادا نہیں ہوتی، اسی طرح عورت کا سر گردن یا بازو یا پنڈلی کھلی ہو تو ایسے لباس میں رہنا خود بھی ناجائز ہے اور نماز بھی ادا نہیں ہوتی، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس مکان میں عورت ننگے سر ہو وہاں نیکی کے فرشتے نہیں آتے۔

عورت کا چہرہ اور ہتھیلیاں اور قدم جو ستر سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے، اس کے یہ معنی ہیں کہ نماز میں اس کے یہ اعضاء کھلے ہوں تو نماز میں کوئی خلل نہیں آئے گا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر محرموں کے سامنے بھی وہ بغیر شرعی عذر کے چہرہ کھول کر بھرا کرے۔

یہ حکم تو فریضہ ستر کے متعلق ہے، جس کے بغیر نماز ہی ادا نہیں ہوتی، اور چونکہ نماز میں صرف ستر پوشی ہی مطلوب نہیں، بلکہ لباس زینت اختیار کرنے کا ارشاد ہے، اس لئے مرد کا ننگے سر نماز پڑھنا یا مونڈھے یا کہنیاں کھول کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، خواہ قمیص ہی نیم آستین یا آستین چڑھائی گئی ہو بہر حال نماز مکروہ ہے، اسی طرح ایسے لباس میں بھی نماز مکروہ ہے جس کو پہن کر آدمی اپنے دوستوں اور عوام کے سامنے جانا قابلِ شرم و عار سمجھے، جیسے صرف بنیان بغیر کرتے کے، اگرچہ پوری آستین بھی ہو، یا سر پر بجائے ٹوپی کے کوئی کپڑا یا چھوٹا دستی رومال باندھ لینا کہ کوئی سمجھدار آدمی اپنے دوستوں یا دوسروں کے سامنے اس ہیئت میں جانا پسند نہیں کرتا، تو اللہ رب العالمین کے دربار میں جانا کیلئے پسندیدہ ہو سکتا ہے، سر مونڈھے، کہنیاں کھول کر نماز کا مکروہ ہونا آیت قرآنی کے لفظ زینت سے بھی مستفاد ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے بھی۔

جس طرح آیت کا پہلا جملہ جاہلیت عرب کی رسم عریانی کو مٹانے کے لئے نازل ہوا، مگر عموم الفاظ سے اور بہت سے احکام و مسائل اس سے معلوم ہوئے، اسی طرح دوسرا جملہ **مَلُوا وَاَشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا** بھی اگرچہ جاہلیت عرب کی اس رسم کو مٹانے کے لئے نازل ہوا کہ ایام حج میں اچھی غذا کھانے پینے کو گناہ سمجھتے تھے، لیکن عموم الفاظ سے یہاں بھی بہت سے احکام و مسائل ثابت ہوتے ہیں۔

کھانا پینا بقدرِ اول یہ کہ کھانا پینا شرعی حیثیت سے بھی انسان پر فرض و لازم ہے، باوجود قدرتِ ضرر فرض ہے کے کوئی شخص کھانا پینا چھوڑ دے، یہاں تک کہ مر جائے، یا اتنا کمزور ہو جائے کہ واجبات بھی ادا نہ کر سکے تو یہ شخص عند اللہ مجرم و گناہگار ہوگا۔

اشیاء عالم میں اصل اباحت و جواز پر ایک مسئلہ اس آیت سے احکام القرآن جصاص کی تصریح کے مطابق جب تک کسی دلیل سے حرمت نعث ثابت نہ ہو کوئی چیز حرام نہیں ہوتی کہ وہ سب جائز و حلال ہیں جب تک کسی خاص چیز کی حرمت و ممانعت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز کو جائز و حلال سمجھا جائے گا، اس کی طرف اشارہ اس بات سے ہوا کہ کَلُوا وَاشْرَبُوا کَا مَفْعُول ذکر نہیں فرمایا کہ کیا چیز کھاؤ پیو، اور علماء عربیت کی تصریح ہے کہ ایسے موقع پر مفعول ذکر نہ کرنا اس کے عموم کی طرف اشارہ ہوا کرتا ہے کہ ہر چیز کھائی سکتی ہو بجز ان اشیاء کے جن کو بالصریح حرام کر دیا گیا ہے۔ (احکام القرآن جصاص)

کھانے پینے میں اسراف | آیت کے آخری جملہ وَلَا تُسْرِفُوا سے ثابت ہوا کہ کھانے پینے کی تو اجازت ہے بلکہ حکم ہے، مگر ساتھ ہی اسراف کرنے کی ممانعت ہے، اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، پھر حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جائے، اور حرام چیزوں کو کھانے پینے برتنے لگے اس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلا وجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دے، جس طرح حرام کا استعمال جرم و گناہ ہے اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانون الہی کی مخالفت اور سخت گناہ ہے۔ (ابن کثیر، منہجی، روح المعانی)

اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ مجھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے پیے، اسی لئے فقہاء نے پیٹ بھرنے سے زائد کھانے کو ناجائز لکھا ہے (احکام القرآن وغیرہ) اسی طرح یہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت و ہمتیاری کے ضرورت سے اتنا کم کھائے جس سے کمزور ہو کر آدمی واجبات کی قدرت نہ رہے، ان دونوں قسم کے اسراف کو منع کرنے کے لئے قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے:-

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ

”یعنی فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں“

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا ۖ

”یعنی اللہ کو وہ لوگ پسندیں جو خرچ کرنے میں تو سطا اور میانہ روی رکھتے ہیں نہ حد ضرورت سے زیادہ خرچ کریں اور نہ اس سے کم خرچ کریں“

کھانے پینے میں اعتدال ہی نافع دین دنیا ہے | حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ بہت کھانے پینے سے بچو،

کیونکہ وہ جسم کو خراب کرتا ہے، بیماریاں پیدا کرتا ہے، عمل میں سستی پیدا کرتا ہے، بلکہ کھانے پینے میں میانہ روی اختیار کر و کہ وہ جسم کی صحت کے لئے بھی مفید ہو، اور اسراف سے دُور رہی، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرجہ جسم عالم کو پسند نہیں فرماتے، (مراد یہ ہو کہ جو زیادہ کھانے سے اختیاری طور پر فرجہ ہو گیا، تم اور فرمایا کہ آدمی اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو دین پر ترجیح نہ دینے لگے۔ (روح عن ابی نعیم)

سلف صالحین نے اس بات کو اسراف میں داخل قرار دیا ہے کہ آدمی ہر وقت کھانے پینے ہی کے دھندے میں مشغول رہے یا اس کو دوسرے اہم کاموں میں مقدم جانے، جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا مقصد زندگی ہی کھانا پینا ہے، انہی حضرات کا مشہور مقولہ ہے کہ خوردن برائے زلیتن است نہ زلیتن برائے خوردن یعنی کھانا اس لئے ہے کہ زندگی قائم رہے، یہ نہیں کہ زندگی کھانے پینے ہی کے لئے ہو۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی اسراف میں داخل فرمایا ہو کہ جب کسی چیز کو جی چاہے اس کو ضرور ہی پورا کر لے، اِنَّ مِنْ الْاِسْرَافِ اَنْ تَاْكُلَ كُلَّ مَا اَشْكَيْتَ (ابن ماجہ عن انس)

اور سہیقیؒ نے نقل کیا ہو کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ دن میں دو مرتبہ کھانا تناول فرمایا، تو ارشاد فرمایا اے عائشہ! کیا تمہیں یہ پسند ہو کہ تمہارا شغل صرف کھانا ہی رہ جائے۔

اور میانہ روی کا یہ حکم جو کھانے پینے کے متعلق اس آیت میں مذکور ہو صرف کھانے پینے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پہننے اور رہنے سہنے کے ہر کام میں درمیانی کیفیت پسند اور محبوب ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ پیو، اور جو چاہو پہنو، صرف دو باتوں سے بچو، ایک یہ کہ اس میں اسراف یعنی قدر ضرورت سے زیادتی نہ ہو، دوسرے فخر و غور نہ ہو۔

ایک آیت سے آٹھ خلاصہ یہ ہے کہ کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا، کے کلمات سے آٹھ مسائل شرعیہ نکلیے۔
مسائل شرعیہ | اول یہ کہ کھانا پینا بقدر ضرورت فرض ہے، دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کی

حرمت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز حلال ہے، تیسرے یہ کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع کر دیا ان کا استعمال اسراف اور ناجائز ہے، چوتھے یہ کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں ان کو حرام سمجھنا بھی اسراف اور بخت گناہ ہو، پانچویں یہ کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اور کھانا ناجائز ہے، چھٹے یہ کہ اتنا کم کھانا جس سے کمزور ہو کر اداسے واجبات کی قدرت نہ رہو درست نہیں ہے بیشاکیج کہ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بھی اسراف ہے، آٹھویں یہ بھی اسراف

ہے کہ جب کبھی کسی چیز کو چھو، تو ضروری ہی اس کو حاصل کرے۔

یہ تو اس آیت کے فوائد دینیہ ہیں، اور اگر طبی طور پر غور کیا جائے تو صحت و تندرستی کے لئے اس کا بہتر کوئی نسخہ نہیں، کھانے پینے میں اعتدال ساری بیماریوں سے امان ہے۔

تفسیر روح المعانی اور منہجی وغیرہ میں ہے کہ امیر المؤمنین ہارون رشید کے پاس ایک نصرانی طبیب علاج کے لئے رہتا تھا، اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا کہ تمہاری کتاب یعنی قرآن میں علم طب کا کوئی حصہ نہیں، حالانکہ دنیا میں دو ہی علم علم ہیں، ایک علم ادیان، دوسرا علم ابدان جس کا نام طب ہے، علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سارے فن طب و حکمت کو آدھی آیت قرآن میں جمع کر دیا ہے، وہ یہ کہ ارشاد فرمایا **كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا** اور تفسیر ابن کثیر میں یہ قول بعض سلف کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے، پھر اس نے کہا کہ اچھا تمہارے رسولؐ کے کلام میں بھی طب کے متعلق کچھ ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات میں سارے فن طب کو جمع کر دیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ معرہ بیماریوں کا گھر ہے، اور مضر چیزوں سے پرہیز ہر دوا کی اصل ہے، اور ہر بدن کو وہ چیز جو جس کا وہ عادی ہے (کشاف، روح) نصرانی طبیب نے یہ سن کر کہا کہ تمہاری کتاب اور تمہارا رسولؐ نے جالینوس کے لئے کوئی طب نہیں چھوڑی۔

بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابی ہریرہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معرہ بدن کی حوض ہے، سارے بدن کی رگیں اسی حوض سے سیراب ہوتی ہیں، اگر معرہ درست ہے تو ساری رگیں یہاں سے صحت مند غذائے کر لیں گی، اور وہ خراب ہو تو ساری رگیں بیماری لیکر بدن میں پھیلیں گی۔

محدثین نے ان روایات حدیث کے الفاظ میں کچھ کلام کیا ہے، لیکن کم کھانے اور محتاط رہنے کی تاکیدات جو بے شمار احادیث میں موجود ہیں ان پر سب کا اتفاق ہے۔ (روح)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ

تو کہہ کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں کے واسطے اور سُختری چیزیں

الرِّشْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً

کھانے کی، تو کہہ یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے ہیں دنیا کی زندگی میں خالص انہی کے واسطے ہیں

يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نَفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۳۶)

قیامت کے دن اسی طرح مفصل بیان کرتے ہیں ہم آیتیں ان کے لئے جو سمجھتے ہیں،

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ

تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا ہر صرحت بھائی کی باتوں کو جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو

وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا

اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو جس کی اس نے سند نہیں اتاری،

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۳۳ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ

اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں، اور ہر فرقہ کے واسطے ایک عہد ہو پھر جب

أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ۝۳۴

آپہنچے گا ان کا وعدہ نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزیں ملبوسات اور مطعومات و مشروبات کو بے دلیل بلکہ خلافت
دلیل حرام سمجھ رہے ہیں ان سے آپ فرما دیجئے کہ (یہ بتلاؤ) اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو
جو اس نے اپنے بندوں کے استعمال کے واسطے بنائے ہیں اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو (جنکو اللہ
نے حلال قرار دیا ہے) کس شخص نے حرام کیا ہے (یعنی حلال و حرام قرار دینا تو خالق و مالک کائنات کا
کام ہے، تم اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام کہنے والے کون؟ آیات مذکورہ میں لباس اور کھانے پینے
کی چیزوں کو انعام خداوندی قرار دیا ہے، اس سے کفار کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انعام تو ہمیں خوب مل
رہا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا اور ہمارے عقائد و اعمال اس کے خلاف ہوتے تو یہ انعام ہمیں کیوں
ملتا، اس شبہ کے جواب کیلئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے یہ کہہ دیجئے کہ (انعامات
الہیہ کے متعلق استعمال کی اجازت دلیل مقبولیت نہیں، ہاں جس استعمال کے بعد کوئی وبال نہ ہو وہ
دلیل مقبولیت ہے، اور ایسا استعمال خالص اہل ایمان کا حصہ ہے، کیونکہ کافر جتنا زیادہ دنیاوی نعمتوں کو
استعمال کرتے ہیں اتنا ہی ان کا وبال اور عذاب آخرت بڑھتا رہتا ہے، اس لئے فرمایا کہ) یہ اشیاء
(لباس اور کھانے پینے کی چیزیں) اس طور پر کہ قیامت کے روز (بھی کدورات سے اور عذاب سے) خالص
ہیں دنیوی زندگی میں خاص اہل ایمان ہی کے لئے ہیں (بجائے کفار کے کہ گو دنیا میں انھوں نے اللہ
کی نعمتوں کو استعمال کر کے عیش و عشرت میں بسر کیا، مگر چونکہ ان نعمتوں کا شکر ایمان و اطاعت کے
ذریعہ ادا نہیں کیا، اس لئے وہاں یہ نعمتیں وبال اور عذاب بن جاویں گی) ہم اسی طرح تمام آیات کو
سمجھداروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں، آپ (ان سے یہ بھی) فرمائیے کہ (تم نے جن

حلال چیزوں کو بلاوجہ حرام سمجھ رکھا ہو وہ تو اللہ نے حرام نہیں کی، البتہ میرے رب نے صرف ان چیزوں کو جن میں سے اکثر میں تم مبتلا ہو (حرام کیا ہو) مثلاً، تمام فحش باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی (جیسے) تنگے ہو کر طواف کرنا، اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی (جیسے بدکاری) اور ہر گناہ کی بات کو (حرام کیا ہو) اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو (حرام کیا ہے) اور اس بات کو (حرام کیا ہو) کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک (عبادت) ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند (اور دلیل) نازل نہیں فرمائی (نہ کتباً نہ جبرئلاً) اور اس بات کو (حرام کیا ہو) کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تمھارے پاس کوئی سند نہ ہو (جس طرح آیت قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ میں تمام مامورات جن پر عمل کرنا مشروع ہے داخل ہو گئے، اسی طرح اِنَّمَا حَرَّمَ میں تمام مہنیات جن کی ممانعت ہو شامل ہو گئے) اور اگر ان محرمات کے ارتکاب کرنے والوں کو فوراً سزا نہ ہونے سے ان کی تحریم میں کسی کو شبہ ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم الہی میں ہر گز وہ رکے ہر فرد کی سزا کے لئے (بمقتضائے حکمت) ایک میعاد معین ہے سو جس وقت ان کی (وہ) میعاد معین (نزدیک) آ جاوے گی اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً ہی سزا جاری ہو جاوے گی اس میعاد کے قبل سزا نہ ہونا اس کی دلیل نہیں کہ ان محرمات پر سزا نہ ہوگی)

معارف و مسائل

پہلی آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو عبادات میں غلو اور خود ایجادیں کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنے اور اپنے اوپر حرام قرار دینے کو عبادت و طاعت سمجھتے ہیں جیسے مشرکین مکہ ایام حج میں بوقت طواف لباس پہننا ہی جائز نہ سمجھتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی حلال اور اچھی غذاؤں سے پرہیز کرنے کو عبادت جانتے تھے۔

ایسے لوگوں کو زجر اور سزائیں کے انداز میں تنبیہ کی گئی کہ اللہ کی زینت یعنی عمدہ لباس جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہو، اور پاکیزہ عمدہ غذا جسے اللہ نے عطا فرمائی ہیں ان کو کس نے حرام کیا۔ عمدہ لباس اور لذیذ کھانے سے مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا صرف اس ذات پاک کا حق ہے جس پر ہیز اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ [اس لئے وہ لوگ قابل عتاب و عذاب ہیں جو اللہ کی حلال کی ہوئی عمدہ پوشاک یا پاکیزہ اور لذیذ خوراک کو حرام سمجھیں، وسعت ہوتے ہوئے پٹے والوں گندہ پر گندہ رہنا نہ کوئی اسلام کی تعلیم ہے، نہ کوئی اسلام میں پسندیدہ چیز ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں۔]

سلف صالحین اور ائمہ اسلام میں بہت سے اکابر جن کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت عطا فرمائی تھی اکثر عمدہ اور بیش قیمت لباس استعمال فرماتے تھے، خواجہ دو عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب وسعت ہوئی عمدہ سے عمدہ لباس بھی زیب تن فرمایا ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ باہر تشریف لائے تو آپؐ کے بدن مبارک پر ایسی چادر تھی

جس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی، امام عظیم ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ چار سو گنی کی قیمت کی چادر استعمال فرمائی۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ ہمیشہ نفیس اور عمدہ لباس استعمال فرماتے تھے، ان کے لئے تو کسی صاحب نے سال بھر کے لئے تین سو ساٹھ جوڑوں کا سالانہ انتظام اپنے ذمہ لیا ہوا تھا، اور جوڑا امامؒ کے بدن پر ایک مرتبہ پہنچتا تھا دوبارہ استعمال نہ ہوتا تھا، کیونکہ صرف ایک روز استعمال کر کے کسی غریب طالب علم کو دیدیتے تھے۔

وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اپنی نعمت اور وسعت عطا فرماویں تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اس کی نعمت کا انشا اس کے لباس وغیرہ میں دیکھا جائے، اس لئے کہ اظہارِ نعمت بھی ایک قسم کا شکر ہے، اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پچھے پرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے۔

ہاں ضروری بات یہ ہے کہ دو چیزوں سے بچے، ایک ریاء و نمود، دوسرے فخر و غرور، یعنی تھن لوگوں کو دکھلانے اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے لباسِ فاخر استعمال نہ کرے، اور ظاہر ہے کہ سلفِ صالحین ان دونوں چیزوں سے بری تھے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلفِ صالحین میں حضرت فاروق عظیمؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے جو عام حالات میں معمولی قسم کا لباس یا پیوند زدہ کپڑے استعمال کرنا منقول ہے اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ اکثر جو کچھ مال آتا وہ فقراء، مساکین اور دینی کاموں میں خرچ کر ڈالتے تھے، اپنے لئے باقی ہی نہ رہتا تھا، جس سے عمدہ لباس آسکے، دوسرے یہ کہ آپ مقتداۓ خلاق تھے، اس سادہ اور سستی پوشاک کے رکھنے سے دوسرے امراء کو اس کی تلقین کرنا تھا، تاکہ عام عسربارہ فقراء پران کی مالی حیثیت کا رعب نہ پڑے۔

اسی طرح صوفیائے کرام جو مبتدیوں کو لباسِ زینت اور عمدہ لذیذ کھانوں سے روکتے ہیں، اس کا منشا بھی یہ نہیں کہ ان چیزوں کو دائمی طور پر ترک کرنا کوئی کارِ ثواب ہے، بلکہ نفس کی خواہشات پر قابو پانے کے لئے ابتداءً سلوک میں ایسے مجاہدے بطور علاج و دواء کے کر دیئے جاتے ہیں، اور جب وہ اس درجہ پر پہنچ جائے کہ خواہشاتِ نفسانی پر قابو پالے کہ اس کا نفس اس کو حرام و ناجائز کی طرف نہ کھینچ سکے، تو اس وقت تمام صوفیائے کرام عام سلفِ صالحین کی طرح عمدہ لباس اور لذیذ کھانوں کو استعمال کرتے ہیں، اور اس وقت یہ طیباتِ رزق ان کے لئے معرفتِ خداوندی اور درجاتِ قرب میں رکاوٹ کے بجائے اضافہ اور تقرب کا ذریعہ بنتے ہیں۔

خوراک و پوشاک میں سنت | خوراک و پوشاک کے بارے میں خلاصہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کا یہ ہے کہ ان چیزوں میں تکلف نہ کرے، جیسی پوشاک و خوراک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پاسانی میسر ہو اس کو مشکر کے ساتھ استعمال کرے، موٹا پٹرا، خشک غذا ملے تو یہ تکلف نہ کرے کہ کبھی کسی طرح اچھا ہی حاصل کرے خواہ قرض لینا پڑے، یا اس کی فکر میں اپنے آپ کو کسی دوسری مشکل میں مبتلا کرنے کی نوبت آئے۔

اسی طرح عمدہ نفیس لباس یا لذیذ کھانا میسر آئے تو یہ تکلف نہ کرے کہ اس کو جان بوجھ کر خراب کرے یا اس کے استعمال سے پرہیز کرے، جس طرح بڑھیا لباس اور غذا کی جستجو تکلف ہے اسی طرح بڑھیا کو خراب کرنا یا اس کو چھوڑ کر گھٹیا استعمال کرنا بھی تکلف و مذموم ہے۔

آیت کے اگلے جملہ میں اس کی ایک خاص حکمت یہ بتلائی گئی کہ دنیا کی تمام نعمتیں نفیس اور عمدہ لباس، پاکیزہ اور لذیذ غذائیں دراصل اطاعت شعار مؤمنین ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، دوسری لوگ ان کے طفیل میں کھاپی رہے ہیں، کیونکہ یہ دنیا دارِ اہل ہے، دارالجزا نہیں، یہاں کھرے کھوٹے اور اچھے برے کا امتیاز دنیا کی نعمتوں میں نہیں کیا جاسکتا، بلکہ رحمن دنیا کی نعمتوں کا یہ دسترخوان عام یہاں سب کے لئے یکساں کھلا ہوا ہے، بلکہ دنیا میں عارۃ اللہ یہ ہے کہ اگر مؤمن و فرمانبردار بندوں سے اطاعت شعاری میں کچھ کمی ہو جاتی ہے تو دوسرے لوگ اُن پر غالب آکر دنیوی نعمتوں کے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، اور یہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مگر یہ قانون صرف اسی دارِ اہل دنیا کے اندر ہے، اور آخرت میں ساری نعمتیں اور راحتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اطاعت شعار بندوں کے لئے مخصوص ہوں گی، یہی معنی ہیں آیت کے اس جملہ کے قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کی سب نعمتیں حیاتِ دنیا میں بھی دراصل مؤمنین ہی کا حق ہیں، اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں اور راحتیں اس خاص کیفیت کے ساتھ کہ وہ آخرت میں وبالِ جان نہ بنیں صرف فرمانبردار مؤمنین کا حصہ ہے، بخلاف کفار و فجار کے کہ گو دنیا میں نعمتیں ان کو بھی ملتی ہیں بلکہ زیادہ ملتی ہیں، مگر ان کی یہ نعمتیں آخرت میں وبالِ جان اور عذاب دائمی بننے والی ہیں، اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے ان کے لئے یہ کوئی عزت و راحت کی چیز نہ ہوتی۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس کے یہ معنی قرار دیئے کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت و مشقت اور پھر زوال کا خطرہ اور پھر طرح طرح کے بچ و غم لگے ہوتے ہیں، خالصت اور خالص راحت کا یہاں وجود ہی نہیں، البتہ قیامت میں جسکو یہ نعمتیں ملیں گی وہ خالص ہو کر ملیں گی، نہ ان کے ساتھ کوئی محنت و مشقت ہوگی، اور نہ ان کے زوال یا نقصان کا کوئی خطرہ، اور نہ اُن کے

بعد کوئی بچ و مصیبت، تینوں مفہوم آیت کے اس جملہ میں کھپ سکتے ہیں، اور اسی لئے مفسرین صحابہ و تابعین نے ان کو خستیاں کیا ہے۔

آخر آیت میں فرمایا **كَذٰلِكَ نَفْصَلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ**، یعنی ہم اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح تفصیل و وضاحت سے بیان کیا کرتے ہیں، جس سے ہر عالم و جاہل سمجھ لے، اس آیت میں لوگوں کے غلو اور ان جاہلانہ خیالات کی تردید تھی کہ اچھا لباس اور اچھا کھانا ترک کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں کچھ ان چیزوں کا بیان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اور یہ حقیقت ہو کہ ان کے ترک کرنے ہی سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ دو ہر جہالت میں مبتلا ہیں، ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی عمدہ اور نفیس چیزوں کو اپنے اوپر بلاوجہ حرام کر کے ان نعمتوں سے محروم ہو گئے، اور دوسری طرف جو چیزیں حقیقتہً حرام تھیں، اور جن کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور آخرت کا عذاب نتیجہ میں آنے والا ہے، ان کے استعمال میں مبتلا ہو کر آخرت کا وبال خرید لیا، اور اس طرح دنیا و آخرت دونوں جگہ نعمتوں سے محروم ہو کر خسران دنیا و آخرت کا مورد بن گئے، ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا حَرَّمَ ذِیْیَ الْاَنۡفُسِ الْاِثۡمِ مَآ ظَہَرَ مِنْہَا وَّمَا بَطَنَ وَاَلَا تُشۡمَرُوۡا اِلَّا بِغَیۡرِ

الْحَقِّ وَاَنَّ تُشۡرِکُوۡا بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنۡزَلْ بِہٖ سُلۡطٰنًا وَاَنَّ تَقُوۡلُوۡا عَلٰی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوۡنَ یعنی جن چیزوں کو تم نے خواہ مخواہ حرام ٹھہرا لیا وہ تو حرام نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے تمام بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوئے ہوں یا چھپے ہوئے، اور ہر گناہ کے کام کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلا دلیل کسی کو شریک ٹھہرانے کو اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

اس تفصیل میں لفظ **اِثۡم** کے تحت وہ تمام گناہ آگئے ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، اور بغی میں وہ گناہ جن کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو، اور شرک اور افتراء علی اللہ یہ عقیدہ کا گناہ عظیم ظاہری ہے۔

اس خاص تفصیل کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا کہ اس میں تقریباً ہر طرح کے محرمات اور گناہ پورے آگئے، خواہ عقیدہ کے گناہ ہوں یا عمل کے اور پھر ذاتی عمل کے گناہ ہوں یا لوگوں کے حقوق، اور اس لئے بھی کہ یہ اہل جاہلیت ان سب جرائم اور محرمات میں مبتلا تھے، اس طرح ان کی دوسری جہالت کو کھولا گیا، کہ حلال چیزوں سے پرہیز کرتے اور حرام کے استعمال سے نہیں جھجکتے۔

اور دین میں غلو اور نواجب و بدعات کا یہ لازمی خاصہ ہو کہ جو شخص ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے

وہ دین کی اصل اور اہم ضروریات سے عارۃً غافل ہو جاتے ہیں، اس لئے غلو فی الدین اور بدعت کا نقصان دور ہوتا ہے، ایک خود غلو اور بدعت میں مبتلا ہونا گناہ ہر دوسرے اس کے بالمقابل صحیح دین اور سنت کے طریقوں سے محروم ہونا، نعوذ باللہ منہ

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں مشرکین و مجرمین کے دو غلط کاموں کا ذکر تھا، ایک حلال کو حرام ٹھہرانا دوسرے حرام کو حلال قرار دینا، تیسری آیت میں ان کے انجام بد اور آخرت کی سزا و عذاب کا بیان ہوا ارشاد فرمایا وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْذِنُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ، یعنی یہ مجرمین جو ہر طرح کی سرکشی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہے ہیں، اور دنیا میں بظاہر ان پر کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا اس عارۃ اللہ سے غافل نہ رہیں کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو اپنی رحمت سے ڈھیل دیتے رہتے ہیں کہ کسی طرح یہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اس ڈھیل اور مہلت کی ایک میعاد معین ہوتی ہے، جب وہ میعاد آپہنچتی ہے تو ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی، اور یہ عذاب میں پکڑ لئے جاتے ہیں، کبھی دنیا ہی میں کوئی عذاب آجاتا ہے، اور اگر دنیا میں عذاب نہ آیا تو مرتے ہی عذاب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں میعاد معین سے آگے پیچھے نہ ہونے کا جو ذکر ہوا یہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہمارے عرف میں خریدار و مکاندار سے کہتا ہے کہ قیمت میں کچھ کمی زیادتی ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ قیمت کی زیادتی اس کو مطلوب نہیں، صرف کمی کو پوچھنا ہے، مگر تبجا اس کے ساتھ زیادتی کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں اصل مقصد تو یہ ہے کہ میعاد معین کے بعد تاخیر نہیں ہوگی، اور تقدیم کا ذکر تاخیر کے ساتھ بطور محاورہ عوام کے کر دیا گیا۔

يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ اِمَّا يٰۤاَتَيْتُكَمُ رَسُلٌ مِّنْكُمْ يَقْصُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۚ فَمَنْ

اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمھارے پاس رسول تم میں سے کہ تمہاری تم کو آیتیں میری توجہ کوئی

اتَّقِ وَاَصْلَحْ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵ وَالَّذِيْنَ

ڈرے اور نیکی پھڑے تو نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے جھٹلایا

كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ

ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے، وہی ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۶ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ اَوْ

ہمیشہ رہیں گے، پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا، یا

كَذَّبَ بِآيَاتِهِ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ حَتَّىٰ

جھٹلا دیں اس کے حکموں کو، وہ لوگ ہیں کہ ملے گا ان کو جو ان کا حصہ لکھا ہوا ہے کتاب میں، یہاں تک

إِذَا جَاءَهُمْ رَسُولُنَا يُخَوِّفُهُمْ لَا قَالُوا آيِنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ

کہ جب پہنچے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کو تو کہیں کیا ہوئی وہ جن کو تم پکارا کرتے تھے

مِن دُونِ اللَّهِ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَاذِبُونَ

سوائے اللہ کے، بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کر لیں گے اپنے اوپر کہ بے شک وہ

كُفْرَيْنَ ۖ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ

کافر تھے، فرمائے گا داخل ہو جاؤ ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں جن اور

وَالنَّاسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعْنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا

آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر جب داخل ہوگی ایک امت تو لعنت کرے گی دوسری امت کو یہاں تک کہ

فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أَخْرِجُهُم لَّا وَلَهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّوْنَا

جب گر چکیں گے اس میں سارے، تو کہیں گے ان کے پچھلے پہلوں کو اے رب ہمارے ہم کو اپنی نے، گمراہ کیا،

فَأَقِمْ وَدَّاعِ ابْنَ آدَمَ مِنَ النَّارِ ۚ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا

سوتوان کو دے دونا عذاب آگ کا، فرمائے گا کہ دونوں کو دو گنا ہو لیکن تم

تَعْلَمُونَ ۚ قَالَتْ أُولَٰئِكَ لَئِنْ كُنَّا نَدْعُوهُمْ لَنُدْعِيَهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْهِمْ

نہیں جاننے، اور کہیں گے ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو ہم پر

مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ ۳۹

بڑائی، اب چکھو عذاب بہ سبب اپنی کمائی کے

خلاصہ تفسیر

(ہم نے عالم ارواح ہی میں کہہ دیا تھا) اے اولادِ آدم کی اگر تمھارے پاس پیغمبر آویں جو تم ہی میں سے ہوں گے جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے سو ان کے آنے پر جو شخص (تم میں ان آیات کی تکذیب سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں) نہ کچھ اندیشہ کی بات ہونے والی ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ (تم پر سے) ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتاویں گے اور ان کے قبول کرنے سے

بمگر کریں گے وہ لوگ دوزخ میں رہیں گے (وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) جب تکذیب کرنے والوں کا سخت وعید شدید ہونا اجمالاً معلوم ہو گیا (سواب تفصیل سنو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا ہندھے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی نہ ہو اس کو خدا کی کہی ہوئی کہے) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلاوے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی ہو اس کو بے کہی بتلاوے) ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ (رزق اور عمر) ہے وہ تو ان کو (دنیا میں) مل جاوے گا (لیکن آخرت میں مصیبت ہی مصیبت ہے) یہاں تک کہ (دوزخ میں مرنے کے وقت تو ان کی یہ حالت ہوگی کہ) جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آویں گے تو ان سے کہیں گے کہ (کہو) وہ کہاں گئے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (اب اس مصیبت میں کیوں نہیں کام آتے) وہ (کفار) کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہو گئے (یعنی واقعی کوئی کام نہ آیا) اور (اس وقت) اپنے کافر ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے (لیکن اس وقت کا اقرار محض بے کار ہو گا، اور بعض آیات میں ایسے ہی سوال و جواب کا وقوع قیامت میں بھی مذکور ہے سو دونوں موقعوں پر ہونا ممکن ہے) اور قیامت میں ان کا یہ حال ہو گا کہ اللہ تعالیٰ فرما دے گا کہ جو فرقے (کفار کے) تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ (چنانچہ آگے چھپے سب کفار اس میں داخل ہوں گے، اور یہ کیفیت واقع ہوگی کہ) جس وقت بھی کوئی جماعت (کفار کی) داخل (دوزخ) ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو بھی (جو انہی جیسے کافر ہوں گے اور ان سے پہلے دوزخ میں جا چکے ہوں گے) لعنت کرے گی (یعنی باہم ہمدردی نہ ہوگی، بلکہ بوجہ انکشاف حقائق کے ہر شخص دوسرے کو بُری نظر سے دیکھے گا اور بُرا کہے گا) یہاں تک کہ جب اس (دوزخ) میں سب جمع ہو جاویں گے تو (اس وقت) پچھلے لوگ (جو بعد میں داخل ہوئے ہوں گے) اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کفر میں دوسروں کے تابع تھے (پہلے داخل ہونے والے) لوگوں کی نسبت (یعنی ان لوگوں کی نسبت جو بوجہ زمین و پیشوائے کفر ہونے کے دوزخ میں پہلے داخل ہوں گے یہ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، سو ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دو گنا دیجئے، (اللہ تعالیٰ) ارشاد فرمائیں گے کہ ان کو دو گنا ہونے سے تم کو کونسی تسلی و راحت ہو جائے گی، بلکہ چونکہ تمہارا عذاب بھی ہمیشہ آنا فانا بڑھتا جاوے گا، اس لئے تمہارا عذاب بھی ان کے دو گنے عذاب ہی جیسا ہو گیا، پس اس حساب سے سب ہی کا (عذاب) دو گنا ہے، لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں (کیونکہ ابھی تو عذاب کی ابتداء ہی ہے) اس تزايد کو دیکھا، نہیں اس لئے ایسی باتیں بنا رہے ہو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کے تضاعف عذاب کو اپنے لئے موجب شفاء غیظ و باعث تسلی سمجھ رہے ہو (اور پہلے داخل ہونے والے) لوگ پچھلے (داخل ہونے والے) لوگوں (خدا تعالیٰ کے اس جواب سے مطلع ہو کر کہیں گے کہ جب سب کی سزا کی یہ حالت ہو تو) پھر تم کو ہم پر (تخفیف عذاب کا بار گیں) کوئی فوقیت نہیں (کیوں کہ

تخفیف نہ ہم کو نہ تم کو، سو تم بھی اپنے کردار (بد) کے مقابلہ میں عذاب و متزاید اکامزہ چکھتے رہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا نہ کھولے جائیں گے اُن کے لئے

أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي

دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں یہاں تک کہ گھٹس جائے اونٹ سونے

سَمِ الْخِيَاطِ ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿۳۰﴾ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ

کے ناکے ہیں اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں گنہگاروں کو ، ان کے واسطے دوزخ کا بچھونا

مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

ہر اور اوپر سے اوڑھنا ، اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا أَلًّا وَسَعْمًا ۖ

اور جو ایمان لائے اور کیں نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اس کی طاقت کے موافق

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي

وہی ہیں جنت میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے ، اور نکال لیں گے ہم جو کچھ

صُدُّوا بِهِمْ مِّنْ غَلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ

ان کے دلوں میں خفگی تھی بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں ، اور کہیں گے شکر

لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَانَا

اللہ کا جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانیوالے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو

اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَن تِلْكَ

اللہ ہے شک لائے تھے رسول ہمارے رب کی سچی بات اور آواز آئے گی کہ یہ جنت

الْجَنَّةُ ۖ أَوْ رِثْمُوهَا ۖ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

ہو ، دارث ہوئے تم اس کے بدلے میں اپنے اعمال کے

خلاصہ تفسیر

(یہ حالت تو کفار کے دخولِ نار کی ہوئی، اب حرامِ جنت کی کیفیت سنو کہ) جو لوگ ہماری

آیتوں کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور ان (کے ماننے) سے تکبر کرتے ہیں ان (کی روح صغود) کے لئے مرنے کے بعد) آسمان کے دروازے نہ کھولے جاویں گے (یہ تو حالت مرنے کے بعد پرزخ میں ہوئی) اور (قیامت کے روز) وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جاویں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جاوے اور یہ محال ہے تو ان کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے) اور ہم ایسے مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں (یعنی ہم کو کوئی عداوت نہ تھی جیسا کیا ویسا بھگتا، اور اوپر جو دوزخ میں جانا مذکور ہوا ہے وہ آگ ان کو ہر چار طرف سے محیط ہوگی کہ کسی طرف سے کچھ راحت نہ ملے، چنانچہ یہ حال ہوگا کہ) ان کے لئے آتش دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا، اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں (جن کا ذکر فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ میں ادھر آیا ہے) اور جو لوگ (آیاتِ الہیہ پر) ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے (اور یہ نیک کام چنداں مشکل نہیں، کیونکہ ہماری عادت ہے کہ) ہم کسی شخص کو اس کی قدرت سے زیادہ کوئی کام نہیں بتلاتے (یہ جملہ معترضہ تھا غرض) ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں، (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہ ہوگی کہ وہاں بھی ایک دوسرے کو لعنت طامت کرتے رہیں گے، بلکہ ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ) جو کچھ ان کے دلوں میں (کسی معاملہ کی وجہ سے دنیا میں باقتضائے طبعی) غبار (اور رنج) تھا ہم اس کو (بھی) دور کر دیں گے (کہ باہم الفت و محبت سے رہیں گے اور) ان کے (مکانات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ لوگ (غایت فرح و سرور سے) کہیں گے اللہ تعالیٰ کا (لاکھ لاکھ) احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی (یہاں تک) رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے (اس میں یہ بھی آگیا کہ یہاں تک پہنچنے کا جو طریقہ تھا ایمان اور اعمال وہ ہم کو بتلایا اور اس پر چلنے کی توفیق دی) واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے، (چنانچہ انھوں نے جن اعمال پر جنت کا وعدہ کیا تھا وہ سچا ثابت ہوا) اور ان سے پکار کر کہا جاوے گا کہ یہ جنت تم کو دی گئی ہے تمھارے اعمال (حسن) کے بدلے۔

معارف و مسائل

چند آیات میں پہلے ایک عہد و میثاق کا ذکر ہے جو ہر انسان سے اس کی اس دنیا میں پیدائش سے پہلے عالم ارواح میں لیا گیا تھا، کہ جب ہمارے رسول تمھارے پاس ہماری ہدایات اور احکام لے کر آئیں تو ان کو دل و جان سے ماننا اور ان کے مطابق عمل کرنا، اور یہ بھی بتلادیا گیا تھا کہ جو شخص دنیا میں آنے کے بعد اس عہد پر قائم رہ کر اس کے مقتضیات کو پورا کرے گا وہ ہر بچہ و غم سے نجات پائے گا اور دائمی راحت و آرام کا مستحق ہوگا، اور جو انبیاء علیہم السلام کی تکذیب یا ان کے احکام

سے سرگشتی کرے اس کے لئے جہنم کا دائمی عذاب مقرر ہے، مذکورہ آیات میں اس صورتِ واقعہ کا اظہار ہے جو اس دنیا میں آنے کے بعد انسانوں کے مختلف گروہوں نے اختیار کی، کہ بعض نے عہد و میثاق کو بھلا دیا، اور اس کی خلاف ورزی کی اور بعض اس پر قائم رہے، اور اس کے مطابق اعمالِ صالحہ انجام دیئے، ان دونوں فریقوں کے انجام اور عذاب و ثواب کا بیان ان چار آیات میں ہے۔

پہلی اور دوسری آیت میں عہد شکنی کرنے والے منکرین و مجرمین کا ذکر ہے، اور آخری دو آیتوں میں عہد پورا کرنے والے مؤمنین و متقین کا۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور ہماری ہدایات اور آیات کے مقابلہ میں تکبر کے ساتھ پیش آئے ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے۔ تفسیر تخریج میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی ایک تفسیر یہ نقل فرمائی ہے کہ نہ ان لوگوں کے اعمال کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے نہ ان کی دعاؤں کیلئے، مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا قبول نہ کی جائے گی، اور ان کے اعمال اس مقام پر جانے سے روک دیئے جائیں گے جہاں اللہ کے نیک بندوں کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں، جس کا نام قرآن کریم نے سورۃ مطففین میں عِلَّتین بتلایا ہے، اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے، جس میں ارشاد ہے: **إِلَيْهِ يَجْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ**۔ یعنی انسان کے کلمات طیبات اللہ تعالیٰ کے پاس لیجائے جاتے ہیں، اور ان کا نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے، یعنی انسان کے اعمالِ صالحہ اس کا سبب بنتے ہیں کہ اس کے کلمات طیبات حق تعالیٰ کی بارگاہِ خاص میں پہنچائے جاتے ہیں۔

اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ منکرین و کفار کی ارجح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، یہ روایں نیچے چٹک دی جائیں گی، اور اس مضمون کی تائید حضرت ہر، ابن عازبؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمدؓ نے مفصل نقل کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے، ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے، اور صحابہ کرام آپ کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مؤمن بندہ کے لئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہرہ والے فرشتے آتے ہیں، جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے، اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں، اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لئے نکل، اس وقت اس کی روح اس طرح

بدن سے آسانی بھل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے، اس کی رُوح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے، یہ فرشتے اس کو لیکر چلتے ہیں جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گردہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک رُوح کس کی ہے، یہ حضرات اس کا نام و لقب لیتے ہیں جو عزت و احترام کے لئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ یہ فرشتے رُوح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھولتے ہیں، دروازہ کھولا جاتا ہے، یہاں اُسے فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں، اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیتین میں لکھو، اور اس کو واپس کر دو یہ رُوح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے، اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں، کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمھارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لئے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں، اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لئے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں، اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت اس کی رُوح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اُڈن میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ رُوح بھکتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی خبیث رُوح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ بُرے سے بُرا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں بھارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کے لئے کہتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ تجلین میں رکھو، جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور اس رُوح کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مومن بندہ سے کئے تھے، یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے ہَاۥ ہَاۥ لَا اَدْرِی، یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لئے جہنم کا فرش، جہنم کا لباس دیدیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آغ و گرمی پہنچتی رہتی ہے، اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منکرین و کفار کی ارواح آسمان تک لیجائی جاتی ہیں، آسمان کا دروازہ ان کے لئے نہیں کھلتا تو وہیں سے پھینک دی جاتی ہے، آیت مذکورہ لَا تُفْتَحُ لَّهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ بوقت موت ان کی ارواح کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

آخر آیت میں ان لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَبَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ، اس میں لفظ لیج دلوج سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں تنگ جگہ میں گھسنا اور جبل اونٹ کو کہا جاتا ہے اور سَمِّ سوئی کے روزن کو، معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک اونٹ جیسا عظیم الجثہ جانور سوئی کے روزن میں داخل نہ ہو جائے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سوئی کے روزن میں اونٹ کا داخل ہونا عادتہً محال ہے اسی طرح ان کا جنت میں جانا محال ہے، اس سے ان لوگوں کا دائمی عذاب جہنم بیان کرنا مقصود ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے عذاب جہنم کی مزید شدت کا بیان ان الفاظ سے کیا گیا ہے لَهِمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ، مہاد کے معنی فرش، اور غَوَاشِ غاشیہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ڈھانپ لینے والی چیز کے، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا سب جہنم کا ہو گا، اور پہلی آیت جس میں جنت سے محرومی کا ذکر تھا اس کے ختم پر وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ، فرمایا اور دوسری آیت جس میں غذا جہنم کا ذکر ہے، اس کے ختم پر وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ارشاد فرمایا، کیونکہ یہ اس سے زیادہ شدید تیسری آیت میں احکام خداوندی کی پیروی اور پابندی کرنے والوں کا ذکر ہے، کہ یہ لوگ جنت والے ہیں اور جنت ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔

احکام شریعت میں | لیکن ان کے لئے جہاں یہ شرط ذکر کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائیں اور نیک اعمال سہولت کی رعایت کریں، اس کے ساتھ ہی رحمت و کرم سے یہ بھی فرمادیا لَا تُكَلِّفُكُمُ الشَّيْءَ إِلَّا وُسْعَهَا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر کوئی ایسا بوجھل کام نہیں ڈالتے جو اس کی طاقت سے باہر ہو، مقصود یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ جن کو دخولِ جنت کے لئے شرط کہا گیا ہے وہ کوئی بہت مشکل کام نہیں جو انسان نہ کر سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت کو ہر شعبہ میں نرم اور آسان کر دیا ہے، بیماری، کمزوری، سفر اور دوسری انسانی ضروریات کا ہر حکم میں لحاظ رکھ کر آسانیاں دی گئی ہیں۔ اور تفسیر بکرمی میں ہے کہ جب انسان کو اعمالِ صالحہ کا حکم دیا گیا تو یہ احتمال تھا کہ اگر یہ حکم اس لئے بھاری معلوم ہو کہ تمام اعمالِ صالحہ ہر جگہ ہر حال میں بجالانا تو انسان کے بس میں نہیں، اس لئے اس کے مشابہ کو ان الفاظ سے دور کر دیا گیا کہ ہم... تمام انسانی زندگی کے مختلف ادوار اور حالات کا جائزہ لے کر ہر حال میں اور ہر وقت اور ہر جگہ کے لئے مناسب احکام دیتے ہیں

جن پر عمل کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

اہل جنت کے دلوں سے باہمی | چوتھی آیت میں اہل جنت کے دو خاص حال بیان کئے گئے، ایک یہ کہ
 کدورتیں نکال دی جائیں گی، وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِ سِدًّا لَّا يُغْلَرُ
 یعنی جنتی لوگوں کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے کوئی رنجش یا کدورت ہوگی تو ہم اس کو
 ان کے دلوں سے نکال دیں گے، یہ لوگ ایک دوسرے سے بالکل خوش بھائی بھائی ہو کر جنت میں
 جائیں گے، اور بسیں گے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ مؤمنین جب پل صراط سے گذر کر جہنم سے نجات حاصل کر لیں گے تو ان کو
 جنت دوزخ کے درمیان ایک پل کے اوپر روک لیا جائے گا، اور ان کے آپس میں اگر کسی سے
 کسی کو رنجش تھی، یا کسی پر کسی کا حق تھا تو یہاں پہنچ کر ایک دوسرے سے انتقام لے کر معاملات
 صاف کر لیں گے، اور اس طرح حسد، بغض، کینہ وغیرہ سے پاک صاف ہو کر جنت میں
 داخل ہوں گے۔

تفسیر منطہری میں ہے کہ یہ پل بظاہر پل صراط کا آخری حصہ ہوگا، جو جنت سے متصل ہے،
 علامہ سیوطی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور اس مقام پر جو حقوق کے مطالبات ہوں گے ان کی ادائیگی ظاہر ہے کہ روپیہ پیسہ سے
 نہ ہو سکے گی، کیونکہ وہ وہاں کسی کے پاس نہ ہوگا، بلکہ بخاری، مسلم کی ایک حدیث کے مطابق یہ ادائیگی
 اعمال سے ہوگی، حقوق کے بدلہ میں اس کے عمل صاحب حق کو دیدیئے جائیں گے، اور اگر اس کے
 اعمال اس طرح سب ختم ہو گئے اور لوگوں کے حقوق ابھی باقی رہے تو پھر صاحب حق کے گناہ
 اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو سب بڑا مفلس قرار دیا ہے
 جس نے دنیا میں اعمالِ صالحہ کئے لیکن لوگوں کے حقوق کی پروا نہیں کی، اس کے نتیجے میں تمام اعمال
 سے خالی مفلس ہو کر رہ گیا۔

اس روایت حدیث میں ادائے حقوق اور انتقام کا عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ
 ضروری نہیں کہ سب کو یہی صورت پیش آئے، بلکہ ابن کثیر اور تفسیر منطہری کی روایت کے مطابق وہاں
 یہ صورت بھی ممکن ہوگی کہ بدوں انتقام لئے آپس کے کینے کدورتیں دور ہو جائیں۔

جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہ لوگ جب پل صراط سے گذر لیں گے تو پانی کے ایک
 چشمہ پر پہنچیں گے اور اس کا پانی پیئیں گے، اس پانی کا خاصہ یہ ہوگا کہ سب کے دلوں سے باہمی
 کینہ و کدورت دھل جائے گی، امام قرطبی نے آیت کریمہ وَجُفَّوْا بَاطِلًا کی

تفسیر بھی یہی نقل کی ہے کہ جنت کے اس پانی سے سب کے دلوں کی رنجشیں اور کدورتیں دھل جائیں گی حضرت علی مرتضیٰ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم اور عثمان اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے سینے دخولِ جنت سے پہلے کدورتوں سے صاف کر دیو جائیں گے (ابن کثیر) یہ وہ حضرات ہیں جن کے آپس میں دنیا میں اختلافات پیش آئے اور لوبتِ جنگ تک پہنچ گئی تھی۔ دوسرا حال اہل جنت کا اس آیت میں یہ بیان کیا گیا کہ جنت میں پہنچ کر یہ لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ان کے لئے جنت کی طرف ہدایت کی اور اس کا راستہ آسان کر دیا، اور کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہماری مجال نہ تھی کہ ہم یہاں پہنچ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی انسان محض اپنی کوشش سے جنت میں نہیں جاسکتا، جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر نہ ہو، کیونکہ کوشش خود اس کے قبضہ میں نہیں وہ بھی محض اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

ہدایت کے مختلف درجات ہیں | امام راغب اصفہانی نے لفظ ہدایت کی تشریح میں بڑی مفید اور اہم بات فرمائی جس کا آخری درجہ دخولِ جنت ہے | ہے کہ ہدایت کا لفظ بہت عام ہے، اس کے درجات مختلف ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ملنے کا نام ہے، اس لئے تقرب الی اللہ کے درجات بھی جتنے مختلف اور غیر متناہی ہیں، اسی طرح ہدایت کے درجات بھی بے حد متفاوت ہیں، ادنیٰ درجہ ہدایت کا کفر و شرک سے نجات اور ایمان ہے جس سے انسان کا رخ غلط راستہ سے پھر کر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتا ہے، پھر بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جس قدر فاصلہ ہے اس کو طے کرنے کے ہر درجہ کا نام ہدایت ہے، اس لئے ہدایت کی طلب سے کسی وقت کوئی انسان یہاں تک کہ انبیاء اور رسل بھی مستغنی نہیں ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر تک اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تعلیم جس طرح اُمت کو دی خود بھی اس دعا کا اہتمام جاری رکھا، کیونکہ تقرب الی اللہ کے درجات کی کوئی انتہاء نہیں، یہاں تک کہ جنت کے داخلہ کو بھی اس آیت میں لفظ ہدایت سے تعبیر کیا گیا کہ یہ ہدایت کا آخری مقام ہے۔

وَنَادَىٰ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنِ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا

اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے پایا جو ہم سے وعدہ کیا تھا

رَبُّنَا حَقًّا هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَاذْنِ

ہمارے رب نے سچا سوچنے بھی پایا اپنے رب کے وعدے کو سچا، وہ کہیں گے کہ ہاں پھر پکارے گا

مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۳۲﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ

ایک پکارنے والا ان کے بیچ میں کہ لعنت ہو اللہ کی اُن ظالموں پر جو روکتے تھے اللہ کی راہ

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَفِرُونَ ﴿۳۵﴾ وَ

سے اور ڈھونڈتے تھے اس میں کجی، اور وہ آخرت سے منکر تھے، اور

بَيْنَهُمْ حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ

دونوں کے بیچ میں ہوگی ایک دیوار اور اعراف کے اوپر مرد ہونگے کہ پہچان لیں گے ہر ایک کو اس کی نشانی سے

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ

اور وہ پکاریں گے جنت والوں کو کہ سلامتی ہے تم پر وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور

يَطْمَعُونَ ﴿۳۶﴾ وَإِذَا حُصِرَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا

وہ امیدوار ہیں، اور جب پھرے گی ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف تو کہیں گے

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۳۷﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ

اے رب ہمارے مت کر ہم کو گنہگار لوگوں کے ساتھ، اور پکاریں گے اعراف والے ان

رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا

لوگوں کو کہ ان کو پہچانتے ہیں ان کی نشانی سے، کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری اور جو

كُنْتُمْ تُكْبِرُونَ ﴿۳۸﴾ أَهَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ

تم تکبر کیا کرتے تھے، اب یہ وہی ہیں کہ تم قسم کھایا کرتے تھے کہ نہ پہنچے گی ان کو اللہ

بِرَحْمَةٍ أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۳۹﴾

کی رحمت، چلے جاؤ جنت میں نہ ڈرے تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے

خلاصہ تفسیر

اور جب اہل جنت جنت میں جا پہنچیں گے اس وقت وہ اہل جنت اہل دوزخ کو اپنی

حالت پر خوشی ظاہر کرنے کو اور ان کی حسرت بڑھانے کو پکاریں گے کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ

فرمایا تھا کہ ایمان اور اعمال صالحہ اختیار کرنے سے جنت دیں گے، ہم نے اس کو واقع کے مطابق

پایا سو (تم بتلاؤ کہ) تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا کہ کفر کے سبب دوزخ میں پڑ گے تم نے

بھی اس کو مطابق واقع کے پایا یعنی اب تو حقیقت اللہ اور رسول کے صدق اور اپنی گمراہی کی

معلوم ہوئی، وہ اہل دوزخ جواب میں کہیں گے ہاں (واقعہ سب باتیں اللہ اور رسول کی ٹھیک نکلیں) پھر ان دوزخیوں کی حسرت اور جلتیوں کی مسرت بڑھانے کو ایک پکارنے والا (یعنی کوئی فرشتہ) دونوں (فریق) کے درمیان میں رکھتا ہو کر پکارے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ماریہوں ظالموں پر جو اللہ کی راہ (یعنی دین حق) سے اعراض کیا کرتے تھے اور اس (دین حق) میں (ہمیشہ بزعیم خود) کجی (کی باتیں) تلاش کرتے رہتے تھے (کہ اس میں عیب اور اعراض پیدا کریں) اور وہ لوگ اس کے ساتھ (آشرت کے بھی منکر تھے) جس کا نتیجہ آج بھگت رہی ہیں، یہ کلام تو اہل جنت کا اور ان کی تائید میں اس سرکاری منادی کا مذکور ہوا، آگے اعراف والوں کا ذکر ہے) اور ان دونوں (فریق یعنی اہل جنت اور اہل دوزخ) کے درمیان آڑ (یعنی دیوار) ... ہوگی (جس کا ذکر سورۃ حدید میں ہے: فَضَيَّبَ بَيْنَهُمْ يَسُورَ الْخَاسِرِ) خاصہ یہ ہوگا کہ جنت کا اثر دوزخ تک اور دوزخ کا اثر جنت تک نہ جانے دے گی، رہا یہ کہ پھر گفتگو کیونکر ہوگی، سو ممکن ہے کہ اس دیوار میں جو دروازہ ہوگا جیسا سورۃ حدید میں ہے یَسُورَ الْخَاسِرِ، اس باب میں سے یہ گفتگو ہو جاوے، یا ویسے ہی آواز پہنچ جاوے) اور اس دیوار کا یا اس کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، اور اس پر سے جنتی اور دوزخی سب نظر آدیں گے (سو) اعراف کے اوپر بہت آدمی ہوں گے (جن کی حسنات اور سیئات میزان میں برابر وزن کی ہوں) وہ لوگ (اہل جنت اور اہل دوزخ میں سے) ہر ایک کو (علاوہ جنت اور دوزخ کے اندر ہونے کی علامت کے) ان کے قیافہ سے (بھی) پہچانیں گے (قیافہ یہ کہ اہل جنت کے چہروں پر نورانیت اور اہل دوزخ کے چہروں پر ظلمت اور کدورت ہوگی، جیسا دوسری آیت میں ہے وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۖ هُمْ فِيهَا يَخْتَفُونَ) اور یہ اہل اعراف اہل جنت کو پکار کر کہیں گے، السلام علیکم، ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، اور اس کے امیدوار ہوں گے (چنانچہ حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی امید پوری کر دی جاوے گی اور جنت میں جاکر حکم ہو جاوے گا) اور جب ان کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف جا پڑیں گی (اس وقت ہول کھا کر کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ (عذاب میں) شامل نہ کیجئے اور جیسے ان اہل اعراف نے اوپر اہل جنت سے سلام و کلام کیا اسی طرح) اہل اعراف (دوزخیوں میں سے) بہت سے آدمیوں کو (جو کہ کافر ہوں گے اور جن کو کہ ان کے قیافہ (ظلمت و کدورت چہرہ) سے پہچانیں گے) کہ یہ کافر ہیں) پکاریں گے (اور) کہیں گے کہ تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا (اور انبیاء کا اتباع نہ کرنا) تمہارے کچھ کام نہ آیا (اور تم اسی تکبر کی وجہ سے مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یہ بچا کر کیا سختی فضل و کرم ہوتے، جیسا آہُوْا لِرَبِّکُمْ اَللّٰهُ عَلَیْہِمْ مِّنْ بَیِّنٰتٍ سے بھی یہ مضمون مفہوم ہوتا ہے، تو ان مسلمانوں کو اب تو دیکھو کیا پادرجہ جنت میں عیش کر رہے ہیں) وہی (مسلمان ہیں) جنکی نسبت تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نہ کرے گا (تو ان پر تو اتنی بڑی

رحمت ہوتی کہ، اُن کو یہ حکم ہو گیا کہ جاؤ جنت میں (جہاں) تم پر نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ تم مغموم ہو گے، اور اس کلام میں جو رجال کی تخصیص کی غالباً وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہنوز عصاة مؤمنین بھی دوزخ میں پڑے ہوں گے، قرینہ اس کا یہ ہے کہ جب اہل اعراف امید جنت میں ہیں مگر داخل جنت نہیں ہوئے ہوں گے، تو گنہگار لوگ جن کے سینات اہل اعراف کے سینات سے زیادہ ہیں، ظاہراً بدرجہ اولیٰ دوزخ سے ابھی نہ بکھلے ہوں گے، مگر ایسے لوگ اس کلام کے مخاطب ہوں گے، واللہ اعلم۔

معارف و مسائل

جب اہل جنت جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں اپنے اپنے مستقر پر پہنچ جائیں گے، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں ہر حیثیت سے بُعد بعید حاصل ہوگا، لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ ان دونوں مقامات کے درمیان کچھ ایسے راستے ہوں گے جن سے ایک دوسرے کو دیکھ سکے گا، اور ان کے آپس میں مکالمات اور سوال و جواب ہوں گے۔ سورۃ صافات میں دو شخصوں کا ذکر مفصل آیا ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے لیکن ایک مؤمن و دوسرا کافر تھا، آخرت میں جب مؤمن جنت میں اور کافر جہنم میں چلا جائے گا تو یہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور باتیں کریں گے، ارشاد ہے:

فَاطْلَمَ قَرَأًا فِي سَوَاءٍ الْجَحِيمِ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَآتِيْنِ وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ اَفَمَا نَحْنُ بِمَبْتَلٰیْنَ اِلَّا مَوْتَنَا الْاُولٰٓئِیْ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ہ جس کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جلتی ساتھی جہانک کر دوزخی ساتھی کو دیکھے گا تو اس کو وسط جہنم میں پڑا ہوا پائے گا، اور کہے گا کہ کجخت تو یہ چاہتا تھا کہ میں بھی تیری طرح برباد ہو جاؤں، اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو آج میں بھی تیرے ساتھ جہنم میں پڑا ہوتا، اور توجہ مجھ سے یہ کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کی موت کے بعد کوئی زندگی اور کوئی حساب کتاب یا ثواب عذاب ہونے والا نہیں اب دیکھ لیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

آیات مذکورہ اور ان کے بعد بھی تقریباً ایک رکوع تک اسی قسم کے مکالمات اور سوال و جواب کا تذکرہ ہے، جو اہل جنت اور اہل جہنم کے آپس میں ہوں گے۔

اور یہ جنت و دوزخ کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے راستے بھی درحقیقت اہل جہنم کے لئے ایک اور طرح کا عذاب ہوگا کہ چار طرف سے ان پر ملامت ہوتی ہوگی، اور وہ اہل جنت کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھ کر جہنم کی آگ کے ساتھ حسرت کی آگ میں بھی جلیں گے، اور اہل جنت کے لئے نعمت و راحت میں ایک نئی طرح کا اضافہ ہوگا کہ دوسرے

فریق کی مصیبت دیکھ کر اپنی راحت و نعمت کی قدر زیادہ ہوگی، اور جو لوگ دنیا میں دینداروں پر ہنسنا کرتے تھے اور ان کا ہتہزہ کیا کرتے تھے اور یہ کوئی انتقام نہ لیتے تھے، آج ان لوگوں کو ذلت و خواری کیسا تھا عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو یہ ہنسیں گے کہ ان کے عمل کی ان کو سزا مل گئی، قرآن کریم میں یہی مضمون سورۃ مطففین میں اس طرح ارشاد ہوا ہے **قَالِیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا مِنْ الْکُفَّارِ یَصْطَحْکُوْنَ۔ عَلٰی الْاَیْمَانِ یَنْظُرُوْنَ۔ هَلْ نُوَبِّئُ الْکُفَّارَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔**

اہل جہنم کو ان کی گمراہی پر تنبیہ اور ان کے احمقانہ کلمات پر ملامت فرشتوں کی طرف سے بھی ہوگی، وہ ان کو مخاطب کر کے کہیں گے **هٰذِہِ النَّارُ الَّتِیْ کُنتُمْ یَحْتَمِلُکُمْ بِؤْنٍ۔ اَفَیَحْضُرُ هٰذِیْۤ اَآءَمَّ اَکُنتُمْ لَا تَبْصِرُوْنَ۔** یعنی یہ ہے وہ آگ جن کو تم جھٹلایا کرتے تھے، اب دیکھو کہ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں نظر نہیں آتا؟

اسی طرح آیات مذکورہ میں پہلی آیت میں ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے سوال کریں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جن نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ کیا تھا ہم نے تو ان کو بالکل سچا اور پورا پایا تم بتلاؤ کہ تمہیں جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا وہ بھی تمہارے سامنے آگیا یا نہیں، وہ اقرار کریں گے کہ بیشک ہم نے بھی اس کا مشاہدہ کر لیا۔

ان کے اس سوال و جواب کی تائید میں اللہ جل شانہ کی طرف سے کوئی فرشتہ یہ منادی کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہر ظالموں پر جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ ان کا راستہ بھی سیدھا نہ رہے، اور وہ آخرت کا انکار کیا کرتے تھے۔

اہل اعراف کون لوگ ہیں | جنت و دوزخ والوں کے باہمی مکالمات کے ضمن میں ایک اور بات تیسری آیت میں یہ بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پا گئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں، ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اعراف کیا چیز ہے، اس کی تشریح سورۃ حدید کی آیات سے ہوتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے، ایک کھلے کافر و مشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں دھکیل دیے جائیں گے، دوسرے مؤمنین ان کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی، تیسرے منافقین، یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے، اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے، اس وقت ایک سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی، مؤمنین اپنے نور ایمان کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں، اس پر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ پیچھے لوٹو وہاں روشنی تلاش کرو، مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور عمل صالح کی ہے، جس کے حاصل کرنے کا مقام پیچھے گذر گیا، جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی، ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں ملے گا، اسی حالت میں منافقین اور مؤمنین کے درمیان ایک دیوار کا حصار حائل کر دیا جائے گا، جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس دروازہ کے باہر تو سارا عذاب ہی عذاب نظر آئے گا، اور دروازہ کے اندر جہاں مؤمنین ہوں گے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی، یہی مضمون اس آیت کا ہے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُوا نَارَ النَّارِ مِن تَحْتِ كَعَمْرٍا قِيلَ ارجعوا ورائكم فالتيسرنا لولاءنا فصرنا بينهم سورا لئلا يابوا باطنهم فيه الرحمة وظاهره من قبله العذاب ۵

اس آیت میں وہ حصار جو اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان حائل کیا جائے گا اس کو لفظ سور سے تعبیر کیا گیا ہے، اور یہ لفظ دراصل شہر سپاہ کے لئے بولا جاتا ہے، جو بڑے شہروں کے گرد غنیم سے حفاظت کے لئے بڑی مضبوط، مستحکم چوڑی دیوار سے بنائی جاتی ہے، ایسی دیواروں میں فوج کے حفاظتی دستوں کی کمین گاہیں بھی بنی ہوتی ہیں، جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔ سورۃ اعراف کی آیت مذکورہ میں ہے: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمِهِمْ، ابن جریر اور دوسرے ائمہ تفسیر کی تخریر کے مطابق اس آیت میں لفظ حجاب کا وہی حصار مراد ہے جس کو سورۃ حدید کی آیت میں لفظ سور سے تعبیر کیا گیا ہے، اس حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، کیونکہ اعراف عرف کی جمع ہے، اور عرف ہر چیز کے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ دُور سے معروف و ممتاز ہوتا ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جنت و دوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے، اور آیت اعراف میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محشر میں اس مقام پر کچھ لوگ ہوں گے جو جنت و دوزخ دونوں طرف کے حالات کو دیکھ رہے ہوں گے، اور دونوں طرف رہنے والوں سے مکالمات اور سوال و جواب کریں گے۔

اب یہ بات کہ یہ کون لوگ ہوں گے اور اس درمیانی مقام میں ان کو کیوں رکھا جائے گا اس میں مفسرین کے اقبال مختلف اور روایات حدیث متعدد ہیں، لیکن صحیح اور راجح جہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات اور سیئات کے دونوں پتے میزانِ عمل میں برابر ہو جائیں گے، اپنے حسنات کے سبب جہنم سے تو نجات پالیں گے، لیکن سیئات اور گناہوں کے سبب ابھی جنت میں ان کا داخلہ نہ ہوا ہوگا، اور بالآخر رحمتِ خداوندی یہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے

صحابہ کرام میں سے حضرت خذیفہ، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم کا اور دوسرے صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے، اور اس میں تمام روایات حدیث بھی جمع ہو جاتی ہیں، جو مختلف عنوانات سے منقول ہیں، امام ابن جریر نے بروایت خذیفہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، اس لئے جہنم سے تونجات ہو گئی، مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے، ان کو اس مقام اعراف پر روک لیا گیا، یہاں تک کہ تمام اہل جنت اور اہل دوزخ کا حساب اور فیصلہ ہو جانے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا، اور بالاخر ان کی مغفرت ہو جائے گی، اور جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ (ابن کثیر)

اور ابن مردویہ نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے، اور اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے، تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلہ سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔

اس حدیث اور پہلی حدیث میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہ حدیث ایک مثال ہے ان لوگوں کی جن کی نیکیاں اور گناہ برابر درجہ کے ہوں، کہ ایک طرف شہادت فی سبیل اللہ اور دوسری طرف ماں باپ کی نافرمانی، دونوں پہلے برابر ہو گئے۔ (کذا قالہ ابن کثیر)

سلام کا مسنون لفظ | اہل اعراف کی تشریح اور تعریف معلوم ہونے کے بعد اب اصل آیت کا مضمون دیکھئے، جس میں ارشاد ہے کہ اہل اعراف اہل جنت کو آواز دے کر کہیں گے (سَلَامٌ عَلَيْكُمْ) یہ لفظ دنیا میں بھی باہمی ملاقات کے وقت بطور تحفہ و اکرام کے بولا جاتا ہے، اور مسنون ہے، اور بعد موت کے قبروں کی زیارت کے وقت بھی، اور پھر محشر اور جنت میں بھی، لیکن آیات اور روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تو اَلْسَلَامُ عَلَیْكُمْ کہنا مسنون ہے، اور اس دنیا سے گزرنے کے بعد بخیر الف لام کے سَلَامٌ عَلَیْکُمْ کا لفظ مسنون ہے، زیارت قبر کے لئے جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے وہ بھی سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدِّینِ آیا ہے، اور فرشتے جب اہل جنت کا استقبال کریں گے اس وقت بھی یہ لفظ اسی عنوان سے آیا ہے، سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبَّتُمْ قَادِحُکُمْ خَلِدْتُمْ، اور یہاں بھی اہل اعراف اہل جنت کو اسی لفظ کے ساتھ سلام کریں گے۔

آگے اہل اعراف کا یہ حال بتلایا ہے کہ وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے، مگر اس کے امیدوار ہیں، اس کے بعد ارشاد ہے: وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ، یعنی جب اہل اعراف کی نظر اہل جہنم پر پڑے گی، اور

ان کے عذاب و مصیبت کا مشاہدہ کریں گے تو اللہ سے پناہ مانگیں گے کہ ہمیں ان ظالموں کے ساتھ نہ کیجئے۔
پانچویں آیت میں یہ بھی مذکور ہے کہ اہل اعراف اہل جہنم کو خطاب کر کے بطور ملامت کے یہ کہیں گے
کہ دنیا میں تم کو جس مال و دولت اور جماعت اور حجت پر بھروسہ تھا اور جن کی وجہ سے تم تکبر و غرور میں مبتلا
تھے آج وہ کچھ تمھارے کام نہ آیا۔

چھٹی آیت میں مذکور ہے اَلَّذِينَ اَقْسَمْتُ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ اَدْخُلُوا
الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُونَ۔

اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اہل اعراف کا سوال جواب
اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے ساتھ ہو چکے گا، اس وقت رب العالمین اہل دوزخ کو خطاب
کر کے یہ کلمات اہل اعراف کے بارے میں فرمائیں گے کہ تم لوگ قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ان کی مغفرت ہوگی
اور ان پر کوئی رحمت نہ ہوگی، سو اب دیکھو ہماری رحمت، اور اس کے ساتھ ہی اہل اعراف کو خطاب
ہوگا کہ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ نہ تم پر کچھ معاملات کا کوئی خوف ہو نا چاہئے، اور نہ آئندہ کا
کوئی غم و فکر۔ (ابن کثیر)

وَنَادَىٰ اَصْحَابُ النَّارِ اَصْحَابَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ

اور پکاریں گے دوزخ والے جنت والوں کو کہ بہاؤ ہم پر حقوڑا سا پانی ،

اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ط قَالَ وَاِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِمَّا عَلٰى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰

یا کچھ اس میں سے جو روزی تم کو دی اللہ نے، کہیں گے اللہ نے ان دونوں کو روک دیا ہے کافروں سے ،

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَ غَرَّتْهُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ

جنہوں نے ٹھہرایا اپنا دین تماشہ اور کھیل اور دھوکہ میں ڈالا ان کو دنیا کی زندگی نے سو آج ہم

نَنسُوْهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا وَمَا كَانُوْا بِاِلْتِمَاسٍ جٰدُوْنَ ۝۵۱

ان کو بھلا دیں گے جیسا انھوں نے بھلا دیا اس دن کے ملنے کو اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے منکر تھے،

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ

اور ہم نے اُن لوگوں کے پاس پہنچادی ہر کتاب جسکو مفصل بیان کیا ہم نے خبر داری سے راہ دکھائی والی اور رحمت

يَوْمَ مَعُوْنٍ ۝۵۲ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهُ ط يَوْمَ يَأْتِي تَاْوِيْلَهُ

ہو ایمان والوں کیلئے ، کیا اب اسی کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہو جائے جس دن ظاہر ہو جائیگا اس کا مضمون

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا

کہنے لگیں گے وہ لوگ جو اس کو بھول رہے تھے پہلے سے بیشک لائے تھے ہمارے رب کے رسول

يَا حَيُّ ۚ فَهَلْ لَنَا مِنْ شَفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلْ غَيْرَ

بجی بات سواب کوئی ہماری سفارش والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم لوٹا دیجے جائیں تو ہم عمل کریں غلط

الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ مَا قَدْ خَسِرُوا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ

اس کے جو ہم کر رہے تھے، بیشک تباہ کیا انھوں نے اپنے آپ کو اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افتراء کیا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

اور (جس طرح اوپر جنت والوں نے دوزخ والوں سے گفتگو کی اسی طرح) دوزخ والے

جنت والوں کو پکاریں گے کہ (ہم مارے بھوک اور پیاس اور گرمی کے بے دم ہوئے جاتے ہیں خدا

کے واسطے) ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو شاید کچھ تسکین ہو جائے یا اور ہی کچھ دیدہ جو

اللہ تعالیٰ نے تم کو دے رکھا ہے، (اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امید کر کے مانگیں گے، کیونکہ

غایت اضطراب میں بعید از توقع باتیں بھی منہ سے نکلا کرتی ہیں) جنت والے (جواب میں) کہیں گے

کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی (یعنی جنت کے کھانے اور پینے کی) کافروں کے لئے بندش

کر رکھی ہے، جنھوں نے دنیا میں اپنے دین کو (جس کا قبول کرنا ان کے ذمہ واجب تھا) لہو و لعب

بنارکھا تھا اور جن کو دنیوی زندگی نے دھوکہ (اور غفلت) میں ڈال رکھا تھا (اس لئے دین کی کچھ پرواہی

نہ کی، اور یہ دارالجزاء ہے) جب دین نہیں اس کا ثمرہ کہاں، آگے حق تعالیٰ اہل جنت کے اس

جواب کی تصدیق و تائید میں فرماتے ہیں) سو (جب ان کی دنیا میں یہ حالت تھی تو) ہم بھی آج

(قیامت) کے روز ان کا نام نہ لیں گے (اور کھانا پینا خاک نہ دیں گے) جیسا انھوں نے اس

(عظیم شان) دن کا نام نہ لیا، اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے، اور ہم نے

ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے (یعنی قرآن) جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے

بہت ہی واضح واضح کر کے بیان کر دیا ہو (اور یہ بیان سب کے سنانے کو کیا ہے لیکن) ذریعہ ہدایت

اور رحمت ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوا) ہے جو (اس کو سن کر) ایمان لے آتے ہیں (اور جو باوجود

اتمام حجت کے ایمان نہیں لاتے، ان کی حالت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ) ان لوگوں کو اور کسی

بات کا انتظار نہیں صرف اس (قرآن) کے بتلائے ہوئے اخیر نتیجہ (یعنی وعدہ سزا) کا انتظار

ہے (یعنی قبل از عذاب و عید سے نہیں ڈرتے تو خود عذاب کا وقوع چاہتے ہوں گے سو) جس روز

اس کا (بتلایا ہوا) اخیر نتیجہ پیش آئے گا (جس کی تفصیل دوزخ وغیرہ کی اور پرندہ کو رہی) اس

روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے تھے (مضطرب ہو کر یوں کہنے لگیں گے واقعی ہمارے

رب کے پیغمبر (دنیا میں) بھی سچی باتیں لائے تھے (مگر ہم سے حماقت ہوئی) سوا ب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہو کہ وہ ہماری سفارش کر دے یا کیا ہم پھر (دنیا میں) واپس بھیجے جاسکتے ہیں، تاکہ ہم لوگ (پھر دنیا میں جا کر) ان اعمالِ بد کے جن کو ہم کیا کرتے تھے بر خلاف دوسرے اعمال (نیک) کریں (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب کوئی صورتِ نجات کی نہیں) بے شک ان لوگوں نے اپنے کو دھوکے (خسارے میں ڈال دیا اور یہ جو باتیں تراشتے تھے (اس وقت) سب گم ہو گیا (اب بجز سزا کے اور کچھ نہ ہوگا)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین چھ دن میں

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَ

پھر قرار پکڑا عرش پر اٹھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہو دوڑتا ہوا اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ

پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے تابعدار اپنے حکم کے سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور

الْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۴﴾

حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہو اللہ جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصہ تفسیر

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز کے برابر وقت میں پیدا کیا، پھر عرش پر (جو مشابہ تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اسکی شان کے لائق ہے) چھپا دیتا ہے شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ایسے طور پر کہ وہ شب دن کو جلدی سے آلیتی ہے (یعنی دن آنا فنا گذرنا معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ دفعۃً رات آجاتی ہے) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم (تکوینی) کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہر خلق ہونا اور حاکم ہونا، بڑے کمالات والے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں ۵۴

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں آسمان و زمین اور سیارات و نجوم کے پیدا کرنے اور ایک خاص نظامِ محکم کے تابع اپنے اپنے کام میں لگے رہنے کا ذکر اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ

کا بیان کر کے ہر اہل عقل انسان کو اس کی دعوتِ فکر دی گئی ہے کہ جو ذات پاک اس عظیم الشان عالم کو عدم سے وجود میں لانے اور حکیمانہ نظام کے ساتھ چلانے پر قادر ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُن چیزوں کو معدوم کر کے قیامت کے روز دوبارہ پیدا فرمادے، اس لئے قیامت کا انکار چھوڑ کر صرف اسی ذات کو اپنا رب سمجھیں، اسی سے اپنی حاجات طلب کریں، اسی کی عبادت کریں، مخلوق پرستی کی دلدل سے نکلیں، اور حقیقت کو پہچانیں، اس میں ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا۔

آسمان و زمین کی تخلیق میں | یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ تو اس پر قادر ہیں کہ یہ سارا جہان چھ روز کی مدت کیوں ہوئی | ایک آن میں پیدا فرمادیں، خود قرآن کریم میں مختلف عنوانات سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہیں ارشاد ہے وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ، یعنی آنکھ جھپکنے کی مقدار میں ہمارا حکم نافذ ہو جاتا ہے، کہیں فرمایا ہے إِذَا أَرَادَ شَيْءًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتے ہیں تو فرمادیتے ہیں کہ ہو جاوہ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر پیدائش عالم کے لئے چھ روز صرف ہونے کی کیا وجہ ہے؟

مفسر القرآن حضرت سعید بن جبیرؓ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ قدرتِ حق تعالیٰ تو بیشک اس پر عادی ہے کہ یہ سب کچھ ایک آن میں پیدا کر دیں، لیکن بتقاضائے حکمت اس عالم کی تخلیق میں چھ دن لگائے گئے تاکہ انسان کو نظامِ عالم کے چلانے میں تدریج اور پختہ کاری کی تعلیم دی جائے جیسا کہ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غور و فکر اور وقار و تدبیر کے ساتھ کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے (منظری بحوالہ شعب اللہیقی) مطلب یہ ہے کہ جلد بازی میں انسان مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و فکر نہیں کر سکتا، اس لئے اکثر کام خراب ہو جاتا ہے، اور پشیمانی ہوتی ہے، غور و تدبیر اور سہولت کے ساتھ جو کام کیا جائے اس میں برکت ہوتی ہے۔

تخلیقِ زمین و آسمان اور سیارات | دوسرا سوال یہ ہے کہ دن اور رات کا وجود تو آفتاب کی حرکت سے پہلے دن رات کیسے پہچانے گئے | پہچانا جاتا ہے، آسمان اور زمین کی پیدائش سے پہلے جب نہ آفتاب تھا نہ ماہتاب، چھ دنوں کی تعداد کس حساب سے ہوئی۔

اس لئے بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ مراد چھ دن سے اتنا وقت اور زمانہ ہے جس میں چھ دن رات اس دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن صاف اور بے غبار بات یہ ہے کہ دن اور رات کی یہ اصطلاح کہ طلوعِ آفتاب سے غروب تک دن اور غروب سے طلوع تک رات، یہ تو اس دنیا کی اصطلاح ہے، پیدائشِ عالم سے پہلے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کی دوسری

علامات مقرر فرما رکھی ہوں، جیسے جنت میں ہوگا کہ وہاں کا دن اور رات حرکتِ آفتاب کے تابع نہیں ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چھ دن جن میں زمین و آسمان بنائے گئے وہ ہمارے چھ دن کے برابر ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے بڑے ہوں، جیسے آخرت کے دن کے بارے میں ارشاد قرآنی ہے کہ ایک ہزار سال کے برابر ایک دن ہوگا۔

ابو عبد اللہ رازیؒ نے فرمایا کہ فلکِ عظیم کی حرکت اس دنیا کی حرکات کے مقابلہ میں اتنی تیز ہے کہ ایک دوڑنے والا انسان ایک قدم اٹھا کر زمین پر رکھنے نہیں پاتا کہ فلکِ عظیم تین ہزار میل کی مسافت طے کر لیتا ہے (بحر محیط)

امام حسن بن حنبلؒ اور مجاہدؒ کا قول یہی ہے کہ یہاں چھ دن سے آخرت کے چھ دن مراد ہیں اور بروایت ضحاکؒ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

اور یہ چھ دن جن میں پیدائشِ عالم وجود میں آئی ہے، صحیح روایات کے مطابق اتوار سے شروع ہو کر جمعہ پر ختم ہوتے ہیں، یوم السبت یعنی ہفتہ کے اندر تخلیقِ عالم کا کام نہیں ہوا، بعض علماء نے فرمایا کہ السبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں، اس روز سکا یوم السبت اسی لئے نام رکھا گیا کہ اس پر کام ختم ہو گیا (تفسیر ابن کثیر)

آیت مذکورہ میں زمین و آسمان کی تخلیق چھ روز میں مکمل ہونے کا ذکر ہے، اس کی تفصیل سورۃ حم سجدہ کی نویں اور دسویں آیات میں اس طرح آئی ہے کہ دو دن میں زمین بنائی گئی، پھر دو دن میں زمین کے اوپر پہاڑ، دریا، معادن، درخت، نباتات، اور انسان و حیوان کے کھانے پینے کی چیزیں بنائی گئیں، کھل چار دن ہو گئے، ارشاد فرمایا، اَخْلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نَارٍ وَ يَوْمَئِذٍ اور پھر فرمایا قَدْ سَأَفِيْهَا اَقْوَامًا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ

پہلے دو دن جن میں زمین بنائی گئی، اتوار اور پیر ہیں، اور دوسرے دو دن جن میں زمین کی آبادی کا سامان پہاڑ، دریا بنائے گئے وہ منگل اور بدھ ہیں، اس کے بعد ارشاد فرمایا فَقَضَاهُمْ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ، یعنی پھر ساتوں آسمان بنائے دو دن میں، ظاہر ہے کہ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہوں گے، اس طرح جمعہ تک چھ دن ہو گئے۔

آسمان و زمین کی تخلیق کا بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ یعنی پھر عرش پر قائم ہوا، استوی کے لفظی معنی قائم ہونے اور عرش شاہی تخت کو کہا جاتا ہے اب یہ عرش رحمن کیسا اور کیا ہے، اور اس پر قائم ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کے متعلق بے غبار اور صاف و صحیح وہ مسلک ہی جو سلف صالحین، صحابہ و تابعین سے اور بعد میں اکثر حضرات صوفیائے کرام سے منقول ہے کہ انسانی عقل اللہ جل شانہ کی ذات

وصفات کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے، اس کی کھوج میں پڑنا بیکار بلکہ مضر ہے، ان پر اجمالاً یہ ایمان لانا چاہئے کہ ان الفاظ سے جو کچھ حق تعالیٰ کی مراد ہے وہ صحیح اور حق ہے، اور خود کوئی معنی متعین کرنے کی فکر نہ کرے۔

حضرت امام مالکؒ سے ایک شخص نے یہی سوال کیا کہ استواء علیٰ ہر شے کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے کچھ دیر تاویل فرمانے کے بعد فرمایا کہ لفظ استواء کے معنی تو معلوم ہیں اور اس کی کیفیت اور حقیقت کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی، اور ایمان لانا اس پر واجب ہے، اور اس کے متعلق کیفیت و حقیقت کا سوال کرنا بدعت ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوالات نہیں کئے، سفیان ثوری، امام ادزاعی، لیث بن سعد، سفیان ابن عیینہ، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ جو آیات اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے متعلق آئی ہیں ان کو جس طرح وہ آتی ہیں اسی طرح بغیر کسی تشریح و تاویل کے رکھ کر ان پر ایمان لانا چاہئے (مظہری)

اس کے بعد آیت مذکورہ میں فرمایا یُخَشِی الْغَیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهُ حَثِیثًا، یعنی اللہ تعالیٰ ڈھانپ دیتے ہیں رات کو دن پر اس طرح کہ رات جلدی کے ساتھ دن کو آلیتی ہے، مراد یہ ہے کہ رات اور دن کا یہ انقلاب عظیم کہ پورے عالم کو نور سے اندھیرے میں یا اندھیرے سے نور میں لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کے تابع اتنی جلدی اور آسانی سے ہو جاتا ہے کہ ذرا دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْحَرَاتٍ بِأَمْرِی، یعنی پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آفتاب اور چاند اور تمام ستاروں کو اس حالت پر کہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے امر و حکم کے تابع چل رہے ہیں۔

اس میں ایک ذی عقل انسان کے لئے دعوتِ فکر ہے جو مخلوق کی بنائی ہوئی مصنوعات کا ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین کی بنائی ہوئی مشینوں میں ادل تو کچھ نقص رہتے ہیں، اور نقص بھی نہ رہیں تو کیسی فولادی مشینیں اور کل پرزے ہوں چلتے چلتے گھستے ہیں، ڈھیلے ہوتے ہیں، مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، گریسنگ کی حاجت پیش آتی ہے، اور اس کیلئے کئی کئی دن بلکہ ہفتوں اور مہینوں مشین معطل رہتی ہے، لیکن ان خدائی مشینوں کو دیکھو کہ جس طرح اور جس شان سے پہلے دن ان کو چلا یا تھا اسی طرح چل رہی ہیں، نہ کبھی ان کی رفتار میں ایک منٹ سیکنڈ کا فرق آتا ہے، نہ کبھی ان کا کوئی پرزہ گھستا ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو درکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ مسخراتِ بامرِم چل رہی ہیں، یعنی ان کے چلنے چلانے کے لئے نہ کوئی بجلی کا پادور کار رہی، نہ کسی انجن کی مدد ضروری ہے، وہ صرف امرِ الہی سے چل رہی ہیں، اسی کے تابع ہیں

اس میں کوئی فرق آنا ناممکن ہے، ہاں جب خود قادر مطلق ہی ان کے فنا کرنے کا ارادہ ایک معین وقت پر کریں گے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کا نام قیامت ہے۔

ان چند مثالوں کے ذکر کے بعد حق تعالیٰ کی قدرت قاہرہ مطلقہ کا بیان ایک کلی قاعدے کی صورت میں اس طرح کیا گیا **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ**، خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا ہیں، معنی یہ ہیں کہ اسی کے لئے خاص ہر خالق ہونا اور حاکم ہونا، اس کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی ادنیٰ چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی کو کسی پر حکم کرنے کا حق ہے، (بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حکم کا کوئی خاص شعبہ کسی کے سپرد کر دیا جائے تو وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کا حکم ہے) اس لئے مراد آیت کی یہ ہوئی کہ یہ ساری چیزیں پیدا کرنا بھی اسی کا کام تھا، اور پیدا ہونے کے بعد ان سے کام لینا بھی کسی دوسرے کے بس کی بات تھی وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے۔ صوفیاء کرام نے فرمایا کہ خلق اور امر دو عالم ہیں، خلق کا تعلق مادہ اور مادیات سے ہے، اور امر کا تعلق مجردات لطیفہ کے ساتھ ہے، آیت **قُلِ الذُّرُومُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي** میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ روح کو امر رب سے فرمایا، خلق اور امر دونوں کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونے کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں یہ تو سب مادی ہیں، ان کی پیدائش کو خلق کہا گیا، اور مافوق السموات جو مادہ اور مادیات سے بری ہیں ان کی پیدائش کو لفظ امر سے تعبیر کیا گیا (منظہری)۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا **تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ**، اس میں لفظ تبارک برکت سے بنا ہے اور لفظ برکت بڑھنے، زیادہ ہونے، ثابت رہنے وغیرہ کے کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس جگہ لفظ تبارک کے معنی بلند و بالا ہونے کے ہیں، جو بڑھنے کے معنی سے بھی لیا جاسکتا ہے، اور ثابت رہنے کے معنی سے بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ قائم اور ثابت بھی ہیں، اور بلند و بالا بھی، بلند ہونے کے معنی کی طرف حدیث کے ایک جملہ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے **تَبَارَكَ وَتَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ**، یہاں تبارکت کی تفسیر تعالیٰ کے لفظ سے کر دی ہے۔

أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝۵۵

پکارو اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے اس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا

اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور

طَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ۝۵۶

توقع سے بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے

خلاصہ تفسیر

تم لوگ (ہر حالت میں اور ہر حاجت میں) اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات واقعی ہے کہ) اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو (دعا میں) حد (ادب) سے نکل جاویں (مثلاً محالات عقلیہ یا محرّمات شرعیہ کی دعا مانگنے لگیں) اور دنیا میں بعد اس کے کہ (تعلیم توحید اور بعثت انبیاء کے ذریعہ) اس کی اصلاح اور درستی کر دی گئی ہے، فیاد مت پھیلاؤ (یعنی امور حقہ توحید وغیرہ کے مانتے اور ان پر چلنے سے جن کی اور تعلیم ہے عالم میں امن قائم ہوتا ہے تم تعلیم مذکور کو چھوڑ کر نقص امن مت کرو) اور (جیسا تم کو اور پر خاص دعا کرنے کا حکم ہوا ہے اسی طرح بقیہ عبادات کا حکم کیا جاتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی عبادت (جس طریقے سے تم کو بتلایا ہے) کیا کرو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے (یعنی عبادت کر کے نہ تو ناز ہو اور نہ مایوسی ہو) آگے عبادت کی ترغیب ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے خاص خاص مظاہر اور اہم انعامات کا ذکر تھا، ان آیات میں اس کا بیان ہے کہ جب قدرت مطلقہ کا مالک اور تمام احسانات و انعامات کا کرنے والا صرف رب العالمین ہے تو مصیبت اور حاجت کے وقت اسی کو پکارنا اور اسی سے دعا کرنا چاہئے، اس کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہونا جہالت اور محرومی ہے، اسی کے ساتھ ان آیات میں دعا کے بعض آداب بھی بتلا دیئے گئے، جن کی رعایت کرنے سے قبولیت دعا کی امید زیادہ ہو جاتی ہے۔

لفظ دعا عربی زبان میں کسی کو... حاجت روائی کے لئے پکارنے کے معنی میں بھی آتا ہے، اور مطلق یاد کرنے کے معنی میں بھی، اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، آیت میں ارشاد ہے: **ادْعُوا رَبَّكُمْ**، یعنی پکارو اپنے رب کو اپنی حاجات کے لئے، یا یاد کرو اور عبادت کرو اپنے رب کی۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اپنی حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دوسری صورت میں یہ کہ ذکر و عبادت صرف اسی کی کرو، یہ دونوں تفسیریں سلف صالحین ائمہ تفسیر سے منقول بھی ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا **أَخْضِرْ عَاوُ خُفْيَةً**، تضرّع کے معنی عجز و انکسار اور اظہار تذلل کے ہیں، اور خفیہ کے معنی پوشیدہ، چھپا ہوا، جیسا کہ اردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔

ان دونوں لفظوں میں دعا و ذکر کے لئے دواہم آداب کا بیان ہے، اول یہ کہ قبولیت دعا کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و انکسار اور تذلل کا اظہار

کر کے دعا کرے، اس کے الفاظ بھی عجز و انکسار کے مناسب ہوں، لب و لہجہ بھی تواضع و انکسار کا ہو، ہیئت دعا مانگنے کی بھی ایسی ہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آجکل عوام جس انداز سے دعا مانگتے ہیں اول تو اس کو دعا مانگنا ہی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ پڑھنا کہنا چاہئے، کیونکہ اکثر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کلمات زبان سے بول رہے ہیں ان کا مطلب کیا ہے، جیسا کہ آجکل عام مساجد میں اماموں کا معمول ہو گیا ہے کہ کچھ عربی زبان کے کلمات دعائیہ انھیں یاد ہوتے ہیں ختم نماز پر انھیں پڑھ دیتی ہیں اکثر تو خود ان اماموں کو بھی ان کلمات کا مطلب مفہوم معلوم نہیں ہوتا اور اگر ان کو معلوم ہو تو کم از کم جاہل مقتدی تو اس سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، وہ بے سمجھے بوجھے امام کے پڑھے ہوئے کلمات کے پیچھے آمین آمین کہتے ہیں، اس سارے تماشے کا حاصل چند کلمات پڑھنا ہوتا ہے، دعا مانگنے کی جو حقیقت یہاں پائی ہی نہیں جاتی، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے ان بے جان کلمات ہی کو قبول فرما کر قبولیت دعا کے آثار پیدا فرمادیں، مگر اپنی طرف سے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دعا پڑھی نہیں جاتی بلکہ مانگی جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مانگنے کے ڈھنگ سے مانگا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے کلمات کے معنی بھی معلوم ہوں اور سمجھ کر ہی کہہ رہا ہو تو اگر اس کے ساتھ عنوان اور لب و لہجہ اور ہیئت ظاہری تواضع و انکسار کی نہ ہو تو یہ دعا نہ ایک مطالبہ رہ جاتا ہے، جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں۔

غرض پہلے لفظ میں رُوح دعا بتلادی گئی کہ وہ عاجزی و انکساری اور اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگنا ہے، دوسرے لفظ میں ایک دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ دعا کا خفیہ اور آہستہ مانگنا افضل اور قرین قبول ہے، کیونکہ باواز بلند دعا مانگنے میں اول تو تواضع و انکسار باقی رہنا مشکل ہے، ثانیاً اس میں ریا و شہرت کا بھی خطرہ ہے، ثالثاً اس کی صورت عمل ایسی ہے کہ گویا یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سمیع علیم ہیں، ہمارے ظاہر و باطن کو یکساں جانتے ہیں، ہر بات خفیہ ہو یا جہر اس کو سنتے ہیں، اسی لئے غزوہ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام کی آواز دعا میں بلند ہو گئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے کو یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو جو اتنی بلند آواز سے کہتے ہو، بلکہ ایک سمیع و قریب تمہارا مخاطب ہی، یعنی اللہ تعالیٰ، (اس لئے آواز بلند کرنا فضول ہے) خود اللہ جل شانہ نے ایک مرد صالح کی دعا کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے اِنَّ نَادٰی رَبِّکَ ذَا ذَا خَفِیًّا، یعنی جب انھوں نے رب کو پکارا آہستہ آواز سے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعا کی یہ کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دعا مانگی جائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہراً دعا کرنے میں اور آہستہ پست آواز سے

کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر و دعا میں بڑا مجاہد کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علم دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی، اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں (ابن کثیر، منظرہ)

ابن جریر نے فرمایا کہ دعا میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے، امام ابو بکر جصاص حنفی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے، حضرت حسن بصری اور ابن عباسؓ سے ایسا ہی منقول ہے، اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۃ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے، کیونکہ آمین بھی ایک دعا ہے۔

ہمارے زمانہ کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرما دیں کہ قرآن و سنت کی اس تلقین اور بزرگان سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں، جو آداب دعا کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں، غلبہ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، کسی خاص موقع پر خاص دعا پوری جماعت سے کرنا مقصود ہو ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعا کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں اس کا مقصد یہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز و عبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں، اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعا کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آجکل عام طور سے ہو رہا ہے۔ یہ بیان اپنی حاجات کے لئے دعا مانگنے کا تھا، اگر دعا کے معنی اس جگہ ذکر و عبادت کے لئے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکر سر ذکر جہر سے افضل ہے، اور صوفیائے کرام میں مشائخ چشتیہ جو بتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے، تاکہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جائے، اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے، ورنہ فی نفسہ ذکر میں جہر کرنا ان کے

یہاں بھی مطلوب نہیں، گوجائز ہے، اور جواز اس کا بھی حدیث سے ثابت ہی بشرطیکہ اس میں ریاہ و نمود نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل، ابن حبان، بیہقی وغیرہ نے حضرت سعید بن ابی وقاصؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الدِّينِ كَيْسُ الْخَفِيِّ وَخَيْرُ
الرِّسْقِ مَا يَكْفِي | یعنی بہترین ذکر خفی ہے، اور بہترین رزق
وہ ہو جو انسان کے لئے کافی ہو جائے۔

ہاں خاص خاص حالات اور اوقات میں جہر ہی مطلوب اور افضل ہے، ان اوقات و حالات کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے واضح فرمادی ہے، مثلاً اذان و اقامت کا بلند آواز سے کہنا، جہری نمازوں میں بلند آواز سے تلاوت قرآن کرنا، تکبیرات نماز، تکبیرات تشریق، حج میں تلبیہ بلند آواز سے کہنا وغیرہ، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فیصلہ اس باب میں یہ فرمایا کہ جن خاص حالات اور مقامات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا عملاً جہر کرنے کی تلقین فرمائی ہے وہاں تو جہر ہی کرنا چاہئے، اس کے علاوہ دوسرے حالات و مقامات میں ذکر خفی اولیٰ و انفع ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا اِنَّهُ لَا يَجِبُ الْمُعْتَلِّ يَنْ، معتدین، اعتداء سے مشق ہو اعتداء کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، حد سے آگے بڑھنا خواہ دعاء میں ہو یا کسی دوسرے عمل میں سب کا یہی حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دین اسلام نام ہی حدود و قیود کی پابندی اور سرماں برداری کا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام معاملات میں حدود و شرعیہ سے تجاوز کیا جائے تو وہ بجائے عبادت کے گناہ بن جاتے ہیں۔

دعاء میں حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دعاء میں لفظی تکلفات قافیہ وغیرہ کے ختم تیار کئے جائیں، جس سے خشوع خضوع میں فرق پڑے، دوسرے کہ دعاء میں غیر ضروری قیدیں شرطیں لگائی جائیں، جیسے حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے حج ا کہ ان کے صاحبزادے اس طرح دعاء مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ میں آپ سے جنت میں سفید رنگ کا داہنی جانب والا محل طلب کرتا ہوں تو موصوف نے اُن کو روکا، اور فرمایا کہ دعائیں ایسی قیدیں شرطیں لگانا حد سے تجاوز ہے، جس کو قرآن و حدیث میں ممنوع قرار دیا گیا، (منظہری بروایت ابن ماجہ وغیرہ)۔

تیسری صورت حد سے تجاوز کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے بددعاء کرے یا کوئی

ایسی چیز مانگے جو عام لوگوں کے لئے مضر ہو، اسی طرح ایک صورت حد سے تجاوز کی یہ بھی ہے جو اس جگہ مذکور ہے کہ دعا میں بلا ضرورت آواز بلند کی جائے (تفسیر منطہری، احکام لہستان)

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا۔ آئیں دو لفظ متضاد اور متقابل آتے ہیں، صلاح اور فساد، صلاح کے معنی درستی اور فساد کے معنی خرابی کے آتے ہیں، امام راغب نے مفردات لہستان میں فرمایا کہ فساد کہتے ہیں کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو، خواہ یہ نکلنا تھوڑا سا ہو یا زیادہ، اور ہر فساد میں کمی بیشی کا مدار اسی اعتدال خروج پر ہے، جس قدر خروج بڑھے گا فساد بڑھے گا، فساد کے معنی خرابی پیدا کرنا اور اصلاح کے معنی درستی کرنا، اس لئے وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا کے معنی یہ ہوئے کہ زمین میں خرابی نہ پیدا کرو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی درستی فرمادی ہے۔

امام راغب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی اصلاح کرنا اس کی کسی صورت میں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو اول ہی ٹھیک ٹھیک اور درست پیدا فرمایا، جیسے وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ، دوسرے یہ کہ اس میں جو فساد آگیا تھا اس کو دور کر دیا، جیسے يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ۔ تیسرے یہ کہ اس کو صلاح کا حکم دیا جائے، اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین کی اصلاح و درستی فرمادی تو اس کے بعد تم اس میں فساد اور خرابی نہ ڈالو، اس میں زمین کی درستی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری درستی کہ زمین کو کھیتی اور درخت اگانے کے قابل بنایا، اس پر بادلوں سے پانی برسا کر زمین سے پھل پھول نکالے، انسان اور دوسرے جانداروں کے لئے زمین سے ہر قسم کی ضروریات زندگی اور آسائش کے سامان پیدا فرمائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی باطنی اور معنوی اصلاح فرمائی، اس طرح کہ زمین پر اپنے رسول اپنی کتابیں اور ہدایات بھیج کر اس کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مفہوم یعنی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی اصلاح اس آیت میں مراد ہو، تو اب معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ظاہری اور باطنی طور پر درست فرمادیا ہے، اب تم اس میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے فساد نہ مچاؤ، اور خرابی پیدا نہ کرو۔

زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے | جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اسی طرح فساد اور لوگوں کے گناہوں کا اس میں کیخبر | کی بھی دو قسمیں ہیں، زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ پتھر کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جاسکے، ایک درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے، تاکہ انسان اس کو نرم کر کے اس میں کھیتی اور درخت اور پھول پھل اگاسکے، اور کھود کر اس میں کنویں اور خندقیں،

ہنریں بنا سکیں، مکانات کی بنیادیں مستحکم کر سکیں، پھر اس زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا
 فرما دیے جن سے زمین کی آبادی ہو، اس میں سبزی اور درخت اور پھول پھل اُگ سکیں، باہر سے ہوا،
 روشنی، گرمی، سردی پیدا کی، اور پھر بادلوں کے ذریعے اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہو سکیں،
 مختلف ستاروں اور سیاروں کی سرد گرم کرنیں اُن پر ڈالی گئیں، جن سے پھولوں پھلوں میں رنگ اور
 رس بھرے گئے، انسان کو فہم و عقل عطا کی گئی، جس کے ذریعے اس نے زمین سے نکلنے والے خام مواد
 لکڑی، لہا، تانبہ، پتیل، ایلوئیم وغیرہ کے جوڑ توڑ لگا کر مصنوعات کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی، یہ سب
 زمین کی اصلاح ظاہری ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی در روحانی کا مدار ذکر اللہ، تعلق مع اللہ اور اس کی اطاعت پر ہے، اس
 کے لئے اللہ تعالیٰ نے اول تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا
 رکھ دیا ہے فَإِنَّهُمْ مَعَافٍ جُورٌ هَآؤَ تَقْوًا مَّآءَ اور انسان کے گرد و پیش کے ہر ذرے ذرے میں
 اپنی قدرتِ کاملہ اور صنعتِ عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر معمولی فہم و ادراک رکھنے
 والا بھی بول اُٹھے کہ قَسَبَ لَكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَلْقِینَ، اس کے علاوہ اپنے رسول بھیجے ہیں
 نازل فرمائیں جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔
 اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہو گئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس
 زمین کو درست کر دیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے بالمقابل
 فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں، اور اس ارشادِ بانی کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت
 کی گئی ہے۔

اگرچہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی اصلاح
 باطنی ہے، اور اس کے بالمقابل فسادِ باطنی سے روکنا ہے، لیکن اس دنیا میں ظاہر و باطن کے اصلاح
 و فساد میں ایک ایسا ربط ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا موجب بن جاتا ہے، اس لئے
 شریعت قرآن نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی
 منع فرمایا، چوری، ڈاکہ، قتل، اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح
 کا فساد پیدا کرتے ہیں، اس لئے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر
 فرمائی، اور عام گناہوں اور جرائم کو بھی ممنوع قرار دیا، کیونکہ ہر جرم و گناہ کہیں ظاہری فساد
 کا موجب ہوتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب
 بنتا ہے، اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے۔

ظاہری فساد کا باطنی کے لئے مستلزم ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اطاعتِ احکامِ الہیہ کی خلاف ورزی ہے، اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی ہی کا دوسرا نام فسادِ باطنی ہے، البتہ فسادِ باطنی کس طرح فسادِ ظاہری کا سبب بنتا ہے، اس کا پہچاننا کسی قدر غور و فکر کا محتاج ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ سارا جہان اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز سب مملکتِ مملکت کی بتائی ہوئی اور اس کے تابع فرمان ہے، جب تک انسان اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان رہتا ہے تو یہ سب چیزیں انسان کی صحیح صحیح خدمتگار ہوتی ہیں اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے تو دنیا کی ساری چیزیں درپردہ انسان کی نافرمان ہو جاتی ہیں، جس کو بظاہر انسان اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا، لیکن ان چیزوں کے آثار و خواص اور نتائج و فوائد میں غور کرنے سے بدیہی طور پر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ظاہر میں تو یہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے استعمال میں رہتی ہیں، پانی اس کے حلق میں اتر کر تو پیاس بجھانے سے انکار نہیں کرتا، کھانا اس کی بھوک رفع کرنے سے نہیں رکتا، لباس اور مکان اس کی سردی گرمی کی آسائشوں کو مہیا کرنے سے انکار نہیں کرتا۔

لیکن عواقب اور نتائج کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اپنا کام پورا نہیں کر رہی، کیونکہ اصل مقصد ان تمام چیزوں اور ان کے استعمال کا یہ ہے کہ انسان کو آرام و راحت میسر آئے، اس کی پریشانی اور تکلیف دور ہو اور بیماریوں کو شفاء ہو۔

اب دنیا کے حالات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ آجکل سامانِ راحت اور سامانِ شفاء کی زائد از قیاس خسرا دانی کے باوجود انسانوں کی اکثریت انتہائی پریشانیوں اور بیماریوں کا شکار ہے، نئے نئے امراض نئی نئی مصیبتیں برس رہی ہیں، کوئی بڑے سے بڑا انسان اپنی جگہ مطمئن اور آسودہ نہیں ہے، بلکہ جوں جوں یہ سامان بڑھتے جاتے ہیں اسی انداز سے مصائب و آفات اور امراض اور پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“

آج کا انسان جس کو برق و بھاپ اور دوسری مادی رنگینیوں نے مسحور بنا رکھا ہے، ذرا ان چیزوں سے بلند ہو کر سوچے تو اس کو معلوم ہو گا کہ ہماری ساری کوششیں اور ساری مصنوعات و ایجادات ہمارے اصل مقصد یعنی اطمینان و راحت کے حاصل کرنے میں فیل اور ناکام ہیں، اس کی وجہ بجز اس معنوی اور باطنی سبب کے نہیں ہے کہ ہم نے اپنے رب اور مالک کی نافرمانی اختیار کی تو اس کی مخلوقات نے معنوی طور پر ہم سے نافرمانی شروع کر دی۔

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

کہ ہمارے لئے حقیقی آرام و راحت مہیا نہیں کرتی، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند و با من تو مردہ با حق زندہ اند

یعنی دنیا کی یہ سب چیزیں اگر چہ ظاہر میں بے جان و بے شعور نظر آتی ہیں، مگر حقیقت میں اتنا ادراک ان میں بھی ہے کہ مالک کے تابع فرمان کام کرتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب غور سے دیکھا جائے تو ہر گناہ اور خدا تعالیٰ سے غفلت اور اسکی ہر نافرمانی دنیا میں نہ صرف باطنی فساد پیدا کرتی ہے بلکہ ظاہری فساد بھی اس کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے، اسی کو مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے۔

اے نایاب پئے منج زکوة و زنا افتد و باندرجات

اور یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ وہ حقیقت ہے جس پر قرآن و حدیث ناطق ہے، لیکن سزا کا ہلکا سا نمونہ اس دنیا میں امراض، وباؤں، طوفانوں، سیلابوں کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔

اس لئے لَا تُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِہَا، کے مفہوم میں جیسے وہ جرائم اور گناہ

داخل ہیں جن سے ظاہر طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر نافرمانی اور خدا تعالیٰ سے غفلت و معصیت بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے آیت مذکورہ میں اس کے بعد فرمایا وَاذْعُوْهُ خَوْفًا

وَّطَمَعًا، یعنی اللہ تعالیٰ کو پکارو خوف اور امید کے ساتھ، یعنی اس طرح کہ ایک طرف دعا کے ناقابل قبول ہونے کا خوف لگتا ہو اور دوسری طرف اس کی رحمت سے پوری امید بھی لگی ہوئی ہو، اور یہی امید و بیم طریق استقامت میں روح انسانی کے دو بازو ہیں، جن سے وہ پرواز کرتی اور درجات عالیہ حاصل کرتی ہے۔

اور ظاہر اس عبارت سے یہ ہے کہ امید و بیم دونوں مساوی درجہ میں ہونا چاہئے، اور

بعض علماء نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ حیات اور تندرستی کے زمانہ میں خوف کو غالب رکھے تاکہ

اطاعت میں کوتاہی نہ ہو، اور جب موت کا وقت قریب آئے تو امید کو غالب رکھے، کیونکہ اب

عمل کی طاقت رخصت ہو چکی ہے، امید رحمت ہی اس کا عمل رہ گیا ہے۔ (بحر محیط)

اور بعض محققین نے فرمایا کہ اصل مقصد دین کے صحیح راستہ پر قائم رہنا اور اللہ تعالیٰ

کی اطاعت پر مداومت کرنا ہے، اور مزاج و طبائع انسانوں کے مختلف ہوتے ہیں، کسی کو

غلبہ خوف سے یہ مقام استقامت اور دوام طاعت حاصل ہوتا ہے، کسی کو غلبہ محبت و رجا

سے، سو جس کو جس حالت سے اس مقصد میں مدد ملے اس کو حاصل کرنے کی فکر کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا کے دو آداب اس سے پہلی آیت میں بتلائے گئے، ایک عاجزی

اور تضرع کے ساتھ ہونا، دوسرے خفیہ و آہستہ ہونا، یہ دونوں صفتیں انسان کے ظاہر و

سے متعلق ہیں، کیونکہ تضرع سے مراد یہ ہے کہ اپنی ہیئت بوقت دعا عاجزانہ، فقیرانہ بنالے،

منکبرانہ یا بے نیازانہ نہ ہو، اور خفیہ ہونے کا تعلق بھی منہ اور زبان سے ہے۔

اس آیت میں دعا کے لئے دو آداب باطنی اور بظاہر گئے، جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے وہ یہ کہ دعا کرنے والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہئے کہ شاید میری دعا قبول نہ ہو، اور امید بھی ہونی چاہئے کہ میری دعا قبول ہو سکتی ہے، کیونکہ اپنی خطاؤں اور گناہوں سے بے فکر ہو جانا بھی ایمان کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے، قبولیت دعا کی جب ہی توقع کی جاسکتی ہے جبکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان درمیان رہے۔

پھر آخر آیت میں فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعا خوف اور امید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہئیں، لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی کی جانب رائج ہے، کیونکہ رب العالمین اور رحیم الرحماء کے جو دو احسان میں نہ کوئی کمی ہے نہ بخل، وہ ہر سے سے برے انسان بلکہ شیطان کی بھی دعا قبول کر سکتا ہے، ہاں اگر عدم قبولیت کا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ اپنی بد اعمالی اور گناہوں کی نحوست سے ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لئے محسن یعنی نیک عمل ہونا درکار ہے۔

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، اور اپنی ہیئت فقیرانہ بناتے ہیں، اور اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، مگر ان کا کھانا، ... بھی حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے اور لباس بھی حرام کا ہے، سو ایسے آدمی کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہو۔ (مسلم ترمذی، عن ابی ہریرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، اور جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرام نے دریافت کیا، جلد بازی کا کیا مطلب ہے، آپ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصہ سے دعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی، یہاں تک کہ مایوس ہو کر دعا چھوڑ دے (مسلم ترمذی)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

مراد یہ ہے کہ رحمت خداوندی کی وسعت کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جاؤ کہ میری دعا ضرور قبول ہوگی، یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کے شامت کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعا کی قبولیت میں آڑے آجائیں، صلی اللہ تعالیٰ علی نبینا وسلم۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ

اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوش خبری لانے والی میٹھ سے پہلے یہاں تک کہ

إِذَا أَقْلَتْ سَحَابًا ثَقَالًا سَقْنَاهُ لِبَدِكُمْ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ

جب وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بھاری بادلوں کو تو ہاتھ دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم

فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ

اُتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل، اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ

تَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ

تم غور کرو، اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے،

وَالَّذِي خَبَتْ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ

اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص، یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں

لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٩﴾

حق ماننے والے لوگوں کو

خلاصہ تفسیر

اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی

امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم

اس بادل کو کسی خشک زمین کی طرف ہاتھ لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں، پھر اس

پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ مردوں کو زندہ

کرنے کی ثابت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا) یوں ہی (قیامت کے روز) ہم مردوں کو (زمین سے)

نکال کھڑا کریں گے (یہ سب اس لئے سنایا) تاکہ تم سمجھو (اور قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ہدایت اگرچہ سب کے لئے عام ہے مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے کم لوگ ہوتے ہیں اس کی

مثال اسی بارش سے سمجھ لو کہ بارش تو ہر زمین پر برسی ہے، مگر کھیتی اور درخت ہر جگہ نہیں پیدا ہوتے

صرف اُن زمینوں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہی، اسی لئے فرمایا کہ) جو زمین ستھری ہوتی ہو اسکی پیداوار تو

خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی تو) بہت کم نکلتی ہے اسی طرح ہم (ہمیشہ)

دلائل کو طح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں (مگر وہ سب) اپنی لوگوں کیلئے (نافع ہوتے ہیں) جو (ان کی) قدر کرتے ہیں

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی خاص خاص اور بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، جس میں آسمان زمین، رات دن، چاند سورج اور عام ستاروں کی پیدائش اور ان کا انسان کی ضروریات مہیا کرنے اور اس کی خدمت میں لگے رہنے کا تذکرہ کر کے اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جب ہماری ساری ضروریات اور ساری راحتوں کا سامان کرنے والی ایک ذات پاک ہے، تو ہر حاجت و ضرورت میں ہمیں دعا و درخواست بھی اسی سے کرنا چاہئے، اور اسی کی طرف رجوع کرنے کو اپنے لئے تعلید کا میا بنی سمجھنا چاہئے۔

مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی آیت میں بھی اسی قسم کی اہم اور بڑی نعمتوں کا ذکر ہے، جن پر انسان اور زمین کی کُل مخلوقات کی حیات و بقاء کا مدار ہے، مثلاً بارش اور اس سے پیدا ہونے والے درخت اور کھیتیاں، ترکاریاں وغیرہ، فرق یہ ہے کہ پچھلی آیات میں نعمتوں کا ذکر تھا جو عالم علوی سے متعلق ہیں، اور اس میں ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جو عالم سفلی سے متعلق ہیں (بحر محیط) اور دوسری آیت میں ایک خاص بات یہ بتلائی گئی ہے کہ ہماری یہ عظیم الشان نعمتیں اگرچہ زمین کے ہر حصہ پر عام ہیں، بارش جب برستی ہے تو دریا پر بھی برستی ہے پہاڑ پر بھی، بنجر اور خراب زمین اور عمدہ اور بہتر زمین سب پر یکساں برستی ہے، لیکن کھیتی، درخت، سبزی صرف اسی زمین میں پیدا ہوتی ہے جس میں اگانے کی صلاحیت ہے، پتھر لی اور ریتلی زمینیں اس بارش کے فیض سے مستفید نہیں ہوتیں۔

پہلی آیت سے یہ نتیجہ نکال کر بتلایا گیا کہ جو ذات پاک مردہ زمین میں نشوونما کی زندگی عطا فرمادیتی ہے، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ جو انسان پہلے سے زندہ تھے پھر مر گئے، ان میں دوبارہ زندگی پیدا فرمادے، اسی نتیجہ کو اس آیت میں واضح طور پر بتلادیا گیا، اور دوسری آیت سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت، آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام پھر ان کے نائب علماء و مشائخ کی تعلیم و تربیت بھی بارش کی طرح ہر انسان کے لئے عام ہے، مگر جس طرح باران رحمت سے ہر زمین فائدہ نہیں اٹھاتی، اسی طرح اس روحانی بارش کا... فائدہ بھی صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے، اور جن لوگوں کے قلوب پتھر لی یا ریتلی زمین کی طرح نشوونما کی قابلیت نہیں رکھتے وہ تمام واضح ہدایات اور آیات بینات کے باوجود اپنی گمراہی پر جھے رہتے ہیں۔

اس نتیجہ کی طرف دوسری آیت کے آخری جملہ سے اشارہ فرمایا گئی اِلَکْ نُصَرِّفُ

اَلَا يَتَذَكَّرُ لِقَوْمٍ يُشْكِرُونَ یعنی ہم اسی طرح اپنے دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو قد کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگرچہ فی الواقع یہ بیان تو سب ہی کے لئے تھا مگر نتیجہ کے طور پر مفید ہونا اپنی لوگوں کے لئے ثابت ہوا جن میں اس کی صلاحیت ہے، اور وہ اس کی قدر و منزلت پہچانتے ہیں، اس طرح مذکورہ دو آیتیں مبادی و معاد کے اہم مسائل پر مشتمل ہو گئیں، اب ان دونوں آیتوں کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لئے سنئے، پہلی آیت میں ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا لِّبَنِينَ يَدَّعٰى رَحْمَتَهُ اس میں ریاح ریح کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ہوا، اور بُشْرَا کے معنی بشارت اور خوش خبری، اور رحمت مراد باران رحمت ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہی جو بھیجتا ہے باران رحمت پہلے ہوائیں خوش خبری دینے کے لئے۔

مطلب یہ ہے کہ عام عارۃ اللہ یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت و بشارت ہوتی ہے، اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر بھی پہلے دیدیتی ہیں، اس لئے یہ ہوائیں دو نعمتوں کا مجموعہ ہے، خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لئے نافع و مفید ہیں، اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خبر بھی دیدیتی ہیں، کیونکہ انسان ایک لطیف اور نازک مخلوق ہے کہ اس کی بہت سی ضروریات بارش کی وجہ سے بند ہو جاتی ہیں، جب بارش کی اطلاع کچھ پہلے مل جائے تو وہ اپنا انتظام کر لیتا ہے، اس کے علاوہ خود اس کا وجود اور اس کا سامان بارش کا متحمل نہیں، وہ بارش کے آثار دیکھ کر اپنے سامان اور اپنی جان کی حفاظت کا سامان کر لیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: حَتّٰی اِذَا آتٰی السَّحَابَ ثِقَالًا، سحاب کے معنی بادل اور ثِقَال ثقیل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بھاری، یعنی جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں بھاری بادلوں سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں، جو ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو کر اوپر جاتے ہیں، اور اس طرح یہ ہزاروں من کا وزنی پانی ہوا پر سوار ہو کر اوپر پہنچ جاتا ہے، اور حیرت انگیز یہ بات ہے کہ نہ اس میں کوئی مشین کام کرتی ہے نہ کوئی انسان اس میں محنت کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جاتا ہے تو خود بخود دریا سے بخارات (مان سون) اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، اور اوپر جا کر بادل بنتا ہے، اور یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں گیلن پانی سے بھرا ہو جاتا ہے خود بخود ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: لِيَبْلُغَ مَتْنٰتٍ، سَوَاق کے معنی کسی جانور کو ہانکنے اور چلانے کے ہیں، اور بَلَد کے معنی شہر اور بستی کے ہیں، مَتْنٰت کے معنی مردہ۔

معنی یہ ہیں کہ جب ہواؤں نے بھاری بادلوں کو اٹھا لیا تو ہم نے ان بادلوں کو ہانک دیا، ایک مرے ہوئے شہر کی طرف « مرے ہوئے شہر سے مراد وہ بستی ہے جو پانی نہ ہونے کے سبب ویران ہو رہی ہے، اور اس جگہ بجائے عام زمین کے خصوصیت سے شہر اور بستی کا

ذکر کرنا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد برق و باران اور ان سے زمین کی سیرابی کا انسان کی ضروریات مہیا کرنا ہے جس کا مسکن شہر ہو، ورنہ جنگل کی سرسبزی خود کوئی مقصد نہیں۔

یہاں تک آیت مذکورہ کے مضمون سے چند اہم چیزیں ثابت ہوئیں؛ اول یہ کہ بارش بادلوں سے برستی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیات میں آسمان سے بارش برسنے کا ذکر ہے وہاں بھی لفظ سماء سے بادل مراد ہے، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت دریائی مان سون کی بجائے براہ راست آسمان سے بادل پیدا ہو جائیں اور ان سے بارش ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ بادلوں کا کسی خاص سمت اور خاص زمین کی طرف جانا یہ براہ راست حکیم خداوندی سے متعلق ہے وہ جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں جس قدر چاہتے ہیں بارش برسانے کا حکم دیدیتے ہیں، بادل فرمان الہی کی تعمیل کرتے ہیں۔

اس کا مشاہدہ ہر جگہ اس طرح ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات کسی شہر یا بستی پر بادل چھایا رہتا ہے، اور وہاں بارش کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن وہ بادل یہاں ایک قطرہ پانی کا نہیں دیتا، بلکہ جس شہر یا بستی کا کوٹہ بحکم الہی مقرر ہو چکا ہے وہیں جا کر برستا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس شہر کے علاوہ کسی اور جگہ اس بادل کا پانی حاصل کر لے۔

قدیم و جدید فلاسفہ نے مان سون اور ہواؤں کی حرکت کے لئے کچھ ضابطے اور اصول نکال رکھے ہیں، جن کے ذریعہ وہ بتلا دیتے ہیں کہ فلاں مان سون جو فلاں سمت سے اٹھا، کس طرف جائے گا، کہاں جا کر برے گا، کتنا پانی برساے گا، عام ممالک میں موسمیات کے محکمے اسی قسم کی معلومات مہیا کرنے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ محکمہ موسمیات کی دی ہوئی خبریں بکثرت غلط ہو جاتی ہیں، اور جب امر الہی ان کے خلاف ہوتا ہے تو ان کے سارے ضابطے قاعدے دھرے رہ جاتے ہیں، ہوائیں اور مان سون اپنا رخ ان کی دی ہوئی خبروں کے خلاف کسی دوسرے سمت کو پھیر لیتی ہیں، اور موسمیات کے محکمے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جو ضابطے قاعدے ہواؤں کی حرکت کے لئے فلاسفہ نے تجویز کئے ہیں وہ بھی کچھ اس کے منافی نہیں ہیں کہ بادلوں کا حمل و نقل فرمان الہی کے تابع ہے، کیونکہ عادت اللہ تعالیٰ کی اس عالم کے تمام کار و بار میں یہی ہے کہ حکم خداوندی اسباب طبعیہ کے پردوں میں ظاہر ہوتا ہے، ان اسباب طبعیہ سے انسان کوئی ضابطہ قاعدہ بنا لیتا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو حافظ شیرازی نے بتلائی ہے کہ

کار زلف نیست مشک افشانی آما عاشقان و مصلحت را ہمتی برآہوے چیں بستہ اند
اس کے بعد ارشاد فرمایا فَاَنْزَلْنَا مِنْهُ الْمَاءَ فَاَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ، یعنی

ہم نے اس مردہ شہر میں پانی برسایا پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پھول نکالے۔
 آخر آیت میں ارشاد فرمایا کَذٰلِكَ نَخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، یعنی ہم اسی طرح
 نکالیں گے مردوں کو قیامت کے روز شاید تم سمجھو مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے مردہ زمین کو زندہ
 کیا اور اس میں سے درخت اور پھل پھول نکالے اسی طرح ہر روز قیامت مردوں کو دوبارہ زندہ کر کے
 نکال کھڑا کریں گے، اور یہ مثالیں ہم نے اس لئے بیان کی ہیں کہ تمہیں سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملے۔
 ہر دایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں
 صورتوں کا مرتبہ پھونکا جائے گا، پہلے صورت پر تمام عالم فنا ہو جائے گا کوئی چیز زندہ باقی نہ رہے گی، اور دوسری
 صورت پر پھر از سر نو نیا عالم پیدا ہوگا، اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے، حدیث مذکور میں ہے کہ ان دونوں
 مرتبہ کے صورتوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اور ان چالیس سال میں مسلسل بارش ہوتی رہے گی،
 اسی عرصہ میں ہر مردہ انسان اور جانور کے اجزاء بدن اس کے ساتھ جمع کر کے ہر ایک کا مکمل ڈھانچہ
 بن جائے گا، اور پھر دوسری مرتبہ صورت پھونکنے کے وقت ان لاشوں کے اندر روح آجائے گی، اور زندہ
 ہو کر کھڑے ہو جائیں گے، اس روایت کا اکثر حصہ بخاری و مسلم میں موجود ہے، بعض اجزاء ابن ماجہ
 کی کتاب البعث سے لئے گئے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرِجُ إِلَّا فَكًا ۚ نَّكَدْ كَہتے ہیں اُس چیز کو جو بے فائدہ بھی ہو اور پھر مقدار میں بھی
 قلیل ہو، معنی یہ ہیں کہ اگرچہ باران رحمت کا فیض ہر شہر ہر زمین پر یکساں ہوتا ہے، لیکن نتائج
 اور ثمرات کے اعتبار سے زمین کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک عمدہ اور اچھی زمین جس میں نشوونما کی
 صلاحیت ہے، اس میں تو ہر طرح کے پھول پھل نکلتے ہیں اور فوائد حاصل ہوتے ہیں، دوسری
 وہ سخت یا کھاری زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت نہیں، اس میں اول تو کچھ پیدا ہی نہیں
 ہوتا، پھر اگر کچھ ہوا بھی تو وہ بہت کم مقدار میں ہوتا ہے، اور جتنا پیدا ہوتا ہے وہ بھی بیکار اور
 خراب ہوتا ہے۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ، یعنی ہم اپنے
 دلائل قدرت طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو قدر کرنے والے ہیں۔
 اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ باران رحمت کے فیضان عام کی طرح ہر دایت ربانی اور آیات نبی
 کا فیض بھی سب ہی انسانوں کے لئے عام ہے، مگر جس طرح ہر زمین بارش سے فائدہ نہیں اٹھاتی
 اسی طرح ہر انسان ہر دایت ربانی سے نفع حاصل نہیں کرتا، بلکہ نفع صرف وہ لوگ حاصل کرتے
 ہیں جو شکر گزار اور قدر شناس ہیں۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ

بیشک بھیجا ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی

مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ

کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، میں خوف کرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کے

عَظِيمٍ ۝۵۹ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلٰلٍ

عذاب ہے۔ بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح

مُبِينٍ ۝۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلٰلَةٌ ۖ وَلٰكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ

بہکا ہوا۔ بولا اے میری قوم میں ہرگز بہکا نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں

رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحْ لَكُمْ وَاَعْلَمُ

جہان کے پروردگار کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں

مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲ اَوْ عَجِبْتُمْ اَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ

اللہ کی طرف سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے

رَبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۶۳

رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم ہو۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهُۥ فِي الْفُلْكِ وَاَعْرَقْنَا

پھر انہوں نے اُس کو جھٹلایا پھر ہم نے بچالیا اُس کو اور اُن کو کہ جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور غرق کر دیا

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عٰمِيْنَ ۝۶۴

ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو، بیشک وہ لوگ تھے اندھے۔

خلاصہ تفسیر

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) ان کی قوم کی طرف بھیجا سوا انہوں نے (اس قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بتوں کی پرستش چھوڑ دو جن کا نام سورۃ نوح میں ہے وَدُّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) مجھ کو تمہارے لئے (در صورت میرا کہنا نہ ماننے کے) ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (کہ وہ یوم قیامت ہے

یا یوم طوفان) ان کی قوم کے ابرو دار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں (بتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب کا ڈراوا دکھا رہے ہو) انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ اے میری قوم تجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (انہوں نے تجھ کو توحید پہنچانے کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور احکام) پہنچاتا ہوں (اور اس پہنچانے میں میری کوئی دنیوی غرض نہیں بلکہ محض تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں) (کیونکہ توحید میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (عذاب یوم عظیم سے جو تم کو تعجب ہوتا ہے تو تمہاری غلطی ہے کیونکہ) میں خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں (تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتلادیا ہے کہ ایمان نہ لانے سے عذاب یوم عظیم واقع ہوگا) اور (تم کو جو میرے رسول ہونے پر بوجہ میرے بشر ہونے کے انکار ہے جیسا سورہ مؤمنون میں تصریح ہے مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً لَوْ كُنْتُمْ مُعْتَبِرِينَ) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات یہی ہے جو مذکور ہوئی يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ لِيُقْبَلَنَّ مِنْكُمْ خُفْيَا وَنَجْوَا) تاکہ وہ شخص تم کو (بحکم خداوندی عذاب سے) ڈراوے اور تاکہ تم (اس کے ڈرانے سے) ڈر جاؤ اور تاکہ (ڈرنے کی وجہ سے مخالفت چھوڑ دو جس سے) تم پر رحم کیا جائے سو (باوجود اس تمام تر فہمائش کے) وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (طوفان کے عذاب سے) بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے (طوفان میں) غرق کر دیا بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے (حق و باطل، نفع و نقصان کچھ نہ سوچتا تھا)۔

معارف و مسائل

سورہ اعراف کے شروع سے یہاں تک اصول اسلام توحید، رسالت، آخرت کا مختلف عنوانات اور دلائل سے اثبات اور لوگوں کو اتباع کی ترغیب اور اس کی مخالفت پر وعید اور ترہیب اور اس کے ضمن میں شیطان کے گمراہ کن مکر و فریب وغیرہ کا بیان تھا اب آٹھویں رکوع سے تقریباً آخر سورت تک چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر ہے جس میں تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طور پر اصول مذکورہ توحید و رسالت، آخرت کی طرف اپنی اپنی امتوں کو دعوت دینا اور ماننے والوں کے اجر و ثواب اور نہ ماننے والوں پر طرح طرح کے

عذاب اور ان کے انجام بد کا مفصل بیان تقریباً چودہ رکوع میں آیا ہے جس کے ضمن میں سیکڑوں اصولی اور فروعی مسائل بھی آگئے ہیں۔ اور موجودہ اقوام کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا سامان ہو گیا کہ پہلے سب رسولوں کے ساتھ ایسے ہی معاملات ہوتے رہے ہیں۔

آیات مذکورہ سورۃ اعراف کا آٹھواں رکوع پورا ہے۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی اُمت کے حالات و مقالات کا بیان ہے۔

سلسلہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی اگرچہ آدم علیہ السلام ہیں۔ لیکن اُن کے زمانہ میں کفر و ضلالت کا مقابلہ نہ تھا اُن کی شریعت میں زیادہ تر احکام بھی زمین کی آباد کاری اور انسانی ضروریات کے متعلق تھے کفر اور کافر کہیں موجود نہ تھے۔ کفر و شرک کا مقابلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا۔ اور رسالت و شریعت کی حیثیت سے دنیا میں وہ سب سے پہلے رسول ہیں۔ اس کے علاوہ طوفان میں پوری دنیا غرق ہو جانے کے بعد جو لوگ باقی رہے وہ حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے رفقاء سفینہ تھے اُنھیں سے نئی دنیا آباد ہوئی اسی لئے اُن کو آدم اصغر کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصص انبیاء کا آغاز بھی انہیں سے کیا گیا ہے جس میں ساڑھے نو سو برس کی طویل عمر میں اُن کی پیغمبرانہ جدوجہد اور اس پر اکثر اُمت کی کج روی اور اس کے نتیجہ میں بجز تھوڑے سے مؤمنین کے باقی سب کا غرق ہونا بیان ہوا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے لَقَدْ اَمَرْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ۔

نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہیں۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے (تفسیر مظہری) قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہو گیا۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھپیس سال بعد ہوئی ہے اور تفسیر قرآن ان کی عمر نو سو پچاس سال ہوئی۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپیس سال ہو جاتے ہیں (مظہری) نوح علیہ السلام کا اہلی نام شاکر

لے یہ مدت مظہری (ص ۳۶ ج ۳) سے لی گئی ہے، لیکن بظاہر اس کے حساب میں غلطی ہوئی ہے خود مظہری کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق حضرت نوحؑ کی کل عمر ۱۰۵۰ سال ہوئی، (کیونکہ ۹۵۰ سال جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبوت کے بعد اور طوفان سے پہلے کی مدت پر مشتمل ہیں، نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی، اور طوفان کے بعد بھی وہ ساٹھ سال زندہ رہے) اس طرح کل مدت ۲۸۵۶ کے بجائے ۲۸۳۶ سال بنتی ہے، اور اگر حضرت نوحؑ کی کل عمر ۱۰۵۰ کے بجائے ۹۵۰ قرار دی جائے، جیسا کہ مصنف نے ذکر کیا ہے تو کل مدت ۲۸۳۶ قرار پاتی ہے۔ محمد تقی عثمانی - ۱۲/۷/۱۳۲۵ھ

اور بعض روایات میں سُنْکُن اور بعض میں عبد الغفار آیا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام سے پہلے ہے یا بعد میں۔ اکثر صحابہ کا قول یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام سے پہلے ہیں (بحر محیط)۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی۔ اور طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔

آیت قرآن لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ سے ثابت ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت و نبوت صرف اپنی قوم کے لئے تھی ساری دنیا کے لئے عام نہ تھی اور ان کی قوم عراق میں آباد بظاہر مہذب مگر شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ یہ تھی لِيَقُومُوا عِبَادًا لِلَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ۚ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ اس کے پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت ہے جو اصل اصول ہے۔ دوسرے جملہ میں شرک و کفر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے جو اس قوم میں دیوار کی طرح پھیل گیا تھا۔ تیسرے جملہ میں اُس عذاب عظیم کے خطرہ سے آگاہ کرنا ہے جو خلاف ورزی کی صورت میں ان کو پیش آنے والا ہے۔ اس عذاب عظیم سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں طوفان کا عذاب بھی۔ (کبیر) ان کی قوم نے اس کے جواب میں کہا۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ لفظ ملأ قوم کے سرداروں اور برادریوں کے چودھریوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کے دین سے ہم کو نکالنا چاہتے ہیں اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور جزا و سزا پانے کے خیالات یہ سب اولیام ہیں۔ اس دل آزار و دغرائش گفتگو کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے پیغمبرانہ لہجہ میں جو جواب دیا وہ مبلغین اور مصلحین کے لئے ایک اہم تعلیم اور ہدایت ہے کہ اشتغال کی بات پر مشغول اور غضبناک ہونے کے بجائے۔ سادہ لفظوں میں ان کے شبہات کا ازالہ فرما رہے ہیں۔ قَالَ لِيَقُومُوا لِيْسَ فِي ضَلَالَةٍ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَبْلِغُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

یعنی اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں مگر بات یہ ہے کہ میں تمہاری طرح آبائی رسوم جہالت کا پابند نہیں بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں جو کچھ کہتا ہوں ہدایات ربی سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچاتا ہوں جس میں تمہارا ہی بھلا ہے نہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ اور نہ میری کوئی غرض۔ اس میں رب العالمین کا لفظ عقیدہ شرک پر ضرب کاری ہے کہ اس میں غور کرنے کے بعد نہ کوئی دیوی اور دیوتا ٹھہر سکتا ہے نہ کوئی یزدان و اہرن۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم کو جو قیامت کے عذاب میں شبہات ہیں اُس کی وجہ تمہاری بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کا علم یقین دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے دوسرے شبہ کا جواب ہے جو سورہ مؤمنون میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً لَّا يَكُونُ لَكُمْ عَلَيْهِ السَّلَامُ کی دعوت پر ایک شبہ یہ بھی کیا کہ یہ تو ہماری ہی طرح ایک بشر اور انسان ہیں ہماری ہی طرح کھاتے پیتے سوتے جاگتے ہیں ان کو ہم کیسے اپنا مقتدا مان لیں اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے لئے کوئی پیغام بھیجنا تھا تو وہ فرشتوں کو بھیجتے جن کا امتیاز اور بڑائی ہم سب پر واضح ہوتی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ہماری قوم اور نسل کا ایک آدمی ہم پر اپنا تفوق اور بڑائی قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں فرمایا اَوْ عَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّثْلِكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ یعنی کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے رب کا پیغام تمہاری طرف ایک ایسے شخص کی معرفت آیا جو تمہاری ہی جنس کا ہے تاکہ وہ تمہیں ڈراوے اور تاکہ تم ڈرجاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یعنی اُس کے ڈرانے سے تم متنبہ ہو کر مخالفت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تم پر رحمت نازل ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بشر کو رسول بنایا جائے۔ اول تو حق تعالیٰ مختار مطلق ہیں جس کو چاہیں اپنی نبوت و رسالت عطا فرمائیں اس میں کسی کو چوں چرا کی مجال نہیں۔ اس کے علاوہ اصل معاملہ پر غور کرو تو واضح ہو جائے کہ عام انسانوں کی طرف رسالت و نبوت کا مقصد بشر ہی کے ذریعہ پورا ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اصل مقصد رسالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عبادت پر لوگوں کو قائم کر دیا جائے اور اُس کے احکام کی مخالفت سے بچایا جائے۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان کی جنس بشر کا کوئی شخص نمونہ عمل بن کر ان کو دکھلائے کہ بشری تقاضوں اور خواہشوں

کے ساتھ بھی احکام الہیہ کی اطاعت اور اس کی عبادت جمع ہو سکتی ہے۔ اگر فرشتے یہ دعوت لے کر آتے اور اپنی مثال لوگوں کے سامنے رکھتے تو سب لوگوں کا یہ عذر ظاہر تھا کہ فرشتے تو بشری خواہشات سے پاک ہیں نہ اُن کو بھوک پیاس لگتی ہے نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے اُن کی طرح ہم کیسے بن جائیں۔ لیکن جب اپنا ہی ایک ہم جنس بشر تمام بشری خواہشات اور خصوصیات رکھنے کے باوجود اُن احکام الہیہ کی مکمل اطاعت کر کے دکھلائے تو اُن کے لئے کوئی عذر نہیں رہ سکتا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا لَیْسَ ذَکُّوْا وَلَیْسَ تَقْوَا۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے ڈرانے سے متاثر ہو کر لوگ ڈر جائیں وہ وہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہم جنس اور ان کی طرح بشری خصوصیات کا جامع ہو۔ یہ شبہ اکثر امتوں کے کفار نے پیش کیا کہ کوئی بشر نبی اور رسول نہیں ہونا چاہئے اور قرآن نے سب کا یہی جواب دیا ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن کی اتنی تصریحات کے باوجود آج بھی کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرنے کی جرات کرتے ہیں۔ مگر جاہل انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ کسی اپنے ہم جنس کی برتری کو تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ہم عصر اولیاء اور علماء سے ان کی معاشرت کی بنا پر نفرت و حقارت کا برتاؤ جاہلوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

قوم نوح علیہ السلام کے دل خراش کلام کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا یہ مشفقانہ اور ناصحانہ رویہ بھی ان کی بے حس قوم پر اثر انداز نہ ہوا بلکہ اندھے بن کر جھٹلانے ہی میں لگے رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا۔ ارشاد فرمایا۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلِّ وَأَعْرَضْنَا الَّذِينَ كَذَبُوا بآيَاتِنَا أَنْهُمْ
كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ۔ یعنی نوح علیہ السلام کی ظالم قوم نے ان کی نصیحت و خیر خواہی کی کوئی پروا
نہ کی اور برابر اپنی تکذیب پر جمع رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے
ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کر کے طوفان سے نجات دے دی اور جن لوگوں نے ہماری
آیات کو جھٹلایا تھا ان کو غرق کر دیا۔ بے شک یہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اور اُن کی قوم کی غرقابی اور کشتی والوں کی نجات کی پوری تفصیل سورہ نوح اور سورہ ہود میں آئے گی۔ اس جگہ بتقاضائے مقام اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب اُس وقت آیا جب کہ وہ اپنی کثرت و قوت کے اعتبار سے بھرپور تھے۔ عراق کی زمین اور اس کے پہاڑ اُن کی کثرت کے سبب تنگ ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور رہا ہے کہ نافرمان لوگوں کو

ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ عذاب اُس وقت بھیجتے ہیں جب وہ اپنی کثرت، قوت اور دولت میں انتہا کو پہنچ جائیں اور اس میں بدست ہو جائیں۔ (ابن کثیر)

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں کتنے آدمی تھے اس میں روایات مختلف ہیں۔ ابن کثیر نے بروایت ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انسی آدمی تھے جن میں ایک کا نام جُرہم تھا یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض روایات میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ انسی کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اُس بستی کا نام ثمانون مشہور ہو گیا۔

غرض اس جگہ نوح علیہ السلام کا مختصر قصہ بیان فرما کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ تمام انبیاء قدیم کی دعوت اور اصول عقائد ایک ہی تھے۔ دوسرے یہ بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی تائید و حمایت کس طرح حیرت انگیز طریقہ پر کرتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے طوفان میں بھی ان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب عذاب الہی کو دعوت دینا ہے جس طرح پچھلی امتیں تکذیب انبیاء کے سبب عذاب میں گرفتار ہو گئیں آج کے لوگوں کو بھی اُس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔

وَالِی عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا ط قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ

اور قوم عاد کی طرف بھیجا اُن کے بھائی ہود کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

إِلَٰهِ غَيْرُهُ ط أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۵﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِیْنَ کَفَرُوا مِنِّ

معبود اس کے سوا، سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ بولے سردار جو کافر تھے اُس

قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرٰکَ فِی سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ﴿۱۶﴾

کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عفتل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

قَالَ یَقَوْمِ لَیْسَ بِی سَفَاهَةٌ وَلٰکِنِّی رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ

بولا اے میری قوم میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۷﴾ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلَتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَکُمْ نٰصِیْحٌ اٰمِیْنٌ ﴿۱۸﴾

عالم کا۔ پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اطمینان کے لائق۔

أَوْحَيْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ

کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ تم کو ڈرائے،

وَإِذْ كُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي

اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار کر دیا نیچے قوم نوح کے اور زیادہ کر دیا تمہارے

الْخَلْقِ بَصْطَةً ۖ فَادْكُرُوا الْآءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا

بدن کا پھیلاؤ، سو یاد کرو اللہ کے احسان تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ بولے

أَجِئْنَا لِنُعْبِدَ اللَّهَ وَنَذَرُ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا

کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ کی اور چھوڑ دیں جن کو بلوجتے رہے ہمارے باپ دادے،

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ

پس تو لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے۔ کہا تم پر واقع

عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءِ

ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ، کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ

سَمِيئَتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ

رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے، نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند،

فَأَنْتَظِرُونِي مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظَرِينَ ﴿٧١﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ

سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ پھر ہم نے بچا لیا اُس کو اور جو

مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَّعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور جڑ کاٹی ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو

وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٧٢﴾

اور نہیں مانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی (حضرت) ہود (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اسے میری قوم تم (صرف) اللہ کی

عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بت پرستی چھوڑ دو جیسا آگے وَنَذَرُ مَا كَانُوا يَعْبُدُونَ اَبَاؤُنَا سے معلوم ہوتا ہے) سو کیا تم (ایسے بڑے جرم عظیم یعنی شرک کے مرتکب ہو کر عذاب الہی سے) نہیں ڈرتے ان کی قوم میں جو آبرو دار لوگ کافر تھے انہوں نے (جواب میں) کہا کہ ہم تم کو کم عقلی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب سے ڈرا رہے ہو) اور ہم بیشک تم کو جھوٹے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں (یعنی نعوذ باللہ نہ تو توحید صحیح مسئلہ ہے اور نہ عذاب کا اتنا صحیح ہے) انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں (انہوں نے مجھ کو تعلیم توحید اور انذار عذاب کا حکم کیا ہے اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور احکام) پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ امانت دار ہوں (کیونکہ توحید و ایمان میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (تم جو میرے بشر ہونے سے میری نبوت کا انکار کرتے ہو جیسا سورۃ ابراہیم میں بعد ذکر قوم نوح و عاد و ثمود کے ہے قَالُوا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اور سورۃ فصلت میں بعد ذکر عاد و ثمود کے ہے قَالُوا الْوَسْءُ رَبَّنَا لَا تَنْزِلْ مَلٰٓئِكَةً اِلَیْہِمْ تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات وہی ہے جو مذکور ہوئی یَقُومُوا عِبَادُوا اللّٰہَ اِلٰی قَوْلِہٖ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) تاکہ وہ شخص تم کو (عذاب الہی سے) ڈراوے (یعنی یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیا بشریت و نبوت میں منافاة ہے اوپر اَفَلَا تَتَّقُوْنَ میں ترہیب تھی آگے ترغیب ہے) اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ (بھی) زیادہ دیا سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) تاکہ تم کو (ہر طرح کی) فلاح ہو وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا (خوب) آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کیا کریں اور جن (بتوں) کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ہم ان (کی عبادت) کو چھوڑ دیں (یعنی ہم ایسا نہ کریں گے) اور ہم کو (نہ ماننے پر) جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو (جیسا اَفَلَا تَتَّقُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے) اس (عذاب) کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو انہوں نے فرمایا کہ (تمہاری سرکشی کی جب یہ حالت ہے تو) بس اب تم پر خدا کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے (پس عذاب کے شبہ کا جواب تو اس وقت معلوم ہو جائے گا اور باقی توحید پر جو شبہ ہے کہ ان بتوں کو معبود کہتے ہو جن کا نام تو تم نے معبود

رکھ لیا ہے، لیکن واقع میں ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل ہی نہیں تو کیا تم مجھ سے ایسے (بے حقیقت) ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو (یعنی وہ مسمیات بمنزلہ بعض اسماء کے ہیں) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرایا ہے (لیکن) ان کے معبود ہونے کی خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل (نقلی یا عقلی) نہیں بھیجی (یعنی جدال میں مدعی کے ذمہ دلیل ہے اور مقابل کی دلیل کا جواب بھی، سو تم نہ دلیل قائم کر سکتے ہو نہ میری دلیل کا جواب دے سکتے ہو پھر جدال کا کیا معنی) سو تم (اب جدال ختم کرو اور عذاب الہی کے) منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں غرض (عذاب آیا اور) ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (یعنی مؤمنین کو) اپنی رحمت (و کرم) سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ تک کاٹ دی (یعنی بالکل ہلاک کر دیا) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ (بوجہ غایت قساوت کے) ایمان لانے والے نہ تھے (یعنی اگر ہلاک بھی نہ ہوتے جب بھی ایمان نہ لاتے اس لئے ہم نے بمقتضائے اس وقت کی حکمت کے خاتمہ ہی کر دیا)۔

معارف و مسائل

عاد اور ثمود کی مختصر تاریخ | عاد اصل میں ایک شخص کا نام ہے جو نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور ان کے بیٹے سام کی اولاد میں ہے۔ پھر اس شخص کی اولاد اور پوری قوم عاد کے نام سے مشہور ہو گئی۔ قرآن کریم میں عاد کی ساتھ کہیں لفظ عاد اولیٰ اور کہیں اَرم ذات الجہاد بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کو اَرم بھی کہا جاتا ہے۔ اور عاد اولیٰ کے مقابلہ میں کوئی عاد ثانیہ بھی ہے، اس کی تحقیق میں مفسرین اور مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہے کہ عاد کے دادا کا نام اَرم ہے اس کے ایک بیٹے یعنی عوص کی اولاد میں عاد ہے یہ عاد اولیٰ کہلاتا ہے اور دوسرے بیٹے جثو کا بیٹا ثمود ہے یہ عاد ثانی کہلاتا ہے۔ اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ عاد اور ثمود دونوں اَرم کی دوشاخیں ہیں۔ ایک شاخ کو عاد اولیٰ اور دوسری کو ثمود یا عاد ثانیہ بھی کہا جاتا ہے اور لفظ اَرم عاد و ثمود دونوں کے لئے مشترک ہے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قوم عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اُس کو عاد اُخریٰ کہتے ہیں۔ (بیان القرآن) اور ثمود علیہ السلام ایک نبی کا نام ہے یہ بھی نوح علیہ السلام کی پانچویں نسل اور سام کی اولاد میں ہیں قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ چوتھی پشت میں سام پر

جمع ہو جاتا ہے اس لئے ہود علیہ السلام عاد کے نبی بھائی ہیں اسی لئے اَخَاهُمْ ھُوْدًا فرمایا گیا۔ قوم عاد کے تیرہ خاندان تھے۔ عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک ان کی بستیاں تھیں۔ ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں ہر قسم کے باغات تھے۔ رہنے کے لئے بڑے بڑے شاندار محلات بناتے تھے۔ بڑے قد اور قوی الجثہ آدمی تھے آیات مذکورہ میں زَادَ کُفْرَی الخَلْقِ بَصُطَةً کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری ہی نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے۔ مگر ان کی کج فہمی نے انھیں نعمتوں کو ان کے لئے وبال جان بنا دیا۔ اپنی قوت و شوکت کے نشہ میں بدمست ہو کر مَنَ اَشَدُّ مَنَاقُوۃً کی ڈینگ مارنے لگے۔ اور رب العالمین جس کی نعمتوں کی بارش ان پر ہو رہی تھی اس کو چھوڑ کر بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت ہود علیہ السلام کا نسب نامہ اور بعض حالات

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ جو خود انھیں کے خاندان سے تھے۔ اور ابو البرکات جوئی جو انساب عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں جو یمن میں جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انھیں کی نسل ہیں۔ اور عربی زبان کی ابتداء انھیں سے ہوئی اور یعرب کی مناسبت سے ہی زبان کا نام عربی اور اس کے بولنے والوں کو عرب کہا گیا۔ (بحر محیط)

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہد نوح علیہ السلام سے جاری تھی کشتی نوح علیہ السلام کے ایک رفیق جبریم تھے جو عربی زبان بولتے تھے (بحر محیط)۔ اور یہی جبریم ہیں جن سے مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتدا یعرب بن قحطان سے ہوئی اور ابو البرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے قوم عاد کو بت پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرنے اور ظلم و جور چھوڑ کر عدل و انصاف اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ مگر یہ لوگ اپنی دولت و قوت کے نشہ میں ہر شار تھے۔ بات نہ مانی جس کے نتیجہ میں اُن پر پہلا عذاب تو یہ آیا کہ تین سال تک مسلسل بارش بند ہو گئی۔ ان کی زمینیں خشک ریگستانی صحرا بن گئی باغات جل گئے۔ مگر اس پر بھی یہ لوگ مشرک و بت پرستی سے باز نہ آئے تو آٹھ دن اور سات راتوں تک ان پر شدید قسم کی آندھی کا عذاب مسلط ہوا جس نے ان کے رہے سہے باغات اور محلات کو زمین پر بچھا دیا ان کے آدمی اور جانور ہوا میں اُڑتے اور پھر سر کے بل آکر گرتے تھے۔ اس طرح یہ قوم عاد پوری کی پوری ہلاک کر دی گئی۔ آیات مذکورہ میں جو ارشاد ہے وَقَطَعْنَا دَاۤیْرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا

یعنی ہم نے جھٹلانے والوں کی نسل قطع کر دی اس کا مطلب بعض حضرات نے یہی قرار دیا ہے کہ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب فنا کر دیئے گئے۔ اور بعض حضرات نے اس لفظ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ آئندہ کے لئے بھی قوم عاد کی نسل اللہ تعالیٰ نے منقطع کر دی۔ حضرت ہود علیہ السلام کی بات نہ ماننے اور کفر و شرک میں مبتلا رہنے پر جب ان کی قوم پر عذاب آیا تو ہود علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے ایک خَظِیرَہ (گھیر) میں پناہ لی۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس طوفانی ہوائے بڑے بڑے محلات تو منہدم ہو رہے تھے مگر اس گھیر میں ہوا نہایت معتدل ہو کر داخل ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام کے سب رفقاء عین نزول عذاب کے وقت بھی اسی جگہ مطمئن بیٹھے رہے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ قوم کے ہلاک ہو جانے کے بعد مکہ معظمہ میں منتقل ہو گئے اور پھر یہیں وفات پائی۔ (بحر محیط)

قوم عاد کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں آنا قرآن مجید میں صراحۃً مذکور اور منصوص ہے اور سورۃ مؤمنون میں قصۃ نوح علیہ السلام ذکر کرنے کے بعد جو ارشاد ہوا ہے ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ یعنی پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور جماعت پیدا کی، ظاہر یہ ہے کہ اس جماعت سے مراد قوم عاد ہے۔ پھر اس جماعت کے اعمال و اقوال بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا فَآخَذَ ثَمَرُ الصَّيْحَةِ بِالْحَقِّ یعنی پکڑ لیا اُن کو ایک سخت آواز نے۔ اس ارشاد قرآنی کی بنا پر بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ قوم عاد پر سخت قسم کی ہیبتناک آواز کا عذاب مُسَلَّط ہوا تھا مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہو سکتا ہے کہ سخت آواز بھی ہوئی ہو اور ہوا کا طوفان بھی۔

یہ مختصر واقعہ ہے قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا اس کی تفصیل قرآنی الفاظ کے ساتھ یہ ہے۔

پہلی آیت میں وَآلِی عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ یُقَوِّمُ رَعْبُدُ وَاللّٰهُ مَا لَکُمْ مِّنْ آلِہِ غَیْبُکُمْ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا تو انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے کیا تم ڈرتے نہیں۔

قوم عاد سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کا عذاب عظیم ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے غائب نہ ہوا تھا اس لئے حضرت ہود علیہ السلام کو عذاب کی شدت و عظمت بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی صرف اتنا فرمانا کافی سمجھا کہ کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

دوسری آیت میں ہے قَالَ الْمَلَا الَّذِیْنَ کَفَرُوا مِنْ قَوْمِہٖ اِنَّا لَنُرِکَ فِیْ سَفَاہَۃٍ وَّلَا اَنۡظُنُّکَ

مِنَ الْكَذِبِينَ۔ یعنی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مبتلا پاتے ہیں اور ہمارا گمان یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تقریباً ایسا ہی معارضہ ہے جیسا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے ان سے کیا تھا صرف بعض الفاظ کا فرق ہے۔ تیسری اور چوتھی آیت میں اس کا جواب بھی تقریباً اُسی انداز کا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ مجھ میں بے وقوفی کچھ نہیں بات صرف اتنی ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول اور پیغمبر بن کر آیا ہوں اُس کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اس لئے تمہاری آبائی جہالتوں اور غلطیوں میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے میں تمہارے طبائع کے خلاف حق بات تمہیں پہنچاتا ہوں جس سے تم بُرا مانتے ہو۔ پانچویں آیت میں قوم عَاد کا وہی اعتراض ذکر کیا گیا ہے جو ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام نے پیش کیا تھا کہ ہم کسی اپنے ہی جیسے بشر اور انسان کو کیسے اپنا بڑا اور پیشوا مان لیں کوئی فرشتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم مان لیتے۔ اس کا جواب بھی قرآن کریم نے وہی ذکر کیا جو نوح علیہ السلام نے دیا تھا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوئی انسان اللہ کا نبی و رسول ہو کر لوگوں کو ڈرانے کے لئے آجائے۔ کیونکہ درحقیقت انسان کے سمجھانے بچھانے کے لئے انسان ہی کا پیغمبر ہونا مؤثر ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ان کو وہ انعامات یاد دلائے جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر مبذول فرمائے ہیں ارشاد فرمایا وَ اذْکُرُوْا اِذْ جَعَلْکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَ زَادْکُمْ فِی الْخَلْقِ بَصۜطَةً ۚ فَاذْکُرُوْا الْاٰیَّۃَ اللّٰہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ یعنی اس بات کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد زمین کا مالک و متصرف بنا دیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ اُس کی ان نعمتوں کو یاد کرو تو تمہارا بھلا ہوگا۔

مگر اس سرکش ہدمست قوم نے ایک نہ سنی اور وہی جواب دیا جو عام طور پر گمراہ لوگ دیا کرتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے ہمارے باپ دادا کا مذہب چھڑا دو اور سارے دیوتاؤں کو چھوڑ کر ہم صرف ایک خدا کو ماننے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ آپ جس عذاب کی دھمکی ہمیں دے رہے ہیں اس عذاب کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

چھٹی آیت میں ہود علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب تمہاری سرکشی اور بے ہوشی کی یہ حالت ہے تو اب تم پر خدا تعالیٰ کا غضب اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی اب اُسی کا انتظار کرتے ہیں۔ قوم کے اس اشتعال آمیز جواب پر عذاب آنے کی خبر تو دے دی لیکن پیغمبرانہ شفقت و نصیحت نے پھر مجبور کیا کہ اس کلام کے دوران میں یہ بھی

فرمادیا کہ افسوس ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بے عقل بے جان چیزوں کو اپنا معبود بنالیا جن کے معبود ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی اور پھر تم ان کی عبادت میں ایسے پختہ ہو گئے کہ ان کی حمایت میں مجھ سے جھگڑا کر رہے ہو۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہود علیہ السلام کی ساری جدوجہد اور عاقبت کی سرکشی کا آخری انجام یہ ہوا کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے عذاب سے محفوظ رکھا اور جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

اس قصہ میں غافل انسانوں کے لئے خدا کی یاد اور اطاعت میں لگ جانے کی ہدایت اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سامان عبرت اور مبلغین و مصلحین کے لئے پیغمبرانہ طریقہ تبلیغ و اصلاح کی تعلیم ہے۔

وَالِی شَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ

اور شمود کی طرف بھیجا اُن کے بھائی صالح کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا

مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِہٖ ۚ قَدْ جَآءَ تَکْمِ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۚ ہٰذِہٖ نَاقَۃٌ

معبود اس کے سوا، تم کو پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے، یہ اوشنی

اللّٰہ لَکُمْ اٰیَۃٌ فَذَرُوہَا تَاکُلْ فِیْ اَرْضِ اللّٰہِ وَلَا تَمْسُوہَا

اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ

ۚ بِسُوۡءٍ فَاِیْخُذْکُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۷۶ وَاذْکُرُوۡا اِذْ جَعَلْکُمْ

بُری طرح، پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک۔ اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار

خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّآکُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوۡنَ

کر دیا عار کے پیچھے اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ بناتے ہو

مِنْ سُهُولِہَا قُصُوۡرًا وَّ تَنْحِتُوۡنَ اِلْجَبَالَ ۚ بَیۡوَتًاۤ اَظْہَرُ

نرم زمین میں محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سویا کر دو

اِلَّاۤءَ اللّٰہِ وَلَا تَعۡتَوۡا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیۡنَ ۝۷۷ قَالَ الْمَلَاۤءُ

احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین میں فساد۔ کہنے لگے سردار

الَّذِیۡنَ اسْتَكْبَرُوۡۤا مِنْۢ قَوْمِہٖۤ لِلَّذِیۡنَ اسْتَضَعِفُوۡۤا لِمَنْ اَمِّنَ

جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان

مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ط قَالُوا إِنَّا

لاپچھے تھے کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اُس کے رب نے ، بولے ہم کو

بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي

تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے ۔ کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو

أَمِنْتُمْ بِهِ كُفْرُونَ ﴿٥٦﴾

یقین ہے ہم اس کو نہیں مانتے ۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (انہوں نے ایک خاص معجزہ کی درخواست کی کہ اس پتھر میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں چنانچہ آپ کی دعا سے ایسا ہی ہوا کہ وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اونٹنی نکلی۔ رواہ محمد بن اسحق۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل (میرے رسول ہونے کی) آچکی ہے (آگے اس کا بیان ہے) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (اور اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلاتی کہ اللہ کی دلیل ہے) سو (علاوہ اس کے کہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو بُرائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آپکڑے اور (اے قوم) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (قوم) عاد کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو (دلخواہ) ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر (بھی بڑے بڑے) محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (بھی) گھر بناتے ہو سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو (اور دوسری نعمتوں کو بھی) یاد کرو (اور کفر و شرک کے ذریعہ) زمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی ایمان لے آؤ مگر باوجود اس قدر فہمائش کے کچھ غبار ایمان لائے اور ان میں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی یعنی) ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے

ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے (پیغمبر بنا کر) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں انہوں نے (جواب میں) کہا کہ بیشک ہم تو اس (حکم) پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کے حالات کا تذکرہ ہے جیسے اس سے پہلے قوم نوح اور قوم ہود علیہما السلام کا ذکر آچکا ہے اور سورہ اعراف کے آخر تک بھی انبیاء سابقین اور ان کی قوموں کے احوال انبیاء کی دعوت حق پر ان کے کفر و انکار کے انجام بد کا بیان ہے۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا وَلَئِنْ ثَمُودُ أَخَاهُمْ ضَلَحًا اس سے پہلے قوم عاد کے تذکرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں ایک قوم عاد دوسری قوم ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے تھے اور ان کے بڑے شہر کا نام حجر تھا جس کو اب عموماً مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی دولت مند، قوی اور بہادر قوم اور سنگ تراشی اور فن تعمیر میں ماہر تھی کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کر ان میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر رومی اور ثمودی خط میں کتبہ منقوش ہیں۔ دنیا کی دولت و ثروت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو کر غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ قوم ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔

حالانکہ ان سے پہلے قوم نوح علیہ السلام کے عذاب کے واقعات کا تذکرہ ابھی تک دنیا میں موجود تھا اور پھر ان کے بھائی قوم عاد کی ہلاکت کے واقعات تو تازہ ہی تھے۔ مگر دولت و قوت کے نشہ کا خاصہ یہی ہے کہ ابھی ایک شخص کی بنیاد منہدم ہوتی ہے دوسرا اس کی خاک کے ڈھیر پر اپنی تعمیر کھڑی کر لیتا ہے اور پہلے کے واقعات کو بھول جاتا ہے۔ قوم عاد کی تباہی اور ہلاکت کے بعد قوم ثمود ان کے مکانات اور زمینوں کی وارث بنی اور انہیں مقامات پر اپنے عشرت کدے طیار کئے جن میں ان کے بھائی ہلاک ہو چکے تھے اور ٹھیک وہی اعمال و افعال شروع کر دیئے جو قوم عاد نے کئے تھے کہ خدا و آخرت سے غافل ہو کر شرک و بت پرستی میں لگ گئے

اللہ تعالیٰ نے اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ صالح علیہ السلام نسب و وطن کے اعتبار سے قومِ ثمود ہی کے ایک فرد تھے۔ کیونکہ یہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے اسی لئے قرآن کریم میں ان کو قومِ ثمود کا بھیائی منسوب کیا ہے اَخَاهُمْ صَالِحًا۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ وہی دعوت ہے جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک سب انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ یعنی ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور بت پرستی سے بچو۔ عام انبیاء سابقین کی طرح صالح علیہ السلام نے بھی قوم سے یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور خالق و مالک سمجھو اس کے سوا کوئی معبود بنانے کے لائق نہیں۔ فرمایا يُقْوِمُوا عِبَادَ اللَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ آلِهٍ غَيْرُهُ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ یعنی اب تو ایک کھلا ہوا نشان بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آپہنچا ہے۔ اس نشان سے مراد ایک عجیب و غریب ناقہ ہے جس کا اجمالی ذکر اس آیت میں بھی ہے اور قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں اُس کی مزید تفصیلات مذکور ہیں۔ واقعہ اس ناقہ کا یہ تھا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی کے زمانہ سے اپنی قوم کو دعوتِ توحید دینا شروع کی اور برابر اس میں لگے رہے یہاں تک کہ بڑھاپہ کے آثار شروع ہو گئے۔ صالح علیہ السلام کے بار بار اصرار سے تنگ ہو کر ان کی قوم نے یہ قرار دیا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کر د جس کو یہ پورا نہ کر سکیں اور ہم ان کی مخالفت میں سرخرو ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام کاتبہ تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال دیجئے جو دس مہینہ کی گاہن ہو اور قوی و تندرست ہو۔

صالح علیہ السلام نے اول ان سے عہد لیا کہ اگر میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کر ادوں تو تم سب مجھ پر اور میری دعوت پر ایمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کر لیا۔ تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کے لئے تو کوئی کام دشوار نہیں ان کا مطالبہ پورا فرمادیں۔ دعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اُسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔ صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے۔ اور باقی تمام قوم نے بھی الادہ کر لیا کہ ایمان لے آئیں۔ مگر قوم کے چند سردار جو

بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے امام تھے انھوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آجائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بنا پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آجائے گا یہی مضمون آیت مذکورہ کے ان جملوں میں ارشاد ہوا ہے **هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ قَدْ رَوَّهَا تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَسْسُوْهَا بِسَوْءٍ قِيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ**۔ یعنی یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمھارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے۔ اور اس کو بُرائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا ورنہ تم کو عذاب الیم آپکڑے گا اس ناقہ کو ناقۃ اللہ اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی قدرت کاملہ کی دلیل اور صالح علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر حیرت انگیز طریق سے پیدا ہوئی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ فرمایا گیا کہ اُن کی پیدائش بھی معجزانہ انداز سے ہوئی تھی۔ **تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ** میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمھاری ملک اور تمھارے گھر سے کچھ نہیں جاتا زمین اللہ کی ہے اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے اُس کی اونٹنی کو اُس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگا ہوں میں کھاتی رہے۔ قوم ثمود جس کنوئیں سے پانی پیتے پلاتے تھے اُسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ عجیب الخلقہ اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنوئیں کا پانی ختم کر دیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے باذن ربانی یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے اور جس روز یہ اونٹنی پانی پیے گی تو دوسروں کو پانی کے بجائے اونٹنی کا دودھ اتنی مقدار میں مل جاتا تھا کہ وہ اپنے سارے برتن اُس سے بھر لیتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس تقسیم کا ذکر اس طرح آیا ہے **وَقَبِّلْتُمُوْهُمْ اِنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شَرْبٍ مُّخْتَصِرٌ**۔ یعنی صالح علیہ السلام آپ اپنی قوم کو بتلادیں کہ کنوئیں کا پانی اُن کے اور ناقۃ اللہ کے درمیان تقسیم ہو گا ایک دن اونٹنی کا اور دوسرے دن پوری قوم کا اور اس تقسیم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی نگرانی مسلط ہوگی کہ کوئی اس کے خلاف نہ کر سکے۔ اور ایک دوسری آیت میں ہے **هَذِهِ نَاقَةُ لِّمَّا شَرَبْتَ وَلَكُمْ شَرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ**۔ یعنی یہ اللہ کی اونٹنی ہے ایک دن پانی کا حق اس کا اور دوسرے دن کا پانی تمھارے لئے معین و مقرر ہے۔

دوسری آیت میں اس وعدہ فراموشی سرکش قوم کی خیر خواہی اور ان کو عذاب الہی سے بچانے کے لئے پھر اُن کو اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات یاد دلاتے کہ اب بھی یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز آجائیں فرمایا۔ **وَادْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْاَرْضِ**

تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا اس میں خلفاء خلیفہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں قائم مقام اور نائب اور قصور قصر کی جمع اونچی عالیشان عمارت اور محل کو کہا جاتا ہے تَنْحِتُونَ، نَحَتْ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں سنگ تراشی۔ جبال جبل کی جمع ہے بمعنی پہاڑ بیوتا بیت کی جمع ہے جو گھر کے کمرے کے لئے بولا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے قوم عاد کو ہلاک کر کے اُن کی جگہ تم کو بسایا اُن کی زمین اور مکانات تمہارے قبضہ میں دے دیئے اور تم کو یہ صنعت سکھلا دی کہ کھلی زمین میں بڑے بڑے محلات بنا لیتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں کمرے اور مکانات بنا لیتے ہو۔ آخر آیت میں فرمایا فَادْكُرُوا اللَّهَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔ یعنی اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ان کا احسان مانو، اُس کی اطاعت اختیار کرو اور زمین میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

احکام و مسائل | آیات مذکورہ سے چند اصولی اور فروعی مسائل معلوم ہوئے۔

اول یہ کہ اصول عقائد میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور اُن کی شریعتیں متحد ہیں سب کی دعوت توحید کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اُس کی خلاف ورزی پر عذاب دنیا و آخرت سے ڈرنا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام پچھلی امتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولتمند آبرو دار لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اُس کے نتیجہ میں دنیا میں بھی ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی مستحق عذاب ہوئے۔

تیسرے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں کافروں پر بھی مبذول ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قوم عاد و ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دولت و قوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

چوتھے تفسیر قرطبی ہی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلات اور عالیشان مکانات کی تعمیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اُن کا بنانا جائز ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ انبیاء و اولیاء اللہ نے اس کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیزیں انسان کو غفلت میں ڈال دینے والی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اونچی تعمیرات کے بارہ میں ارشادات منقول ہیں وہ اسی انداز کے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں وہ مکالمہ اور مباحثہ ذکر کیا گیا ہے جو قوم ثمود کے دو گروہوں کے درمیان ہوا۔ ایک وہ گروہ جو صالح علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا، دوسرا منکرین و کفار کا گروہ۔ ارشاد فرمایا قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُوا مِنْ آمَنَ

مِنْهُمْ یعنی کہا قوم صالح علیہ السلام میں سے اُن لوگوں نے جنہوں نے تکبر کیا اُن لوگوں سے جن کو حقیر و ضعیف سمجھا جاتا تھا یعنی جو ایمان لائے تھے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ اس جگہ ان دونوں گروہوں کے دو وصف قرآن کریم نے بتلائے مگر کفار کا وصف بصیغہ معروف بتلایا اسْتَكْبَرُوا اور مؤمنین کا وصف بصیغہ مجہول بَتَلَايَا اسْتَضْعَفُوا اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ کفار کا یہ حال کہ وہ تکبر کرتے تھے خود اُن کا اپنا فعل تھا جو قابل مواخذہ و ملامت اور انجام کار موجب عذاب ہوا۔ اور مؤمنین کا جو وصف یہ لوگ بیان کرتے تھے کہ وہ ذلیل و حقیر اور ضعیف ہیں۔ یہ کفار کا کہنا ہے خود مؤمنین کا واقعی حال اور وصف نہیں جس پر کوئی ملامت ہو سکے بلکہ ملامت ان لوگوں پر ہے جو بلا وجہ ان کو حقیر و ضعیف کہتے اور سمجھتے ہیں۔ آگے وہ مکالمہ جو دونوں گروہوں میں ہوا یہ ہے کہ کفار نے مؤمنین سے کہا کہ کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

مؤمنین نے جواب دیا کہ جو ہدایات وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے کر بھیجے گئے ہیں ہم ان سب پر یقین و ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر کشاف میں ہے کہ قوم ثمود کے مؤمنین نے کیسا بلیغ جواب دیا ہے کہ تم جس بحث میں پڑے ہوئے ہو کہ یہ رسول ہیں یا نہیں یہ بات قابل بحث ہی نہیں بلکہ بدیہی اور یقینی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوا پیغام ہے۔ بات کچھ ہو سکتی ہے تو یہ کہ کون اُن پر ایمان لاتا ہے کون نہیں، سو ہم تو بحمد اللہ اُن کی لائی ہوئی سب ہدایات پر ایمان رکھتے ہیں۔

مگر ان کے بلیغ جواب پر بھی قوم نے وہی سرکشی کی بات کی کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اُس کے منکر ہیں۔ دنیا کی محبت اور دولت و قوت کے نشہ سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے کہ وہ انسان کی آنکھوں کا پردہ بن جاتے ہیں اور وہ بدیہی چیزوں کا انکار کرنے لگتا ہے۔

فَعَقَرُوا وَالنَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُصْلِحْ

پھر انہوں نے کاٹ ڈالا اونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رب کے حکم سے اور بولے اے صالح

اَتَيْنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۷۹﴾ فَأَخَذَتْهُمْ

لے آہم ہر جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا اگر تو رسول ہے۔ پس آپکڑا اُن کو

الرَّجْفَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَثِينَ ﴿۸۰﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ

زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں اوندھے پڑے۔ پھر صالح الٹا پھرا اُن سے

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ

اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور خیر خواہی کی تمہاری

وَلٰكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ﴿٧٩﴾

لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے ۔

خلاصہ تفسیر

غرض (نہ صالح علیہ السلام پر ایمان لائے اور نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے بلکہ) اس اونٹنی کو (بھی) مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم (ماننے) سے (بھی) سرکشی کی (وہ حکم اعتقادِ توحید و رسالت تھا) اور (اس پر یہ بیباکی کہ) کہنے لگے کہ اے صالح جس (عذاب) کی آپ ہم کو دھکی دیتے تھے اس کو منگوائیے اگر آپ پیغمبر ہیں (کیونکہ پیغمبر کا صادق ہونا لازم ہے) پس پکڑا ان کو زلزلہ نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے اس وقت صالح (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا (جس پر عمل کرنا موجبِ فلاح تھا) اور میں نے تمہاری (بہت) خیر خواہی کی (کہ کس طرح شفقت سے سمجھایا) لیکن (افسوس تو یہ ہے کہ) تم لوگ (اپنے) خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے (اس لئے ایک نہ سنی اور آخر روزِ بد دیکھا) ۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے پہاڑ کی ایک بڑی چٹان شق ہو کر اس سے ایک عجیب و غریب اونٹنی پیدا ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو بھی اس قوم کے لئے آخری امتحان اس طرح بنا دیا تھا کہ جس کنویں سے ساری بستی کے لوگ اور اُن کے مویشی پانی حاصل کرتے تھے یہ اس کا سارا پانی پی جاتی تھی اس لئے صالح علیہ السلام نے ان کے لئے باری مقرر کر دی تھی کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے دوسرے دن بستی والے ۔ قوم ثمود اس اونٹنی کی وجہ سے ایک تکلیف میں مبتلا تھے ۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ ہلاک ہو جائے مگر خود ایسی حرکت کرنے سے ڈرتے تھے کہ خدا تعالیٰ کا عذاب آجائے گا ۔ شیطان کا سب سے بڑا وہ فریب جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنی ہوش و عقل کھو بیٹھتا ہے

وہ عورت کا فتنہ ہے۔ قوم کی دو حسین و جمیل عورتوں نے یہ بازی لگا دی کہ جو شخص اس ناقہ کو قتل کر دے گا ہم اور ہماری لڑکیوں میں سے جس کو چاہے وہ اس کی ہے۔ قوم کے دو نوجوان - مَصْدَعٌ اور قَذَار اس نشہ میں مدہوش ہو کر اس ناقہ کو قتل کرنے کے لئے نکلے اور ناقہ کے راستہ میں ایک پتھر کی چٹان کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب ناقہ سامنے آئی تو مصدع نے تیر کا وار کیا اور قذار نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ کر قتل کر دیا۔

قرآن کریم نے اسی کو قوم ثمود کا سب سے بڑا شقی اور بد بخت قرار دیا ہے۔ اِذْ اَنْبَعَثْ اَشْقٰھَا۔ کیونکہ اس کے سبب پوری قوم عذاب میں گرفتار ہو گئی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتلادیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ تَمَتَّعُوْا فِیْ ذٰلِکُمْ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ ذٰلِکَ وَعَدٌ عَلَیْکُمْ مَّکْذُوْبٌ۔ یعنی تین دن اور اپنے گھروں میں آرام کرو (اس کے بعد عذاب آئے والا ہے) اور یہ وعدہ سچا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں۔ مگر جس قوم کا وقت خراب آجاتا ہے اس کے لئے کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہیں ہوتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے اس ارشاد پر بھی ان بد بخت لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا اور اُس کی علامت کیا ہوگی۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ لو عذاب کی علامات بھی سن لو، کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے سخت زرد ہو جائیں گے مرد و عورت، بچہ بوڑھا کوئی اس سے مستثنیٰ نہ ہوگا، پھر برسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے سخت سرخ ہو جائیں گے اور ترسوں ہفتہ کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہو جائیں گے۔ اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بد نصیب قوم نے یہ سن کر بھی بجائے اس کے کہ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہو جاتے یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کر دیں اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔ قوم کے اس ارادہ کا تذکرہ قرآن میں دوسری جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ قوم کے اس متفقہ فیصلہ کے ماتحت کچھ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل کے ارادہ سے گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی میں ان پر پتھر برسا کر ہلاک کر دیا۔ وَمَكْرُوْا مَّکْرًا وَّ مَّکْرًا وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۔ یعنی انہوں نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایسی تدبیر کی کہ اُن کو اُس کی خبر نہ ہوئی۔

اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہو گئے جیسے گہرا زرد رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ عذاب کی پہلی علامت کے سچا ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے۔ اور اپنی غلط کاریوں سے باز آجاتے۔ بلکہ ان کا غیظ و غضب حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم اُن کے قتل کی فکر میں پھرنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر سے بجائے اُس کی بھی علامات ہوتی ہیں کہ قلوب و دماغ اوندھے ہو جاتے ہیں نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔

بالآخر دوسرا دن آیا تو پیش گوئی کے مطابق سب کے چہرے سُرخ ہو گئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہو گئے۔ اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر انتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرف سے کس طرح آتا ہے۔

اسی حال میں زمین سے ایک شدید زلزلہ آیا اور اوپر سے سخت ہیبتناک چیخ اور شدید آواز ہوئی جس سے سب کے سب بیک وقت بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مر گئے۔ زلزلہ کا ذکر تو ان آیات میں موجود ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں فَآخَذَ ثَمَمُ الرَّجْفَةِ۔ رجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔

اور دوسری آیات میں فَآخَذَ ثَمَمُ الصَّيْحَةِ بھی آیا ہے صَیْحَہ کے معنی ہیں چیخ اور شدید آواز۔ دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دونوں طرح کے عذاب ان پر جمع ہو گئے تھے۔ زمین سے زلزلہ اور اوپر سے صیحہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جِثْمِينَ۔ جِثْمِین مصدر جِثْم سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بے حس و حرکت ہو کر ایک جگہ پڑ جانا یا بیٹھ رہنا (قاموس)۔ معنی یہ ہیں کہ جو جس حال میں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَهْرِهِ وَ عَذَابِهِ۔

قوم ثمود کے اس قصہ کے اہم اجزاء تو خود قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں اور کچھ اجزاء روایات حدیث میں مذکور ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے لئے ہیں مگر اُن پر کسی واقعہ اور حقیقت کے ثبوت کا مدار نہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا گزر اس مقام حجر پر ہوا جہاں قوم ثمود پر عذاب آیا تھا۔ تو آپ نے صحابہ کرام کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اُس کے کنوئیں کا پانی استعمال کرے۔ (مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابورغال کے کوئی نہیں بچا۔ یہ شخص اس وقت حرم مکہ میں پہنچا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حرم مکہ کے احترام کے سبب اُس وقت اس کو عذاب سے بچالیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آگیا اور وہیں ہلاک ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابورغال کی قبر کا نشان بھی دکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہو گئی تھی۔ صحابہ کرام نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی اس روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے بنو ثقیف اسی ابورغال کی اولاد ہیں۔ (منظہری)

ان معذب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کدرے بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآن کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفر شام کے راستہ پر یہ مقامات آج بھی داستانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

لَمْ تَسْكُنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا
قوم صالح علیہ السلام کے واقعہ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ۔ یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے مومنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ چار ہزار مومنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضرموت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے اُن کا مکہ معظمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر افسوس تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہو چکی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اُس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کر کے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا نزولِ عذاب اور ہلاکت قوم سے پہلے ہوا ہو اگرچہ بیان میں اُس کو مؤخر ذکر کیا ہے۔

وَلَوْ طَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ

اور بھیجا لو ط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا

بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝۸۰ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ

اس کو کسی نے جہان میں - تم تو دوڑتے ہو مردوں پر

شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۖ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝۸۱

شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ

اور کچھ جواب نہ دیا اُس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے

قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ۝۸۲ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ

شہر سے، یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں۔ پھر بچا دیا ہم نے اُس کو اور اُس کے گھروالوں کو

إِلَّا امْرَأَتَهُ زَكَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝۸۳ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا

مگر اس کی عورت، کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں۔ اور برسایا ہم نے اُن کے اوپر سینہ یعنی پتھروں کا،

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝۸۴

پھر دیکھ، کیا ہوا انہما گنہگاروں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے لو ط (علیہ السلام) کو (چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر) بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم (یعنی اپنی امت) سے فرمایا کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا (یعنی) تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اور اس کام کے ارتکاب میں یہ نہیں کہ تم کو کوئی دھوکہ ہو گیا ہو) بلکہ (اس باب میں) تم حد (انسانیت) ہی سے گزر گئے ہو اور (ان مضامین کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا۔ بجز اس کے کہ (آخر میں) یہودگی کی راہ سے) آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو (یعنی) لو ط علیہ السلام کو اور ان کے ساتھی مؤمنین کو) تم اپنی (اس) بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (اور ہم کو گندہ بتلاتے ہیں پھر گندوں میں پاؤں کا کیا کام، یہ بات انہوں نے براہِ تمسخر کہی تھی) سو (جب یہاں تک نوبت پہنچی تو) ہم نے (اس قوم پر

عذاب نازل کیا اور) لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے متعلقین کو (یعنی ان کے گھر والوں کو اور دوسرے ایمان والوں کو بھی اس عذاب سے) بچا لیا (اس طرح کہ وہاں سے نکل جانے کا پہلے ہی حکم ہو گیا)۔ بجز ان کی بیوی کے کہ وہ (بوجہ ایمان نہ لانے کے) ان ہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور (وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو (اے دیکھنے والے) دیکھ تو سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا (اگر تو غور سے دیکھے گا تو تعجب کرے گا اور سمجھے گا کہ نافرمانی کا کیا انجام ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے قصص کا جو سلسلہ اوپر سے چل رہا ہے اُس کا چوتھا قصہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے۔

لوط علیہ السلام حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ دونوں کا اصل وطن مغربی عراق میں بصرہ کے قریب ارض بابل کے نام سے معروف تھا اس میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ خلیل اللہ علیہ السلام کا گھرانہ خود بت پرستی میں مبتلا تھا۔ حق تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ابراہیم علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ قوم نے مخالفت کی جس کی نوبت آتش نمرود تک پہنچی۔ خود والد نے گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔

اپنے گھرانہ میں سے صرف زوجہ محترمہ حضرت سارہ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام مسلمان ہوئے۔ فَأَمِّنَ لَهُ كَوْثًا۔ بالآخر انھیں دونوں کو ساتھ لے کر وطن سے ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ نہر اردن پر پہنچنے کے بعد بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ کنعان میں جا کر مقیم ہوئے جو بیت المقدس کے قریب ہے۔

اور لوط علیہ السلام کو بھی حق تعالیٰ نے نبوت عطا فرما کر اردن اور بیت المقدس کے درمیان مقام سدوم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ یہ علاقہ پانچ اچھے بڑے شہروں پر مشتمل تھا۔ جن کے نام سدوم، عمورہ، ادمہ، صوبیم اور بعل یا صوغر تھے ان کے مجموعہ کو قرآن کریم نے مَوْتَفَكْہ اور مَوْتَفَكَات کے الفاظ میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سدوم ان شہروں کا دارالحکومت اور مرکز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہیں قیام فرمایا۔ زمین سرسبز و شاداب تھی ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ (یہ تاریخی تفصیلات بحر محیط، منظرہ، ابن کثیر، المنار وغیرہ میں مذکور ہیں)۔

انسان کی عام عادت قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے کَلَّا رَأَى الْإِنْسَانَ كَيْتَغَىٰ ۚ أَن رَّاهُ اسْتَغَىٰ ۚ یعنی انسان سرکشی کرنے لگتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں رہا۔ ان لوگوں پر بھی حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عام انسانی عادت کے تحت دولت و ثروت کے نشہ میں مبتلا ہو کر عیش و عشرت اور ہوا و ہوس کے اُس کنارے پر پہنچ گئے کہ انسانی غیرت و حیا اور اچھے بُرے کی فطری تمیز بھی کھو بیٹھے۔ ایسے خلافِ فطرت فواحش میں مبتلا ہو گئے جو حرام اور گناہ ہونے کے علاوہ فطرتِ سلیمہ کے لئے نفرت اور ایسے گھن کے کام ہیں کہ عام جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا۔ اُنہوں نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا۔ اَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ۔ یعنی بطور تنبیہ کے فرمایا، کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کیا۔

زنا کے بارہ میں تو قرآن کریم نے اِنَّہٗ كَانَ فَاحِشَةً بِغَيْرِ الْف لام کے ذکر کیا ہے اور یہاں الف لام کے ساتھ الفاحشہ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ خلافِ فطرت بدکاری گویا تمام فواحش کا مجموعہ اور زنا سے زیادہ شدید جرم ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ یہ بدکاری تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کی۔ عمرو بن دینار نے فرمایا کہ اس قوم سے پہلے دنیا میں کبھی ایسی حرکت نہ دیکھی گئی تھی (منظہری) اور نہ اہل سدوم سے پہلے کسی بُرے سے بُرے انسان کا ذہن اس طرف گیا تھا۔ اُموی خلیفہ عبدالملک نے کہا کہ اگر قرآن میں قوم لوط علیہ السلام کا واقعہ مذکور نہ ہوتا تو میں کبھی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی انسان ایسا کام کر سکتا ہے۔ (ابن کثیر)

اس میں ان کی بے حیائی پر دو حیثیت سے تنبیہ کی گئی اول تو یہ کہ بہت سے گناہوں میں انسان اپنے ماحول یا اپنے اسلاف کی تقلید کی وجہ سے مبتلا ہو جاتا ہے گو وہ بھی کوئی شرعی عذر نہیں۔ مگر عرفاً اُس کو کسی نہ کسی درجہ میں معذور کہا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا گناہ جو پہلے کسی نے نہیں کیا نہ اُس کے لئے خاص مقتضیات ہیں یہ اور بھی زیادہ وبال ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے کہ کسی بُرے کام یا بُری رسم کو جو شخص ایجاد کرتا ہے اُس پر اپنے فعل کا گناہ اور عذاب تو ہوتا ہی ہے اُس کے ساتھ اُن تمام لوگوں کا عذاب و وبال بھی اسی کی گردن پر ہوتا ہے جو قیامت تک اس کے فعل سے متاثر ہو کر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی اس بے حیائی کو زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ انسان کی طبعی اور فطری خواہش کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حلال اور جائز طریقہ عورتوں سے نکاح کرنے کا مقرر فرما دیا ہے اُس کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کو اختیار کرنا نری خباثت نفس اور گندہ ذہنی کا ثبوت ہے۔

اسی لئے صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس جرم کو عام بدکاری سے زیادہ شدید جرم و گناہ قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا ایسا فعل کرنے والے کو ایسی ہی سزا دینا چاہئے جیسے قوم لوط کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی کہ آسمان سے پتھر برسے، زمین کا تختہ الٹ گیا اس لئے اس شخص کو کسی اونچے پہاڑ سے گرا کر اوپر سے پتھراؤ کر دیا جائے۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ میں بروایت ابن عباسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کام کرنے والوں کے بارہ میں فرمایا فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ۔ یعنی اس کام کے فاعل و مفعول دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ (ابن کثیر)

آخر آیت میں فرمایا بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ۔ یعنی تم ایسی قوم ہو جو حد انسانیت سے گزر گئی ہے۔ یعنی تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم ہر کام میں اُس کی حد سے نکل جاتے ہو۔ جنسی خواہش کے بارہ میں بھی ایسا ہی ہوا کہ خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حد سے نکل کر خلاف وضع فطری میں مبتلا ہو گئے۔

تیسری آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں ان کی قوم کا جواب اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کوئی معقول جواب تو بن نہیں سکا ضد میں آکر آپس میں یہ کہنے لگے کہ یہ لوگ بڑی پاکی اور صفائی کے مدعی ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اپنی بستی سے نکال دو۔

تیسری اور چوتھی آیتوں میں قوم سدوم کی اس کج روی اور بے حیائی کی سزا آسمانی کا ذکر ہے اور یہ کہ اس پوری قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا صرف لوط علیہ السلام اور ان کے چند ساتھی عذاب سے محفوظ رہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَأَنْتَ أَعْيُنُهُمْ أَفْرَافٌ۔ یعنی ہم نے لوط اور اُن کے اہل کو عذاب سے نجات دی۔ یہ اہل کون لوگ تھے۔ بعض حضرات مفسرین کا قول ہے کہ اہل میں دولڑکیاں تھیں جو مسلمان ہوئی تھیں۔ بیوی بھی مسلمان نہ ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ مذکور ہے کہ اُن تمام بستیوں میں ایک گھر کے سوا کوئی مسلمان نہ تھا۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کے صرف گھر کے آدمی مسلمان تھے جن کو عذاب سے نجات ملی اُن میں

بھی بیوی داخل نہ تھی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گئے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچانے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے اہل و متعلقین کو لے کر آخرات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آجائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل کی اپنے اہل و متعلقین کو لے کر آخرت میں سدوم سے نکل گئے۔ بیوی کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ساتھ چلی ہی نہیں دوسری یہ کہ کچھ دور تک ساتھ چلی مگر حکم خداوندی کے خلاف پیچھے مڑ کر بستی والوں کا حال دیکھنا چاہتی تھی تو اس کو عذاب نے پکڑ لیا۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات میں اس واقعہ کو منجمل اور مفصل بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں تیسری آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم نے لوط علیہ السلام اور اُن کے اہل و متعلقین کو عذاب سے نجات دے دی مگر ان کی بیوی عذاب میں رہ گئی۔ نجات دینے کی یہ صورت کہ یہ لوگ آخرات میں بستی سے نکل جائیں اور مڑ کر نہ دیکھیں دوسری آیات میں مذکور ہے۔

چوتھی آیت میں اس قوم پر نازل ہونے والے عذاب کو مختصر لفظوں میں صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر ایک عجیب قسم کی بارش بھیجی گئی۔ اور سورۃ ہود میں اس عذاب کی مفصل کیفیت یہ بیان فرمائی ہے۔ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَابًا رَّغِيمًا مِّنْ سِجِّيلٍ مُّنْضُودٍ مُّسَوِّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَاهِي مِّنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ۔ یعنی جب ہمارا عذاب آپہنچا تو کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے اُن پر پتھر کنکر کے تہ بہ تہ نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور۔

اس سے معلوم ہوا کہ اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کے پورے طبقہ کو جبریل امین نے اٹھا کر اوندھا پلٹ دیا۔ اور جن پتھروں کی بارش برسی وہ تہ بہ تہ تھے یعنی ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بہ تہ جمع ہو گئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر ایک پتھر پر اُس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کی ہلاکت کے لئے پھینکا گیا تھا۔ اور سورۃ حجر کی آیات میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی مذکور ہے فَآخَذَ تَهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ۔ یعنی آپکڑا اُن کو چنگھاڑنے سورج نکلنے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمان سے کوئی سخت آواز چنگھاڑ کی صورت میں آئی پھر اس کے

بعد دوسرے عذاب آئے۔ ظاہر الفاظ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چنگھاڑ کے بعد پہلے زمین کا تختہ الٹ دیا گیا پھر اُس پر اُن کی مزید تذلیل و تحقیر کے لئے پتھراؤ کیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے پتھراؤ کیا گیا ہو بعد میں زمین کا تختہ الٹا دیا گیا ہو۔ کیونکہ قرآنی اسلوب بیان میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا ذکر پہلے ہوا ہو وہ وقوع کے اعتبار سے بھی پہلے ہو۔

قوم لوط علیہ السلام کے ہولناک عذابوں میں سے زمین کا تختہ الٹ دینے کی سزا اُن کے فحش و بے حیائی عمل کے ساتھ خاص مناسبت بھی رکھتی ہے کہ اُنھوں نے قلب موضوع کا ارتکاب کیا ہے۔

سورۃ ہود کی آیات کے آخر میں قرآن کریم نے اہل عرب کی مزید تنبیہ کے لئے یہ بھی فرمایا کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ۔ یعنی یہ الٹی ہوئی بستیاں ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ سفر شام کے راستہ پر ہر وقت ان کے سامنے آتی ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ یہ اُس سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اور یہ منظر صرف نزول قرآن کے زمانہ میں نہیں آج بھی موجود ہے بیت المقدس اور نہر اردن کے درمیان آج بھی یہ قطعہ زمین بحر لوط یا بحر میت کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی زمین سطح سمندر سے بہت زیادہ گہرائی میں ہے اور اُس کے ایک خاص حصہ پر ایک دریا کی صورت میں ایک عجیب قسم کا پانی موجود ہے جس میں کوئی جاندار مچھلی، مینڈک وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے اُس کو بحر میت بولتے ہیں۔ یہی مقام سدوم کا بتلایا جاتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِهِ وَغَضَبِهِ۔

وَالِی مَدَیْنِ اَخَاهُمْ شُعَبًا ۖ قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا

اور مدین کی طرف بھیجا ان کے بھائی شعیب کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں

لَكُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَيْرُهُ ۚ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَادْفَعُوا

تمہارا معبود اُس کے سوا، تمہارے پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے سو پوری کرو

الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَهُمْ وَلَا تَقْسِدُوا

ماپ اور تول، اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور مت خرابی ڈالو

فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اَصْلَاحِهَا ۚ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝۸۵

زمین میں اُس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔

وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستے

اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبِعُوا نَهَايَ عِوَجَاءِ وَادْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا

سے اُس کو جو کہ ایمان لائے اُس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب، اور یاد کرو جب کہ تم بہت تھوڑے

فَكَثَرَكُمْ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۸۷﴾ وَإِنْ كَانَ

پھر تم کو بڑھادیا، اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر

طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا

تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ساتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا

فَاصْبِرْ وَاحْتَسِبْ يَحْكُمُ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۸﴾

تو صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل (کہ کوئی معجزہ ہے) آچکی ہے (جب میری نبوت ثابت ہے) تو (احکام) شرعیہ میں میرا کہنا مانو چنانچہ میں کہتا ہوں کہ) تم ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے) اور روکے زمین میں بعد اس کے کہ (تعلیم و توحید و بعثتِ انبیاء و ایجابِ عدل و ادائے حقوق مکیال و میزان سے) اس کی درستی (تجویز) کر دی گئی فساد مت پھیلاؤ (یعنی ان احکام کی مخالفت اور کفر مت کرو کہ موجب فساد ہے) یہ (جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنا) تمہارے لئے (دنیا و آخرت دونوں میں) نافع ہے اگر تم (میری) تصدیق کرو (جس پر دلیل قائم ہے اور تصدیق کر کے عمل کرو تو امور مذکورہ دارین میں نافع ہیں آخرت میں تو ظاہر ہے کہ نجات ہوگی اور دنیا میں عمل بالشرع سے امن و انتظام قائم رہتا ہے خاص کر پورا نا پنے تولنے میں بوجہ اعتبار بڑھنے کے تجارت کو ترقی ہوتی ہے) اور تم ہر کون پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو (ایمان

لانے پر دھکیاں دو اور (ان کو) اللہ کی راہ (یعنی ایمان) سے روکو اور اس (راہ) میں کچی (اور شہادت) کی تلاش میں لگے رہو (کہ بے جا اعتراض سوچ سوچ کر لوگوں کو بہکاؤ یہ لوگ ضلال مذکور سابق کے ساتھ اس ضلال میں بھی مبتلا تھے کہ سڑکوں پر بیٹھ کر آنے والوں کو بہکاتے کہ شعیب علیہ السلام پر ایمان نہ لانا نہیں تو ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ آگے تذکیر نعمت سے ترغیب اور تذکیر نقت سے ترہیب ہے یعنی) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم (شمار میں یا مال میں) کم تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو (شمار یا مال میں) زیادہ کر دیا (یہ تو ترغیب تھی ایمان لانے پر) اور دیکھو تو کیسا بُرا انجام ہوا فساد (یعنی کفر و تکذیب و ظلم) کرنے والوں کا (جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود گزر چکے ہیں اسی طرح تم پر عذاب آنے کا اندیشہ ہے یہ ترہیب ہے کفر بر اور اگر تم کو عذاب نہ آنے کا اس سے شبہ ہو کہ تم میں سے بعضے (تو) اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے ایمان لائے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لائے (اور پھر بھی دونوں فریق ایک ہی حالت میں ہیں یہ نہیں کہ ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آگیا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا عذاب سے ڈرانا بے اصل ہے) تو (اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فوراً عذاب نہ آنے سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ عذاب نہ آئے گا) ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے (یعنی دونوں فریق کے) درمیان میں اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کئے دیتے ہیں (یعنی عذاب نازل کر کے مؤمنین کو نجات دیں گے اور کفار کو ہلاک کریں گے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں (کہ ان کا فیصلہ بالکل مناسب ہی ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

انبیاء علیہم السلام کے قصص جن کا سلسلہ گزشتہ آیات سے چل رہا ہے ان میں پانچواں قصہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے جو آیات متذکرہ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادہ مدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔ مدین حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل و اولاد بھی مدین کے نام سے معروف ہو گئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اُس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہے وَكَهَّانَ وَرَدَّ مَاءَ مَدْيَنَ۔ اس میں یہی بستی مراد ہے۔ (ابن کثیر)۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے

حسن بیان کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا تھا۔ (ابن کثیر۔ بحر محیط)
حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں قرآن کریم نے کہیں اُن کا اہل
مدین اور اصحابِ مدین کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہیں اصحابِ ایکہ کے نام سے۔ ایکہ کے
معنی جنگل اور بن کہے ہیں۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں قومیں الگ الگ تھیں دونوں کی بستیاں بھی
الگ تھیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام ان میں سے پہلے ایک قوم کی طرف بھیجے گئے ان کی ہلاکت
کے بعد دوسری قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ دونوں قوموں پر جو عذاب آیا اُس کے الفاظ
بھی مختلف ہیں اصحابِ مدین پر کہیں صیحہ اور کہیں رَحْفَہ مذکور ہے اور اصحابِ ایکہ پر
عذابِ ظِلَّة ذکر کیا گیا ہے۔ صیحہ کے معنی چنگھاڑ اور سخت آواز کے اور رَحْفَہ کے معنی زلزلہ
ہیں اور ظِلَّة سائبان کو کہا جاتا ہے۔ اصحابِ ایکہ پر عذاب کی یہ صورت ہوئی کہ اول چند روز
ان کی پوری بستی میں سخت گرمی پڑی جس سے ساری قوم بلبلا اُٹھی۔ پھر اُن کے قریب جنگل
پر ایک گہرا بادل آیا جس سے اُس جنگل میں سایہ ہو گیا اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ دیکھ
کر سارے بستی کے آدمی اس بادل کے سایہ میں جمع ہو گئے۔ اس طرح یہ خدائی مجرم بغیر کسی وارنٹ
اور سپاہی کے اپنے پاؤں چل کر اپنی ہلاکت کی جگہ پہنچ گئے۔ جب سب جمع ہو گئے تو بادل سے
آگ برسی اور زمین میں بھی زلزلہ آیا جس سے یہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اصحابِ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قوم کا نام
ہے اور عذاب کی جو تین قسمیں ابھی ذکر کی گئی ہیں۔ تینوں اس قوم پر جمع ہو گئیں۔ پہلے بادل
سے آگ برسی پھر اُس کے ساتھ سخت آواز چنگھاڑ کی شکل میں آئی پھر زمین میں زلزلہ
آیا۔ ابن کثیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بہر حال یہ دونوں قومیں الگ الگ ہوں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہوں۔ حضرت شعیب
علیہ السلام نے جو پیغام حق ان کو دیا وہ پہلی اور دوسری آیات میں مذکور ہے۔ اس پیغام کی
تفسیر سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اسلام جو تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک دعوت ہے۔ اس کا
خلاصہ ادائے حقوق ہے۔ پھر حقوق دو قسم کے ہیں ایک براہِ راست اللہ تعالیٰ کا حق جس کے
کرنے یا چھوڑنے سے انسانوں کا کوئی معتد بہ نفع نقصان متعلق نہیں جیسے عبادات نماز
روزہ وغیرہ۔ دوسرے حقوق العباد جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔ اور یہ قوم ان دونوں حقوق
سے بے خبر اور دونوں کے خلاف کام کر رہی تھی۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں پر ایمان نہ لاکر حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے

تھے اور اس کے ساتھ خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق کو ضائع کر رہے تھے اور اُس پر مزید یہ کہ راستوں اور سڑکوں کے دھانوں پر بیٹھ جاتے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر لوٹتے اور شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ اس طرح روئے زمین پر فساد مچا رکھا تھا۔ یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دو آیتوں میں اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے تین باتیں فرمائیں، اول **يَقُوْهُرْ اَعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ**۔ یعنی اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود بننے کے لائق نہیں۔ یہ وہی دعوت توحید ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقائد و اعمال کی روح ہے چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اُس کے حقوق سے غافل تھی اس لئے اُن کو بھی سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا۔ اور فرمایا **قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ**۔ یعنی تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے یہاں واضح دلیل سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ تفسیر بحر محیط میں مختلف صورتیں ان کے معجزات کی ذکر کی ہیں۔

دوسری بات یہ فرمائی **فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ** وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ اس میں کیل کے معنی ناپ اور میزان بمعنی وزن تولنے کے معنی میں ہے اور بخص کے معنی کسی کے حق میں کمی کر کے نقصان پہنچانے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی کر کے اُن کو نقصان نہ پہنچایا کرو۔

اس میں پہلے تو ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں **لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ** فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کوتاہی کو عام کر دیا۔ خواہ وہ مال سے متعلق ہو یا عزت و آبرو سے یا کسی دوسری چیز سے۔ (بحر محیط)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ناپ تول میں حق سے کم دینا حرام ہے اسی طرح دوسرے حقوق انسانی میں کمی کرنا بھی حرام ہے۔ کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ یا کسی کے درجہ اور رتبہ کے موافق اس کا احترام نہ کرنا۔ جس جس کی اطاعت واجب ہے اُن کی اطاعت میں کوتاہی کرنا۔ یا جس شخص کی تعظیم و تکریم واجب ہے اُس میں کوتاہی برتنا۔ یہ سب امور اسی جرم میں داخل ہیں جو شعیب علیہ السلام کی قوم کیا کرتی تھی۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

لوگوں کی آبرو کو اُن کے خون کے برابر واجب الاحترام اور قابل حفاظت قرار دیا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں مُطَقِّفِیْن اور تَطْفِیْف کا ذکر آیا ہے اُس میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک شخص کو جلدی جلدی رکوع سجدے کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا قد طَقَّفْتَ یعنی تو نے ناپ تول میں کمی کر دی (موظا امام مالک)۔ مراد یہ ہے کہ نماز کا جو حق تھا وہ تو نے پورا نہ کیا۔ اس میں حق نماز پورا ادا نہ کرنے کو تطفیف کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ آخر آیت میں فرمایا وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا۔ یعنی زمین کی درستی کے بعد اُس میں فساد مت پھیلاؤ۔ یہ جملہ اسی سورۃ اعراف میں پہلے بھی آچکا ہے وہاں اس کے معنی کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ زمین کی ظاہری اصلاح ہر چیز کو اُس کے مصرف پر خرچ کرنے اور حدود کی رعایت کرنے اور عدل و انصاف قائم رکھنے پر موقوف ہے اور باطنی اصلاح، تعلق مع اللہ اور اطاعت احکام الہیہ پر اسی طرح زمین کا ظاہری اور باطنی فساد ان اصول کو چھوڑ دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام نے ان تمام اصول کو نظر انداز کر رکھا تھا جس کی وجہ سے زمین پر ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد برپا تھا۔ اس لئے اُن کو یہ نصیحت کی گئی کہ تمہارے یہ اعمال ساری زمین کو خراب کرنے والے ہیں ان سے بچو۔

پھر فرمایا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ یعنی یہی بات تمہارے لئے نافع ہے اگر تم میری بات مانو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی ان ناجائز حرکتوں سے باز آ جاؤ تو اسی میں تمہارے دین و دنیا کی فلاح اور بہبود ہے۔ دین اور آخرت کی فلاح تو ظاہر ہے کہ احکام الہیہ کی اطاعت سے وابستہ ہے اور دنیا کی فلاح اس لئے کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں شخص ناپ تول میں اور دوسرے حقوق میں دیانت داری سے کام کرتا ہے تو بازار میں اس کی ساکھ قائم ہو کر اس کی تجارت کو فروغ ہو گا۔

تیسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے۔ راستوں بٹریوں پر نہ بیٹھا کرو۔ اس کا مطلب بعض مفسرین نے یہ قرار دیا کہ یہ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں کہ یہ لوگ راستوں پر بیٹھ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے والوں کو روکتے اور ڈراتے دھمکاتے تھے اس سے منع کیا گیا۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ان کے یہ دو جرم الگ الگ تھے۔ راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ بھی کرتے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے روکتے بھی تھے۔ پہلے جملہ میں پہلا مضمون اور دوسرے جملہ میں دوسرا مضمون بیان فرمایا ہے۔ تفسیر بحر محیط وغیرہ میں

اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور راستوں پر بیٹھ کر لوٹ کھسوٹ کرنے میں اس کو بھی داخل قرار دیا ہے جو خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرنے کے لئے راستوں پر چوکیاں بنائی جاتی ہیں۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ جو لوگ راستوں پر بیٹھ کر خلافِ شرع ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں وہ بھی قومِ شعیب علیہ السلام کی طرح مجرم ہیں، بلکہ اُن سے زیادہ ظالم و جابر ہیں۔ آخر آیت میں فرمایا وَتَبْعُوْهُنَّا عَوَجًا یعنی تم لوگ اللہ کے راستہ میں کجی کی تلاش میں لگے رہتے ہو کہ کہیں اُنکلی رکھنے کی جگہ ملے تو اعتراضات و شبہات کے دفتر کھول دیں اور لوگوں کو دینِ حق سے بیزار کرنے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں فرمایا وَ اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَرَكُمْ وَاَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ اس میں ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے ترغیب و ترہیب کے دونوں پہلو استعمال کئے گئے۔ اول تو ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت یاد دلائی کہ تم پہلے اعداد و شمار کے لحاظ سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری نسلیں بڑھا کر ایک بڑی وسیع قوم بنا دیا۔ یا مال و سامان کے اعتبار سے کم تھے اللہ تعالیٰ نے دولت عطا فرما کر مستغنی کر دیا۔ پھر ترہیب کے لئے فرمایا کہ اپنے سے پہلے فساد کرنے والی قوموں کے انجام پر نظر ڈالو کہ قوم نوح قوم عاد و ثمود قوم لوط پر کیا عذاب آپکے ہیں تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔

پانچویں آیت میں اس قوم کے ایک شبہ کا جواب ہے کہ شعیب علیہ السلام کی دعوتِ ایمان کے بعد ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی کچھ ایمان لائے کچھ منکر رہے۔ مگر ظاہری اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جماعتیں یکساں آرام و عیش میں ہیں اگر منکر ہونا کوئی جرم ہوتا تو مجرم کو سزا ملتی۔ اس کے جواب میں فرمایا فَاصْبِرْ وَاَحْتِمْ يَحْكُمُ اللّٰهُ بَيْنَنَا یعنی جلد بازی نہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے علم و کرم سے مجرموں کو بھلت دیتے ہیں جب وہ بالکل ہی سرکش ہو جاتے ہیں تو پھر فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ تمہارا بھی یہی حال ہے اگر تم اپنے انکار سے باز نہ آئے تو عنقریب منکروں پر فیصلہ کن عذاب نازل ہو جائے گا۔

قَالَ الْمَلَا الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ

بولے سردار جو کبر تھے اس کی قوم میں ہم ضرور نکال دیں گے

لِشُعَيْبٍ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قُرَيْبِنَا اَوْ لِنَعُوْدَنَّ

اے شعیب تم کو اور اُن کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ

فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوْ لَوْ كُنَّا كَرِهِيْنَ ۝۱۰ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلٰی اللّٰهِ

ہمارے دین میں، بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی - بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر

كَذِبًا إِنَّ عُنْدَنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّسْنَا اللَّهَ مِنْهَا ط وَمَا يَكُونُ

جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے، اور ہمارا کام نہیں

لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا ط وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ

کہ لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پورے گار سب

شَيْءٍ عِلْمًا ط عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ط رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا

چیزوں کو اپنے علم میں، اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا، اے ہمارے رب فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں

بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا

انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور بولے سردار جو کافر تھے

مِنْ قَوْمِهِ لَئِنْ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَخَسِرُونَ ﴿۹۹﴾ فَأَخَذْتُمُ

اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بیشک خراب ہو گے۔ پھر آ پکڑا اُن کو

الرَّجْفَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَيَيْنَ ﴿۱۰۰﴾ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا

زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو

كَانَ لَمْ يَخْنَوْا فِيهَا الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ﴿۱۰۱﴾

گویا کبھی بے ہی نہ تھے وہاں، جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب۔

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰ قَوْمٍ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالِ رَبِّي وَنَصَحْتُ

پھر اٹھا پھرا اُن لوگوں سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا

لَكُمْ فَكَيْفَ أَسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿۱۰۲﴾

تمہاری، اب کیا افسوس کروں کافروں پر۔

خلاصہ تفسیر

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنیں تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (تو البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے۔ یہ بات مومنین کے لئے اس لئے کہی کہ وہ لوگ قبل ایمان کے اسی طریق کفر پر تھے لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لئے کہی کہ ان کے سکوت قبل بعثت سے

وہ یہ ہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا (شعیب علیہ السلام) نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آجائیں گے گویم (بدلیل و بصیرت) اس کو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اس کو اختیار کریں) ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں اگر (خدا نہ کرے) ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو (کیونکہ اول تو مطلقاً کفر کو دین حق سمجھنا ہی اللہ پر تہمت لگانا ہے کہ یہ دین معاذ اللہ کو پسند ہے خصوصاً مؤمن کا کافر ہونا چونکہ بعد علم و قبول دلیل حق کے ہے اور زیادہ تہمت ہے ایک تو وہی تہمت دوسری وہ تہمت کہ اللہ نے جو مجھ کو دلیل کا علم دیا تھا جس کو میں حق سمجھتا تھا وہ علم غلط دیا تھا اور شعیب علیہ السلام نے لفظ عود یا تو تغلیباً دوسروں کے اعتبار سے یا ان کے گمان کو فرض کر کے یا مشکاکہ برتا، اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے) مقدر (میں) کیا ہو (جس کی مصلحت اہنی کے علم میں ہے تو خیر اور بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے (اس علم سے سب مقدرات کے مصالح کو جانتے ہیں مگر) ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں (اور بھروسہ کر کے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو دین حق پر ثابت رکھے اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین نہ تھا انبیاء کو یہ یقین دیا جاتا ہے بلکہ مقصود اظہار عجز اور تفویض الی المالک ہے جو کہ لوازم کمال نبوت سے ہے اور دوسرے مؤمنین کے اعتبار سے لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں یہ جواب دے کر جب دیکھا کہ ان سے خطاب کرنا بالکل مؤثر نہیں اور ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہیں ان سے خطاب ترک کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری (اس) قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے کیونکہ خدائی فیصلہ کا حق ہونا لازم ہے یعنی اب عملی طور پر حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیجئے) اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اور ان کی قوم کے (انہی مذکور) کافر سرداروں نے (شعیب علیہ السلام) کی یہ تقریر بلیغ سن کر اندیشہ کیا کہ کہیں سامعین پر اس کا اثر نہ ہو جائے اس لئے انہوں نے بقیہ کفار سے (کہا کہ اگر تم شعیب علیہ السلام) کی راہ چلنے لگو گے تو بیشک بڑا نقصان اٹھاؤ گے (دین کا بھی کیونکہ ہمارا مذہب حق ہے حق کو چھوڑنا خسارہ ہے اور دنیا کا بھی اس لئے کہ پورا ناپنے تولنے میں بچت کم ہوگی غرض وہ سب اپنے کفر و ظلم پر جے رہے اب عذاب کی آمد ہوئی) پس ان کو زلزلہ نے پکڑا سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی (اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکلنے کو آواز دے تھے

خود) ان کی یہ حالت ہو گئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی (اور ان کے اتباع کرنے والے کو خاسر بتلاتے تھے خود) وہی خسارہ میں پڑ گئے اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے (جن پر عمل کرنا ہر طرح کی فلاح کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بڑی) خیر خواہی کی کہ کس کس طرح سمجھایا گیا مگر افسوس تم نے نہ مانا اور یہ روز بد دیکھا پھر ان کے عناد و کفر وغیرہ کو یاد کر کے فرمانے لگے کہ جب انہوں نے اپنے ہاتھوں یہ مصیبت خریدی تو پھر میں ان کا فر لوگوں (کے ہلاک ہونے) پر کیوں رنج کروں۔

معارف و مسائل

شعیب علیہ السلام سے جب اُن کی قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کے ماننے والے پھلتے پھولتے اور نہ ماننے والوں پر عذاب آتا مگر ہو یہ رہا ہے کہ دونوں فریق برابر درجہ میں آرام کی زندگی گزار رہے ہیں تو ہم آپ کو کیسے سچا مان لیں۔ اس پر حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ جلد بازی نہ کرو عنقریب اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ فرمادیں گے۔ اس پر قوم کے متکبر سرداروں نے وہی بات کہی جو ہمیشہ ظالم متکبر کہا کرتے ہیں کہ اے شعیب یا تو تم اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں وہ سب ہمارے مذہب میں واپس آ جاؤ۔ ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔

ان کے مذہب میں واپس آنا قوم شعیب علیہ السلام کے مؤمنین کے متعلق تو اس لئے صادق ہے کہ وہ سب پہلے اُنہیں کے مذہب اور طریقہ پر تھے۔ پھر شعیب علیہ السلام کی دعوت پر مسلمان ہو گئے۔ مگر حضرت شعیب علیہ السلام تو ایک دن بھی اُن کے باطل مذہب و طریقہ پر نہ رہے تھے اور نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر کبھی کسی مشرکانہ باطل مذہب کی پیروی کر سکتا ہے تو پھر اُن کے لئے یہ کہنا کہ ہمارے مذہب میں واپس آ جاؤ غالباً اس وجہ سے تھا کہ نبوت عطا ہونے سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان لوگوں کے باطل اقوال و اعمال پر سکوت فرماتے تھے اور قوم کے اندر رلے ملے رہتے تھے اس کے سبب اُن کا خیال حضرت شعیب علیہ السلام کے بارہ میں بھی یہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ہی ہم خیال اور ہمارے مذہب کے پیرو ہیں۔ دعوت ایمان کے بعد اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا مذہب ہم سے مختلف ہے اور خیال کیا کہ یہ ہمارے مذہب سے پھر گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب دیا اَوْ كُنتَ كَارِهٍۭیْنِ۔ یعنی کیا

تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہارے مذہب کو ناپسند اور باطل سمجھنے کے باوجود ہم تمہارے مذہب میں داخل ہو جائیں۔ اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ہے۔

دوسری آیت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارے باطل مذہب سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی۔ اس کے بعد اگر ہم تمہارے مذہب میں واپس ہو جائیں تو یہ ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ پر سخت جھوٹا بہتان ہوگا۔ کیونکہ اول تو خود کفر و شرک کو مذہب بنانا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو اس پر اقرار اور بہتان ہے۔ اس کے علاوہ ایمان لانے اور علم و بصیرت حاصل ہونے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹنا گویا یہ کہتا ہے کہ پہلا طریقہ باطل اور غلط تھا حق اور صحیح وہ طریقہ ہے جس کو اب اختیار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دوہرا جھوٹ اور بہتان ہے کہ حق کو باطل کہا اور باطل کو حق۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں ہو سکتے۔ اور ایسا دعویٰ کرنا بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقربان بارگاہ الہی اور اہل معرفت کی شایان شان نہیں اس لئے فرمایا مَا كَانَتْ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا۔ یعنی ہم تمہارے مذہب میں ہرگز واپس نہیں ہو سکتے بجز اس کے کہ (خدا نخواستہ) ہمارے پروردگار ہی کی مشیت و ارادہ ہماری گمراہی کا ہو جائے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم نے اُسی اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔ اس میں اپنے عجز و ضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل و تفویض ہے جو کمالات نبوت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں۔ کسی نیکی کا کرنا یا بُرائی سے بچنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ہے۔ جیسا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَوْلَا اللَّهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلِينَا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو ہم کو صحیح راستہ کی ہدایت نہ ہوتی اور نہ ہم صدقہ خیرات کر پاتے نہ ناز پڑھ سکتے۔

یہاں تک کہ قوم کے متکبر سرداروں سے گفتگو کرنے کے بعد جب حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اب ان کو خطاب چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ لفظ فتح کے معنی اس جگہ

فیصلہ کرنے کے ہیں اسی معنی سے فاتح بمعنی قاضی آتا ہے (بحر محیط)۔

اور درحقیقت ان الفاظ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے کفار کے لئے ہلاکت کی دعا کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرما کر ان لوگوں کو زلزلہ کے ذریعہ ہلاک کر دیا۔ دوسری آیت کا مضمون ختم ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کے قوم کے متکبر سرداروں کا ایک گمراہ کن قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ آپس میں کہنے لگے یا اپنے پیروؤں سے کہنے لگے کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع کیا تو تم بڑے بے وقوف جاہل ٹھہرو گے۔ (بحر محیط عن عطار)

چوتھی آیت میں اس سرکش قوم کے عذاب کا واقعہ اس طرح ذکر فرمایا۔ فَآخَذْتَهُمُ الرِّجْفَةُ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِيمِينَ۔ یعنی اُن کو سخت اور عظیم زلزلہ نے آپکڑا جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

قوم شعیب علیہ السلام کا عذاب اس آیت میں زلزلہ کو بتلایا ہے اور دوسری آیات میں فَآخَذَهُمْ عَذَابٌ يَوْمِ الظُّلَّةِ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کو یَوْمِ الظُّلَّةِ کے عذاب نے پکڑ لیا۔ یَوْمِ الظُّلَّةِ کے معنی ہیں سایہ کا دن۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اُن پر گہرے بادل کا سایہ آیا جب سب اس کے نیچے جمع ہو گئے تو اسی بادل سے اُن پر پتھریا آگ برساتی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے لئے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم پر ازل تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو جس سے ان کا دم گھٹنے لگانہ کسی سایہ میں چہن آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی۔ پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی۔ یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا۔ اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذابِ ظلمہ دونوں جمع ہو گئے (بحر محیط)۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم شعیب علیہ السلام کے مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذابِ ظلمہ سے ہلاک کئے گئے ہوں۔

پانچویں آیت میں قوم شعیب کے واقعہ سے دوسروں کو عبرت کا سبق دیا گیا ہے جو اس واقعہ کے بیان کا اصل مقصود ہے۔ فرمایا۔ الَّذِينَ كَذَبُوا شُعَيْبًا كَاذِبًا غَنًا وَمَا كَانُوا فِيهَا لَرَاعِيْنَ۔ لفظ غَنًی کے ایک معنی کسی مقام میں خوش عیشی کے ساتھ بسر کرنے کے بھی آتے ہیں اس جگہ

یہی معنی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جن مکانات میں آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ اس عذاب کے بعد ایسے ہو گئے کہ گویا کبھی یہاں آرام و عیش کا نام ہی نہ تھا۔ پھر فرمایا **الَّذِينَ كَذَبُوا شَعْيًا كَانُوا هُمُ الْخَسِرِينَ**۔ یعنی جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی لوگ خسارہ میں پڑے۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے مؤمن ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ انجی اکار خسارہ انہیں پر پڑا۔

چھٹی آیت میں فرمایا **فَتَوَلَّى عَنْهُمْ** یعنی قوم پر عذاب آتا ہوا دیکھ کر شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھی یہاں سے چل دیئے۔ جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ حضرات یہاں سے مکہ معظمہ آگئے۔ اور پھر آخر تک یہیں قیام رہا۔

قوم کی انتہائی سرکشی اور نافرمانی سے یابوس ہو کر شعیب علیہ السلام نے بددعا تو کر دی۔ مگر جب اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب آیا تو پیغمبرانہ شفقت و رحمت کے سبب دل دکھا تو اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے قوم کو خطاب کر کے فرمایا۔ کہ میں نے تو تم کو تمہارے رب کے احکام پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا تھا مگر میں کافر قوم کا کہاں تک غم کروں۔



بِحَمْدِ اللہ جلد سوم تمام ہوئی

باقی سورۃ اعراف چوتھی جلد میں آئے گی۔

